ماہنامہ

جاسوسی ڈائجسٹ

فروری ۱۹۸۳ء

Jasoosi Digest February 1983

Scanned by: Ata-Ul-Mustafa (0333-4585215)

Jasoosi Digest February 1983

مدیر — معراج رسول
معاون — صدیقی
مدیر معاون — احمد سعید
ترتیب — طاہر یوسفی
مستقل — غلام کبریا

پبلشر: معراج رسول ◎ مقام اشاعت: سعید منشن بلیوریا اسٹریٹ آئی آئی چندریگر روڈ کراچی ◎ پرنٹر: ابن حسن ◎ مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس، کراچی

Jasoosi Digest February 1983

جاسوسی ڈائجسٹ

جلد ۱۳ ◎ شمارہ ۲ ◎ فروری ۱۹۸۳ء ◎ قیمت: دس روپے ◎ زرسالانہ مع رجسٹری خرچ: ۱۲۰ روپے ◎ خط و کتابت کا پتہ: پوسٹ بکس ۲۲۹ کراچی

Jasoosi Digest February 1983

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم السلامُ علیکم ! اقلیم علیم صاحب کے والدِ بزرگوار کے انتقال پر جاسوسی ڈائجسٹ کے قارئین نے دعائے مغفرت

قارئینِ کرام !

کے ساتھ دلی رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔ اقلیم صاحب کے لئے ان حضرات کا فرداً فرداً شکریہ ادا کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس لئے ان صفحات کے ذریعے وہ تمام قارئین کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

محی الدین نواب کی کہانی "مجرم" انگریزی ناول سے ماخوذ تھی۔ غلطی سے کہانی کے ساتھ اس کی نشاندہی نہ کی جا سکی تھی۔ اور اب آیئے تبصروں کی طرف۔ لیکن اس سے پہلے ایک بات اور، بعض قارئین کا خیال ہے کہ انعام یافتہ طویل تبصرے شائع ہونے کی صورت میں جگہ کم رہ جاتی ہے اور دوسرے خطوط شائع ہونے سے رہ جاتے ہیں۔ اس لئے انعام یافتہ تبصرے پر انعام دے دیا جائے، تبصرے شائع نہ کئے جائیں۔ ہمارے خیال میں یہ مناسب نہیں ہے۔ البتہ یہ صورت ہو سکتی ہے کہ یہ تبصرے مختصر کر دیئے جائیں۔ اس مرتبہ یہی طریقہ اختیار کیا جا رہا ہے۔ اس مرتبہ بھی اچھے تبصرے خاصی تعداد میں تھے لیکن بہت سوچ بچار کے بعد بالآخر امتیاز محمود کوکب صاحب کو پہلے انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ ایک سال کے لئے جاسوسی ڈائجسٹ ان کے نام جاری کیا جا رہا ہے۔ تبصرہ ملاحظہ فرمایئے ــــ اس شمارے کی بہترین کہانی مجرم ہے۔ کاش! یہ معاشرہ ان کہانیوں سے کوئی سبق حاصل کر سکے۔ دوسری بہترین کہانی "دولت کی صلیب" ہے۔ مصنف نے کہانی کا "تانا بانا" ایسا بنا ہے کہ کہانی کو شروع کر کے رسالے کو ہاتھ سے رکھا نہیں جا سکتا۔ "چھٹی حس" کے انجام نے حیرت زدہ کر دیا۔ بہت اچھی کہانی تھی۔ جبران ہمارا پسندیدہ کردار رہا ہے۔ "پیشہ ور" بھی اچھی تھی۔ "چارا" میں پولیس افسر نے جس طرح مجرم کا سراغ لگایا ہے وہ اچھا ہے۔ لیکن کہانی زیادہ متاثر نہ کر سکی۔ "مفرور" اس قسط میں بور رہی۔ سوائے صفدر اور سیتا کی واپسی کے کوئی قابلِ ذکر واقعہ نہیں تھا۔ شاید آئندہ دلچسپ ہو۔ "ہم پلہ" نے بالکل متاثر نہیں کیا۔ "معصوم تمنا" ملی جلی کیفیت کی حامل ہے۔ "گمراہ" ہماری پسندیدہ کہانیوں میں سرِفہرست ہے۔ جبار توقیر صاحب کا اندازِ بیاں دلچسپ اور مسحور کن ہے۔ "اجتماعی مفاد" میں ڈیوڈ بیری نے اپنی صلاحیتوں کا اچھا استعمال کیا ہے۔ "عقابوں کا نشیمن" اولیور کی حاضر دماغی کا شاہکار ہے۔ انجم نازلی کی "ڈرامہ" زیادہ متاثر نہ کر سکی۔ "مارِ آستین" بہتر ہے۔ سرورق پر آرٹسٹ صاحب نے ایک خوبصورت چہرہ پیش کیا ہے لیکن اس میں ایک بات کھٹکتی ہے کہ آنکھوں کے نچلے پپوٹوں پر سرخی کا استعمال ہوا ہے۔ حالانکہ یہ سرخی پپوٹوں کو الٹا کر کے دیکھنے پر نظر آتی ہے۔ چہرہ انتہائی خوبصورت ہے۔ متناسب ہونٹ، دہانہ، ناک اور ماتھے کی بناوٹ اور دلکش بال، یہ سب مل کر سرورق کو نہایت جاذبِ نظر بناتے ہیں۔ اقتباسات تقریباً سب ہی اچھے ہیں ــــ امتیاز محمود صاحب ! پہلا انعام حاصل کرنے کی مبارکباد قبول کیجئے۔ کہانیوں کی پسندیدگی کا شکریہ۔

دوسرا انعام چھ ماہ کے لئے "محور" حاصل کیا ہے، مشتاق احمد مستوئی صاحب نے۔ تبصرہ ملاحظہ فرمایئے ــــ جنوری کا شمارہ پسند آیا۔ سرورق نے بہت متاثر کیا۔ لڑکی کے چہرے اور آنکھوں میں مسحور کن کشش پائی جاتی ہے۔ "دولت کی صلیب" نے خاص متاثر نہیں کیا۔ نرگس شیخ کی "چھٹی حس" بہت پسند آئی۔ اثر لغمانی کی "پیشہ ور" بھی اچھی تھی۔ "چارا" بھی خوب رہی۔ "مفرور" جاسوسی ڈائجسٹ کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا سلسلہ ہے لیکن موجودہ قسط کمزور رہی۔ "ہم پلہ" خوب رہی۔ ڈیلی جیسے لالچی لوگوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔ "معصوم تمنا" خاص متاثر نہ کر سکی۔ "گمراہ" بھی اچھا سلسلہ ہے۔ جبار توقیر صاحب کا اندازِ بیان بہت دلچسپ ہے (غلطی سے "گمراہ" کی اس قسط میں پنوعاقل لکھا گیا ہے۔ اصل میں وہ مقام حیدرآباد تھا۔ پتہ نہیں یہ غلطی کاتب صاحب کیوں کر گئے۔ ممکن ہے پنوعاقل میں ان کے کوئی عزیز رہتے ہوں) "اجتماعی مفاد" کوئی خاص کہانی نہیں لگی۔ محمود احمد مودی کی "عقابوں کا نشیمن" بہت پسند آئی۔ غم واقعی دولت ہے۔ "ڈرامہ" کوئی خاص تاثر نہ چھوڑ سکی۔ ظفر اعجاز کی "مارِ آستین" نے بہت متاثر کیا۔ نہ جانے شہالی جیسے کتنے غدار عرب ملکوں کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہیں۔ "مجرم" میں نواب صاحب نے ایک غیرت مند بھائی کی غیرت کا بھرم رکھنے کا جو نقشہ کھینچا ہے، وہ انہی کا حصہ ہے۔ اس کہانی کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے ــــ مشتاق احمد مستوئی صاحب ! آپ نے چھ ماہ کے لئے "محور" کا انعام حاصل کیا اس کی مبارکباد قبول کیجئے۔ جاسوسی ڈائجسٹ کی پسندیدگی کا شکریہ۔ چند اچھے تبصرے بھیجنے والے ہیں۔ نمبر ایک۔ راولپنڈی سے حق نواز شاکر سیال صاحب لکھتے ہیں ــــ شمارۂ جنوری کی تقریباً تمام کہانیاں اچھی ہیں۔ "صلیبِ دولت" میں ڈاکٹر رشید کے کیمرے نے بالآخر غلام علی کو بے نقاب کر ہی دیا۔ "چھٹی حس" نے خاص متاثر نہیں کیا۔ "چارا" میں پولیس افسر نے انگوٹھی کے ذریعے قاتل تک پہنچنے کا جو حربہ استعمال کیا وہ لاجواب تھا۔ "مفرور" میں سیتا اگر ابالہ جانے کا ارادہ رکھتی ہے تو اسے صفدر علی کا ساتھ دینا پڑے گا۔ "گمراہ" میں اب امید ہو گئی ہے کہ غلام جیلانی تکریم احمد کے ذریعے ڈاکٹر دمن تک پہنچ جائے گا۔ "ہم پلہ" میں جے ڈی نے ڈیلیا ہی خاوند بلڈیا جیسی آسس کی لڑکی تھی۔ سرورق کی تینوں کہانیوں میں سے نواب صاحب کی "مجرم" نے بہت متاثر کیا ــــ نمبر دو، تشکیل احمد صاحب بہاولپور(؟) ڈی : اس ماہ سرورق نے دیوانہ بنا دیا۔ اس حسینۂ عالم کو ایک نظر دیکھنے سے ہی دل گنوا بیٹھے۔ سرخی مائل گلابی ہونٹ اگرچہ لپ اسٹک کے ہی مرہونِ منت ہیں۔ بلور جیسی آنکھیں، جھیل سیف الملوک جیسا صاف و شفاف چہرہ (ابھی تک تو ہم نے آنکھوں کو جھیل سے تشبیہ دیتے سنا تھا) اور سانپ کی طرح بل کھاتی زلفیں، یوں جیسے پرستان پر کوئی پری بیٹھی ہے۔ (یہ سب کچھ پڑھ کر ذاکر صاحب خوب مزے لے رہے ہوں گے۔ اور کیوں نہ

ہو تخلیق تو آفرانہی کی ہے۔ بشّس ہم جمیل کی "دولت کی صلیب" موجودہ معاشرے کی جیتی جاگتی مثال ہے۔ "چھٹی حس" بھی اچھی کہانی تھی۔ جبران
کا نام دیکھ کر باچھیں کھل گئیں۔ "چارا" نے متاثر کیا۔ پولیس افسر کی ذہانت قابلِ داد تھی۔ "مفرور" اگرچہ اس مرتبہ دلچسپ نہ تھی لیکن پاکستانی ماحول کی
عکاسی بڑی اچھی طرح کی گئی ہے۔ "ہم پلّہ" بھی اچھی کہانی تھی۔ "معصوم تمنا" نے کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑا۔ آسیہ نے اس مرتبہ کمال کر دکھایا۔ آسیہ کے
مجرم کو بھی کوئی عبرتناک سزا ملنی چاہئے۔ "اجتماعی مفاد" دلچسپ اور سبق آموز تحریر تھی۔ "ڈرامہ" ایک بہترین کہانی تھی۔ "عقابوں کا نشیمن" بھی بہت پسند
آئی۔ شکیل احمد صاحب ہمیں خوشی ہے کہ ہماری کوشش بارآور ثابت ہوئی اور آپ کو مجموعی طور پر پرچہ اچھا لگا، شکریہ! نمبر تین۔ ان بخاری صاحب
میرپور خاص: "اس مرتبہ سرورق پچھلے ماہ سے کم نمبر پر رہا لیکن بہرحال خوبصورت تھا۔ رنگوں کا انتخاب بھی اچھا تھا لیکن لڑکی کے ہونٹوں
کی بناوٹ اور سرخی اس کو معصوم نہ پیش کر سکی۔ (ذاکر صاحب متوجہ ہوں) میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ جاسوسی ڈائجسٹ میں ٹائیٹل کے اندر والا اور
بیک ٹائیٹل کے اندر والا صفحہ خالی کیوں ہوتا ہے۔ اتنی بڑی اشاعت کے پرچے کے لئے اشتہاروں کی تو کمی نہیں ہونی چاہئے۔ اسے شکر ہے آپ کا خیال درست
ہے۔ اشتہاروں کی تو کمی نہیں ہے البتہ رقم کی کمی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ان صفحات پر اشتہاروں کے ریٹ بیک ٹائیٹل سے زیادہ ہونے چاہئیں کیونکہ ان
صفحات پر اشتہار چھاپنے کی اضافی رقم ہمیں پریس کو دینا پڑتی ہے جو اشاعت زیادہ ہونے کی وجہ سے خاصی بڑی بنتی ہے۔ جبکہ مشتہرین کا کہنا ہے کہ
ان صفحات کے ریٹ بیک ٹائیٹل سے کم ہونے چاہئیں۔ اب آپ کچھ سمجھ گئے ہوں گے کہ جاسوسی ڈائجسٹ میں ان صفحات پر اشتہار کیوں نہیں ہوتے۔
کہانیوں کے اسکیچ گو زیادہ تر کہانیوں کے مطابق تھے لیکن پرانے انداز کے ہوتے ہیں۔ آپ اس طرف توجہ دیں۔ "دولت کی صلیب" اچھی کہانی تھی۔ "چھٹی حس"
فراڈ کے بارے میں اچھی تحریر تھی۔ "جبران" کی کہانی میں اثر نعمانی صاحب نے خاصا سسپنس رکھا۔ اس کہانی میں ڈاکٹر صاحب کی تصویر میں جو بال دکھائے
گئے ہیں وہ بال کم اور گھاس زیادہ لگ رہے تھے۔ "چارا" میں ڈان اور میلے نے بڑی چالاکی سے مجرم کو پھانسا تھا۔ "مفرور" کا ایپی سوڈ خوبصورت
تھا۔ کہانی بھی شاندار جا رہی ہے۔ ڈائجسٹوں میں شائع ہونے والی تمام سلسلہ وار کہانیوں میں "گمراہ" سب سے آگے ہے۔ "اجتماعی مفاد" میں الو لطیف
کے نظریئے سے ہمیں اختلاف ہے۔ "عقابوں کا نشیمن" ایک ہلکی پھلکی کہانی کے لحاظ سے ٹھیک ہے۔ "ڈرامہ" سرورق کی پہلی خوبصورت کہانی تھی۔
"مارِ آستین" کو سمجھنے میں کافی دماغ صرف کرنا پڑا۔ یہ کہانی مزے دار نہ تھی۔ "بھرم" میں معاشرتی کہانی کے ساتھ ساتھ جاسوسی کا بھی خوبصورت
رنگ شامل کرنا نواب صاحب ہی کا کام ہے۔" ن۔ بخاری صاحب! تبصرے کا شکریہ۔ جاسوسی ڈائجسٹ آپ پسند کرتے ہیں، ہمارے لئے
اس سے زیادہ خوشی کی اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ نمبر چار۔ محمد عبدالعزیز صاحب، کراچی سے: "اس دفعہ کا شمارہ یقیناً خوبصورت ترین شمارہ ہے
لاجواب اور دلنشیں سرورق سے مزین یہ شمارہ ہمارے ذہنوں میں مدتوں جگمگاتا رہے گا۔ سرورق کی لڑکی دیکھ کر ہم نے سوچا کہ اسے دل میں
بسالیں لیکن پس منظر میں ہونے والی لڑائی کو دیکھ کر ہم نے سوچا کہ اس جھگڑے میں پڑنا مناسب نہیں ہے۔ "دولت کی صلیب" تجسس سے بھرپور
ایک عمدہ کہانی تھی۔ "چھٹی حس" میں میری نے بڑی ذہانت سے اپنے شوہر کے لئے راستہ صاف کیا۔ اثر نعمانی بڑے انتظار کے بعد ہمارے پسندیدہ
کردار کو لائے ہیں لیکن ایک خوبصورت کہانی کے ساتھ۔ مجرم کی ذرا سی غلطی اسے بے نقاب کر دیتی ہے۔ اس کا اندازہ "چارا" پڑھ کر ہوا۔ اب آیئے
جاسوسی کی جان "مفرور" کی طرف۔ اقلیم علیم صاحب قارئین کے بے حد اصرار پر معظم علی کو پاکستان تو لے آئے ہیں لیکن اب اسے ہندوستان کی طرف
"مفرور" کرنے کی سوچ رہے ہیں۔ بہرحال، یہ سلسلہ اچھا چل رہا ہے اس لئے ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ "ہم پلّہ" میں جے ڈی نے اپنی لختِ جگر کے لئے
صحیح بَر کا انتخاب کیا۔ "معصوم تمنا" میں معصوم مارگریٹ نے ذہانت اور مستقل مزاجی کا اچھا مظاہرہ کیا۔ "گمراہ" نے اب بہت اچھا موڑ لیا ہے۔
جبار توقیر صاحب اب آسیہ سے جیلانی کو ملواہی دیں۔ "اجتماعی مفاد" پڑھ کر بیری پر بے اختیار رشک آ گیا۔ "عقابوں کا نشیمن" بہت دلچسپ کہانی
تھی۔ سرورق کی پہلی کہانی کا انجام بالکل غیر متوقع نکلا۔ "مارِ آستین" بہت خوبصورت اور یادگار کہانی تھی۔ اس شمارے کی سب سے خوبصورت کہانی
"بھرم" تھی۔ دھیمے دھیمے شروع ہو کر یہ کہانی آہستہ آہستہ ذہن کو جھنجوڑتی ہے۔ لطائف اچھے تھے۔ اشتہارات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ نمبر پانچ۔
ملک محمد قاسم شاہین، نواب شاہ: "جاسوسی ڈائجسٹ شمارہ جنوری کا سرورق انتہائی خوبصورت رہا۔ لطیفے اس مرتبہ کم تھے اور بعض پرانے بھی تھے
"دولت کی صلیب" نہایت اچھی کہانی ہے۔ "چھٹی حس" جاسوسی کے معیار کی کہانی نہیں تھی۔ "پیشہ ور" مصنف کے شایانِ شان تھی۔ "چارا" ایک مختصر لیکن
جامع کہانی تھی۔ "مفرور" میں اقلیم علیم صاحب کافی محنت کر رہے ہیں۔ اس کہانی کے بارے میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے برابر ہے۔ "ہم پلّہ" تجسس
انگیز خوبصورت کہانی تھی۔ "معصوم تمنا" عام سی کہانی تھی۔ "گمراہ" کے لئے جبار توقیر صاحب کافی محنت کر رہے ہیں۔ اس مرتبہ گمراہ پینتیس صفحات پر
مشتمل تھی۔ جبکہ "مفرور" کے اکیس صفحات تھے۔ "مفرور" کے ساتھ یہ سوتیلی ماں کا سا سلوک کیوں کیا جا رہا ہے۔ "اجتماعی مفاد" بہترین جاسوسی کہانی
تھی۔ "عقابوں کا نشیمن" کو اس ماہ کی سربراہ کہانی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ "ڈرامہ" بہت عمدہ، پُرتجسس کہانی تھی۔ "مارِ آستین" سنسنی خیز واقعات پر
مشتمل ایک بہترین کہانی تھی۔ "بھرم" ناقابلِ فراموش کہانی تھی۔ نواب صاحب نے اس کہانی سے سحر زدہ کر دیا۔" ملک محمد قاسم صاحب! کہانیوں
کی پسندیدگی کا شکریہ۔ سرورق آپ کو بہت پسند آیا، یہ خوشی کی بات ہے۔ صادق آباد سے حاجی احمد پتافی صاحب نے جبار توقیر صاحب کی
جغرافیہ دانی پر اعتراض کیا ہے۔ لکھتے ہیں: "جیلانی اور آبی کو نواب شاہ سے تیز گام میں سوار کرا کے انہوں نے پنو عاقل میں اتار دیا ہے
پنو عاقل کراچی جاتے ہوئے نواب شاہ سے حتیٰ کہ روہڑی اور سکھر سے بھی پہلے واقع ہے اور اس پر ستم یہ کہ کراچی کا ٹیکسی ڈرائیور ان کو میسّر
آ گیا۔ کراچی کا ٹیکسی ڈرائیور اس دور افتادہ پسماندہ علاقے میں کیا کر رہا تھا؟" حاجی احمد پتافی صاحب! معلوم ہوتا ہے آپ گھومتے پھرتے

بہت ہیں۔ ویسے اس غلطی کا تعلق گھومنے پھرنے سے نہیں بلکہ لکھنے پڑھنے سے ہے۔ مصنف نے لکھا حیدرآباد، کاتب نے پڑھا پنڈو عاقل۔ نتیجہ میں آپ کا خط ہماری میز پر۔ اب تو مطمئن ہو گئے آپ۔ راولپنڈی کے سلیم اقبال صاحب معراج صاحب سے بہت ناراض ہیں۔ یہ خط انہوں نے معراج صاحب ہی کو لکھا ہے اور وہ ہیں اس وقت پاکستان سے باہر، نتیجہ یہ ہوا کہ جواب ہمیں بھگتنا پڑے گا۔ لکھتے ہیں: "پتہ نہیں آپ کو لڑکیوں کے چہروں میں کیا نظر آتا ہے کہ آپ ہر دفعہ میک اپ سے تھپا ہوا چہرہ شائع کر دیتے ہیں۔ اسی میں آپ کو جاسوسی نظر آتی ہے۔ (بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔) میرے خیال میں ڈائجسٹ کے لئے یہ مناسب نہیں ہے۔ آپ لڑکی ہی دکھانا چاہتے ہیں تو اسے لڑتا ہوا دکھائیں، تاکہ یہ جاسوسی ڈائجسٹ کا سرورق معلوم ہو۔ اس دفعہ کے سرورق میں سے لڑکی کو ہٹا دیں تو اچھا سرورق ثابت ہو سکتا ہے۔ "دولت کی صلیب" میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس سے پہلے بھی اس نام سے کہانیاں چھپ چکی ہیں۔ ایک ہی چیز کو بار بار پڑھنے میں لطف نہیں آتا۔ "گمراہ" کی قسط اچھی ہے۔ اس دفعہ "مفرور" بھی بہت پسند آئی۔ میرے خیال میں پچھلی دو تین قسطوں سے اچھی تھی۔ میرے خیال میں اب اقلیم علیم صاحب سیتا اور صفدر کو ان کے والدین سے ملا دیں، اور کہانی ختم کر دیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی اسے طول دیا جائے گا۔ (کہانی آپ پسند کرتے ہیں پھر بھی چاہتے ہیں کہ ختم کر دی جائے۔ یہ بھی ایک لطیفہ ہی ہے۔) "مجرم" نے خاص متاثر نہیں کیا۔ اس کہانی میں ان کے لکھنے کے انداز نے متاثر نہیں کیا" سلیم اقبال صاحب شکر ہے کہ ایک قاری نے تو "مجرم" کی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ "مجرم" کے بارے میں تعریفی خط پڑھ پڑھ کر ہم تو تھک گئے تھے۔ اتنے ڈھیر سارے خطوط میں ایک خط تو ایسا نکلا۔ جو ہم نواب صاحب کو دکھا سکیں۔ سارے تعریفی خط دیکھ کر تو ہمیں ڈر ہو رہا تھا کہ ان کا وزن نہ بڑھ جائے۔ اور یہ تو آپ کو پتہ ہی ہے کہ موجودہ دور کے ڈاکٹر صاحبان وزن بڑھانے کے سختی سے مخالف ہیں اور یہ خط سیالکوٹ سے سعید حنیف صاحب نے لکھا ہے: "چھ سال سے جاسوسی ڈائجسٹ باقاعدگی سے پڑھ رہا ہوں۔ یہ مجھے اتنا پسند ہے کہ اب کوئی ڈائجسٹ اچھا نہیں لگتا۔ اس سے پہلے بھی کئی خطوط لکھے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے بغیر پڑھے ردی کی ٹوکری کی نذر کر دیئے۔ آپ کو وقت پر خط لکھ سکیں، اس لئے اسپیشل طور پر جاسوسی تین ہی دن میں ختم کر لیا۔ اس دفعہ سرورق بہت ہی خوبصورت تھا۔ "مفرور" پچھلے ماہ کی طرح پھر نمبر لے گئی۔ "گمراہ" کے جبار توقیر صاحب کو مبارکباد۔ سرورق کی کہانیوں میں "ڈرامہ" اور "مجرم" اچھی تھیں۔ "پیشہ ور"، "ہمارا" اور "معصوم تمنا" بھی بہت شاندار تھیں۔" ناٹک شوکت حسین صاحب جہلم سے لکھتے ہیں: "مفرور جس نئے مرحلے میں داخل ہوئی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کہانی ختم ہونے والی ہے۔ مگر اقلیم علیم صاحب سے میری گزارش ہے کہ اس کہانی کو ختم نہ کریں۔ بلکہ صفدر کو پھر ہنگامے اور قتل و غارت کی طرف لے جائیں۔ "عقابوں کا نشیمن" اپنے نام کی طرح اچھی کہانی ہے۔ مودی صاحب سے گزارش ہے کہ اسی قسم کی کہانیاں ہر ماہ لکھا کریں۔ نواب صاحب کو "مجرم" جیسی کہانی لکھنے پر مبارکباد۔" حافظ منظور احمد صاحب بقلم خود نے یہ خط بلکہ شکایت نامہ بہاولپور شہر پنجاب سے لکھا ہے: "جنوری ۸۳ء کا جاسوسی ڈائجسٹ اس وقت میرے ہاتھوں میں ہے اور میں صفحہ نمبر ۶ پر چھیتی اور نکتہ چینی پڑھ رہا ہوں۔ آپ نے چھیتی اور نکتہ چینی کے چار صفحات مخصوص کئے ہیں اور ان صفحات پر آپ چودہ پندرہ خطوط کے جواب دیتے ہیں۔ آپ نے پورے چار صفحے تبصروں میں ضائع کر دیئے۔ اور ان لوگوں کا احساس نہیں کیا۔ جنہوں نے بڑی محبت سے آپ کو خط لکھے تھے۔ غالباً آپ نے صرف اپنے رشتہ داروں کے خطوط کے جواب دیئے ہیں۔ باقی لوگوں کے خطوط گول کر گئے ہیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ یا تو یہ صفحات بڑھائیں یا تبصرے شائع نہ کیا کریں۔ اس طرح جوابات کے لئے زیادہ جگہ نکل آئے گی۔ اس مرتبہ "گمراہ" کا صفحہ نمبر غلط لکھا گیا ہے۔ یہ آپ کی بہت بڑی غلطی ہے۔ خیال کیا کریں۔" حافظ منظور احمد صاحب! آپ کا یہ خیال تو بالکل درست ہے کہ ہم اپنے رشتہ داروں کے جواب دیتے ہیں۔ جاسوسی ڈائجسٹ پڑھنے والے تمام قارئین کو ہم اپنا بھائی سمجھتے ہیں۔ آپ بھی تو ہمارے رشتہ دار ہی ہیں 'نا'! دیکھ لیجئے، آپ کے خط کا جواب بھی حاضر ہے۔ جی ہاں! یہ غلطی تو ہم سے سرزد ہو چکی ہے۔ کوشش کریں گے کہ آئندہ آپ کو اس قسم کی پریشانی نہ ہو۔ یہ نوٹس ہے جو ہمیں محمد رمضان ہالہ صاحب ولد خان بہادر نے راجہ جنگ سے دیا ہے۔ "جناب عالی! گزارش ہے کہ نئے سال کے ناول جاسوسی ڈائجسٹ جنوری ماہنامہ ۸۳ء کو جو ناول شائع ہوا ہے اس پر سر فہرست کہانی "گمراہ" کو صفحہ ۲۵ پر ظاہر کیا گیا ہے مگر صفحہ ۲۵ پر کہانی "گمراہ" کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اس لئے بطور اطلاع آپ کو نوٹس دے رہا ہوں کہ میرے ساتھ فوراً رابطہ قائم کریں۔ ورنہ انتظار کے بعد آپ پر قانونی کارروائی کروں گا۔ جس کا ازالہ آپ کو خود بھگتنا ہو گا۔ اس لئے میں آپ کو عرض کر رہا ہوں کہ جتنی جلدی ہو سکے آپ فوراً میرے ساتھ تار یا لیٹر کے ذریعے سے رابطہ قائم کریں، ورنہ میں کارروائی کروں گا۔ کیونکہ میں بارہ سال سے آپ کے ناول کا مطالعہ کر رہا ہوں اور یہ دیکھ کر مجھے سخت حیرانی ہوئی ہے کہ ایک عظیم ناول چھپنے والا بھی لاپرواہی کا شکار ہو گیا... وغیرہ وغیرہ" محمد رمضان ہالہ صاحب ہمیں اپنی اس غلطی پر افسوس ہے۔ رہی قانونی کارروائی تو آپ کا یہ خیال غلط ہے کہ قانون دانوں کے پاس اتنا فالتو وقت ہے کہ وہ اس بکھیڑے میں پڑیں۔ ویسے بھی ہم خط لکھنے کے چور ہیں۔ افتخار گوندل صاحب نے سعودی عرب سے لکھا ہے: "جنوری ۸۳ء کا جاسوسی ڈائجسٹ اس وقت میرے ہاتھ میں ہے۔ سرورق اچھا ہے۔ بس ذرا حسینہ جی کی گردن میں تھوڑا فرق رہ گیا۔ کہانیاں اچھی تھیں۔ "دولت کی صلیب" نے متاثر نہیں کیا۔ "مفرور" اور "گمراہ" پہلے سے اچھی تھیں لیکن سرورق کی دوسری کہانی "مارِ آستین" پڑھتے پڑھتے جب اس مقام پر پہنچے کہ مہاگنی کی ایک بھنوی میز کے گرد فخری عمر بیٹھا تھا تو ہم اٹک گئے۔ کہ مہاگنی کون سی لکڑی ہوتی ہے اور کہاں پائی جاتی ہے۔ کئی ملکوں کے آدمیوں سے پتہ کیا لیکن

معلوم نہ ہو سکا۔ افتخار گوندل صاحب! مہاگنی بھی ایک طرح کی لکڑی ہوتی ہے جیسے چیڑ، دیار، پرتل، صندل اور اخروٹ کی لکڑی۔ زیادہ تر یہ لکڑی بھارت میں ہوتی ہے۔

کڈھالہ سے قمر سلیم قمر صاحب لکھتے ہیں "سرورق اس دفعہ خاصا دلفریب تھا مگر خالصتاً جاسوسی نہیں۔ پرچہ خرید کر سب سے پہلے بھرم پڑھی۔ رانی کا دردناک انجام پڑھ کر دل بھر آیا۔ نواب صاحب بلاشبہ معاشرے کے جراح ہیں۔ مارِ آستین بھی خوب کراری کہانی رہی۔ ڈرامہ بھی کسی حد تک ٹھیک ہی تھی۔ دولت کی صلیب کو خواہ مخواہ طول دے کر بور کیا گیا۔ بیشہ ور اپنی مثال آپ تھی۔ گمراہ بھی اچھی جا رہی ہے اقلیم صاحب نے میتا اور صفدر علی کو پاکستان پہنچا کر کہانی میں چار چاند لگا دیے ہیں معصوم تمنا میں مارگریٹ کا کردار پسند آیا۔ جار ابھی اپنے انداز کی ...... دلچسپ کہانی تھی جبھٹی حس اور عقابوں کا نشیمن یادگار کہانیاں تھیں۔" بھلر کے چراغ محمد شاکر لکھتے ہیں "سب سے پہلے مفرور کے بارے میں۔ سابقہ قسط اپنے نقطۂ عروج پر تھی کہ ایکدم باقی آئندہ ماہ پڑھ کر اپنا تو فیوز ہی بھک سے اڑ گیا۔ اقلیم صاحب پر اتنا غصہ آیا کہ بس .... ایک مہینہ تک ہجر کی آگ میں جلنے کے بعد جاسوسی آیا تو سب سے پہلے مفرور شروع کی تو کہانی کا پہلا باب ہی پڑھنے کے بعد ایسا معلوم ہوا کہ غبارے میں سے ہوا نکل گئی ہو کسی شخص کو انتہائی بلندی پر چڑھا کر سیڑھی کھینچ لینے والی بات ہو گئی۔ سابقہ قسط میں آندرے سسلوف کا جہاز میں نظر آنا صفدر کو لمبی سوچوں میں ڈال گیا تھا مگر نہ جانے اقلیم صاحب کو کیا سوجھی کہ آندرے پر ول کا دورہ ڈال کر صفدر کو ایک اور یقینی قتل سے صاف بچا لے گئے۔ اقلیم صاحب نے خود ہی لکھا تھا کہ آندرے تو ایک انتہائی مضبوط اور ذہین ایجنٹ تھا مگر پھر صرف اپنے دشمن کو دیکھ کر ہی مر جانا چہ معنی دارد ––؟" بھائی چراغ صاحب خدا کرے آپ ہمیشہ اپنی روشنی پھیلاتے رہیں۔ دلچسپ کہانی کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے کہ اس کے ختم ہونے کا احساس نہیں ہوتا۔ رہا سسلوف کا مرنا تو آدمی چاہے کتنا ہی چالاک اور مضبوط ہو موت پر اس کا بس نہیں چلتا۔ پھر ہارٹ فیل کے بیے آندرے کیا کر سکتا تھا آخر آپ صفدر کو زبردستی قاتل بنانے پر کیوں تلے ہوئے ہیں۔ ڈھاڈر سے قربان علی صاحب نے لکھا ہے "سرورق میں کوئی خاص کشش نہیں تھی ––بہرحال تنقید کے لائق بھی نہیں تھا۔ دولت کی صلیب تاثرانگیز کہانی تھی۔ معصوم تمنا ایک بے سروپا کہانی لگی مفرور ایک بار پھر دلچسپ ہو گئی ہے۔ سرورق کی کہانی ڈرامہ سرورق کے برعکس تھی۔ مارِ آستین دلچسپ کہانی تھی۔ رانی نے بھرم میں اپنے بھائی کا بھرم تو رکھ لیا لیکن اپنے بھائی کا ساتھ نہ دے سکی۔ کہانی بہت اچھی تھی۔ غلام مصطفےٰ نار جہلم سے لکھتے ہیں "آپ کا پرچہ میں ختم کر چکا ہوں لیکن آخری صفحے پر پہنچ کر میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور رونے لگا۔ کیونکہ رانی کے آخری خط کے چند الفاظ حقیقت میں دکھوں کا مجموعہ تھے۔ میں بھرم کو تمام پرچے کی خوبصورت ترین کہانی سمجھتے ہوئے نواب صاحب کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور درخواست کرتا ہوں کہ وہ ایسی ہی تحریریں پیش کر کے قارئین سے داد وصول کرتے رہیں۔ میں کسی اور کہانی کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ مجھ پر ایسی کیفیت طاری ہے کہ اور کچھ کہنے کے قابل نہیں ہوں۔" غلام مصطفےٰ صاحب! آپ بھی خوب آدمی ہیں جس مصنف کی کہانی نے آپ کو رُلا دیا اُسی مصنف کی کہانی کی فرمائش کر رہے ہیں؟ ویسے ہم آپ کے خیال کی تائید کرتے ہیں نواب صاحب کی تحریریں ایسی ہی متاثر کن ہوتی ہیں۔ اس کہانی کی وجہ سے ہمیں بھی پریشانی ہو گئی تھی۔

الیس یو شاہ صاحب، لاہور۔ جاسوسی ڈائجسٹ کی کہانیوں اور سرورق کی پسندیدگی کا شکریہ! جی ہاں نواب صاحب کی بھرم سب ہی کو بہت پسند آئی ہے رسید فدا حسین صاحب، امیٹاری۔ شکر ہے کہ آپ کو محور کے شمارے مل گئے۔ نیا محور آنے والا ہے ان شاء اللہ آپ کو روانہ کر دیا جائے گا۔ اللہ دسایا صاحب، قصور۔ آپ نے لفافے پر ہی "خبردار" لکھ کر ہمیں چونکا دیا۔ آپ مطمئن رہیں عام طور پر ہم پورا خط پڑھنے کے بعد ہی اس کے بارے میں فیصلہ کرتے ہیں۔ سرورق کی تصویر آپ کو اتنی پسند آئی کہ آپ اسی میں کھوئے رہے خیر اب تو آپ ہی اس کے مالک ہیں جب تک چاہیں دیکھتے رہیں۔ جاسوسی ڈائجسٹ کی پسندیدگی کا شکریہ! واہ کینٹ کی بہن طاہرہ مرزا ہمیں افسوس ہے کہ سبز حویلی کا راز شائع نہ ہو سکے گی۔ پرچے کی پسندیدگی کا شکریہ! مرزا وقار بیگ صاحب، نواب شاہ۔ آپ کا انجام پسند نہیں آیا اس لیے اشاعت کے بارے میں معذرت قبول فرمایئے۔ حمیدی گل صاحب، پشاور۔ آپ کی اسپائی کہانی تو معاف کیجیے قابلِ اشاعت نہیں ہے۔ اسرار احمد قریشی صاحب، کراچی۔ آپ بے شک کہانیاں ہمیں بھیجیں۔ قابلِ اشاعت ہوئیں تو ضرور شائع کی جائیں گی۔ مشتاق علی صاحب، کراچی۔ محور کا شمارہ ابھی شائع نہیں ہوا ہے۔ شائع ہوتے ہی روانہ کر دیا جائے گا۔ سجاد شاہ زخمی صاحب، منگلا۔ مطمئن رہیں گمراہ ابھی جاری ہے۔ صفیہ ملک صاحبہ، کراچی۔ آپ پتہ لکھ دیتیں تو دوسرا پرچہ بھیج دیا جاتا۔ اس پرچہ کو آپ اپنے قریبی بک اسٹال سے بدل لیں۔ ملک عبدالقادر صاحب، گوجرانوالہ۔ پرچہ ہمیں بھیج دیں ہم آپ کو دوسرا پرچہ روانہ کر دیں گے۔ رفعت صاحب، کراچی۔ آپ احادیث اور ائمہ کے اقوال ضرور بھیجیں لیکن یہ خیال رکھیں کہ جہاں سے آپ لیں اس کا حوالہ ضرور دیں ہم شکریے کے ساتھ شائع کریں گے۔ ایم ایچ جگ جیت صاحب ہم آپ کے مسودے کے منتظر ہیں۔ ابھی تک تو ہمیں یہ مسودہ ملا نہیں ملنے کے بعد ہی کچھ کہا جا سکتا ہے۔ مستری غلام احمد الیاس صاحب، ددہ آدم خیل ضلع کوہاٹ۔ آپ نے جن غلطیوں کی نشاندہی کی ان کے لیے معذرت قبول فرمایئے۔ ہم کوشش کریں گے کہ آئندہ ایسی غلطیاں نہ ہوں۔

اس مرتبہ ہم نے زیادہ خطوط شامل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن پھر بھی کچھ خطوط باقی رہ گئے اس لیے ان حضرات سے معذرت اور اب اگلے ماہ تک کے لیے اجازت دیجیے۔ خدا حافظ۔ احمد سعید۔

Jasoosi Digest February 1983

لیجئے اس ماہ نادرہ گیلانی کی ایک اور خوبصورت کہانی پیش خدمت ہے۔ ان کی کہانیاں پہاڑی چشموں کی طرح تند و تیز ہوتی ہیں۔ ان کی بہاؤ خیز روانی انہیں ٹھہرنے نہیں دیتی۔ لیکن نادرہ کی موجودہ کہانی کسی سبک رو ندی کی طرح آہستہ خرام ہے۔ سطر بہ سطر صفحہ بہ صفحہ آہستہ آہستہ مزے لے لے کر پڑھی جانے والی کہانی۔

رات کا پچھلا پہر ہو، ہر سُو چاندنی پھیلی ہوئی ہو، دور بہت دور کہیں کوئی دھیمے سُروں میں بانسری بجا رہا ہو تو انسان پر سحر سا طاری ہو جاتا ہے۔ سُروں کی ایسی کیفیت چھا جاتی ہے جسے الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ زندہ تصویر بھی یہی کیفیت طاری کر دیتی ہے۔ شرط یہی ہے کہ اس کہانی کو آپ ایک ہی نشست میں ختم کریں اور دورانِ مطالعہ کسی کی طرف سے دخل اندازی نہ ہو۔

جذبات کی عکاسی، احساسات کی ترجمانی اور خیالات کی تصویر کشی دلچسپ واقعات کے ساتھ بڑے ماہرانہ انداز میں کی گئی ہے۔ یہ کہانی انگریزی ناول Living Image سے ماخوذ ہے۔

——— احمد سعید

بنگلہ دیش ایرلائن "بیمان" کا بوئنگ ڈھاکہ سے کراچی پرواز کے لئے تیار کھڑا تھا۔ مسافر اپنی اپنی سیٹیں سنبھال چکے تھے۔ سامنے سگریٹ بجھانے اور سیٹ بیلٹ باندھنے کی ہدایات روشن ہو چکی تھیں۔ شبنم ایئر ہوسٹس کی یونیفارم میں ملبوس مسافروں کے سامنے ہنگامی حالات میں آکسیجن ماسک اور لائف جیکٹ استعمال کرنے کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ جو مسافر پہلی بار ہوائی سفر کر رہے تھے۔ وہ اسے دلچسپی سے دیکھ رہے تھے جہاز کے کپتان نے مائیک پر کیبن کریو کو سیٹیں سنبھال لینے کی ہدایت دی۔ جہاز کے انجن اسٹارٹ ہوئے اور وہ دھیرے دھیرے رن وے پر دوڑنے لگا۔ پھر دیکھتے دیکھتے اس کی رفتار میں تیزی آئی اور پھر دوڑتے دوڑتے ایک جھٹکے کے ساتھ وہ فضا میں بلند ہو گیا۔ شبنم اور اس کی ساتھی ایئر ہوسٹس نے بیلٹس کھولیں اور جہاز کے پچھلے حصے میں بنے ہوئے کچن میں آکر ساریوں کے اوپر ایپرن باندھنے لگیں۔ سب سے پہلے جوس پیش کرنا تھا۔ شبنم خاصی سینئر ایئر ہوسٹس تھی لہٰذا اس نے دوسری لڑکی اور ایئر اسٹیورڈ کو ہدایات دیں۔ تمباکو نوشی کی اجازت ملتے ہی بہت سے مسافروں نے سگریٹ سلگا لئے۔ جوس کے بعد کھانا سرو ہونا تھا۔ شبنم کو ذرا سا وقت ملا تو اس نے اپنا بیگ کھولا۔ اندر کے خانے میں سے ایک لفافہ نکالا

رنگ و تصویر
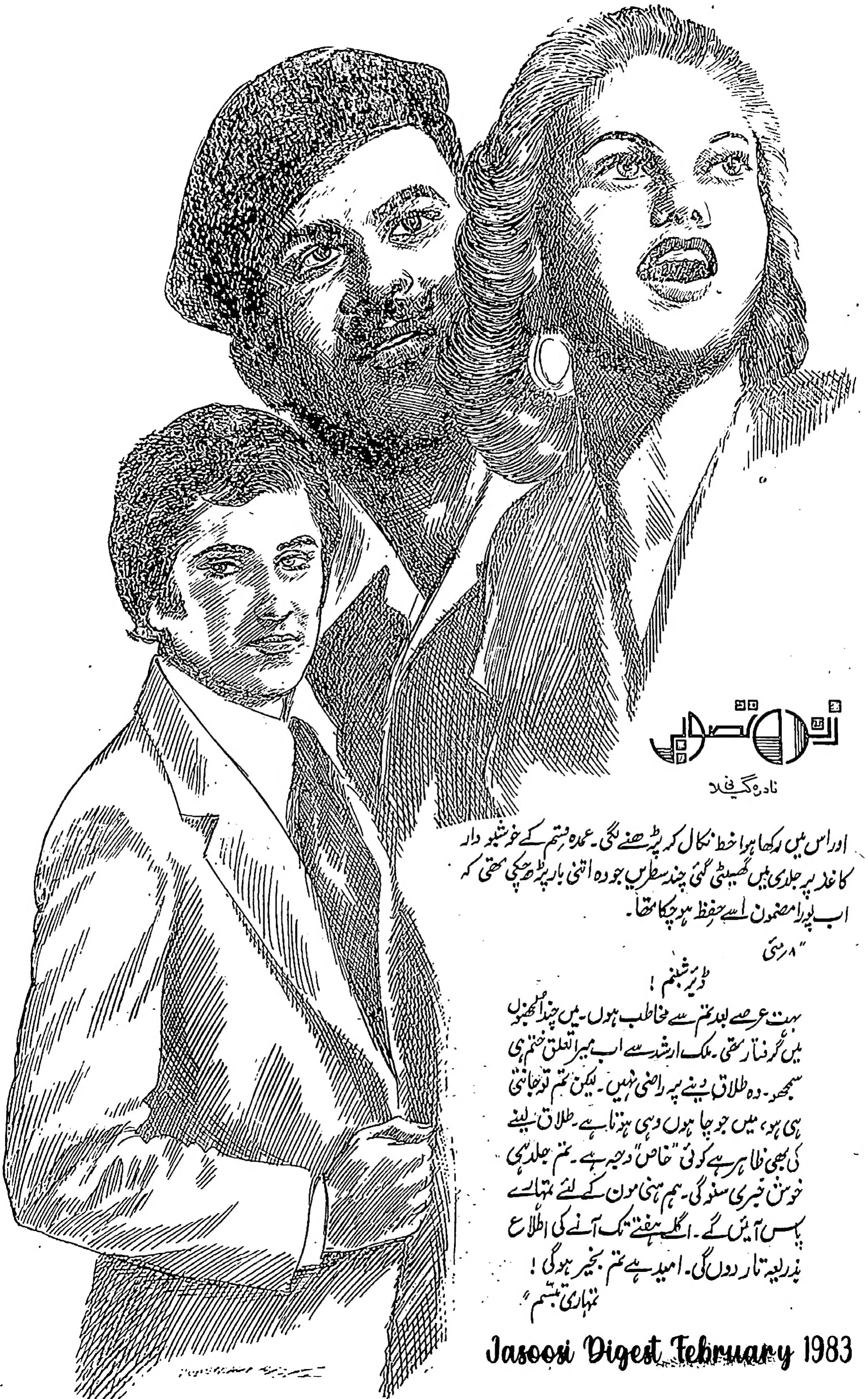
نادرہ گیلانی

اور اس میں رکھا ہوا خط نکال کر پڑھنے لگی۔ عمدہ قسم کے خوشبو دار کاغذ پر جلدی میں گھسیٹی گئی چند سطریں جو وہ اتنی بار پڑھ چکی تھی کہ اب پورا مضمون اسے حفظ ہو چکا تھا۔

"۸ مئی

ڈیئر شبنم!

بہت عرصے بعد تم سے مخاطب ہوں۔ میں چند الجھنوں میں گرفتار تھی۔ ملک ارشد سے اب میرا تعلق ختم ہی سمجھو۔ وہ طلاق دینے پر راضی نہیں۔ لیکن تم تو جانتی ہی ہو، میں جو چاہوں وہی ہوتا ہے۔ طلاق لینے کی بھی ظاہر ہے کوئی "خاص" وجہ ہے۔ تم جلد ہی خوش خبری سنو گی۔ ہم ہنی مون کے لئے تمہارے پاس آئیں گے۔ اگلے ہفتے تک آنے کی اطلاع بذریعہ تار دوں گی۔ امید ہے تم بخیر ہو گی!

تمہاری تبسم"

شبنم نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور خط دوبارہ لفافہ میں ڈال کر بیگ میں رکھ لیا۔ یہ خط اس کی بہن کا تھا۔ اس کی سگی بڑی بہن کا۔ دس سال کے عرصے میں یہ دوسرا خط تھا جو تبسم نے اس کے نام لکھا تھا۔ آٹھ سال پہلے بھی اسے ایک خط ملا تھا۔ وہ بھی قیمتی مہکتے کاغذ پر تھا لیکن جذبات سے بالکل عاری ۔۔۔ چند رسمی سی سطریں، جو شبنم کو آج بھی یاد تھیں۔

"ڈیئر شبنم!

تمہیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ میں نے شادی کر لی ہے۔ ملک ارشد اس ملک کا مشہور صنعت کار ہے۔ میں نے ارشد کو یہی بتایا ہے کہ میرا پورا خاندان مکتی باہنی کے ہاتھوں مارا گیا اور میں اس دنیا میں بالکل اکیلی ہوں۔ وہ تمہارے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتا۔ میں بھی نہیں چاہتی کہ وہ مجھے معمولی خاندان کا فرد سمجھے۔

ابا کا ڈھاکہ والا گھر اب صرف تمہارا ہے میں اس سے دستبردار ہوں۔ امید ہے تم بھی میری طرح ہمت سے کام لے کر اپنا مستقبل سنوار لوگی۔

فقط تبسم!"

وہ ابا اماں کے مرنے پر بھی اتنا نہ روئی تھی۔ جتنا اس خط کو پڑھ کر روئی ۔۔۔ چھوٹے بھائی کی خون میں نہائی لاش دیکھ کر بھی اتنا نہیں تڑپی تھی، جتنا اس خط کو پڑھ کر تڑپی۔ وہ سب تو مر گئے تھے نا ۔۔۔ دنیا سے ان کا ناطہ ٹوٹ گیا تھا، رشتہ ختم ہو گیا تھا۔ لیکن تبسم ..... تبسم تو زندہ تھی۔ اس کا اپنا خون تھی۔ اس کی بڑی بہن تھی۔ وہ جیتے جی اس سے الگ ہو گئی۔ جائیداد اسے بخش کر اس نے اپنا رشتہ ہی توڑ ڈالا۔ وہ سب کچھ یاد کر کے شبنم کی آنکھیں آج بھی بھیگ جاتی تھیں۔

"ارے شبنم! کیا سوچ رہی ہو۔۔۔ ٹرے لگا دی نا۔۔۔ کھانا سرو کرنا ہے۔" اس کی ساتھی لڑکی نے اس کو ٹھوکا دیا تو وہ جلدی جلدی اپنے حواسوں میں آئی اور کام میں جت گئی۔

تبسم کا یہ دوسرا خط اسے پندرہ دن پہلے ملا تھا۔ اس کے بعد سے ہی وہ اس کے تار کی منتظر تھی لیکن خط کے بعد اسے تبسم کی کوئی خبر نہ ملی۔ اس نے بیرون ملک پرواز بھی نہیں لی کہ کہیں اس اثنا میں تبسم کا تار نہ آ جائے، یا وہ خود نہ آ جائے۔ وہ بہن کی منتظر رہی لیکن تبسم کی کوئی خبر کہیں سے نہ آ سکی۔ پھر اسے آج یہ کراچی کی فلائیٹ ملی تو اس کے دل نے کہا کراچی چل اور خود تبسم سے رابطہ کر۔ اسے یہ بھی خدشہ تھا کہ شاید تبسم اس بات کو پسند نہ کرے خیر کچھ بھی ہو میں فون تو ضرور کروں گی کسی اور نے اٹھایا تو میں نام نہیں بتاؤں گی یہ بھی نہیں کہ میں تبسم کی کون ہوں۔۔۔ آخر اتنی بڑی دنیا میں تبسم کی کوئی دوست بھی تو ہوگی جو اسے فون کر سکتی ہو۔

سفر اپنے اختتام پر تھا۔ فضائی میزبان اپنے مسافروں کو دوبارہ سیٹ بیلٹ باندھنے میں مدد کر رہی تھیں۔ کپتان نے مائیک پر اعلان کیا کہ اب سے تھوڑی دیر بعد وہ لوگ کراچی کے بین الاقوامی ہوائی اڈے پر اترنے والے ہیں۔ امید ہے یہ سفر خوشگوار گزرا ہوگا۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔

جہاز نیچے اترنے لگا۔ ایئر پورٹ کی عمارت دکھائی دینے لگی تھی، پھر ایک جھٹکے کے ساتھ جہاز زمین سے لگ گیا اور کچھ دور جا کر ٹھہر گیا۔ انجن بند ہوئے ۔۔۔ دروازے کھلے ۔۔۔ مسافروں نے اپنے ہاتھوں میں پکڑے سامان سمیٹنے شروع کئے۔ شبنم دروازے پر کھڑی مسکرا مسکرا کر سب کو خدا حافظ کہہ رہی تھی۔ جب تمام مسافر اتر گئے تو شبنم نے بھی اپنا بیگ اٹھایا۔ کراچی میں ان کا قیام صرف دو گھنٹے کا تھا اس کے بعد جہاز دوبئی کیلئے روانہ ہو رہا تھا۔ وہاں سے پھر اگلے دن واپسی کا سفر اسی روٹ سے ہونا تھا۔ ان دو تین گھنٹوں میں جہاز کا عملہ صرف ایئر پورٹ کی حدود میں اتر سکتا تھا۔ شبنم جہاز کی سیڑھیاں اترتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اس بھرے پڑے شہر میں کہیں اس کی بہن بھی سانس لے رہی ہے۔ وہ ایئر پورٹ پر بیمان کے آفس میں داخل ہوئی وہاں منحنی سا سانولا سا ایک نوجوان کھڑا تھا اس نے شبنم کی یونیفارم سے پہچان لیا کہ وہ بیمان کی ایئر ہوسٹس ہے رسمی کلمات کے بعد اس نے اس سے ٹیلی فون کی ڈائریکٹری مانگی۔ ایم کے صفحات میں اسے ملک ارشد کا نام آسانی مل گیا ۔۔۔ نام کے آگے ان کے فون نمبروں کی ایک قطار تھی۔ اس کے بعد گھر کا نمبر بھی درج تھا۔ شبنم نے کاغذ قلم مانگ کر وہ نمبر نوٹ کر لیا۔ سمجھ دار لڑکے نے خود ہی فون بھی شبنم کے آگے بڑھا دیا۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ نمبر ڈائل کرنے شروع کئے۔

دوسری جانب سے تیسری گھنٹی پر کسی نے فون اٹھا لیا۔

"ہیلو!" آواز کسی مرد کی تھی۔

"کیا یہ ملک ارشد کی قیام گاہ ہے؟" شبنم نے اپنے لہجے پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں!"

"مسز ملک ارشد سے بات کرنی ہے مجھے۔"

"کس سے؟" دوسری جانب سے شدید حیرت کا اظہار ہوا۔

"بیگم ملک ارشد سے ..... تبسم ارشد سے۔" اس نے فقرہ دہرایا۔

"آپ کون بول رہی ہیں؟" مرد نے سوال کیا۔ اس کے سوال کرنے کا انداز شبنم کو نروس کر رہا تھا۔

"میں ... میں ... ان کی ایک دوست ہوں۔"
"کیا آپ ملک سے باہر گئی ہوئی تھیں؟"
"جی ۔۔۔ جی ہاں۔" وہ اب کھل سی گئی تھی۔
"جب ہی ۔" دوسری جانب سے کہا گیا۔ "میں ہاؤس کیپر بول رہا ہوں۔ بیگم صاحبہ کا تو پندرہ دن ہوئے انتقال ہو گیا ہے۔"

شبنم نے ریسیور پر اپنی گرفت مضبوط کر لی، ورنہ وہ یقیناً اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا۔ اسے زمین اپنے پیروں تلے سے کھسکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ کاؤنٹر پر کھڑے نوجوان نے جلدی سے کرسی گھسیٹی۔ وہ گرنے کے سے انداز میں اس پر بیٹھ گئی۔ ریسیور اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ دوسری جانب سے ہیلو ہیلو کی چند آوازوں کے بعد فون بند ہو گیا۔ شبنم نے تھکے تھکے سے انداز میں ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ وہ بالکل خالی الذہن ہو رہی تھی۔ وہ کچھ بھی نہیں سوچ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر یونہی گم صم بیٹھی رہی۔ کسی نے اس کے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھما دیا۔ وہ خالی خالی نظروں سے گلاس کو تکتی رہی۔ چند آوازیں آ رہی تھیں لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں۔ کون ہیں؟ اور وہ خود، وہ خود کون ہے ۔۔۔؟ پھر وہ بیٹھی بیٹھی کرسی سے لڑھک گئی۔

وہ ہوش میں آئی تو خود کو ایک صوفے پر لیٹا ہوا پایا۔ اس کے اردگرد اس کے عملے کے لوگ کھڑے تھے۔ اس کی ساتھی لڑکی اس کا ہاتھ تھامے بیٹھی تھی۔ اسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر وہ بولی۔ "شبنم... اوہ شبنم کیا ہوا تھا تمہیں؟"

"کچھ نہیں۔" وہ دھیرے سے بولی۔ "اب ٹھیک ہوں میں۔"
"جہاز جانے میں پندرہ منٹ باقی ہیں مس شبنم! اگر آپ کی طبیعت خراب ہو تو یہاں رک جائیں۔"
"نہیں نہیں ۔۔۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "بس ذرا چکر سا آ گیا تھا۔"

وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ اپنا لباس درست کیا۔ پھر بیگ اٹھایا۔ اور جہاز کی طرف چل دی۔ وہ کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ اندر جاتے ہی اس نے اپنی ڈیوٹی سنبھال لی۔ اس کے ساتھیوں نے کہا بھی کہ وہ آرام سے بیٹھی رہے، وہ لوگ کام سنبھال لیں گے ۔۔۔ لیکن وہ تو خود کو مصروف رکھنا چاہ رہی تھی، اتنا مصروف کہ اسے سوچنے تک کو وقت نہ ملے۔

جہاز پھر پرواز کے لئے بلند ہوا۔ وہ ایک ایک مسافر کے پاس جا کر اُن کی ضروریات دریافت کر رہی تھی۔ اس نے کئی بچوں کے ساتھ مذاق کئے ۔۔۔ کئی عورتوں سے ہنس ہنس کر باتیں کیں عمر رسیدہ مسافروں کی نشست مزید آرام دہ بنائی۔ پھر چائے وغیرہ سرو کرنے لگی۔ وقت گزر گیا۔ دوبئی ایئرپورٹ پر جہاز لینڈ کر چکا تھا۔ وہ اسی طرح مسکرا مسکرا کر مسافروں کو الوداع کہہ رہی تھی۔ باہر چلچلاتی دھوپ اور جھلسا دینے والی لو تھی۔ ائیرپورٹ کی عمارت سے نکل کر جہاز کا عملہ گاڑی میں بیٹھا۔ وہ سب سے ہنس بول رہی تھی۔ ہوٹل پہنچ کر اس نے اپنے کمرے کی چابی لی۔ اپنا ہلکا سا بیگ وہ خود ہی اٹھا کر کمرے تک لے آئی تھی۔ دروازے کے باہر DO NOT DISTURB کا بورڈ لٹکایا۔ ہینڈ بیگ زمین پر پھینکا اور کپڑے تبدیل کئے بغیر بستر پر گر گئی۔ ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ "تبسم!" اس کے منہ سے چیخ سی نکلی اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

۔۔۔۔۔۔

۱۹۷۰ء مشرقی پاکستان کا شہر ڈھاکہ۔ اور ڈھاکہ کے ایک محلہ محمد پور کا ایک چھوٹا سا سادہ سا گھر، اور اس گھر کے پانچ مکین۔ اونچے لمبے گورے چٹے ابا ۔۔۔ سانولی سی دبلی پتلی اماں ۔۔۔ تبسم ۔۔۔ وہ خود ۔۔۔ اور مراد اُن کا بھائی ۔۔۔ وہ لوگ کتنے خوش رہتے تھے ۔۔۔ دن میں سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہوتے۔ ابا نوکری پر اور وہ تینوں اسکول چلے جاتے اماں چھوٹے سے گھر کو چمکاتیں، نکھارتیں ۔۔۔ مزیدار بنگالی کھانے پکاتیں ۔۔۔ شام کو سب مل کر کھانا کھاتے ۔۔۔ کھانے کے بعد کتنی ہی دیر تک بیٹھے ہنسی مذاق کرتے ۔۔۔ کبھی کبھی اماں اپنی کوئل سی آواز میں کوئی گیت سناتیں۔ ابا خوش ہو ہو کر تالیاں بجاتے۔

ابا مغربی پاکستان کے صوبے پنجاب سے تعلق رکھتے تھے اماں بنگالی تھیں۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں ۔۔۔ لوٹا سا قد ۔۔۔ دھان پان لیکن بہت پھرتیلی ۔۔۔ ابا تبسم کو زیادہ چاہتے تھے۔ تینوں بچوں میں تبسم انہیں سب سے زیادہ پیاری تھی۔ اس کی جائز اور ناجائز اکثر فرمائشیں وہ پوری کرتے۔ اماں چڑتیں لڑکی کو اتنا سر پر مت چڑھاؤ ۔۔۔ لوگوں سے اس کا نباہ مشکل ہو جائے گا۔ ابا ہنستے ۔۔۔ ایسے لوگوں میں دوں گا، اپنی شہزادی کو کہ وہ ہاتھ کا چھالا بنا کر رکھیں گے ۔۔۔ تبسم اور بھی اترا جاتی۔

تبسم بہت خوبصورت تھی۔ ابا کا گورا چٹا رنگ۔ اور اماں کے تیکھے نقوش اسے ورثے میں ملے تھے۔ بادامی آنکھیں ۔۔۔ بھورے بال ۔۔۔ لمبا قد ۔۔۔ سڈول جسم۔ اس کا شمار شہر کی حسین ترین لڑکیوں میں ہوتا تھا۔ شبنم دیکھنے میں تو تبسم کی ہم شکل ہی تھی۔ لیکن جانے کیا بات تھی کہ تبسم کے آگے وہ ہمیشہ ماند پڑ جاتی ۔۔۔ تبسم کا حُسن شعلہ فشاں تھا ۔۔۔ دلوں کو گرماتا تھا جبکہ شبنم کی خوبصورتی چاند کی چاندنی کی طرح ٹھنڈی تھی ۔۔۔ چاند روشنی تو بکھیرتا ہے لیکن دن کا سا سماں نہیں پیدا کر سکتا۔ شاید یہ دونوں کے ناموں کا اثر تھا۔ تبسم شوخ و شنگ اور شبنم سنجیدہ، کم گو
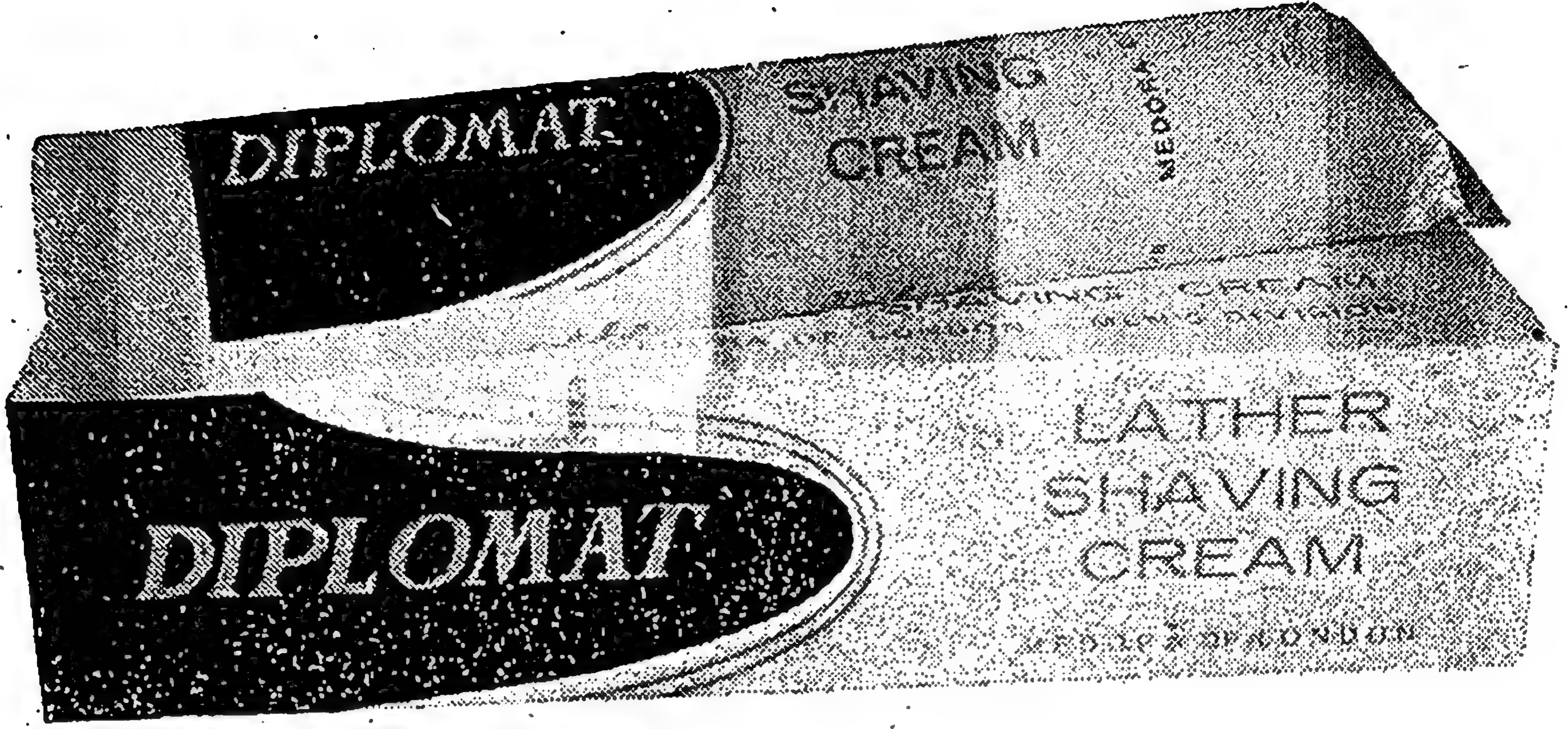
مراد بالکل اماں پہ گیا تھا۔ سانولا سلونا، دُبلا پتلا لڑکا ——— شبنم کو اماں ابا، تبسم اور مراد سب سے بہت محبت تھی۔ جبکہ تبسم خود غرض اور خود پسند تھی۔ سب سے بڑی تھی اور ابا کی لاڈلی تھی۔ اس لئے سب سے زیادہ اسی کی سنی جاتی تھی۔

سنہ میں تبسم اٹھارہ سال کی تھی ——— شبنم سولہ سال کی اور مراد چودہ سال کا تھا۔

تبسم نے انٹر کے بعد پی آئی اے میں نوکری کر لی تھی اور اس وقت کراچی میں ٹریننگ لے رہی تھی۔

شبنم میٹرک کا امتحان دے کر فارغ بیٹھی تھی۔ مراد آٹھویں میں تھا۔ تب ہی خون کی ایک آندھی چلی اور بہت سے خوش نما لہلہاتے پھول جل گئے۔ ابا نے خط لکھ کر تبسم کو سختی سے ہدایت کی کہ وہ ہرگز ڈھاکہ نہ آئے۔ تبسم خود ایسی بے وقوفی کی قائل نہ تھی۔ شبنم اور مراد گھر میں قید سے ہو کر رہ گئے۔ مراد سہما سہما رہتا تھا۔ ابا پریشان سے نظر آتے تھے۔ سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے ابھی تک محفوظ تھے۔ لیکن تھے تو آخر غیر بنگالی۔

"اماں! تم تو بنگالی ہو ——— ہم گھر میں بھی بنگلہ بولتے ہیں۔ ہمیں تو کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہئے۔" مراد پوچھتا۔

ابا اس کی تسلی کرتے "ہاں ہاں بھئی ہمیں کیا خطرہ ؟ بس ذرا احتیاط ہے۔" لیکن سب جانتے تھے کہ اس بات میں زیادہ وزن نہیں۔ وہ بے چارے جو بیس بائیس سال پہلے ہجرت کر کے یہاں آئے ——— یہیں کے ماحول میں رچ بس گئے ——— یہی زبان بولنے ——— انہی کی طرح نظر آئے ——— وہ بھی بنگالی نہیں بہاری کہلائے۔ پنجابی تو پھر پنجابی تھے۔ ابا کا قد کاٹھ۔ رنگ روپ ان کا دشمن ہو گیا۔

اماں کا یہی قصور کیا کم تھا کہ انہوں نے ایک غیر بنگالی کو بنگالی پر ترجیح دی تھی۔

اڑتی اڑتی سنی کہ آج ان کے محلے کی باری ہے۔ مراد نے گھر کے دروازے پر ایک عجیب سا نشان بھی لگا دیکھ لیا۔ ابا کو پڑوسیوں نے تسلی دی۔ ہمارے ہوتے کوئی آپ کو کچھ نہیں کہے گا۔ اطمینان سے رہئے ——— پھر بھی ابا نے شبنم کو اماں کی دور کی رشتہ دار کے ہاں پہنچا دیا ——— اور وہ جو حفاظت کا ذمہ لے رہے تھے۔ جنہوں نے دوستی کی قسمیں کھائی تھیں۔ وہی قاتل بن کر آ گئے ——— ابا کے سینے میں تین گولیاں لگیں۔ اماں دوڑتی ہوئی نکلیں "ہم بنگلہ ہیں ——— ہم بنگلہ....." ان کے سر میں گولیاں لگیں۔ مراد اناج والی کوٹھری میں چھپا بیٹھا تھا۔ گھر لٹنے پہ آیا تو مال کے ساتھ وہ بھی برآمد ہوا۔ اس کا گلا گھونٹ دیا گیا۔

اپنے پیاروں کی لاشیں دیکھ کر وہ ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی

طوفان تھم گیا تھا۔ وہ اماں کے رشتہ داروں کے پاس ایک سال تک نیم دیوانگی کی کیفیت میں رہی ——— پھر رفتہ رفتہ ہوش ٹھکانے آنے لگے۔ زندگی خدا کی امانت ہے اور اسے اس امانت کی حفاظت کرنی تھی۔ ابا کا گھر اسے مل گیا۔ جب اس نے کمانے پر چڑھایا اور خود کالج میں داخلہ لے کر ہوسٹل چلی آئی۔ اماں کے رشتہ دار لاولد تھے۔ جب تک زندہ رہے اس کے کام آتے رہے۔ جس سال اس نے بی اے کیا۔ اسی سال وہ دونوں میاں بیوی بھی یکے بعد دیگرے خدا کو پیارے ہو گئے۔ بی اے کرنے کے بعد اس نے کچھ عرصہ ڈھاکہ ریڈیو پر پروگرام کئے۔ پھر بنگلہ دیش ایئرلائن میں ایئر ہوسٹس کی آسامی کے لئے اخبار میں اشتہار چھپا تو اس نے بھی درخواست دے دی۔ انتخاب ہوا، پھر ٹریننگ ہوئی۔ پھر اندرونِ ملک پروازیں ملیں۔ اور اب وہ دنیا میں ہر جگہ جا چکی تھی۔

اس نے تبسم کو بھلا دیا تھا۔ اس کا خط ملنے سے پہلے تک تو وہ سچ مچ بھلا بیٹھی تھی کہ اس کی کوئی بہن بھی ہے۔ وہ کئی بار کراچی آئی لیکن اسے کبھی بھول کر بھی تبسم کا خیال نہ آیا تھا لیکن پھر اچانک یہ خط آ گیا اور جیسے بند دریچے کھل گئے ہوں۔ یاد کا ایک ہی جھونکا اسے ماضی میں لے گیا ——— وہ بے چینی سے بہن کی منتظر رہی۔ کراچی کی فلائیٹ مل گئی تو اس نے سوچا خود ہی تبسم سے معلوم کر لوں کہ وہ اب تک کیوں نہیں آ سکی۔

"کاش! تبسم کو میں نے وہ فون نہ کیا ہوتا ——— کاش تم نے مجھے خط ہی نہ لکھا ہوتا۔"

واپسی پر جہاز پھر کراچی سے ہوتا ہوا اچلا گیا۔ شبنم نے ایک بار پھر ملک ارشد کے ہاں فون کیا ——— لازم تھا کوئی ——— اور اس بار شبنم نے خود اعتمادی سے بات کی۔ اسے اتنا معلوم ہو چکا تھا کہ تبسم کی موت خودکشی تھی۔

⭘

بنگلہ دیش ایئرلائن "بیمان" کا جہاز ابھی ابھی ڈھاکہ سے کراچی پہنچا تھا۔ شبنم بھی اسی فلائیٹ سے کراچی پہنچی تھی۔ لیکن آج اس کی حیثیت ایک مسافر کی تھی۔ وہ دو ماہ کی چھٹی پر آئی تھی، تفریح کی غرض سے نہیں۔ اپنی بہن تبسم کی اچانک موت کی وجہ جاننے۔

بیمان کے کاؤنٹر پر وہی لڑکا تھا جس نے پہلی بار تبسم کو فون پر بات کرائی تھی۔ وہ شبنم کو دیکھ کر مسکرایا پھر بولا "آج آپ یونیفارم میں نہیں ہیں۔"

"ہاں آج خود ایک مسافر ہوں اور آپ کے شہر میں مہمان۔" وہ بھی مسکرائی۔

"اوہ ——— چھٹی پہ آئی ہیں ؟"

"ہاں — اور مجھے کسی اچھے اور کم مہنگے ہوٹل کا پتہ بھی بتا دو۔"

"کتنے دن ٹھہریں گی؟"

"چھٹی تو میری دو ماہ کی ہے — کام پہلے ختم ہو گیا، تو پہلے ہی واپس چلی جاؤں گی۔"

"میری آنٹی کا گلشن اقبال میں ورکنگ گرلز کے لئے ایک ہوسٹل ہے — پے انگ گیسٹ ٹھہراتی ہیں وہ — اگر آپ چاہیں تو......"

"اوہ، اگر ایسا ہو جائے تو بہت ہی اچھا ہو گا۔" شبنم خوشی سے بولی۔

"تھوڑی دیر تک میری ڈیوٹی آف ہو جائے گی۔ آپ تھوڑا سا انتظار کر لیں — میں خود ہی آپ کو لے چلوں گا۔"

"ٹھیک ہے — میں یہیں بیٹھ جاتی ہوں۔" وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ پھر مڑ کر اس سے بولی۔ "بھئی! میں نے آپ کا نام تو پوچھا ہی نہیں۔"

"عبدالحئی —" وہ شرماتے ہوئے بولا۔

"میرا نام شبنم گل ہے — اور مجھے سچ مچ تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے۔" وہ مسکرائی۔

❂

گلشن اقبال میں مسز کریم الدین کا چھ سو گز پر بنا ہوا ہوسٹل خاصا خوبصورت اور آرام دہ تھا۔ اس میں اوپر نیچے ملا کر چھ بیڈ روم تھے۔ مسز کریم الدین بیوہ اور بے اولاد تھیں۔ تمام جمع پونجی سے انہوں نے یہ ہوسٹل قائم کیا تھا۔ اس میں رہنے والی لڑکیوں کو واقعی اولاد کی طرح چاہتیں۔ ان کی تمام ضروریات کا خیال رکھتیں۔ ایک بیڈ روم میں دو لڑکیاں رہتیں۔ کبھی کبھار کوئی مہمان بھی آ جاتی تو اس کے لئے اضافی بیڈ ڈالا جاتا تھا۔ خود مسز کریم الدین جو آنٹی کہلاتی تھیں۔ ایک کمرے میں جو کچن سے قریب تھا، رہتیں۔ دو ملازم تھے۔ ایک چوکیدار اور ایک باورچی۔ مستقل رہنے والی دس لڑکیاں تھیں۔ جن میں سے چھ ایئر ہوسٹس تھیں۔ جن کے والدین دوسرے شہروں میں تھے۔ دو بینک ملازم تھیں۔ ایک ادھیڑ عمر کی کالج لیکچرار تھی اور ایک غیر ملکی لڑکی جو یونیورسٹی میں فارمیسی کی طالبہ تھی۔
شبنم کو جس کمرے میں جگہ ملی۔ اس میں دو لوں لڑکیاں ایئر ہوسٹس تھیں ایک موجود تھی اور ایک پرواز پر تھی۔ سب نے شبنم کا استقبال بڑی گرمجوشی سے کیا۔ اس نے اپنا مختصر سا سامان رکھا۔ پھر نہا دھو کر لاؤنج میں آ بیٹھی۔ شام ہو چلی تھی۔ لاؤنج میں ٹی وی چل رہا تھا۔ ایک دو لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ باقی اپنے کمروں میں ہی تھیں۔ ٹی وی لاؤنج کی دوسری جانب کچن تھا اور کچن کی دائیں جانب آنٹی کا کمرہ جس میں فون بھی تھا۔ لڑکیوں کو فون کرنے اور فون وصول کرنے کی بھی سہولت تھی۔ مرد ملاقاتیوں کا اندر آنا سختی سے منع تھا۔ رات نو بجے کے بعد گیٹ بھی بند کر دیا جاتا تھا۔ صرف وہ ایئر ہوسٹس لڑکیاں جو فلائیٹ پر جا رہی ہوں یا آ رہی ہوں، یا مہمان کے طور پر ٹھہری ہوئی ہوں، اس پابندی سے مستثنیٰ تھیں۔ شبنم کو یہاں آ کر بڑا اچھا لگا۔ اسے خوشی تھی کہ عبدالحئی کی بدولت اتنی اچھی جگہ اپنے رہنے کے لئے مل گئی جہاں خرچہ بھی اس کی توقعات سے بہت کم تھا۔ وہ یہاں رہ کر اطمینان سے تبسم کی

چٹکلا

پولیس کانسٹبلوں پر جُوا کھیلنے کا الزام تھا۔ افسر اعلیٰ کے سامنے ایک نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ "میں جُوا نہیں کھیل رہا تھا، جناب عالی! میں تو صرف اپنے دوستوں سے تھوڑی سی گپ شپ کرنے گیا تھا۔"
گواہی کی کمی کی بنا پر اسے بے قصور ٹھہرا کر چھوڑ دیا گیا۔
دوسرے کانسٹبل نے کہا۔ "میں جُوا نہیں کھیل رہا تھا، جناب عالی! میں تو اس انتظار میں تھا کہ میرے دوست جائیں تو بجلی کا سوئچ آف کر کے سونے کے لیے چلا جاؤں۔"
اسے بھی گواہی کی کمی کے باعث بے قصور ٹھہرایا گیا۔
تیسرے نے کہا۔ "میں جُوا نہیں کھیل رہا تھا، جناب عالی، میں نے روشنی جلتی ہوئی دیکھی تھی اور صرف یہ معلوم کرنے چلا گیا تھا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے؟"
گواہی کی کمی نے اسے بھی بے قصور ٹھہرایا۔
لیکن چوتھا کانسٹبل باقی تینوں سے زیادہ مصیبت میں تھا۔ اسے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ اس کے پاس سے تاش بھی برآمد ہوئے تھے اور رقم بھی۔
افسر اعلیٰ نے کہا۔ "تم ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ جُوا نہیں کھیل رہے تھے۔"
"میں اور جُوا؟ کمال کرتے ہیں جناب عالی!" چوتھے نے کہا۔ "اچھا فرض کر لیجیے کہ میں جُوا کھیل رہا تھا لیکن کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ کس کے ساتھ کھیل رہا تھا؟"

موت کا معمہ حل کرے گی۔ اس نے جاسوسوں کی طرح سوچا۔

رات کو بستر پر لیٹ کر اس نے سارا قصہ ذہن میں دہرایا کہاں سے شروع کروں ـــ اس الجھی ہوئی ڈور کا کون سا سرا پکڑوں کہ یہ سلجھتی چلی جائے۔ ملک ارشد......اس کے دل نے جواب دیا۔ دماغ نے تصدیق کی۔ ملک ارشد ہی وہ شخص ہے جو تبسم کی موت پر صحیح بیان دے سکے گا۔

اگلے روز اس نے ملک ارشد کے گھر فون کیا۔ وہ ہاؤس کیپر تھا۔

"وہ نہیں ہیں۔"

"کہاں ملیں گے؟"

"پتہ نہیں ـــ" اور اس کے بعد کھٹ سے فون بند کر دیا گیا۔

اس نے ڈائرکٹری میں سے آفس کے نمبر نکالے اور ڈھیر سارے نمبروں میں سے ایک نمبر گھمایا۔ "ملک انڈسٹریز۔" آپریٹر لڑکی نے جواب دیا۔

"مجھے ملک ارشد سے بات کرنی ہے۔" شبنم نے خود اعتمادی سے کہا۔

"وہ ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں۔" لڑکی نے جواب دیا۔

"کب آئیں گے؟"

"پتہ نہیں ـــ آپ چار پانچ دن بعد معلوم کر لیں۔"

چار پانچ دن بعد بھی یہی جواب ملا۔ "وہ شہر میں نہیں ہیں کل پرسوں تک آئیں گے۔"

کل پرسوں یہ جواب ملا۔ "وہ ابھی ابھی تشریف لے گئے ہیں۔ کل فون کریں ـــ"

شبنم پر ناامیدی طاری ہونے لگی۔ اسے اپنا کراچی آنا بے کار لگنے لگا۔ وہ ابھی تک آنٹی کے ہوسٹل ہی میں مقیم تھی اور جب سے آئی تھی صرف ایک بار باہر نکلی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں اداس اور تنہا بیٹھی تھی کہ ایئر ہوسٹس کی یونیفارم میں ملبوس ہاتھ میں بیگ تھامے ایک لڑکی اندر داخل ہوئی۔ وہ ابھی ابھی فلائیٹ سے واپس آئی تھی اور اس کمرے کی دوسری پارٹنر تھی۔

"ہیلو!" اس نے خوشدلی سے کہا۔

"ہیلو ـــ سوری، میں نے آپ کے کمرے پر قبضہ کر رکھا ہے۔"

"ارے نہیں ـــ" وہ بیگ رکھ کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "ہم تو یوں بھی مسافر لوگ ہیں۔ آج یہاں، کل وہاں ـــ کہیں مستقل بسیرا نہیں رہتا۔"

"ہاں ـــ واقعی ـــ" شبنم نے تائید کی ـــ وہ لڑکی اب اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔

"میرا نام شبنم ہے ـــ میں ڈھاکہ سے آئی ہوں۔"

"اوہ ـــ میں رعنا ہوں۔ ویسے مجھے لگتا ہے، آپ کو دیکھا ہے کہیں۔"

"نہیں دیکھا ہوگا ـــ میں پہلی بار اس شہر میں آئی ہوں۔"

"اچھا ـــ لیکن آپ کا چہرہ بڑا مانوس سا لگتا ہے۔" رعنا سوچتے ہوئے بولی۔

رات کو کھانے پر صرف سات لڑکیاں تھیں۔ شبنم کھانے کے بعد کمرے میں آ گئی۔ رعنا ٹی وی دیکھنے بیٹھ گئی۔ وہ سونے کی تیاری کر رہی تھی جب رعنا اندر داخل ہوئی۔ "یاد آ گیا جی! آپ کو کہاں دیکھا ہے۔"

"کہاں؟" شبنم نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

"دراصل آپ کو تو نہیں ـــ البتہ آپ سے ملتی جلتی سی ایک شخصیت کو دیکھا ہے۔ خدا کی قسم! مجھے تو ایسا لگ رہا ہے، جیسے تبسم میرے سامنے موجود ہے۔"

شبنم کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو گئے۔ "تبسم!" وہ زیرِ لب بڑبڑائی۔

اسی وقت کمرے میں مقیم دوسری لڑکی بھی اندر آ گئی۔

"ارے دیکھو طلعت ـــ یہ تبسم سے کتنی ملتی ہیں۔"

اس نے بھی غور سے شبنم کو دیکھا۔ پھر سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"ہاں بھئی واقعی ـــ"

"کون تھی یہ تبسم؟" شبنم نے ڈوبتی آواز میں پوچھا۔

"ایک تھی بے چاری۔"

"تمہاری دوست تھی؟"

"ارے نہیں ـــ میں اور وہ ایک ہی بیوٹی پارلر میں جاتے تھے ـــ وہیں اس سے ملاقات ہوئی ـــ پھر ایک دن اچانک پتہ چلا کہ وہ مر گئی۔"

"کیسے مر گئی؟" شبنم بے قرار ہو گئی۔

"پتہ نہیں یار ـــ کچھ پراسرار سی بات تھی۔" رعنا چپ ہو گئی۔ تو شبنم کا دل چاہا اس سے کرید کرید کر معلوم کرے۔

"ویسے تم حد درجہ اس سے ملتی جلتی ہو۔ کہیں اس کی رشتہ دار تو نہیں ہو؟"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" طلعت بولی۔ "وہ پنجابی تھی، یہ ڈھاکے سے آئی ہیں۔"

پھر وہ دونوں آپس میں بات کرنے لگیں۔ شبنم نے بے چینی سے پوچھ ہی لیا۔ "کچھ اور بھی تو بتاؤ تبسم آخر تھی کون؟"

"ارے بھئی! وہ کراچی کی مشہور عورتوں میں سے تھی۔ ایک

وجہ شہرت تو اس کی خوبصورتی تھی ۔۔۔ دوسری وجہ شہرت یہ تھی کہ ملک ارشد کی بیوی تھی، جو شہر کا امیر ترین آدمی ہے۔"

"تیسری وجہ شہرت بھی تو بتاؤ۔" طلعت نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں ۔۔۔ بڑی فلرٹ قسم کی عورت تھی۔" رعنا نے کہا اور شبنم کو ندامت سی محسوس ہونے لگی۔ "اس کا آخری افیئر اس کے شوہر کے دوست کے ساتھ چل رہا تھا۔ لوگ کہتے ہیں اسی عشق کی ناکامی کے باعث اس نے خودکشی کرلی۔"

"خودکشی؟" شبنم نے دہرایا۔

"پولیس نے یہ کیس ہی بند کر دیا۔ ملک ارشد بڑا بااثر آدمی ہے۔ اس نے تو اخباروں میں بھی خبر نہیں آنے دی۔ یہ تو اڑتی اڑتی سنی ہے۔"

"وہ کون تھا جس کے ساتھ تبسم کا ۔۔۔۔" وہ بہن کے بارے میں ایسی بات کرتے ہوئے ہچکچا کر رہ گئی۔

"ارے بڑا ہینڈسم آدمی ہے۔ لیکن بڑا چکر باز ۔۔۔ کسی ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں ہے ۔۔۔ عارف رضا۔"

"عارف رضا۔" شبنم نے یہ نام ذہن نشین کرلیا۔ اسے اس بات کی خوشی تھی کہ اسے آخر کار کچھ تو معلوم ہوا۔ اب اگر ملک ارشد سے ملاقات نہ کرسکی تو وہ عارف رضا ہی سے ملنے کی کوشش کرے گی۔ لیکن یہ خودکشی والی بات اسے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ پولیس والوں نے پوسٹ مارٹم تو کروایا ہوگا۔ پتہ نہیں اصل رپورٹ کیا ہوگی۔ ملک ارشد نے معاملہ دبوا دیا ہوگا۔ ظاہر ہے یہاں تبسم کا کون تھا؟ جو کھوج لگواتا۔ پولیس کو تفتیش کے لئے مجبور کرتا۔ پتہ نہیں کیس کون سے تھانے میں ہوگا ۔۔۔ جانے یہاں کی پولیس کا رویہ کیسا ہوتا ہے؟ وہ کس حد تک ایماندار ہوتے ہیں ۔۔۔ اور کس حد تک مددگار۔

اگلی صبح اس نے ایک بار پھر ٹیلی فون ڈائریکٹری نکالی اور ملک ارشد کے گھر کا ایڈریس دیکھا۔ ڈیفنس سوسائٹی کا پتہ تھا۔ ظاہر ہے کہ تبسم کا کیس بھی ڈیفنس تھانے میں ہی ہوگا۔

ٹیکسی والے نے اسے ڈیفنس تھانے کے بالکل سامنے اتارا وہ ساڑی کے آنچل کو اچھی طرح لپیٹتی ہوئی اندر داخل ہوئی ۔۔۔ کتنی ہی نظروں نے اسے غور سے دیکھا۔ "کس سے ملنا ہے آپ کو؟" پولیس کی وردی میں ملبوس ایک شخص نے اس سے سوال کیا۔

"انسپکٹر صاحب سے۔"

"کون سے انسپکٹر سے؟"

"کوئی بھی ۔۔۔ جو ڈیوٹی پر ہو۔"

"آئیے۔" وہ اس کے ساتھ چل دی۔ ایک چھوٹے سے کمرے

"میں کتاب خریدنے جا رہی ہوں۔"
"کیوں؟"
"میرے منیجر نے مطالعہ کے لیے مجھے ایک خوبصورت ٹیبل لیمپ کا تحفہ دیا ہے۔"

میں بچھی ایک کرسی پر اسے بیٹھنے کو کہہ کر وہ خود میز کی دوسری جانب رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"فرمائیے۔"

"اوہ! تو آپ ہی انسپکٹر ۔۔۔۔"

"میں ایس ایچ او ہوں اس تھانے کا۔ سبحانی میرا نام ہے۔ کیا خدمت کرسکتا ہوں آپ کی؟"

"مجھے ایک کیس کے بارے میں معلوم کرنا ہے۔" وہ رک گئی۔

"کہیے ۔۔۔ کہتی رہیئے۔"

"اب سے مہینہ بھر پہلے تبسم ارشد نامی ایک عورت پراسرار حالات میں فوت ہوئی تھی۔ میں ۔۔۔ میں اس کے بارے میں تفصیل جاننا چاہتی ہوں۔"

"ہوں۔" ایس ایچ او نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ "آپ ۔۔۔۔"

"میں تبسم کی بہن ہوں۔" اس نے دل کڑا کر کے کہا۔

"جی ۔۔۔!" وہ حیرت سے بولا۔ "لیکن ہمیں تو یہ بتایا گیا تھا کہ اس کا کوئی رشتہ دار حیات نہیں ہے۔"

"جی ہاں! چند مصلحتوں کی بنا پر تبسم نے یہ بات چھپا رکھی تھی۔" شبنم نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "آپ مجھے کیس کی تفصیل بتائیے۔"

ایس ایچ او نے میز پر رکھی گھنٹی بجائی۔ ایک سپاہی اندر داخل ہوا۔ اس نے ایک کاغذ پر کچھ لکھا۔ پھر سپاہی کو دیتے ہوئے بولا۔

"یہ فائل نکلوا کر لاؤ ۔۔۔" سپاہی کے جانے کے بعد وہ شبنم سے مخاطب ہوا۔ "آپ اب تک کہاں تھیں؟"

"میں بنگلہ دیش کی شہری ہوں ۔۔۔ ڈھاکہ میں رہتی ہوں۔"

"آپ کو بہن کے مرنے کی اطلاع کس نے دی؟"

"کسی نے بھی نہیں ۔۔۔ میں چند دن پہلے کراچی آئی تھی ۔۔۔ میں بیمان میں ایئرہوسٹس ہوں۔ یہاں آکر میں نے تبسم سے فون پر بات کرنی چاہی۔ وہاں سے یہ اطلاع ملی کہ ۔۔۔۔"

سپاہی اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک فائل تھی۔

"ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔" ایس ایچ او نے فائل لے کر کہا اور پھر ان کاغذات کا مطالعہ کرنے لگا۔

مسمات تبسم ارشد — زوجہ ملک ارشد — عمر ۲۲ سال۔
شبنم کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ موت زہریلی چیز کھانے سے واقع ہوئی — زہر کی قسم آرسینک — موت کی نوعیت، خودکشی — خودکشی کی وجہ، شوہر سے اختلافات۔"

"میرا خیال ہے ایسا نہیں ہے۔"

"کیا؟ شوہر سے اختلاف....."

"نہیں، خودکشی۔"

"کیا مطلب؟" سبحانی نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

شبنم نے اپنے پرس میں سے ایک خط نکالا اور اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ "یہ پڑھیے۔"

ایس ایچ او نے مختصر سا خط پڑھا۔ پھر ایک لمبی سی "ہوں" کہی۔ "یہ خط آپ کو کب لکھا تھا انہوں نے؟"

"اس پر تاریخ لکھی ہوئی ہے — ۸ر جولائی۔"

"اور ملا کب آپ کو؟"

"۱۰ر جولائی۔"

"یعنی مسمات تبسم نے اپنی موت سے پہلے آپ کو یہ خط لکھا؟"

"ظاہر ہے۔" شبنم چڑ کر بولی۔ "مرنے کے بعد تو نہیں لکھ سکتی تھی۔"

سبحانی نے اس کی بات کا ذرا بھی برا نہیں مانا۔ ایک بار پھر اس نے بغور خط کا جائزہ لیا۔ پھر فائل میں لکھی تاریخ وفات پڑھی۔ ۹ر جولائی — یعنی صرف ایک دن قبل تبسم نے وہ خط اپنی بہن کو لکھا تھا۔ "اچھا! تو اب آپ کیا چاہتی ہیں؟"

"میں اس کیس کی تفتیش کرانا چاہتی ہوں۔"

"ہم تفتیش کر چکے ہیں — خودکشی کا کیس ہے — فائل اب بند ہو چکی ہے۔"

"کھولیں اسے — دوبارہ تفتیش کریں۔ یہ خودکشی نہیں ہے۔"

"آپ نے یہ اندازہ کیونکر لگایا؟"

"یہ خط پڑھا ہے آپ نے۔" شبنم کے لہجے میں تلخی تھی۔

"جی ہاں — پڑھا ہے۔ حیرت ہے بنگالی ہونے کے باوجود آپ کی بہن نے اردو میں خط لکھا ہے اور آپ بھی بہت صاف اردو بول رہی ہیں۔"

"میرے والد آپ کے ہم وطن تھے — ویسے یہ بات غیر متعلق ہے۔"

"اچھا، اچھا۔" وہ جھینپ گیا۔ "ہاں تو اس خط سے یہ کہاں ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اگلے روز خودکشی نہیں کرنے والی تھیں؟"

شبنم کا جی چاہا اپنا سر پیٹ لے۔ "جو لوگ اگلے دن خودکشی کرنے والے ہوں وہ ایک دن پہلے اپنے مستقبل کے منصوبے ہرگز نہیں بتاتے۔"

"ہو سکتا ہے ایک دن پہلے تک انہوں نے خودکشی کرنے کا سوچا نہ ہو۔"

"سبحانی صاحب! آپ ذرا سنجیدگی سے غور کریں۔ یہ خودکشی ہرگز نہیں — میں اپنی بہن کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ اس خط میں اس کے الفاظ پر غور کریں۔"

"میں جو چاہتی ہوں وہی ہوتا ہے۔"

"جی — پھر —؟"

"پھر یہ کہ ..... کہ ....." وہ ذرا سا جھجکی پھر بولی۔ "وہ طلاق کے بعد کسی دوسرے شخص سے شادی کرنا چاہ رہی تھی۔ اس نے ہنی مون کا پروگرام بھی بنا لیا تھا۔ ایک روز پہلے مستقبل سے اتنا پُرامید شخص اگلے روز خودکشی نہیں کر سکتا۔"

"ہو سکتا ہے کہ ملک ارشد نے انہیں طلاق دینے سے صاف انکار کر دیا ہو — ایسی صورت میں....."

"ایسی صورت میں اس نے خود کو ختم کر ڈالا۔ نہیں سبحانی صاحب بالکل نہیں۔"

"آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟"

"میرا خیال ہے اسے قتل کیا گیا ہے۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔

"ہوں....." ایس ایچ او نے پھر لمبی سی ہوں کہی۔

"کسی پر شبہ ہے آپ کو؟"

"اس کے شوہر پر۔"

"آپ کو پتہ ہے ملک ارشد بہت....."

"جانتی ہوں میں —" اس نے بات کاٹی۔ "وہ بہت اثر و رسوخ والا آدمی ہے۔ اس نے اخباروں میں بھی یہ خبر نہیں چھپنے دی۔ اس نے کیس بھی بند کروا دیا۔ لیکن انسان کا خون اتنا سستا بھی نہیں — میری بہن لاوارث بھی نہیں —"

"آپ اپنے بہنوئی سے ملیں؟"

"جی نہیں — میں نے آج تک اس کی شکل بھی نہیں دیکھی۔ پچھلے کئی دنوں سے میں مسلسل کوشش کر رہی ہوں، اس سے ملنے کی، لیکن یہی جواب ملتا ہے کہ وہ ملک سے باہر ہیں — کبھی شہر سے باہر ہیں۔"

"تو کیا آپ ملک ارشد کے خلاف رپورٹ درج کروانا..... چاہتی ہیں؟"

شبنم سوچ میں پڑ گئی۔ "نہیں — میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ آپ پھر سے اس کی تفتیش کریں — حقیقت خود بخود سامنے

آ جائے گی۔"

ایس ایچ او کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ "دیکھئے بی بی! آپ اس چکر میں نہ پڑیں۔ آپ اس ملک میں اجنبی ہیں۔ اکیلی ہیں۔ عورت ذات ہیں ــــ قانون اور پولیس کے بارے میں آپ نے صرف کتابوں میں ہی پڑھا ہوگا۔ کبھی واسطہ نہیں پڑا ہوگا۔ یوں بھی ملک ارشد سے ٹکر لینا دانشمندی نہیں۔"

"مجھے حقیقت جاننی ہے ــــ آپ اگر مدد نہیں کریں گے تو میں خود اپنے طور پر کھوج لگاؤں گی۔ آپ صرف مجھے ملک ارشد سے ملوا دیں۔"

"میں بھلا کس طرح ملوا سکتا ہوں۔"

"میرا اس سے رابطہ نہیں ہو رہا ــــ وہ فون پر نہیں ملتا ــــ آپ اپنی سرکاری حیثیت میں اس سے کہیں کہ وہ مجھ سے مل لے۔"

"نہیں بی بی ــــ یہ کام اتنا سیدھا نہیں ہے ــــ میں اسے سرکاری حیثیت میں کوئی حکم نہیں دے سکتا۔ آپ کو خود ہی کوشش کرنی ہوگی۔"

"آپ کچھ نہیں کریں گے؟"

"سوری!" وہ خشک لہجے میں بولا۔

شبنم نے کچھ سوچا پھر بولی۔ "یہ عارف رضا کون صاحب ہیں؟"

ایس ایچ او ایک بار پھر مسکرایا۔ "آپ تو کافی کچھ جانتی ہیں۔ عارف رضا صاحب، ملک ارشد کے اچھے دوستوں میں شمار ہوتے تھے۔"

"تھے؟"

"ہاں!" وہ ہنسا۔ "اب نہیں ہیں ــــ رین بو ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں اعلیٰ عہدہ پر ہے ــــ بہت شوقین مزاج آدمی ہے۔ خوبصورت ہے ــــ غیر شادی شدہ ہے۔ عورتوں میں بہت زیادہ مقبول ہے۔"

"ان کا ایڈریس اور فون نمبر دے سکیں گے۔"

"ضرور۔" سبحانی نے ڈائری کھولی اور ایک کاغذ پر چند سطریں لکھ کر شبنم کی طرف بڑھا دیں۔ "ایک مشورہ ہے آپ کے لئے مس شبنم!"

"جی؟" اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"بہتر تو یہی ہے کہ آپ یہ سب کچھ نہ کریں ــــ کسی سے نہ ملیں ــــ اور اگر آپ مُصر ہی ہیں تو پھر آپ کو بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اگر آپ کا شبہ صحیح ہے کہ آپ کی بہن کو قتل کیا گیا ہے تو عین ممکن ہے آپ قاتل کے روبرو ہوں۔"

"آپ فکر نہ کریں۔" وہ مسکرائی ــــ "مشورہ کا شکریہ۔"

"اور ہاں ــــ اس خط کا کسی سے ذکر نہ کریں۔ ورنہ حالات بدتر ہو سکتے ہیں۔"

❁

باتھ آئی لینڈ پر نئے لگژری اپارٹمنٹس کے سامنے شبنم ٹیکسی سے اتری۔ ہاتھ میں پکڑی چٹ سے اس نے بلڈنگ کا نام ملایا۔ پھر مطمئن ہو کر ٹیکسی والے کو پیسے ادا کر کے گیٹ سے اندر داخل ہو گئی۔ فلیٹ نمبر ۴۸ چوتھے فلور پر تھا۔ لفٹ کے ذریعے وہ اوپر پہنچی۔ سامنے ہی نمبر ۴۸ تھا۔ دروازے پر عارف رضا کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔ اس نے گھنٹی پر انگلی رکھی۔ چند لمحوں بعد دروازہ کھلا۔ ایک ادھیڑ عمر کی ملازمہ ٹائپ عورت نے جھانکا۔ "جی؟"

"عارف رضا صاحب ہیں؟"

"ابھی دفتر سے واپس نہیں آئے۔"

"اوہ!" شبنم کو مایوسی ہوئی۔

"آنے والا ہوگا صاحب ــــ آپ انتظار کر لو۔"

"کب تک آ جائیں گے وہ؟"

"بس آدھے پونے گھنٹے تک۔"

شبنم نے انتظار کرنا ہی مناسب سمجھا۔ وہ اندر آگئی۔ عورت نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔

"چائے مائے لاؤں؟" اس کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ

"یہ اندازہ لگانے کے لیے کہ تمہیں کشتی رانی میں کس حد تک مہارت حاصل ہے، میں تم سے چند سوالات پوچھتا ہوں۔ بتاؤ، اس وقت کیا کرو گے، جب اچانک سامنے سے سیلاب کا ریلا آجائے گا؟"

"فوراً لنگر ڈال دوں گا۔"

"اسی وقت پیچھے سے سیلاب کا دوسرا ریلا آجائے تو کیا کرو گے؟"

"ایک اور لنگر ڈال دوں گا۔"

"پھر دائیں جانب سے سیلاب کا ریلا آجائے تو؟"

"تو ایک اور لنگر ڈال دوں گا۔"

"پھر بائیں جانب سے ریلا آئے تو؟"

"تو ایک اور لنگر ڈال دوں گا۔"

"ایک منٹ! تمہاری کشتی ہے یا لنگر خانہ؟ آخر اتنے لنگر کہاں سے آئیں گے؟"

"وہیں سے جہاں سے آپ سیلاب کے ریلے لائیں گے۔"

وہ اس فلیٹ میں خواتین مہمانوں کی عادی ہیں۔
"نہیں۔ بس ایک گلاس پانی۔" عورت چلی گئی تو شبنم نے کمرے کا جائزہ لیا۔ قیمتی قالین ۔۔۔ نفیس فرنیچر ۔۔۔ دیواروں میں نصب ایئر کنڈیشنر ۔۔۔ خوبصورت پینٹنگز۔ عارف رضا باذوق آدمی لگتا ہے ۔۔۔ شبنم نے دل میں کہا۔ ملازمہ خوبصورت سے گلاس میں جوس لے کر آ گئی۔ "شکریہ۔"
"صاحب بس آتا ہوگا ۔۔۔ دفتر سے سیدھا گھر ہی آتا ہے۔ اگر دیر ہو تو میرے کو فون کر کے بول دیتا ہے کہ ماسی! تم کام ختم کر کے گھر بند کر کے چلی جاؤ۔ میرے پاس بھی ایک چابی ہوتی ہے نا۔"
باتونی عورت یہ جتا رہی تھی کہ وہ بہت قابلِ اعتبار ملازمہ ہے۔ شبنم نے اسے زیادہ لفٹ دینی مناسب نہیں سمجھا۔
"اچھا! اب آرام سے بیٹھو ۔۔۔ میں کام ختم کر لوں۔" وہ اٹھی جاتے جاتے کمرے کا ایئر کنڈیشنر چلا گئی۔
شبنم کو اپنی جرأت پر حیرت ہو رہی تھی۔ کس دیدہ دلیری سے وہ اس اجنبی شہر میں ایک انجان آدمی کے گھر میں بیٹھی ہوئی ہے تن تنہا ۔۔۔
کمرے کی نیم تاریک اور خنک فضا نے اسے اونگھنے پر مجبور کر دیا۔ وہ یقیناً سو گئی تھی۔ جب ہی تو اسے پتہ بھی نہ چلا کہ کب وہ اندر داخل ہو گیا۔ وہ تو اس کے کھنکارنے کی آواز سے ہڑبڑا کر اٹھی۔ کمرے میں کوئی شخص دکھائی تو دے رہا تھا لیکن صاف طور پر نہیں۔ کیونکہ کھڑکیوں پر گہرے دبیز پردوں نے تاریکی کر رکھی تھی۔
"ہیلو۔" وہ بولی۔
"ہیلو۔ آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔" وہ بولا۔
"اور آپ نے مجھے۔" وہ مسکرائی۔
آنے والے نے سوئچ دبایا ۔۔۔ دیواروں پر نصب بلب روشنی بکھیرنے لگے۔ شبنم نے دیکھا وہ شخص بلاشبہ مردانہ وجاہت کا شاہکار تھا۔ اتنا وجیہہ آدمی شبنم کی نظروں سے پہلے کبھی نہیں گزرا تھا۔ وہ کرسی سے اٹھی۔ تب اس آدمی نے اسے روشنی میں غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تحیر تھا۔ "میرے خدا ۔۔۔ تم؟ کون ہو تم؟"
"میرا نام شبنم ہے۔" وہ مسکرائی۔
وہ آہستہ آہستہ اپنی کیفیت پر قابو پاتا جا رہا تھا لیکن اس کی حیرت ابھی تک اس کی آنکھوں سے عیاں تھی۔ "میں عارف رضا ہوں۔" اس نے عادتاً اپنا تعارف کرایا۔
"میں جانتی ہوں ۔۔۔ اور یہاں آپ ہی سے ملنے آئی ہوں۔ آپ کی ملازمہ نے مجھے انتظار کرنے کا مشورہ دیا تھا۔"
"آپ کو پتہ ہے کہ بالکل آپ جیسی ایک اور شخصیت بھی ہے۔"
"ہے نہیں ۔۔۔ تھی۔" شبنم نے تصحیح کی۔
"ہاں تھی۔" وہ تھکا تھکا سا بولا۔ پھر اس نے شیلف میں رکھا البم اٹھایا اور ایک صفحہ پر چپکی تصویر اسے دکھاتے ہوئے بولا۔ "یہ دیکھئے ۔۔۔ بالکل آپ جیسی۔"
شبنم نے دیکھا۔ وہ تبسم کی تصویر تھی۔ دس سال بہت ہوتے ہیں۔ وہ ان سالوں میں اور بھی خوبصورت ہو گئی تھی۔ تصویر کسی پارٹی میں کھینچی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک مرد بھی تھا۔ عارف رضا۔ اگر تبسم اسی سے شادی کرنے والی تھی تو واقعی یہ جوڑا دنیا کے حسین ترین جوڑوں میں شمار ہوتا۔
عارف رضا بھی چند لمحے تصویر کو تکتا رہا۔ پھر چونک کر بولا۔
"آپ کون ہیں ۔۔۔ اور کیا چاہتی ہیں؟"
"میں نے کہا نا ۔۔۔ کہ میرا نام شبنم ہے۔ میں آپ سے ملنے آئی ہوں۔"
"کس سلسلے میں؟" وہ سنجیدگی سے بولا۔
"تبسم کو کیا ہوا تھا عارف صاحب ۔۔۔ وہ کیسے مری؟"
وہ بیحد سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔
عارف رضا ایک بار پھر حیرت زدہ سا دکھائی دینے لگا۔
"آپ ۔۔۔۔؟"
"میں تبسم کی بہن ہوں ۔۔۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ تبسم کی ایک بہن بھی ہے؟"
"نہیں ۔۔۔ میں اس کے بارے میں اتنا کچھ جاننے کے باوجود کچھ نہیں جانتا تھا۔"
"تب پھر کیا آپ میری بات پر یقین کر لیں گے کہ میں اس کی بہن ہوں؟"
"آپ کی شکل و صورت خود گواہی دے رہی ہے۔ کیا آپ جڑواں نہیں تھیں؟"
"نہیں۔ تبسم مجھ سے دو سال بڑی تھی۔ لیکن ماہ و سال اس کے قریب سے دبے پاؤں گزر جاتے تھے۔ اسے چھوتے نہیں تھے۔ ویسے ہم دونوں میں اتنی مشابہت تو نہیں کہ آپ دھوکہ کھا جائیں۔"
"شاید اگر دونوں بیک وقت نظروں کے سامنے ہوں تو ایسا نہ لگتا ہو ۔۔۔ لیکن اب ۔۔۔ جبکہ وہ بہت دور جا چکی ہے۔ اور صرف آپ سامنے ہیں، لگتا ہے میں تبسم کو ہی دیکھ رہا ہوں۔"
"تبسم کیوں مر گئی عارف صاحب؟"
ایک ٹھنڈی سانس عارف رضا کے ہونٹوں سے نکلی۔ وہ خود کرسی پر بیٹھ گیا۔ شبنم کھڑی رہی۔ "کاش ۔۔۔۔ کاش! میں جان سکتا ۔۔۔ آپ اس کی بہن ہیں ۔۔۔ آپ کو شاید کچھ پتہ ہو۔"

"ہم نے دس سال سے ایک دوسرے کی شکل نہیں دیکھی۔ میں ڈھاکہ میں ہوتی ہوں۔ وہ اکہتر کی جنگ سے پہلے ہی ادھر آگئی تھی۔ میں بیمان میں ایئر ہوسٹس ہوں۔ تبسم کی موت کی خبر نے مجھے یہاں آنے پر مجبور کردیا ہے۔"

"لیکن آپ مجھ سے کس لئے ملنے آئی ہیں؟"

"اس لئے کہ تبسم اپنے خطوں میں آپ کا تذکرہ بہت اپنائیت سے کرتی رہی ہے۔ اس نے کئی بار لکھا کہ آپ اس کے اچھے دوستوں میں سے ہیں اور وہ آپ پر بہت اعتبار کرتی ہے۔" شبنم اپنے جھوٹ کی برجستگی پر خود بھی دنگ رہ گئی۔

"آپ ملک سے ملیں۔"

"نہیں ـــــ میں نے بہت کوشش کی، ان سے ملنے کی لیکن کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔ مجھے تبسم کی موت کی وجہ جاننی ہے، عارف صاحب ـــــ ہر قیمت پر۔"

"وہ ملک کو چھوڑنا چاہتی تھی ـــــ ملک اس پر آمادہ نہیں تھا۔"

"... اور اس بات سے دل برداشتہ ہو کر اس نے خودکشی کرلی ـــــ" وہ بولی۔

"سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے اس پر یقین نہیں۔"

شبنم کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ "چلو ہم ایک سے دو ہوئے۔ مجھے بھی اس خودکشی والی بات پر یقین نہیں۔"

"وہ بہت حوصلہ مند لڑکی تھی ـــــ" عارف رضا نے کہا۔ "وہ ہارنا نہیں جانتی تھی۔" شبنم کو بہت اطمینان ہوا کہ کوئی اور شخص بھی اس کا ہم خیال ہے۔ "آپ کا دوست کیا کہتا ہے؟" اس کا اشارہ ملک ارشد کی طرف تھا۔

"وہ اب میرا دوست نہیں ـــــ بہت پہلے ہی ہمارے تعلقات خراب ہوگئے تھے ـــــ اب تو بس شناسائی کہیے......"

"آپ میری ملاقات کرواسکتے ہیں اس سے؟"

"میری تو عرصہ ہوا، اس سے ملاقات نہیں ہوئی ـــــ آپ خود کوشش کریں۔"

"نہیں مل رہا نہ وہ مجھے ـــــ میں بہت کوشش کر چکی ہوں۔"

"کیا کہتا ہے وہ؟"

"میری اس سے بات ہی کب ہوئی ہے ـــــ فون ریسیو کرنے والے کہہ دیتے ہیں کہ وہ یہاں نہیں ہیں۔"

"آپ کراچی کب آئیں؟"

تب شبنم نے پوری کہانی اسے سنائی۔ کیسے وہ پہلی بار آئی ـــــ کیسے اسے تبسم کی موت کی اطلاع ملی ـــــ پھر وہ دو ماہ کی چھٹی لے کر یہاں آئی ـــــ گلشنِ اقبال کے ایک ہوسٹل میں اس

"دس گیلن پٹرول کافی ہے محترمہ!"

"ہاں!"

"پٹرول چیک کر لیجئے۔"

"ٹھیک ہے۔ شکریہ!"

"ریڈی ایٹر میں پانی بھر دوں؟"

"بھر دو۔"

"کوئی اور خدمت محترمہ؟"

"ہاں، ذرا اپنی زبان باہر نکالو تاکہ میں لفافے کی گوند گیلی کرکے لفافے کو بند کرسکوں۔"

کا قیام ہے ـــــ دو ماہ میں سے دس دن گزر چکے ہیں ـــــ اور وہ ابھی تک ملک ارشد سے بات تک نہ کرسکی۔

"اوکے مس شبنم! میں دیکھوں گا کہ آپ کے لئے کیا کرسکتا ہوں۔ آپ میری مہمان ہیں ـــــ کوئی مسئلہ ہو ـــــ کوئی کام ہو، بلا تکلف کہہ دیجئے گا۔"

شبنم کا دل ایک دم سے ہلکا ہوگیا ـــــ میٹھے بول میں واقعی جان ہوتی ہے۔ "شکریہ عارف صاحب!"

"چلئے! آپ کو باہر کھانا کھلاؤں۔"

"نہیں، نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔"

"ضرورت ہے بھئی ـــــ میں نے خود بھی نہیں کھایا ہے۔ اور ہم اپنی دوستی کی ابتدا خوشگوار ماحول سے کریں گے ـــــ چلو اٹھو۔" وہ اپنائیت سے بولا۔ اور تنہائی کی ماری شبنم مسکرا اٹھی۔

عارف رضا اپنے آفس میں خیالوں میں گم بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے خوبصورت چہرے پر تفکر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ "رین بو" ملک کی مشہور ترین ایڈورٹائزنگ ایجنسی تھی اور عارف رضا اس کا مینیجنگ ڈائریکٹر۔

ذاتی طور پر وہ اشتہاری بزنس کو شطرنج کی بازی کی طرح سمجھتا تھا۔ حاضر دماغی، چالبازی، بے پناہ باخبری ـــــ سوجھ بوجھ ـــــ مہروں کی بروقت حرکت ـــــ مضبوط قوتِ ارادی۔ اور مخالف چاروں شانے چت ـــــ

اس بزنس میں بھی تو یہی تمام صلاحیتیں کام آتی ہیں۔ اور ابھی تک انہی صلاحیتوں کے بل بوتے پر اس نے شاندار کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ بہت پیسہ کمایا ـــــ بہت نام ہوا ـــــ اپنی کمپنی کو

بڑے بڑے اکاؤنٹ دلوائے ۔۔۔ چالیس سال کی عمر میں وہ شہر کا کامیاب ترین اور مشہور ترین کنوارہ تھا۔ اس نے زندگی کی تمام بازیاں بہت احتیاط اور مہارت سے چلی تھیں ۔۔۔ غلطی سے پاک۔ لیکن اب اس سے ایک غلطی ہو چکی تھی۔ زندگی کی سب سے بڑی غلطی ۔۔۔

تبسم ملک۔

اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگیں۔ میز پر رکھے پرفیومڈ ٹشو پیپر کے ڈبے میں سے ایک پیپر نکال کر اس نے پسینہ صاف کیا اور بزر دبایا۔ اس کی سیکریٹری مارتھا اندر داخل ہوئی۔

"یس سر۔"

"میٹنگ ختم ہو گئی مارتھا؟"

"نو سر ۔۔۔ ابھی تک سب اندر ہی ہیں۔"

"مجھے تو نہیں بلوایا؟"

"نو سر!" مارتھا کے لہجے میں ہمدردی تھی۔

"ٹھیک ہے، تم جاؤ ۔۔۔" وہ چلی گئی۔ عارف رضا سر تھامے بیٹھا رہا۔ یہ پہلی بار تھی کہ بورڈ آف ڈائریکٹرز کی میٹنگ ہوئی اور اسے نظر انداز کر دیا گیا۔ وہ اس کی وجہ جانتا تھا ۔۔۔ ملک ارشد ۔۔۔ تبسم کا شوہر ۔۔۔ رین بو ایجنسی کا سب سے بڑا کلائنٹ ۔۔۔ ملک انڈسٹریز کی پبلسٹی کا سارا بزنس ان کی ایجنسی کے پاس تھا۔ ملک سلک ملز ۔۔۔ ملک کاٹن ملز۔ ملک وولن ملز ۔۔۔ پھر سال میں ایک بار ملک پارچہ جات سے تیار کئے گئے ملبوسات کا فیشن شو ہوتا ۔۔۔ اس کا اہتمام بھی رین بو کرتی۔ اور اب یہ سب کچھ خاک میں ملتا نظر آ رہا تھا کیونکہ ملک ارشد نے معاہدہ کی تجدید سے انکار کر دیا تھا۔ باتوں باتوں میں اس نے عارف رضا سے اپنے اختلافات کا تذکرہ بھی کر دیا تھا۔ آج کی اس ہنگامی میٹنگ میں یہی فیصلہ ہونا تھا کہ کمپنی کے لئے عارف رضا ناگزیر ہے ۔۔۔ یا ملک ارشد کا اکاؤنٹ۔ عارف رضا کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ تھا۔ اتنے بڑے اکاؤنٹ کے آگے ایک نہیں سو مینیجنگ ڈائریکٹرز کو بھینٹ چڑھایا جا سکتا ہے۔

آفس کا دروازہ کھلا اور حبیب خان اندر آیا۔ وہ بھی کمپنی کے ڈائریکٹرز میں سے ایک تھا۔

"اوہ خدا ۔۔۔ کیا گرما گرم میٹنگ تھی ۔۔۔ بڑے میاں آگ بگولہ ہو رہے تھے۔"

بڑے میاں سے مراد ایجنسی کے مالک حامد مرزا تھے ۔۔۔ حبیب خان نے غور سے عارف رضا کو دیکھا جو گم صم سا اپنی کرسی میں دھنسا بیٹھا تھا۔

"ارے یار تم کو کیا ہو گیا؟ ایسے سوگوار نہ بنو ۔۔۔ ابھی تم نکالے نہیں گئے۔" حبیب خان کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ عارف رضا کا جی چاہا، اسے دھکے دے کر باہر نکال دے لیکن وہ کوئی اور غلطی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"کیا رہا میٹنگ میں؟"

"کل تمہیں تحریری رپورٹ مل جائے گی ۔۔۔ میں تمہیں مختصراً بتا دیتا ہوں۔ فیصلہ یہ ہوا ہے کہ تمہیں ایک چانس دیا جائے ملک ارشد کو منانے کا ۔۔۔ اگر تم معاہدہ کی تجدید کروانے میں کامیاب ہو جاؤ تو ٹھیک.... ورنہ تم سے استعفیٰ مانگا جائے گا۔ اور یہ ہم سب کا متفقہ فیصلہ ہے۔"

"او مائی گاڈ ۔۔۔" عارف رضا نے دوبارہ اپنا سر ہاتھوں میں تھام لیا۔ "وہ شخص تو فون پر بھی بات کرنے کو تیار نہیں۔ معاہدہ پر دستخط کیا کرے گا؟"

"یہ تمہارا دردِ سر ہے منّے۔" وہ تمسخر سے بولا۔ "ویسے ایک بات تو بتاؤ۔ کیا یہ واقعی سچ ہے؟"

"کیا؟" اس نے ماتھے پر بل ڈالے۔

"یہی... جو لوگ کہہ رہے ہیں ۔۔۔ تمہارا اور تبسم ملک کا چکر..."

"تم کچھ زیادہ ہی فری ہو رہے ہو۔" وہ درشتگی سے بولا۔

"سوری ۔۔۔" حبیب خان جھینپ گیا اور کندھے اچکاتے ہوئے باہر چلا گیا۔

عارف رضا نے بزر دبا کر سیکریٹری کو بلایا۔ "مارتھا! میٹنگ ختم ہو گئی ہے۔ میں جا رہا ہوں ۔۔۔ میرا کمرہ بند کر کے اور ساری چیزیں لاک کر کے تم بھی چلی جاؤ۔" وہ میز پر سے چابیاں اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔

آج یہ بات حبیب خان کے منہ سے بھی نکل گئی۔ اسے حبیب خان کو اتنی سختی سے جواب نہیں دینا چاہئے تھا ۔۔۔ اس طرح تو وہ اور بھی مشکوک دکھائی دینے لگتا ہے۔ حبیب خان کہہ رہا تھا کہ دوسرے لوگ یہی بات کر رہے تھے۔ یعنی اور بھی لوگ یہی کہتے ہیں ۔۔۔ اس کے متعلق باتیں بناتے ہیں ۔۔۔ اوہ خدا ۔۔۔ حبیب خان ذہین اور اسمارٹ آدمی نہیں ہے۔ لیکن آنکھیں کھلی رکھتا ہے ۔۔۔ ہاتھ بچا کر رکھتا ہے ۔۔۔ یہی وجہ ہے جو وہ آج سر اٹھا کر اس سے بات کر رہا ہے ۔۔۔ اور خود اس نے نہ آنکھیں کھلی رکھیں۔ نہ ہاتھ بچائے۔ لوگ باتیں بنا رہے ہیں ۔۔۔ آخر کون سی قیامت آ گئی ہے ۔۔۔ ٹھیک ہے اس کا افیئر ایک شادی شدہ عورت کے ساتھ تھا۔ لیکن یہ کوئی نئی اور چونکا دینے والی بات نہیں ۔۔۔ آئے دن ایسا کچھ ہوتا رہتا ہے ۔۔۔ پھر اس عورت نے خودکشی کر لی ۔۔۔ یہ ہے نئی اور چونکا دینے والی بات ۔۔۔ مگر اس میں اس کا کیا قصور ہے۔ اف آخر

اسے ضرورت کیا پڑی تھی، تبسم کے ساتھ چکر چلانے کی؟

ملک ارشد اپنی لائبریری میں مطالعہ میں مصروف تھا جب ملازم نے آکر اطلاع دی: "سر! انہی خاتون کا فون ہے ۔۔۔ وہ کہہ رہی ہیں کہ بہت ضروری بات کرنی ہے۔"

"کہہ دو، میں شہر میں نہیں ہوں ۔۔۔ بلکہ کہہ دو کہ میں ملک سے ہی باہر گیا ہوا ہوں۔"

"ٹھیک ہے سر۔" تابعدار ملازم سر جھکا کر چلا گیا۔

امیر ہونے کا ایک یہ بھی فائدہ ہے۔ کوئی آپ کو ڈھونڈنا بھی چاہے تو نہ پا سکے۔ فصیلیں بلند کرلیں۔ کمرے ساؤنڈ پروف بنا لیں۔ گھر پہ آنے والوں کو چوکیدار کی مدد سے باہر ہی باہر رخصت کردیں فون کالز کا جواب ملازم دیں۔ اور وہی کہیں جو آپ انہیں بتائیں۔

ملک ارشد کی پوری زندگی یونہی تو گزر رہی تھی۔ حصاروں میں مقید، بچپن سے لے کر آج تک وہ اکیلا اور اداس رہا۔ لڑکپن ہوسٹل کے کمروں میں اور جوانی بڑے بڑے بنگلوں میں۔ لیکن زندگی وہی رہی، تنہائی ویسی ہی رہی۔ وہی اکیلا پن جو ہمیشہ سے اس کا ساتھی تھا۔ آج بھی اس کی زیست کے ساتھ وابستہ تھا۔ ایک بار، صرف ایک بار اسے محسوس ہوا تھا کہ اس نے اس تنہائی کو زیر کر لیا ہے ۔۔۔ وہ جب تبسم سے ملا تھا۔

ملک ارشد اپنی کرسی سے اٹھا۔ کمرے کی ایک دیوار پر قدِ آدم فریم تھا جس پر سیاہ مخملی پردہ تھا۔ وہ فریم کے قریب پہنچا اور دیوار میں نصب ایک سوئچ کو دبایا ۔۔۔ پردہ بیچ میں سے دو حصوں میں تقسیم ہو کر سمٹتا چلا گیا۔ پھر اس نے ایک دوسرا بٹن دبایا۔ اور تمام پینل نور میں نہا گیا ۔۔۔ یہ ایک پینٹنگ تھی ۔۔۔ تبسم کی آئل پینٹنگ ۔۔۔ جیسے خود تبسم جیتی جاگتی سامنے آکھڑی ہو۔ بھورے چمکدار بال، خوبصورت بیضوی چہرے کے گرد ہالا سا کئے ہوئے تھے ۔۔۔ بادامی آنکھیں ہیرے کی کنیوں کی طرح چمک رہی تھیں ۔۔۔ سرخ نیم وا ہونٹ، جیسے کچھ کہنے ہی والے تھے۔ نیلی ساڑی سے جھانکتا اس کا سنہری بدن لو دے رہا تھا ۔۔۔ وہ ان تمام ہتھیاروں سے لیس تھی جو کسی بھی مرد کی تنہائی کے پرخچے اڑا سکتے تھے۔ مصور نے تخلیق کے اعلیٰ ترین لمحات میں یہ تصویر بنائی تھی۔

تبسم سے اس کی پہلی ملاقات ایک فیشن شو میں ہوئی تھی۔ جس میں تبسم ایک ماڈل تھی۔ ملک ارشد نے اسے دیکھا ۔۔۔ پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کا جی چاہا کہ شو کے آرگنائزر سے اس کا اتہ پتہ دریافت کرے۔ لیکن وہ بہت اونچی پوزیشن کا آدمی تھا۔ اس قسم کی چھوٹی حرکت اسے زیب نہیں دیتی تھی۔ شو کے بعد اس کا تمام فنکاروں اور ماڈلز سے تعارف کروایا گیا۔ تب اس نے

"تمہارا کہنا ہے کہ تم نے نشے کے بغیر کبھی کار نہیں چلائی؟"

"جی ہاں، سابق ایس پی صاحب!"

"اور تم یہ بھی کہتے ہو کہ پچھلے سال تم نے جان بوجھ کر دس افراد کو کچل دیا تھا؟"

"جی ہاں، سابق ایس پی صاحب!"

"اور تم ہمیشہ بیچ سڑک پر کار چلانا اور دوسری گاڑیوں سے ٹکرانا پسند کرتے ہو؟"

"جی ہاں، سابق ایس پی صاحب!"

"اور تمہیں کار کے نیچے دب کر ہلاک ہونے والوں پر کبھی ترس نہیں آتا؟"

"جی ہاں، سابق ایس پی صاحب!"

"ٹھیک ہے، ہمیں اپنی بس کمپنی کے لئے تمہارے جیسے ہی جی دار ڈرائیوروں کی ضرورت ہے۔ کل سے کام پر آجاؤ۔"

موقع دیکھ کر تبسم کو دھیرے سے کل کسی وقت فون کرنے کو کہا۔ تبسم زندگی کا اتنا بڑا چانس ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ پہلی ملاقات پر ہی وہ جان گئی کہ ملک ارشد اس کے حسن کا دیوانہ ہے۔ اس نے اس دیوانگی کو بڑی مہارت سے جنون کی طرف دھکیل دیا۔ دو ہفتے بھی نہ گزرے تھے کہ وہ مسز ملک ارشد بن گئی۔ لوگ چونک اٹھے ۔۔۔ کچھ طنزاً مسکرائے ۔۔۔ کچھ نے ناگواری سے ناک چڑھائی۔

ملک ارشد جانتا تھا کہ وہ سب لوگ اس وقت کیا سوچ رہے ہیں ۔۔۔ یہی کہ یہ شادی سال چھ ماہ سے زیادہ نہ چل سکے گی۔ وہ ۳۸ سال کا تھا اور تبسم ۲۲ سال کی۔ اس کا خاندان ملک کے اعلیٰ ترین خاندانوں میں شمار ہوتا تھا اور تبسم کے نہ کوئی آگے تھا نہ پیچھے ۔۔۔ وہ اس موضوع پر بات ہی نہیں کرتی تھی۔

"میں دنیا میں بالکل اکیلی ہوں ارشد ۔۔۔ سب شہید ہو گئے۔" اس کے آگے وہ رو پڑتی ۔۔۔ اور ملک ارشد اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بے چین ہو جاتا ۔۔۔ خود اس کو بھی اس بات کی زیادہ پرواہ نہیں تھی کہ تبسم کون ہے؟ کس خاندان کی ہے؟ وہ خود مختار تھا۔ کچی عمر کا نوجوان نہیں تھا۔ اس لئے اپنے خاندان میں کسی کے آگے جواب دہ نہ تھا۔ بس ایک بات اسے کبھی کبھی کھٹکتی۔ وہ یہ کہ وہ خود اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا جبکہ تبسم کے پاس فقط ابتدائی تعلیم

تھی۔ یہ بھی گوارہ تھا لیکن وہ آگے کچھ سیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔
ملک ارشد کو کبھی کبھی اس کے ساتھ بات چیت میں مایوسی ہوتی
وہ معزز لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے کے آداب سے بھی ناواقف تھی۔
وہ تو ایک خوبصورت مجسمہ تھی، سجاوٹ کی چیز تھی۔ اس کے ہونے
سے زندگی سج تو سکتی تھی سنور نہیں سکتی تھی ـــــ وہ گھر کی تنہائی
دُور کر سکتی تھی ـــــ دل کی نہیں ـــــ اس کی تمنا کی جا سکتی تھی۔
اس سے محبت نہیں ـــــ اور یہ ساری باتیں ملک ارشد کو جلد ہی
معلوم ہو گئی تھیں ـــــ پھر بھی یہ شادی آٹھ سال چلی۔ اور ۹ جولائی
کو تبسم کی موت کے ساتھ ہی اس کا اختتام ہوا ـــــ اور اب
دل کی تنہائی کے ساتھ ساتھ گھر کی تنہائی بھی ملک ارشد کا مقدر بن
گئی تھی۔

❋

اس روز کے بعد سے شبنم کی عارف رضا سے آج یہ تیسری
ملاقات تھی۔ وہ دونوں اس وقت ایک چینی ریسٹورنٹ میں
دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔
"میری چھٹی کے پندرہ دن گزر چکے ہیں ـــــ اور ابھی
تک میں ملک ارشد سے نہیں مل سکی۔"
"ہو جائے گی ملاقات۔ ذرا سا صبر کرو۔"
"مجھے تو کوئی امید نظر نہیں آتی ـــــ کچھ کرو عارف!"
"مجھے خود اپنی اتنی پریشانیاں ہیں اس سے ملنا میرے لئے
بھی بہت ضروری ہے۔ ٹائم ہی نہیں دیتا وہ۔"
"کسی اور سے کہلواؤ کہ تبسم کی بہن ملنا چاہتی ہے۔"
"وہ یقین نہیں کرے گا۔"
"لگتا ہے مجھے یونہی ناکام واپس جانا پڑے گا۔" وہ مایوسی
سے بولی۔
"نہیں، نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ میں کوئی دوسرا طریقہ سوچوں
گا۔" اس نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔ وہ شدید پریشانی کے دور
سے گزر رہا تھا۔ گلے تک مصیبت میں دھنسا کھڑا تھا۔ دس سال
کی محنت اور سنہرا مستقبل سب دھواں دھواں ہو رہا تھا۔
اگلے دن بالکل غیر متوقع طور پر ملک ارشد کی سیکرٹری
کا فون آ گیا۔ ملک ارشد نے عارف رضا کو آج شام چھ بجے
کا وقت دیا تھا۔ یہ ملاقات ملک ارشد کی قیام گاہ پر رکھی گئی تھی۔
عارف رضا اس کے گھر جاتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ اس گھر سے
بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔ لیکن ملاقات کا مقام تبدیل کرنے کا
انجام ملاقات کا منسوخ ہونا بھی ہو سکتا تھا۔
ٹھیک چھ بجے وہ ملک ارشد کے گھر پر موجود تھا۔ ملازم
اسے سیدھا اسٹڈی روم میں لے گیا۔ ملک ارشد ٹیبل پر جھکا
کچھ لکھ رہا تھا۔ بیٹھے بیٹھے ہی اس نے عارف رضا سے ہاتھ ملایا۔
پھر اشارے سے اسے بیٹھنے کو کہا۔
عارف رضا نے کنکھیوں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ سب کچھ
ویسا ہی تھا ـــــ کچھ نہیں بدلا تھا۔ تبسم کی پسندیدہ آرام دہ کرسی
اسی جگہ اسی زاویے سے رکھی ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ دیوار پر ٹنگی
تبسم کی قدِ آدم پورٹریٹ بھی اسی طرح آویزاں تھی۔ آج اس کا
پردہ اٹھا ہوا تھا لیکن لائٹیں روشن نہیں تھیں۔ یوں تاریکی میں
تبسم کا ہیولہ سا نظر آ رہا تھا۔ عارف رضا نے بے چینی سے
پہلو بدلے۔
"کہو عارف! کیسے ہو؟" ملک ارشد نے بھاری آواز میں
اسے مخاطب کیا۔
"ٹھیک ہوں۔" پھیکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر تھی۔
"کافی عرصہ بعد تم سے ملاقات ہو رہی ہے۔"
"میں پہلے بھی آنا چاہتا تھا ـــــ لیکن ـــــ" وہ ذرا سا رکا۔
"مجھے بہت افسوس ہے۔"
"افسوس ـــــ" ملک ارشد نے سوالیہ انداز میں کہا پھر عارف رضا
کو دیکھا۔ جس کی نگاہیں تبسم کی پورٹریٹ پر گڑی ہوئی تھیں۔
"او ہاں ـــــ افسوس ....."
"جو کچھ ہوا بہت دردناک تھا۔" عارف رضا کی آواز
جذبات سے بھرپور تھی۔
"تم مجھ سے ملنا چاہ رہے تھے ـــــ؟" ملک ارشد نے
اس کی بات یکسر نظرانداز کر کے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔
"ہاں ـــــ" عارف رضا نے سنبھلتے ہوئے جواب دیا۔ "میں کئی
دنوں سے فون پر تم سے رابطہ کرنا چاہ رہا تھا ـــــ ملاقات
کا وقت لینے کے لئے ـــــ لیکن تم بہت مصروف رہے ہو
پچھلے دنوں۔"
"ہاں ـــــ مصروفیات کچھ بڑھتی ہی جا رہی ہیں ـــــ کس
سلسلے میں ملنا چاہ رہے تھے تم ـــــ معاہدے کی تجدید کے لئے؟"
وہ عارف کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا ہوا بولا۔
"ہاں۔" اس نے صاف گوئی سے اعتراف کیا۔ "تمہارا
اکاؤنٹ ایجنسی کے لئے بہت قیمتی ہے۔ وہاں یہ قیاس آرائی
ہے کہ اس بار تم معاہدے کی تجدید نہیں کرو گے ـــــ اور درپردہ
مجھے اس کا ذمہ دار ٹھہرایا جا رہا ہے۔" عارف رضا کی آنکھیں
جھک گئیں۔
ملک ارشد نے میز پر رکھے خوبصورت سے ڈبے میں سے
قیمتی ہوانا سگار نکالا اور اس کا سر توڑا ـــــ "ہوں ـــــ" وہ گمبھیر
آواز میں بولا۔

"اس کے علاوہ بھی ایک دیرینہ بھی جو میں تم سے ملنا چاہ رہا تھا۔ ایک خاتون تم سے ملنے کے لئے بہت لمبا سفر کر کے آئی ہیں ــــ اس کا کہنا ہے کہ وہ تبسم ــــ تبسم ملک سے بہت قریب رہی ہیں۔"

"پھر ؟"

"پھر یہ کہ اگر تم اس سے مل لو تو ــــ"

"عارف !" ملک ارشد کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں بہت مصروف آدمی ہوں۔ غیر ضروری ملاقاتوں کے لئے وقت نہیں نکال سکتا۔ رہ گئی معاہدہ کی بات تو ابھی تک میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ ویسے بھی اس کی معیاد میں ابھی ایک ماہ باقی ہے تمہیں اپنے فیصلے سے بہت جلد مطلع کر دوں گا۔"

"لیکن ہم ہر سال معاہدہ کی تجدید ایک ماہ قبل ہی کر لیتے ہیں"

"ضروری تو نہیں کہ ہر بار وہی کچھ ہو جو ہم پلان کریں۔" ملک ارشد کی آواز میں بڑی کاٹ تھی۔ عارف رضا پسینے میں نہا گیا۔

"تمہارے آنے کا بہت بہت شکریہ۔" ملک ارشد نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ اور ملاقات ختم ہونے کا اشارہ کر دیا۔ "تمہاری ہمدردی کا بھی شکریہ۔"

دونوں کی نظریں بیک وقت تبسم کی تصویر کی طرف اٹھیں۔ ملک ارشد کے ہونٹوں پر بہت گہری مسکراہٹ تھی ــــ

"خدا حافظ۔"

❋

اس ناکام ملاقات سے عارف رضا بہت ہی دل برداشتہ تھا۔ اسے اپنے کیریئر کے خاتمے کا یقین ہو گیا تھا۔ وہ آج دفتر بھی نہیں گیا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا یونہی اکیلا پڑا رہے۔ اچانک فون کی گھنٹی بجی ــــ شبنم تھی۔

"ملاقات ہوئی ملک سے ــــ کیسی رہی؟" وہ بڑے اشتیاق لہجے میں بولی۔

"بے کار، ہوپ لیس۔"

"اوہ ــــ" وہ مایوس سی ہو گئی۔ "میرے بارے میں بھی بات کی؟"

"ہاں ــــ وہ بالکل بھی انٹرسٹڈ نہیں ہے۔"

"سنو ــــ کیا کر رہے ہو؟ چلو تمہیں الوداعی لنچ کھلاؤں۔ اگلی فلائیٹ سے میں واپس جا رہی ہوں۔"

"اوہ، لو ــــ کیوں بھئی ــــ؟"

"کیا کروں گی یہاں رہ کر ــــ بولو، آ رہے ہو؟"

"ٹھیک ــــ کہاں؟"

فرانس کے انقلاب میں آئرلینڈ کے تین باشندے شاہ پسند ہونے کے جرم میں پکڑے گئے اور انہیں آرا مشین میں ڈال کر دو ٹکڑے کر دینے کی رونگٹے کھڑے کر دینے والی بھیانک سزا دی گئی۔

ایک آئرش کو آرا مشین میں ڈالا گیا۔ مشین نہیں چلی۔ آرا نہیں گھوما۔ آئرش کے دو ٹکڑے نہیں ہوئے اور فرانس کے مروجہ دستور کے مطابق آئرش کی سزا معاف کر دی گئی۔

پھر دوسرے آئرش کو آرا مشین میں ڈالا گیا مشین پھر نہیں چلی۔ آرا پھر نہیں گھوما۔ دوسرے آئرش کے بھی دو ٹکڑے نہیں ہوئے۔ اور دستور کے مطابق دوسرے آئرش کی سزا بھی معاف کر دی گئی۔

تیسرے آئرش کی باری آئی۔ اسے آرا مشین میں ڈالا گیا۔ ایک جلاد مشین چلانے بڑھا۔ اسی وقت تیسرا آئرش زور سے چلایا۔ "ایک منٹ ٹھہرو۔"

جلاد ٹھہر گیا اور تیسرے آئرش کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"میں سمجھ گیا ہوں کہ مشین کیوں نہیں چل رہی ہے۔" تیسرے آئرش نے جلاد کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "آرے میں ایک پتھر پھنس گیا ہے۔ اسے نکال دو، پھر دیکھو کس تیزی سے مشین چلتی ہے۔"

"ہولی ڈے ان آ جاؤ ــــ آدھے گھنٹے تک۔"

عارف رضا ٹھیک آدھے گھنٹے بعد ہوٹل پہنچ گیا ــــ شبنم ابھی نہیں پہنچی تھی۔ وہ لاؤنج میں ٹہلنے لگا۔ دس منٹ بعد شبنم صدر دروازے سے اندر داخل ہوئی۔ گلابی شلوار قمیض میں ملبوس اپنی عمر سے کہیں کم نظر آ رہی تھی۔ اف خدا ــــ یہ تبسم سے کتنی ملتی جلتی ہے؟ آج پہلی بار اس نے شبنم کو شلوار قمیض میں دیکھا تھا وہ ہمیشہ ساری ہی میں نظر آتی تھی۔ اس لباس میں اس کی تبسم سے مشابہت اور بھی بڑھ گئی تھی۔

"ہیلو!" وہ قریب آ کر مسکرائی۔ مسکرانے کا انداز بھی تبسم جیسا تھا۔ اسی لمحے ایک خیال بجلی کی سی تیزی سے اس کے دماغ میں کوندا۔ اس کی آنکھوں میں چمک سی اتر آئی۔ اس کے وجیہہ چہرے پر کئی دنوں سے جو تناؤ سا تھا۔ وہ چھٹنے لگا۔

"کیا بات ہے؟ میرا تو خیال تھا تم روتے بسورتے سے نظر آؤ

گے لیکن تم تو بڑے خوش شکل ہو۔"

"ہاں ۔۔۔ تمہیں دیکھ کر مجھے ہوش آگیا۔" وہ ہنسا۔

دونوں اندر آکر نسبتاً پرسکون جگہ پر بیٹھ گئے۔ عارف رضا نے ویٹر کو شاندار قسم کا آرڈر دیا۔ وہ آرڈر لے کر چلا گیا تو شبنم ناراضگی سے بولی۔

"میرا خیال تھا کہ میں نے تمہیں مدعو کیا ہے۔"

"کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"پڑتا ہے ۔۔۔ یہ الوداعی ملاقات ہے۔"

"نہیں۔" وہ دبی دبی مسکراہٹ لیے اسے دیکھتا رہا۔ شبنم کا چمپئی رنگ تپنے لگا۔

"کیا دیکھ رہے ہو اتنے غور سے؟"

"بہت اچھے ۔۔۔ بالکل پرفیکٹ ۔۔۔ بس ذرا بالوں کا رنگ بدلنا ہوگا ۔۔۔ میک اپ اور گہرا ۔۔۔ اداؤں میں ذرا سی بے باکی، انداز میں خود اعتمادی ۔۔۔"

"عارف!" شبنم بالوں کو ہاتھ سے پیچھے کرکے اکتائے ہوئے انداز میں بولی۔

"ابھی بتاتا ہوں ۔۔۔ ذرا سا صبر کرو ۔۔۔ فرسٹ کلاس آئیڈیا آیا ہے میرے ذہن میں ۔۔۔ سنو گی تو اچھل جاؤ گی۔"

وہ واقعی اس کا آئیڈیا سن کر اچھل گئی۔ خوشی سے نہیں حیرت سے۔

"کیا کہا ۔۔۔ تم ۔۔۔ نے ۔۔۔ کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"آرام سے، آرام سے۔" وہ مسکرایا۔ "تم ملک ارشد سے ملنا چاہتی ہو، ہے نا؟"

"ہاں، لیکن ......"

"اور وہ اس پر راضی نہیں۔" عارف نے شبنم کی بات کاٹی۔ "تم نے خود کتنی بار کوشش کی۔ کل میں نے اس سے بات کی۔ پتہ ہے اس نے کیا جواب دیا۔ بڑے غرور سے بولا۔ میرے پاس غیر ضروری ملاقاتوں کے لیے وقت نہیں ہے ۔۔۔ پولیس بھی اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہ کرسکی۔ بس اب ایک ہی طریقہ ہے۔"

"اور وہ یہ کہ میں تبسم بن جاؤں۔" وہ چڑ گئی۔

"ہاں ۔۔۔ بس ذرا سی محنت کرنی پڑے گی۔"

"اور ملک ارشد مجھے تبسم سمجھ کر مجھ سے ملنے لگے گا۔ عارف، عارف! یہ تمہیں کیا ہوگیا ہے؟"

"پوری بات تو سنو ۔۔۔ تم کسی ایسی جگہ اس سے ملو گی جہاں اور بہت سے لوگ ہوں گے۔ وہ تمہیں دیکھ کر خود تمہارے پاس آئے گا۔ اس کا مجھے یقین ہے ۔۔۔ پھر باقی کا کام تمہارا ہوگا۔"

"مگر وہ ......"

"اگر مگر مت کرو۔ تمہیں اپنے بالوں کا رنگ بدل کر انہیں دوسرے انداز میں سجانا ہوگا۔ باقی تو تم خود ہی اس سے اتنی ملتی جلتی ہو کہ پہلی بار تو میں خود چونک گیا تھا۔"

"اور یہ ملاقات ہوگی کہاں ۔۔۔" شبنم نے پہلی بار اس اسکیم میں دلچسپی لی۔

"مسٹر اینڈ مسز جوکھیو کے ہاں ۔۔۔ شہر کے مشہور لوگ ہیں بہت مہمان نواز اور سوشل لوگ ہیں۔ اگلے ہفتے ان کے ہاں پارٹی ہے۔ مجھے دعوت نامہ آیا ہے۔ ملک ارشد کے تو ان سے بہت ہی دوستانہ تعلقات ہیں۔ وہ وہاں ضرور ہوگا۔"

"اگر نہ ہوا۔"

"تو کسی اور پارٹی میں سہی ۔۔۔ شہر میں آئے دن اس قسم کے اجتماعات ہوتے رہتے ہیں۔ کہیں نہ کہیں تو وہ آئے گا۔"

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"ڈرو نہیں ۔۔۔ میں تمہارے ساتھ ہوں ۔۔۔ اور ہمیں یہ ثابت کرنا ہے کہ تبسم نے خودکشی نہیں کی ۔۔۔ بلکہ اسے قتل کیا گیا ہے۔"

"ملک ارشد نے آخر تبسم کو کیوں قتل کیا ہوگا؟" وہ کھوئی کھوئی سی بولی۔

"وہ بہت حاسد آدمی ہے اس نے تبسم کو طلاق دینے کے بجائے اسے ختم ہی کردیا۔"

"کیا وہ تم سے حسد کرتا تھا؟" شبنم نے تیکھا سا سوال کیا۔

"وہ ہر اس شخص سے جلتا تھا جو اس کی بیوی کے قریب سے بھی گزر جاتا تھا۔"

کھانا آگیا اور دونوں کی توجہ کھانے پر مبذول ہوگئی۔

"پتہ ہے۔ ملک نے اپنے گھر میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔" وہ کھانا کھاتے کھاتے بولا۔

"کیا تبدیلی کرنی چاہیئے تھی اسے؟"

"میرا مطلب ہے کہ تبسم کی زندگی میں جو چیز جس جگہ تھی جس انداز سے تھی۔ اب بھی بالکل وہیں اور ویسی ہی ہے۔"

"اسے بیوی سے بہت محبت ہوگی نا۔"

"ہاں ۔۔۔ یا شاید نفرت۔"

"نفرت ۔۔۔؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"دیکھو نا۔ اس نے ذرا سی بھی تبدیلی نہیں کی۔ ساری سجاوٹ اسی طرح ہے۔ تبسم کی آرام کرسی جس پر بیٹھ کر وہ جھولتی رہتی تھی۔ اس کا پسندیدہ کرسٹل کا گلدان جس میں وہ ہمیشہ گلاب

کے پھول سجاتی تھی ـــــ اور سب سے بڑھ کر تبسّم کی پورٹریٹ سب کچھ ویسا ہی ہے۔ محبت کرنے والا شوہر نوران یا دوں سے پاگل ہو جائے ـــــ لیکن وہ خوش ہوتا ہے، یہ محسوس کر کے کہ ہر چیز اسی طرح ہے ـــــ بس وہ نہیں ہے۔ یعنی اس کے جانے سے کوئی فرق نہیں پڑا۔"

"اوہ ـــ" شبنم کانپ اٹھی۔ اس کے خیال میں نفرت کا یہ روپ بہت انوکھا تھا۔ کھانا ختم ہوا۔ عارف رضا کے بل ادا کرنے پر شبنم نے احتجاج کیا۔

"پھر کبھی سہی۔ اب تو یہ سلسلہ چلتا ہی رہے گا۔ ہم ملتے رہیں گے۔" وہ اسے ہوسٹل تک چھوڑنے گیا۔

"کل ہم بیوٹی پارلر چلیں گے۔ تمہارے کالے بالوں کو شرابی رنگ دینے کے لئے۔"

وہ گاڑی سے اترنے لگی "کل کتنے بجے؟"

"میں دو بجے تمہیں لینے آ جاؤں گا۔" پھر بالکل اچانک ہی وہ بولا "اور جب یہ سارا چکر ختم ہو جائے گا۔ تو ـــ تو ـــ" پھر وہ کہتے کہتے رُک گیا۔

"خدا حافظ ـــ" شبنم کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا وہ عارف رضا کی ادھوری بات سے بہت کچھ سمجھ گئی تھی۔

❂

شبنم نے آنکھیں پھاڑ کر اپنے اس نئے روپ کو دیکھا۔ سیاہ چوڑی دار پاجامہ، سیاہ جالی کی قمیض ـــ بالوں کا نیا انداز ـــ شوخ میک اپ ـــ وہ بڑے سے آئینے کے سامنے کھڑی مسلسل اپنے عکس کو گھور رہی تھی۔ "تبسّم" وہ زیرِ لب بولی۔ وہ اور بھی حسین نظر آ رہی تھی۔ تبسّم کا رُوپ دھار لینے سے وہ خود اعتمادی بھی اس میں آ گئی تھی جو تبسّم کا خاصا تھی۔ خود عارف بھی اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

"اگر اجازت دو تو ایک لمبی سی سیٹی بجا کر تمہاری تعریف کروں؟"

"اس کی ضرورت نہیں۔" وہ ہنسی "یوں بھی سیٹیاں بجانا شریف مردوں کا کام نہیں ـــ ویسے کیسی لگ رہی ہوں؟"

"بہت اچھی ـــ بہت ہی اچھی۔"

"میں تو خود کو بالکل فراڈ لگ رہی ہوں۔"

"اتنا مت سوچو ـــ تم کسی فرشتہ کی طرح معصوم نظر آ رہی ہو۔"

"فرشتے کی طرح؟ یا تبسّم کی طرح؟"

عارف رضا نے اس کا سوال نظر انداز کر دیا۔

وہ دونوں جب پارٹی میں پہنچے تو بہت کم مہمان تھے۔

اور ایک شوہر ایسا بھی تھا، جس نے گراں قدر معاوضے پر ایک مشہور و معروف سرجن کی خدمات حاصل کی تھیں تاکہ وہ بیوی کے منہ سے لگے ہوئے فون کو علیحدہ کر سکے۔

عارف رضا نے اس کا تعارف کروایا "یہ شبنم ہیں ـــ ہمارے ملک میں مہمان ہیں ـــ ان کا خیال رکھنا۔"

"تم کہاں جا رہے ہو ـــ؟" کسی نے پوچھا۔

"مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے ـــ تھوڑی دیر تک آ جاؤں گا۔" اس نے بات بنائی۔ اس کا واپس آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

مسز جوکھیو نے شبنم کو بڑے غور سے دیکھا "لگتا ہے تم سے پہلے بھی ملاقات ہو چکی ہے۔"

"نہیں ـــ" وہ زبردستی مسکرائی "میں پہلی بار کراچی آئی ہوں۔"

"اچھا ـــ لیکن ـــ" وہ کچھ الجھ سی گئی۔ پھر دوسرے مہمانوں سے اس کا تعارف کروانے لگی۔

شبنم کا دم گھٹنے سا لگا تھا۔ رفتہ رفتہ مہمانوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ اتنے بہت سارے لوگوں میں وہ تنہا تھی، اجنبی تھی۔ رات جوں جوں ڈھل رہی تھی، پارٹی نکھر رہی تھی۔ شبنم بڑے سے ہال کے ایک کونے میں کھڑی سوچ رہی تھی کہ اس نے یہاں آ کر بڑی غلطی کی ہے۔ یہ سب تماشا ہے۔ مجھے زیب نہیں دیتا ـــ سراسر بناوٹ ہے ـــ مجھے واپس چلے جانا چاہئے۔ اس جگہ سے، اس شہر سے ـــ اس ملک سے۔

"ہیلو" ایک آواز نے اسے بُری طرح چونکا دیا۔ اُفوہ! پھر کوئی آ گیا ڈانس کے لئے کہنے۔ وہ بار بار معذرت کر کے تنگ آ چکی تھی۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ سیاہ ڈنر سوٹ میں ملبوس ایک دراز قد شخص اس کے بالکل قریب کھڑا تھا۔

"آپ یہاں ہوتے ہوئے بھی یہاں نہیں تھیں۔" اس کی آواز بہت بھاری تھی۔

"جی ہاں ـــ میں اس قسم کے اجتماعات کی عادی نہیں ہوں۔"

"آہستہ آہستہ ہو جائیں گی۔" اور اس کے ساتھ ہی شبنم پر یہ خوشگوار انکشاف ہوا کہ وہ ملک ارشد سے مخاطب ہے۔ اس

کا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ شخص ملک ارشد کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

"میں کبھی بھی اس ماحول کی عادی نہیں ہو سکتی۔ یہ میری فطرت کے خلاف ہے۔ مجھے اتنا شور اور ہنگامہ پسند نہیں ہے۔"

"پھر تو آپ بھی میری طرح ہیں۔ مجھے بھی یہ سب بہت مصنوعی اور بڑا بے معنی لگتا ہے۔"

شبنم نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ اس کا لباس بہت قیمتی اور شکن سے پاک تھا۔ اس کی انگوٹھی۔ اور رسٹ واچ میں لگے ہیرے ہاتھ کی جنبش سے چمک چمک جاتے۔ سلیقے سے بنے بالوں میں سفیدی کی جھلک زیادہ تھی۔ چمکدار سیاہ جوتے یک اس کی امارت کی گواہی دے رہے تھے۔ اسکے ہاتھ بھاری، انگلیاں مضبوط اور ناخن صفائی سے ترشے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے شبنم جس بیزاری اور کوفت میں مبتلا تھی۔ وہ اب غائب ہو چکی تھی۔

جس ملک ارشد سے وہ ہزار جتن کرنے کے باوجود فون تک پر بات نہ کر سکی۔ وہ آج خود چل کر اس کے پاس آیا تھا۔ اسے ہنسی آ گئی۔

"پتہ ہے یہ ہنسی میں پہلے بھی کئی بار سن چکا ہوں — دیکھ چکا ہوں —" اس کی آواز میں حیرت تھی۔

"کیا مطلب؟" شبنم کی خود اعتمادی بڑھ رہی تھی۔

"یہ مسکراہٹ — یہ بال پیچھے جھٹکنے کا عمل — یہ بات کرنے میں ہاتھ ہلانے کا انداز، سب میرے دیکھے بھالے ہیں — ویسے کیا آپ پارٹی سے لطف اندوز ہو رہی ہیں؟"

"بالکل نہیں۔"

"چلیئے، پھر باہر لان میں بیٹھتے ہیں۔"

لان میں خنکی تھی — تازہ ہوا تھی — چاندنی تھی — رات کی رانی کی مہک تھی — وہ ایک بنچ پر آ کر بیٹھ گئے۔ آس پاس چند اور بھی جوڑے تھے۔ لیکن وہ سب اپنے آپ میں ہی مگن تھے۔

"ہم ابھی تک ایک دوسرے سے متعارف بھی نہیں ہوئے۔"

"ہاں واقعی۔"

"چلیئے پہل میں کرتا ہوں — میرا نام ملک ارشد ہے۔"

"اور میں ....." وہ مسکرائی۔ "شبنم گل ہوں۔" پھر اس نے ٹٹولنے والی نظروں سے ملک ارشد کے چہرے کا جائزہ لیا اور یہ اندازہ لگانے میں اسے دیر نہ لگی کہ یہ نام اس کے لئے قطعی نیا ہے۔

"اندر ہال میں جب میں نے یہ کہا تھا کہ آپ کا چہرہ میرے لئے اجنبی نہیں ہے تو میں نے صرف آپ کا تعارف حاصل کرنے کے لئے ڈائیلاگ نہیں بولا تھا۔"

"مجھے یقین ہے۔" وہ پوری سچائی سے بولی۔

وہ چند لمحے اسے گہری گہری نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

"بخدا آپ میرے لئے اجنبی نہیں ہیں ..... یہ دیکھیں۔"

اس نے جیب میں سے اپنا پرس نکالا۔ اندرونی خانے سے ایک تصویر نکال کر شبنم کی جانب بڑھائی۔ شبنم نے بغیر دیکھے ہی جان لیا کہ یہ تبسم کی تصویر ہو گی۔ اس نے لاپرواہی سے تصویر پکڑ لی۔ تبسم کا شعلہ افشاں چہرہ اس کے سامنے تھا۔ "زیادہ تو نہیں لیکن شاید تھوڑی بہت مشابہت ہے۔"

"بہت زیادہ ہے — شکل و صورت — قد و قامت.... تبسم بالکل آپ جیسی ہی تھی۔"

"تھی —؟"

"ہاں — وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔" شبنم کو وہم سا ہوا کہ ملک ارشد کے لہجے میں اطمینان جھلک رہا تھا۔

"مجھے افسوس ہے —" اس کا جی چاہا وہ اسے بتا دے کہ وہ کون ہے — لیکن نہیں — ابھی نہیں — ابھی تو اس سے بہت کچھ اگلوانا ہے — پھر کبھی — بہت جلد۔

"اچھا چھوڑیں اس بات کو — آیئے آپ کے بارے میں گفتگو کریں۔"

"میرے بارے میں؟"

شبنم کا دل یکبارگی کانپ اٹھا۔ "کیا جانتے ہیں؟"

"آپ شادی شدہ نہیں ہیں — کیونکہ آپ کی انگلیوں میں کوئی رنگ نہیں ہے — اور یہ کہ آپ یہاں کی رہنے والی نہیں، آپ کا لہجہ بتا رہا ہے۔ آپ کسی ایسی جگہ کام کرتی ہیں جہاں لباس اور خوبصورت میک اپ بہت اہم ہے۔ شاید ماڈلنگ سے آپ کا تعلق ہے — یا پھر کسی فضائی کمپنی سے.... اور یہ کہ آپ کا کسی کے ساتھ جذباتی تعلق بھی نہیں۔ ورنہ آپ یہاں نہ ہوتیں — اور یہ کہ آپ اکیلی رہتی ہیں — شخصیت میں یہ خود اعتمادی اکیلے رہنے سے ہی آتی ہے — مجھے ٹوک دیں اگر میں کوئی بات غلط کہوں تو —"

"نہیں —" وہ بے ساختہ ہنس دی۔ "بہت اچھے۔ آپ کے اندازے بہت صحیح ہیں۔ اب کچھ اپنے بارے میں بھی بتایئے۔"

"اپنے بارے میں —" وہ اداسی سے بولا۔ "جی چاہتا ہے ایک کتاب لکھوں اپنی زندگی کے بارے میں۔"

"جی تو میرا بھی چاہتا ہے — لیکن حوصلہ نہیں پڑتا۔"

"حوصلہ ہارنا نہیں چاہیئے شبنم!"

"ارے! ہم لوگ تو بہت سنجیدہ ہو گئے۔" وہ پھر ہنسی۔

"آپ کا سراپا ہی نہیں، انداز بھی بالکل تبسم کے سے ہیں۔"

"تبسم؟" وہ دھیرے سے بولی۔

"ہاں.... میری بیوی ___ ابھی جس کی تصویر دکھائی تھی میں نے آپ کو۔" وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ شبنم بھی چپ سی ہو گئی۔ کافی دیر تک دونوں خاموش اپنی اپنی جگہ سوچتے رہے۔ شاید تبسم کے بارے میں۔ شبنم کو ترس سا آنے لگا.... اپنے پر بھی اور سامنے بیٹھے اس شخص پر بھی۔

"اس نے اپنی ایک قدِ آدم پورٹریٹ بنوائی تھی ___ ابھی تک میرے اسٹڈی روم میں لگی ہوئی ہے۔ وہ بلامبالغہ آپ کی پورٹریٹ بھی سمجھی جا سکتی ہے ___ آپ دیکھیں گی اسے؟"

"ہاں!" وہ کھوئی کھوئی سی بولی۔ "ہاں شاید کسی روز۔"

"کس روز؟" وہ بے چینی سے بولا۔ "بہت جلد ___ ہے نا؟"

"پتہ نہیں ___ میں یہاں مہمان ہوں ___ جلد ہی واپس چلی جاؤں گی ___" شبنم کی اداسی گہری ہو گئی۔

"نہیں نہیں ___ ابھی نہیں جانا ___ اتنی جلدی نہیں ___ ابھی تو ہم ملے ہیں ___ مجھ سے دور نہ بھاگنا۔" وہ بے حد جذباتی ہو رہا تھا۔

"لیکن" وہ پریشان سی ہو گئی۔ "دیکھیں نا ___ ہم تو ایک دوسرے کے لئے بالکل اجنبی ہیں۔"

"نہیں ___ ہم اجنبی نہیں ___ ہمارے درمیان کوئی ایسا تعلق ضرور ہے جو ایک دم سے ہمیں قریب لے آیا ہے ___ یہ بات آپ بھی جانتی ہیں ___ ہے نا؟"

شبنم بھی یہ بات جانتی تھی کہ ایک ایسا تعلق ہے، جو انہیں قریب لے آیا ہے ___ تبسم ___

ملک ارشد بے قراری سے سنگِ مرمر کی بنی ہوئی ان سیڑھیوں کو طے کر رہا تھا جو اس کے گھر کی دوسری منزل کو جاتی ہیں۔ سیڑھیاں دائیں ہاتھ کو مڑ کر ختم ہو گئیں آگے وسیع کاریڈور تھا۔ اس میں بائیں ہاتھ پر بیڈ رومز کا ایک سلسلہ سا تھا۔ چوتھے دروازے پر ٹھہر کر اس نے کچھ سوچا پھر دروازے پر لگی ناب کو گھما کر اندر داخل ہو گیا ___ یہ تبسم کی خوابگاہ تھی۔ اس کمرے سے اس کی بہت سی یادیں وابستہ تھیں جو زیادہ تر تلخ تھیں ___ اذیت ناک تھیں۔

کمرے میں ابھی تک تبسم کی مخصوص مہک باقی تھی۔ کمرہ بیش قیمت فرنیچر اور نایاب قسم کے قالین سے آراستہ تھا۔ ہر چیز سنہری تھی۔ قالین ___ پردے ___ کرسی کا کشن ___ ڈبل بیڈ ___ بیڈ کے اطراف لگی کنوپی ___ ہر چیز جیسے چمکتی دمکتی، سونے کی بنی ہوئی تھی۔

ملک ارشد خواب کے سے عالم میں کچھ دیر کھڑا رہا۔ اس کمرے میں آ کر اس کی ہمیشہ یہی کیفیت ہو جاتی تھی۔ اس نے اس کمرے کی ہر چیز اسی عالم میں رہنے دی تھی۔ حد یہ کہ بستر کی چادر بھی..... اور اس پر تبسم کے جسم سے بنی ہوئی شکنیں بھی ویسے ہی موجود تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ابھی ابھی کوئی اس پر سے سو کر اٹھا ہے۔ سامنے دریچہ تھا اور دریچے کے پاس نازک سی رائٹنگ ٹیبل تھی جس پر نفیس اور قیمتی قلمدان تھا۔ تبسم کا مخصوص ذاتی رائٹنگ پیڈ تھا اور ایک چرمی جلد کی سیاہ ڈائری تھی جس میں وہ اپنے ضروری اپائنٹمنٹ درج کیا کرتی تھی۔ ملک ارشد نے اس کا وہ صفحہ کھولا، جس میں آخری بار تبسم نے کچھ لکھا تھا۔ وہ پہلے بھی اسے پڑھ چکا تھا۔ لیکن آج وہ اسے نئے زاویئے سے پڑھ رہا تھا۔ "۱۸ جولائی ___ ش، گ۔"

اس کے ذہن میں چھناکا سا ہوا۔ یہ مختصر سا جملہ، جو اسے پہلے بے معنی اور بے ضرر سا نظر آرہا تھا۔ اب نئے معنوں کے ساتھ اس کے سامنے تھا۔ ش گ — یعنی شبنم گل — اس کی نگاہیں صفحہ پہ جمی رہیں — یہاں تک کہ سیاہ سطر سفید کاغذ کے پس منظر میں دھند کی مانند دکھائی دینے لگی — شبنم گل — تبسم گل — ویسا ہی چہرہ — ویسی ہی آواز — وہی انداز — وہی چال ڈھال وہ کون ہے —؟ کون ہے ؟؟؟ اس کی کنپٹیوں میں ٹیس سی اٹھی۔ اس نے خود کو سنبھالا اور فون اٹھا کر ایک نمبر ڈائل کرنے لگا۔ فون پر مختصر سی گفتگو کے بعد ملک ارشد کی پریشانیوں میں مزید اضافہ ہوتا گیا — اس نے ڈیفنس تھانے کے ایس ایچ او سے بات کی تھی۔ جس کے نتیجے میں اسے پتہ چلا کہ تبسم کی پُراسرار موت کا کیس دوبارہ کھول دیا گیا ہے — اور اب اس کی تحقیقات سی آئی اے کا انسپکٹر جہاں زیب کر رہا ہے۔

ہوا کی رفتار سے گاڑی دوڑاتا ہوا وہ انسپکٹر جہاں زیب کے دفتر پہنچا۔ انسپکٹر جہاں زیب حال ہی میں تبدیل ہو کر کراچی آیا تھا۔ موٹا سا، گورا، چٹا پٹھان، کسی طور بھی خفیہ پولیس کا آدمی نظر نہیں آتا تھا۔ وہ تو مزاحیہ فلموں کا کوئی کردار لگتا تھا۔ اس کے چہرے پر بلا کی معصومیت اور آواز میں حد درجہ نرمی تھی لیکن وہ اپنے کام میں کتنا ہوشیار تھا، یہ کم ہی لوگ جانتے تھے — ملک ارشد نے اپنا تعارف کرایا۔ جس کے جواب میں انسپکٹر جہاں زیب نے نہایت سادگی سے پوچھا۔ "میں کیا کر سکتا ہوں آپ کے لئے ؟"

"میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ میری بیوی کی موت کے سلسلے میں اب جو تازہ تحقیقات کی گئی ہیں، کیا ان کے نتیجے میں اس کے کسی رشتہ دار کا بھی سراغ ملا ہے ....؟"

انسپکٹر جہاں زیب نے سر سے پیروں تک ملک ارشد کو دیکھا "یہ بات تو آپ بہتر جانتے ہوں گے ملک صاحب !"

"نہیں — وہ اپنے رشتہ داروں کے بارے میں بات کرنا پسند نہیں کرتی تھی۔ نہ ہی میں نے کبھی یہ کرید نے کی کوشش کی تھی۔"

"اچھا ! تو پھر سنیئے !" انسپکٹر نے بڑبڑا کر کہنا شروع کیا۔ "حال ہی میں ہمیں یہ معلوم ہوا ہے کہ آپ کی مسز کی ایک بہن زندہ ہے — اور بنگلہ دیش کی شہری ہے۔"

ملک ارشد کے چہرے پر ایک رنگ آیا اور ایک گیا۔

"شبنم گل !" اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔ انسپکٹر کے چہرے پر معصوم سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"تو آپ کی ملاقات ہو گئی بالآخر ان سے ؟"

"دوسروں کے ذاتی معاملات میں غیر ضروری دخل انداز کرنے والوں کے خلاف اس ملک میں کوئی قانون نہیں ہے کیا ؟" اس کے لہجے میں کرختگی تھی۔

"وہ حقیقت جاننا چاہتی ہے ملک صاحب — اپنی بہن کی موت کے بارے میں — اور اسے اس بات کا پورا حق حاصل ہے۔"

"لیکن اس نے مجھے نہیں بتایا کہ وہ تبسم کی بہن ہے۔"

"غالباً اس نے مناسب نہیں سمجھا ہو گا۔"

"یہ کیس تو بند ہو چکا تھا — خودکشی ثابت ہو گئی تھی۔ پھر.... پھر....؟"

"کیس بند نہیں ہوا تھا — بند کروا دیا گیا تھا۔" وہ بہت مطمئن لہجے میں بولا۔ "بہرحال آپ کی اطلاع کے لئے اب نئے سرے سے اس کی تحقیقات ہوں گی۔"

"کس کی ہدایت پر ؟"

"شبنم گل کی خواہش پر — انہیں شک ہے کہ اس کی بہن کو قتل کیا گیا ہے۔"

ملک ارشد سر سے پیر تک ٹھنڈے پسینے میں نہا گیا — انسپکٹر جہاں زیب کی چھوٹی چھوٹی چمک دار آنکھیں بغور اس کا جائزہ لے رہی تھیں — "یہ شخص کچھ چھپا رہا ہے۔" اس نے سوچا۔

"اس لڑکی کی یہاں موجودگی سے اور کون کون شخص واقف ہے ؟"

"عارف رضا۔ وہی اس کی سرپرستی کر رہا ہے۔ ورنہ وہ یہاں بالکل اجنبی ہے۔"

ملک ارشد کے اندیشے سچ ثابت ہوئے۔ عارف رضا۔ اس نے زیرِ لب یہ نام دہرایا۔ اچھا تو وہ یہی خاتون تھی جس کی وہ سفارش کر رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اسے مل لوں۔ خودکشی والی بات پر اسے بھی اعتبار نہیں آیا ہو گا۔ وہ شبنم کے ذریعے مجھے آزمانا چاہتا ہے — حقیقت جاننا چاہتا ہے۔ مجھے بلیک میل کرنا چاہتا ہے .... اس اکاؤنٹ کی خاطر۔

ملک ارشد انسپکٹر جہاں زیب سے رخصت ہوا۔ اب ایک طریقہ ہے، عارف رضا کو خاموش کرنے کا.... باز رکھنے کا۔ معاہدے کی تجدید — پیسے میں واقعی بڑی طاقت ہے۔

ملک ارشد سے ملاقات کے تیسرے دن شبنم کو ہوسٹل میں ملک ارشد کا فون موصول ہوا۔ شہر کے مشہور ہوٹل میں ملک کے مشہور ترین اور بہترین گلوکاروں کا کنسرٹ تھا۔ وہ شبنم کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ شبنم خوشی سے رضامند ہو گئی۔ "آج رات

نو بجے ــــ تیار رہنا۔"

رات کے ٹھیک نو بجے ہوسٹل کی عمارت کے باہر ملک ارشد کی سیاہ مرسڈیز کا ہارن بجا۔ شبنم آج بھی بہت اہتمام سے تیار ہوئی تھی کھلتے ہوئے زرد رنگ کی ساڑی پر بالوں کا جوڑا بنا تھا۔ ملک ارشد اپنی ایئر کنڈیشنڈ گاڑی میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ آج بھی بہترین سوٹ میں تھا۔ شبنم اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اس کے برابر آ بیٹھی ــــ گاڑی میں بھینی بھینی سی خوشبو تھی۔ شبنم نے مسکرا کر ملک ارشد کی جانب دیکھا ــــ وہ سنجیدگی سے گاڑی چلانے میں مصروف تھا۔ پہلی بار جب اس نے ملک ارشد کو دیکھا تھا تو اس کا اندازہ تھا یہ کم از کم پچاس سال کا ہے۔ لیکن آج اس نے سوچا کہ وہ پہلا اندازہ غلط تھا ــــ ملک ارشد پینتالیس سے زیادہ کا ہرگز نہ تھا۔ اس کی کنپٹیوں پر سفید بالوں کی بہتات تھی جو اس کی وجاہت میں اضافہ کر رہے تھے۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے سے تھے۔ جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ یا تو وہ بہت نیند لیتا ہے یا پھر بہت زیادہ سوچتا ہے۔

پروگرام بہت دلچسپ تھا۔ شبنم پوری طرح اس سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ کبھی کبھی پاس بیٹھے ملک ارشد پر بھی نگاہ ڈال لیتی۔ عجیب بات تھی کہ یہ شخص جو اس کے خیال کے مطابق اس کی بہن کا قاتل تھا یا کسی نہ کسی طور اس کی موت کا ذمہ دار تھا۔ اسے قابلِ نفرت نہیں لگتا تھا۔ جانے اس شخص کے کردار کا وہ کونسا پہلو ہے جو چھپا ہوا ہے۔ جو قابلِ نفرت ہے۔ تبسم نے یونہی تو اس سے علیحدگی کا فیصلہ نہیں کیا ہو گا ــــ یقیناً کوئی بات ایسی ہے ضرور ــــ

ملک ارشد پورے وقت خاموش بیٹھا رہا۔ بظاہر وہ پروگرام میں محو تھا لیکن حقیقت میں اس کے دماغ میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی وہ پاس بیٹھی اس عورت کے متعلق سوچ رہا تھا جو اس کی بیوی کی ہمشکل تھی۔ اس کی بہن تھی ــــ اور اسے بے وقوف بنا رہی تھی۔

پروگرام ابھی اختتام پر بھی نہیں پہنچا تھا کہ ملک ارشد نے اس کے کان میں سرگوشی کی "میں بور ہو رہا ہوں ــــ آؤ واپس چلیں ــــ" اور وہ ایک دم ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ شبنم کو حیرت کے ساتھ ساتھ دُکھ بھی ہوا۔ اس نے رسماً یہ بھی نہ پوچھا کہ کیا وہ مزید ٹھہرنا چاہ رہی ہے ــــ وہ لوگ گاڑی میں آ بیٹھے۔ ملک ارشد خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔ شبنم کو اس کی خاموشی اب کھلنے لگی تھی۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ شبنم کا خیال یہ تھا کہ اب وہ لوگ کسی ہوٹل میں رات کا کھانا کھائیں گے اور ڈھیر ساری باتیں کریں گے۔ تب شاید وہ موقع محل دیکھ کر اسے اپنے بارے میں بتائے۔

گاڑی انجانے راستوں سے گزرنے لگی۔ یوں تو پورا شہر ہی تبسم کے لیے اجنبی تھا لیکن یہ راستے تو بالکل ہی نئے اور سنسان تھے۔ یہ کسی ہوٹل کو جانے والی راہ ہرگز نہیں ہو سکتی تھی اسے تشویش ہونے لگی ــــ اور اس کا خیال درست ثابت ہوا۔ ایک بڑے سے محل نما بنگلے کے گیٹ پر ملک ارشد نے گاڑی روک دی۔

"یہ میرا گھر ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔ شبنم سر سے پیر تک برف ہو گئی۔ خدایا ــــ یہ مجھے یہاں کیوں لایا ہے ــــ اس نے گھبرا کر پہلو بدلا۔ ملک ارشد ہارن بجا کر چوکیدار کو بلا رہا تھا۔

"میں تھک گیا ہوں ــــ آرام کرنا چاہ رہا ہوں ــــ آپ کو ڈرائیور گھر چھوڑ آئے گا۔" چوکیدار گیٹ کھولنے لگا تو ملک نے اسے منع کر دیا۔

"سینے دد خان ــــ ڈرائیور کو بلاؤ ــــ میڈم کو گھر چھوڑ آئے۔" پھر شبنم سے مخاطب ہو کر بولا۔ "آپ پیچھے بیٹھ جائیے۔" وہ گاڑی سے اتر گیا۔ شبنم کو محسوس ہوا، گویا ملک ارشد نے بھری محفل میں اسے طمانچہ دے مارا ہو۔ وہ اتر کر پچھلی نشست پر بیٹھ گئی۔ "خدا حافظ ــــ" ملک ارشد نے اس کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

"خدا حافظ۔" اس نے بمشکل اپنے آنسو پیئے ــــ اتنی شدید بے عزتی کا خیال اسے دیوانہ کیئے دے رہا تھا۔

اگلے روز چھٹی کا دن تھا۔ وہ دیر تک پڑی سوتی رہی۔ گیارہ بجے عارف کا فون آیا۔ "ارے بھئی! کہاں ہو تم؟"

"یہیں ہوں ــــ لیکن سخت بیزار ہو گئی ہوں۔"

"ملاقات ہوئی ملک سے؟"

"ہاں ــــ ہوئی۔"

"کیسا رہا؟"

"پہلی ملاقات جتنی کامیاب تھی۔ یہ دوسری اتنی ہی ناکام رہی۔" وہ بہت غصے میں تھی۔

"چ چ ــــ اچھا چلو تمہیں کہیں گھما لائیں۔"

"نہیں میرا موڈ نہیں ہے۔"

"صندمت کرو ــــ چلو سمندر پہ چلتے ہیں ــــ لنچ پیک کروا لیں گے ــــ وہیں کھائیں گے تم ایک گھنٹے تک تیار رہنا۔" شبنم کا جواب سنے بغیر اس نے فون رکھ دیا۔

⭘

ہاکس بے کے ساحل پر ایک ہٹ کے سامنے وہ دونوں بیٹھے تھے۔ شبنم سوچوں میں گم ساحل سے ٹکراتی لہروں کو دیکھ

رہی تھی۔

"اچھا — تو یہ دوسری ملاقات فلاپ ہوگئی؟"

"فلاپ —" وہ تیوری چڑھا کر بولی "سخت توہین آمیز۔" اس نے ساری تفصیل اسے بتائی۔

"عجیب آدمی ہے —" عارف رضا بڑبڑایا۔

"بہت عجیب ہے — بہت پُراسرار — اس کی شخصیت کا یہی اسرار تبسم کو پسند آیا ہوگا۔ وہ خود بھی کچھ اسی قسم کی تھی اس کے متعلق کوئی بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی تھی اور ملک ارشد بھی ایسا ہی ہے — ہر گھڑی لوگوں کو سرپرائز دیتا ہے۔"

"لگتا ہے تم خاصی متاثر ہوگئی ہو۔ اس سے؟" عارف رضا کا لہجہ شاکی تھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"یعنی جس انداز سے تم اس کی تعریفیں کر رہی ہو، اس سے تو یہی لگتا ہے۔"

"یہ تعریف ہے؟"

"اور کیا بُرائی ہے؟"

"میں صرف اپنے تاثرات بیان کر رہی ہوں۔"

"اچھا — چلو ہٹاؤ اس موضوع کو — یہ بتاؤ تمہارا اپنے بارے میں کیا ارادہ ہے؟"

"بس واپسی کی تیاری۔"

"ارے — ابھی سے — ابھی تو تبسم کا معمہ حل نہیں ہوا۔"

"میری چھٹیاں ختم ہونے والی ہیں۔"

"ابھی تو کافی باقی ہیں — اور پھر کیا مشکل ہے — بڑھوا لینا۔"

"مشکل ہے نا۔ اتنی آسانی سے چھٹی نہیں بڑھ جاتی۔"

"استعفیٰ دے دو۔"

"جی ہاں — اور... بھوکی مرجاؤں۔"

"یہاں کوئی جوب کرلو۔"

"میں پاکستانی نہیں ہوں — غیر ملکیوں کو جوب یا آسانی نہیں ملتے۔"

"تو بن جاؤ پاکستانی۔"

"کس طرح؟"

"سب سے آسان اور خوبصورت طریقہ تو یہ ہے کہ تم کسی اچھے سے پاکستانی سے شادی کرلو۔" عارف رضا کی خوبصورت اور پُرکشش آنکھوں میں شوخی تھی۔

شبنم ہنس دی "اس کے علاوہ کوئی ترکیب بتاؤ۔"

"کیوں — اس ترکیب میں کیا خرابی ہے؟"

"خرابی کوئی نہیں ہے — لیکن فی الفور ایک اچھا سا آدمی کہاں سے دستیاب ہوگا؟"

"کہیں آس پاس نظریں دوڑاؤ — مل ہی جائے گا۔ اور بعض دفعہ تو یہ ہوتا ہے کہ سامنے پڑی چیز نظر نہیں آتی۔" وہ شرارت سے بولا۔ شبنم ہنستی رہی۔

گئی رات کی تلخی عارف رضا کی شگفتہ باتوں میں دھل سی گئی۔ پھر انہوں نے کھانا کھایا۔ کچھ دیر ساحل پر ٹہلتے رہے — عارف رضا سوئمنگ کرنے لگا۔ شبنم ریت پر بیٹھی بہت سی باتیں سوچتی رہی — واپسی سورج ڈھلنے سے پہلے ہی ہوگئی۔ راستے میں اچانک عارف رضا نے نعرہ لگایا۔

"اوہ خدا — میں بھی کتنا احمق ہوں۔"

"وہ تو ہو — لیکن بات کیا ہے؟" شبنم نے چوٹ کی۔

"ایک شربت کا نیا ایڈ بنانا ہیں — کلائینٹ بالکل نئی لڑکی چاہتا ہے۔ اتنی بہت سی لڑکیوں کے ٹیسٹ لے چکا ہوں۔ کوئی بھی نہیں جچی — اب اچانک تمہارا خیال آیا — لو دیکھو — اب تک میں خواہ مخواہ ہی جھک مارتا رہا۔"

"میں... یعنی... میں ماڈلنگ...؟"

"ہاں — تم — ماڈلنگ..."

"نہیں — نہیں۔"

"دیکھو شبنم! تم پردیس میں ہو — اور غیر معینہ مدت تک تمہارا یہاں قیام رہے گا۔ پیسوں کی ضرورت تمہیں آج نہیں تو کل ضرور پڑے گی۔ پھر تم کیوں نہ ماڈلنگ شروع کردو — مسز واحدی اس کی انچارج ہیں — میں تمہیں ان سے ملوا دوں گا۔"

شبنم نے کچھ دیر سوچا۔ ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے یہ۔ جمع پونجی جو وہ ساتھ لائی تھی۔ واقعی جواب دیتی نظر آ رہی تھی۔ پتہ نہیں یہاں کب تک ٹھہرنا ہوگا — اس نے حامی بھرلی۔
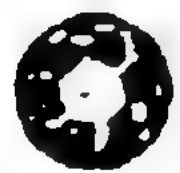
اگلی صبح وہ عارف رضا کے ساتھ ہی "رینبو ایجنسی" کے آفس چلی آئی۔ عارف رضا اپنے کمرے میں جانے کے بجائے اسے سیدھا مسز واحدی کے پاس لے گیا۔

"دیکھیے، آپ کے لئے سرپرائز لایا ہوں —" اس نے شبنم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

مسز واحدی کو یہ سرپرائز اتنا پسند آیا کہ انہوں نے فوراً کنٹریکٹ منگوا کر شبنم سے سائن کروالیے۔ "کل تمہارا

اسکرین ٹسٹ لیں گے — ویسے یہ فارمیلٹی ہی ہے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ تم کامیاب رہو گی۔ مجھے چہروں کی بہت پہچان ہے۔"

"اچھا! تم دونوں خواتین باتیں کرو — میں ذرا اپنے آفس میں جھانک آؤں۔"

عارف رضا نے آفس پہنچ کر میز پر رکھے ٹیلی فون پیغامات دیکھے۔ چند ایک ناموں کے بعد جو نام اسے نظر آیا۔ وہ اس کے دل کی دھڑکن کو تیز تر کر گیا — ملک ارشد اس نے اپنی سیکریٹری کو بلوایا۔

"یہ — یہ ملک ارشد کا نام آپ نے لکھا ہے؟"

"جی سر — ان کے پی اے کا فون تھا۔ پیغام دیا ہے کہ آپ فوراً انہیں کال کر لیں۔"

عارف رضا کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ اس نے شبنم کو مہرہ بنا کر ملک ارشد کو شہہ دی تھی اور اب ملک ارشد کو مات ہونے ہی والی ہے۔ اس کے چہرے پر گہری مسکراہٹ تھی۔

"تم فون ملاؤ — پھر میری بات کراؤ۔"

"یس سر" سیکریٹری نے ملک ارشد کا فون ملا کر.... عارف رضا کو دے دیا۔

دوسری طرف سے پی اے بات کر رہا تھا: "ملک صاحب نے کہا ہے کہ آپ کنٹریکٹ پیپر تیار کروالیں — کل پرسوں تک وہ اس پر سائن کر دیں گے۔"

عارف رضا نے زندگی بھر کبھی اتنا جاں فزا پیام نہ سنا تھا۔

"بہت بہتر جناب — آپ ملک صاحب کو یقین دلا دیں کہ ہم پہلے سے بھی زیادہ صلاحیتوں سے کام لیں گے۔" وہ سرتاپا انکساری کی تفسیر بن گیا۔

"ملک صاحب نے یہ بھی کہلوایا ہے۔" پی اے بولا۔ "کہ اس بار یہ توسیع دو سال تک کے لیے بھی ہو سکتی ہے۔ وہ اس پر غور کر رہے ہیں۔"

عارف رضا کا ماتھا ٹھنکا۔ یہ اچانک مہربانیاں۔ "بہت بہت شکریہ۔" وہ بمشکل کہہ سکا۔

"اور ہاں۔" دوسری جانب سے پی اے کی آواز آئی۔ "وہ جاننا چاہتے ہیں کہ کہاں گئے وہ دوست جو بنگلہ دیش سے تشریف لائے تھے، واپس چلے گئے؟ اگر نہیں تو امید ہے جلد ہی بخیر و عافیت ان کی روانگی ہو جائے گی۔"

ملک ارشد کو مات نہیں ہوئی تھی۔ اس نے شہہ بچائی تھی، ایک غیر متوقع چال چل کر۔

"تم مجھے ایک لاکھ پونڈ بھی دو گے، تب بھی میں امریکہ نہیں جاؤں گا۔" ایک آئرش نے دوسرے سے کہا۔

"وجہ؟"

"وجہ یہ ہے کہ وہاں کا ٹریفک دائیں ہاتھ پر چلتا ہے۔"

"اس سے تمہاری صحت پر کیا اثر پڑے گا؟"

"کل میں نے ڈبلن میں دائیں ہاتھ پر کار چلانے کی کوشش کی تھی۔ تم صحت کی بات کرتے ہو، میری زندگی کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔"

تیسرے روز معاہدے پر دستخط ہو گئے لیکن یہ معاہدہ مشروط ہوا تھا۔ عارف رضا کی تیار کی ہوئی دستاویز کو ملک ارشد نے مسترد کر دیا اور اپنے وکیل سے کنٹریکٹ بنوایا۔ اس معاہدے سے ملک ارشد کو یہ حق حاصل تھا کہ اگر رین بو ایجنسی اس کی توقعات پر پوری نہ اتر رہی ہو تو وہ جب چاہے گا معاہدہ منسوخ کر دے گا۔ رقم کی ادائیگی تین تین ماہ کے وقفے سے ہونی تھی۔ عارف رضا کو اپنے ہاتھ کٹے ہوئے محسوس ہوئے لیکن وہ مجبور تھا اس نے پی اے اور وکیل کی وساطت سے ملک ارشد کو کہلوایا کہ وہ وعدہ کرتا ہے کہ عنقریب اپنے دوست کو واپس بنگلہ دیش روانہ کر دے گا۔ اور اس کے جواب میں عارف رضا کو یقین دلایا گیا کہ ملک ارشد دو سالہ معاہدے کے پلان پر بڑی سنجیدگی سے غور کر رہے ہیں۔

شبنم کو واپسی کے لیے رضامند کرنا عارف رضا کے لیے اتنا آسان نہیں تھا۔ اس نے خود ہی اسے روکا، پھر ماڈلنگ کے لیے رضامند کیا۔ اب کیسے اسے کہہ دے کہ تم واپس چلی جاؤ۔

شبنم کو ماڈلنگ بہت دلچسپ لگی۔ وہ بہت لگن اور محنت سے کام کر رہی تھی۔ مسز واحدی سے بھی اس کی کافی انڈراسٹینڈنگ رہتی تھی۔ جس روز معاہدے پر سائن ہوتے اس سے اگلے روز شبنم عارف رضا کے آفس میں داخل ہوئی۔

"مبارک ہو۔" وہ چہکی۔ "مجھے سچ مچ بہت خوشی ہوئی ہے۔"

"شکریہ شبنم! آؤ بیٹھو۔" عارف رضا نے کافی منگوائی۔

"خالی کافی پر ٹرخا رہے ہو، مٹھائی کہاں ہے؟"

"مٹھائی کیا چیز ہے۔ اس خوشی میں تو زبردست پارٹی دینے کی سوچ رہا ہوں۔"

"پارٹی میں ملک ارشد کو بھی ضرور بلانا۔"

عارف رضا کا مسکراتا ہوا چہرہ تاریک پڑ گیا۔ سیکریٹری کافی

لے آئی تھی۔ شبنم نے دو پیالے بنائے۔ عارف رضا گہری گہری نظروں سے شبنم کا جائزہ لے رہا تھا۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟" وہ جھینپ سی گئی۔

"خاصی خوبصورت ہو۔ رنگ بھی پہلے سے بہت نکھر گیا ہے۔ جب آئی تھیں تو سانولی سلونی بنگالن دکھائی دیتی تھیں۔" وہ شوخی سے بولا۔

"اچھا۔" وہ ہنسی۔ "اور اب؟"

"اب!" وہ سوچنے لگا۔ "بس اور بھی اچھی ہو گئی ہو۔" اسے کوئی تشبیہہ نہ سوجھی۔

"پارٹی کب دے رہے ہو؟"

"جلد ہی۔ شاید اگلے ویک اینڈ پر۔"

"ملک کو بلاؤ گے نا؟"

"ملک، ملک، ملک... یہ کیا تم نے رٹ لگا رکھی ہے؟"

شبنم دم بخود رہ گئی۔ اس نے حیرت سے عارف رضا کو دیکھا جس کا خوبصورت چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ مسکراتی چمکتی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ وہ بہت بدصورت لگ رہا تھا۔

"کیا کہہ رہے ہو عارف؟" وہ مدھم لہجے میں بولی۔

"یہی کہ کیا تم ملک ارشد کو بھول نہیں سکتیں؟"

"بھول جاؤں اسے۔ آخر کیوں؟"

"جو کچھ اس رات اس نے تمہارے ساتھ کیا، جس طرح تمہاری شخصیت کو نظر انداز کیا اس کے بعد بھی تم اس سے ملنا چاہتی ہو؟" عارف رضا کی آواز کی تندی اب دھیمی پڑ گئی تھی۔

"میں ملک ارشد کو بھول بھی جاؤں تب بھی تبسم کو نہیں بھول سکتی۔ رہ گئی بات اس رات کے رویے کی تو میں اسے برداشت کر چکی ہوں کیونکہ میرے آگے ایک بڑا مقصد ہے اور وہ مقصد مجھے یونہی آسانی سے حاصل نہیں ہو جائے گا، اور پھر یہ قطعی طور پر میرا ذاتی معاملہ ہے۔" وہ خشک لہجہ میں بولی۔

عارف رضا کو ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ "تمہارے ذاتی معاملہ سے تھوڑا بہت تعلق تو مجھے بھی ہے نا!" وہ آگے کی جانب جھکتا ہوا بولا۔ "تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔" اس کی آواز کی جذباتیت سے شبنم کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، لیکن اس دھڑکن میں کوئی مٹھاس نہیں تھی بلکہ ایک قسم کا خوف تھا۔

"تم وقت ضائع کر رہی ہو شبنم! یہ سب کچھ لاحاصل ہے۔"

"یہ بات تم اب کیوں کہہ رہے ہو؟ پہلے تو تم بہت پرامید تھے۔ پھر یہ سارا پلان تمہارا ہی تو تھا۔"

"ہاں! پہلے میرا خیال تھا کہ شاید ملک ارشد دباؤ میں آ جائے...!"

"ٹھیک ہے۔" وہ اٹھتی ہوئی بولی۔ "تم میرا ساتھ نہ دینا چاہو تو نہ دو، لیکن تم مجھے روک نہیں سکتے۔" وہ باہر نکل گئی۔

"اسے روکنا ہو گا۔ ہر قیمت پر۔" عارف رضا نے مٹھیاں بھینچ کر سوچا۔

مسز کریم الدین کے ہوسٹل میں شبنم کا مزید قیام اب مشکل ہو گیا تھا۔ اس کی کئی وجوہات تھیں۔ سب سے پہلی تو یہ کہ شبنم ہوسٹل کی باقاعدہ مقیم نہیں تھی۔ وہ وہاں کچھ عرصہ کے لیے مہمان کے طور پر رہ رہی تھی۔ ہوسٹل میں جگہ بالکل نہیں تھی۔ اسے احساس تھا کہ وہ ان دونوں لڑکیوں کیلئے مصیبت بن گئی ہے۔ چھوٹے سے کمرے میں تیسرے پلنگ کے لیے جگہ بڑی مشکل سے نکالی جاتی تھی۔ دوسری وجہ ہوسٹل کا سخت قانون تھا جس کے تحت نو بجے سے پہلے پہلے لڑکیوں کو واپس آنا ہوتا تھا۔ دو راتیں باہر تو وہ خصوصی اجازت لے کر چلی گئی تھی لیکن مسز کریم الدین کا خیال تھا کہ لڑکیوں کا رات گئے واپس آنا ان کے ہوسٹل کی بدنامی کا باعث بن سکتا تھا۔ اور تیسری سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ مسز کریم الدین کو یہ علم ہو گیا تھا کہ وہ پولیس اسٹیشن کے بھی چکر لگا چکی ہے اور عین ممکن ہے کہ کسی دن پولیس خود ان کے ہوسٹل میں آ جاتے۔ وہ پولیس والوں سے بچنا چاہتی تھیں۔ ہر چند کہ ان کے اور لڑکیوں کے ہاتھ صاف تھے پھر بھی ان کا خیال تھا کہ پولیس اگر ایک بار بھی یہاں آ گئی تو ہوسٹل بری طرح بدنام ہو جائے گا۔ لڑکیاں وہاں خود کو محفوظ نہیں سمجھیں گی۔ پھر پولیس والوں کی شہرت بھی ایسی ہے کہ ان پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ ایکبار انہیں ادھر کا راستہ مل گیا تو وہ یونہی بلاوجہ ان کے سر پر سوار ہوا کریں گے۔

شبنم کے لیے رہائش کا مسئلہ دردِ سر بن گیا۔ اس نے رعنا سے اس سلسلہ میں بات کی۔ رعنا نے کچھ دیر سوچا پھر چٹکی بجاتے ہوئے بولی "تمہارا مسئلہ سمجھو کہ حل ہو گیا۔"

"وہ کیسے؟"

"میری ایک دوست ہے۔ بیرونی ایئر کمپنی میں ایئر ہوسٹس ہے۔ باتھ آئی لینڈ میں اس کا دو کمروں کا فلیٹ ہے پہلے وہ ایک دوسری لڑکی کے ساتھ اسے شیئر کر رہی تھی۔ اب اس کی شادی ہو گئی ہے۔ اسے بھی کسی نئی پارٹنر کی تلاش ہے۔ تم چاہو تو...!"

"ہائے پلیز! تم فوراً اس سے بات کرو۔" شبنم بے قراری سے بولی۔

اور یہ مسئلہ واقعی بہت جلدی اور بآسانی حل ہو گیا۔

تیسرے دن شبنم فلیٹ میں شفٹ ہو گئی۔ دو خواب گاہ
ایک نشست گاہ، دو باتھ رومز اور ایک چھوٹے سے کچن پر مشتمل
یہ فلیٹ دو لڑکیوں کے لیے بہت کافی تھا۔ شبنم کو جگہ بہت پسند
آئی۔ اسے سجا سجایا گھر رہنے کو مل گیا۔ اور سب سے بڑی بات
یہ تھی کہ یہاں فون بھی لگا ہوا تھا۔

اگلے ہی دن غیر متوقع طور پر عارف رضا کا فون آ گیا۔

"ہیلو... دیکھو سنو... میری آواز سن کر فون بند مت کر دینا۔"

"تمہیں میرا نمبر کہاں سے پتہ چلا؟"

"مسز کریم الدین سے۔ میں نے پہلے ہوسٹل فون کیا۔ انہوں نے بتایا کہ تم اب ایک فلیٹ میں رہ رہی ہو۔ ماشاء اللہ گھر والی ہو گئی ہو۔ مبارک ہو۔"

"شکریہ!"

"خفا ہو اب تک؟ آئی ایم سوری۔ اس دن میں نے بہت زیادتی کی۔"

"کوئی بات نہیں عارف! ہم اب بھی دوست ہیں۔"

"اکیلی رہ رہی ہو یہاں؟"

"نہیں، ایک دوست کے ساتھ شیئر کر رہی ہوں۔"

"دوست؟"

"ہاں بھئی دوست۔ لڑکی ہے۔" وہ ہنسی۔

"اوہ آئی سی۔" وہ مطمئن سا بولا۔ "اچھا اور سناؤ کیا خبر ہے؟"

"خبر تو بڑی زبردست ہے۔ مسز واحدی نے مجھے ملک لان کے ایڈ میں بک کر لیا ہے۔"

"کیا؟" وہ دم بخود رہ گیا۔

"ہاں۔ مسز واحدی بڑے زبردست آئیڈیا رکھتی ہیں۔ میرے لیے خاص طور پر چاندنی بوتیک سے لباس تیار کروا رہی ہیں۔"

"یہ کب طے ہوا؟"

"کل فون آیا تھا ان کا۔"

"مجھے خبر بھی نہیں ہوئی؟" وہ شاکی سا تھا۔

"ارے بھئی تم اکاؤنٹس کے شعبے کے آدمی ہو۔"

"پھر بھی۔"

"ایک مزے کی بات اور۔ ایڈ کی ساری شوٹنگ ملک کے بنگلے پر ہوگی۔"

"اس نے اجازت دے دی؟"

"دے ہی دی ہوگی۔ سچ میں بڑی بے چین ہو رہی ہوں اس کا گھر دیکھنے کو۔ خاص طور پر وہ پورٹریٹ۔"

"کیا وہ یہ بات جانتا ہے کہ اس ایڈ کی ماڈل تم ہو؟"

"پتہ نہیں۔ اس سے فرق بھی کیا پڑتا ہے؟"

"او کے شبنم اگڈ لک۔ ہاں اپنے نئے گھر میں بلاؤ گی نا؟"

"ضرور، ورنہ تمہیں یہ کیسے پتہ چلے گا کہ میں کیسے مزیدار کھانے پکاتی ہوں۔ تم کل آ جاؤ۔" اس نے ہنستے ہوئے فون بند کر دیا۔ اور عارف رضا سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرنا چاہیے؟

عارف رضا شام کے ساڑھے سات بجے شبنم کے فلیٹ پر آ پہنچا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پھولوں کا خوبصورت سا گلدستہ تھا۔ اور دوسرے ہاتھ میں کیک کا ڈبہ۔

"نیا گھر مبارک!"

"شکریہ۔ ویسے یہ گھر نہیں، مکان ہے صرف۔" وہ ہنسی۔

اس کی ساتھی لڑکی عالیہ بھی موجود تھی۔ وہ تھوڑی دیر ان کے ساتھ بیٹھی پھر معذرت کر کے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

شبنم نے میز پر پلیٹیں لگائیں۔

"تمہیں یوں کام کرتے دیکھ کر بڑا عجیب سا لگ رہا ہے۔" عارف رضا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لگنا تو نہیں چاہیے۔ کیونکہ میرا اصلی روپ تو یہی ہے۔"

"رعب ڈال رہی ہو مجھ پر کہ بڑی سگھڑ لڑکی ہو؟"

"تم پر رعب ڈال کر مجھے کیا کرنا ہے۔ چلو آ جاؤ کھانا لگ گیا ہے۔ یہ سب میں نے خود پکایا ہے۔" عارف رضا نے ایک کرسی سنبھال لی۔ میز کئی طرح کے پکوانوں سے سجی ہوئی تھی۔ ہر ڈش کو بڑی ہی فنکاری سے سجایا گیا تھا۔ عالیہ نے کھانے پر ان کا ساتھ دیا۔ پھر واپس اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"بہت بہت شکریہ شبنم! کیا واقعی یہ سارا اہتمام میرے لیے تھا، آخر کیوں؟"

"تمہارا کیا خیال ہے؟"

"یہی کہ اس کے پیچھے ضرور کوئی خاص وجہ ہے۔"

شبنم اس کی اس بات پر آزردہ سی ہو گئی۔ "کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ میں نے صرف تمہاری دوستی کی خاطر یہ کیا ہو؟"

"نہیں۔ اور یہ گئے دنوں کی شکر گزاری کے لیے بھی نہیں ہے۔ یہ تو آنے والے دنوں کی رشوت ہے۔"

"کہنا کیا چاہتے ہو تم؟" وہ ناگواری سے بولی۔

"تم پھر ملک ارشد سے ملنا چاہتی ہو۔ اپنے طور پر ناکام رہی ہو۔ اس لیے تم نے سوچا کہ پھر میری مدد لی جائے۔ یہی نا بات؟"

"اوہ خدا!" وہ تلخی سے بولی۔ "تمہاری سوچیں بہت چھوٹی ہو گئی ہیں۔"

"لیکن میں اب تمہیں اس سے ملنے نہیں دوں گا۔"

"کیوں؟" اس نے ماتھے پر بل ڈالے۔ "کیا اس لیے کہ اب تو تمہارا مطلب حل ہو چکا ہے۔"

عارف رضا بے تحاشا چونک اٹھا۔ "میرا مقصد؟"

"ہاں۔ ملک معاہدے کی تجدید نہیں کر رہا تھا۔ وہ تبسم کی وجہ سے تم سے خائف تھا۔ پھر تمہیں میں نظر آئی۔ تم نے مجھے استعمال کیا۔ ملک سے ملوایا۔ اس نے معاہدے کی تجدید کر دی۔ اب ظاہر ہے میرا کام ختم ہو گیا۔ تمہیں یہ بھی خدشہ ہے کہ اگر میں اس سے ملتی رہی تو اسے کبھی نہ کبھی یہ بات پتہ چل جائے گی کہ تم نے مجھے اس سے ملوانے کے لیے یہ ڈرامہ رچایا تھا اور تم دوبارہ زیرِ عتاب آ جاؤ گے۔" وہ سخت غصے میں تھی۔ عارف رضا ششدر رہ گیا۔ اسے شبنم سے ایسی کھری کھری باتوں کی امید نہیں تھی۔ "تم بہت ہوشیار آدمی ہو عارف!" وہ پھر بولی۔ "لیکن ایک بات میں تمہیں بتا دوں، تم میری مدد کرو یا نہ کرو، میں اس سے ضرور ملوں گی۔ کم سے کم کوشش کرتی رہوں گی، اور میرا ابھی واپسی کا بھی کوئی ارادہ نہیں۔"

"تمہاری بات ختم ہو گئی؟" وہ پُرسکون آواز میں بولا۔ شبنم نے کوئی جواب نہ دیا۔ "تمہارا خیال بالکل ٹھیک ہے۔ اب جبکہ ہمیں اس کا اکاؤنٹ مل گیا ہے۔ ہم اسے کھونا نہیں چاہتے اور نہ کسی کو اس بات کی اجازت دیں گے کہ وہ ہمارے درمیان غلط فہمیاں پیدا کرے۔ اس بات کا بڑا امکان ہے کہ تمہیں دیکھ کر وہ دوبارہ اکھڑ جائے۔ تمہاری اطلاع کے لیے خود ملک ارشد نے یہ کہلوایا ہے کہ میں تمہیں جلد از جلد واپس بھجوا دوں۔"

"اگر میں واپس نہ جانا چاہوں تو؟"

"ٹھیک ہے نہ جاؤ، لیکن تمہیں باز رکھنے کی میں ہر کوشش کروں گا۔ خواہ اس کے لیے مجھے تم سے شادی ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔"

اس بات پر شبنم اچانک قہقہہ مار کر ہنس دی۔ "تمہارا خیال ہے، میں تم سے شادی پر راضی ہو جاؤں گی؟"

"ظاہر ہے، میں ہر طرح سے معقول آدمی ہوں۔" وہ بھی ہنس دیا۔

"تم اچھے آدمی ہو عارف! لیکن احمق بھی ہو۔"

"جی ہاں۔ ہر وہ مرد جو شادی کرنے پر آمادہ ہو جائے احمق ہی ہوتا ہے۔ ویسے مذاق برطرف، ہم لوگ لڑکپن کی حدیں پار کر چکے ہیں۔ تم بھی ایک میچور عورت ہو۔ ہمارے معاشرے میں عورت اکیلی نہیں رہ سکتی۔ یہ ملک بھی تمہارے لیے اجنبی ہے۔ تمہیں تو جلد از جلد شادی کر لینی چاہیے۔"

"جی نہیں، یہ خیال دل سے نکال دو۔"

"میں نے ابھی باقاعدہ تمہیں پیغام نہیں دیا ہے۔ صرف اپنا خیال ظاہر کیا ہے لیکن اگر تم میں ذرا سی بھی حقیقت پسندی ہے اور تم صورتِ حال کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہو تو راضی ہو جاؤ گی۔"

پھر اس نے شبنم کا ہاتھ تھام لیا اور بولا۔ "ملک کو بھول جاؤ۔ لعنت بھیجو اس پر۔ صرف اپنے اور میرے بارے میں سوچو۔ یہ سمجھ کر کہ دنیا میں صرف ہم دونوں کا وجود ہی سب سے زیادہ اہم ہے۔"

شبنم دم سادھے اس کی بات سن رہی تھی۔ پھر سرگوشی میں بولی۔ "تم نے یہی بات تبسم سے بھی کہی ہو گی؟"

عارف رضا کو جیسے کرنٹ سا لگ گیا ہو۔ اس نے شبنم کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ "کیا یہ ضروری ہے کہ تم ہمیشہ ماضی میں ہی جھانکتی رہو؟"

"ہاں کیونکہ تبسم کا وجود اب ماضی کا ہی حصہ ہے۔"

"تبسم کو بھول جاؤ۔ شبنم کو زندہ رہنے دو۔ اپنی شخصیت کو ابھارو۔ تبسم کا رول مت ادا کرو۔"

"ہنہ۔" وہ تلخی سے مسکرائی۔ "یہ تمہارا ہی آئیڈیا تھا۔ تم نے ہی مجھے تبسم کا رول ادا کرنے کو کہا تھا۔"

"ہاں! اور مجھے ساری زندگی اس کا افسوس رہے گا۔ بجائے تبسم کو دفن کرنے کے تم شبنم کو دفن کیے دے رہی ہو۔" وہ اٹھ کر اس کی کرسی کی پشت پر آ کھڑا ہوا۔ پھر جھک کر اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ "تم اتنی سی بات نہیں سمجھ سکتیں کہ میں تم سے پیار کرنے لگا ہوں۔ بے حد۔ بے پناہ!"

"پلیز، عارف! پلیز۔" وہ گھبرا گئی۔ "مجھے وقت دو۔ میں ابھی کچھ فیصلہ نہیں کر سکتی۔"

"اوکے۔ تمہاری مرضی، لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ وقت تیزی سے گزر جاتا ہے، کسی کے لیے نہیں رکتا۔ اور گزر جانے والا وقت کسی بھی قیمت پر واپس نہیں آتا۔" وہ رخصت ہو گیا۔ اسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن شبنم اس کی ہو جائے گی۔ اسے اپنی بے پناہ مردانہ وجاہت پر بہت ناز تھا۔

شبنم کے ڈریسز تیار ہو کر آ چکے تھے تبھی یہ چونکا دینے والی خبر ملی کہ ملک ارشد نے ایڈ کی ماڈل کا نام معلوم کروا لیا تھا۔ اور جب اسے بتایا گیا تو وہ بپھر سا گیا۔ "میرے اتنے قیمتی ملبوسات کی ماڈلنگ ایک نئی اور معمولی شکل و صورت کی لڑکی نہیں کرے گی۔"

مسز واحدی کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ کمپنی کے ڈائریکٹر جعفری صاحب پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر دوڑتے پھر رہے تھے۔ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ ملک ارشد

نے کسی بات پر اعتراض کیا ہو۔ رین بو ایجنسی ملک کی سب سے بڑی اشتہاری کمپنی تھی۔ ملک ارشد خود بہت تعاون کرتا رہا تھا۔ اب یہ یکایک اسے پتہ نہیں کیا ہو گیا۔ پہلے وہ عارف رضا سے چڑتا تھا۔ اب اس نئی لڑکی کے درپے ہو گیا تھا۔ شبنم کو اس صورتِ حال کا علم ہوا تو اس پر شدید مایوسی طاری ہو گئی۔ اس کی راہ میں قدم قدم پر رکاوٹیں کھڑی کی جا رہی تھیں۔ وہ کسے اپنا ہمدرد جانے۔ کس سے امید رکھے۔

اسی مایوسی کی کیفیت میں وہ گھر پہنچی تو عالیہ اپنی فلائیٹ پر جانے کو تیار کھڑی تھی۔

"شبنم! تمہارا فون آیا تھا۔"

"کس کا تھا؟"

"پتہ نہیں۔ بس تمہیں پوچھا۔ میں نے کہا وہ نہیں ہیں۔ فوراً ہی اس نے فون بند کر دیا۔"

"مرد تھا یا عورت؟"

"یہ بھی میں ٹھیک سے اندازہ نہ لگا سکی۔ عجیب سی پھنسی پھنسی آواز تھی۔"

شبنم سوچ میں پڑ گئی۔ اس دوران عالیہ خدا حافظ کہتی ہوئی چلی گئی۔ شبنم نے اپنے لیے چائے کا ایک کپ بنایا اور ڈرائنگ روم میں صوفے پر آ بیٹھی۔ وہ بہت گہری سوچوں میں گم تھی۔ فون کی گھنٹی بجی تو وہ اچھل گئی۔ "ہیلو۔" اس نے ریسور اٹھایا۔

"شبنم؟" دوسری جانب سے واقعی پھنسی پھنسی سی آواز آئی۔

"جی ہاں۔ آپ کون ہیں؟"

"میری بات غور سے سنو۔" دوسری جانب سے کہا گیا۔ "چلی جاؤ یہاں سے۔ چلی جاؤ جہاں سے آئی ہو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارا حشر بھی وہی ہو جو اس کا ہوا تھا۔ بھاگ جاؤ۔ اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے۔" اور اس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔ شبنم کے رگ و پے میں دہشت دوڑ گئی۔ یہ کون تھا؟ کس کی آواز تھی؟ کچھ یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا، اپنی آواز کو مصنوعی طور پر بنا کر بول رہا تھا۔ یوں جیسے کوئی ناک بند کر کے بولے۔ لیکن وہ کون تھا؟ ملک ارشد؟ یا عارف رضا؟ یا کوئی اور۔

یہ سب کچھ اب اس کی برداشت سے باہر تھا۔ اسے جلد ہی کچھ کرنا ہو گا۔ وہ یوں آسانی سے ہار نہیں مانے گی۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ شام کے چھ بجے تھے۔ باہر ابھی تک کافی اجالا تھا۔ اس نے پرس اور چابیاں اٹھائیں اور ایک عزم کے ساتھ باہر نکل گئی۔

"ملک پیلس" کے بڑے سے گیٹ کے سامنے ٹیکسی رکوا کر شبنم نے کرایہ ادا کیا اور اتر گئی۔ اس نے ایک گہری نظر اس محل نما کوٹھی پر ڈالی۔ دو ہزار مربع گز پر بنی ہوئی یہ طویل و عریض کوٹھی امیرانہ شان و شوکت کا منہ بولتا شاہکار تھی۔ اس نے گھنٹی پر انگلی رکھی۔ گیٹ سے ملحق چھوٹے سے کیبن میں سے چوکیدار نکلا۔ اس نے حیرت سے شبنم کو دیکھا۔

"میں ملک صاحب سے ملنے آئی ہوں۔ اور مجھے یہ بھی علم ہے کہ وہ گھر پر تشریف رکھتے ہیں۔" شبنم نے یونہی اندازے سے کہہ دیا۔

چوکیدار نے گیٹ پر لگے انٹرکوم کے ذریعے اندر اطلاع دی پھر مڑ کر اس سے پوچھا۔ "آپ کا نام؟"

"شبنم گل۔" وہ خود اعتمادی سے بولی۔ چوکیدار نے اس کا نام انٹرکوم میں دہرایا۔ پھر اسے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ لمبی روش پر چلتی ہوئی اندرونی دروازے تک پہنچی جسے ایک اور ملازم نے کھولا۔ "ملک صاحب اس وقت بہت مصروف ہیں۔"

"میں ان کی فرصت تک انتظار کر لوں گی۔" وہ اطمینان سے بولی۔

"شاید کئی گھنٹے لگ جائیں۔"

"کوئی بات نہیں۔ مجھے یہ کتاب ختم کرنے کا موقع مل جائے گا۔" اس نے اپنے بیگ سے ایک کتاب نکالی۔ ملازم اسے ساتھ لیے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا۔ وہ ایک صوفے پر بہت اطمینان سے بیٹھ گئی۔ ملازم کے چلے جانے کے بعد اس نے بغور کمرے کا جائزہ لیا۔ اتنا بڑا ڈرائنگ روم اس نے فلموں میں ہی دیکھا تھا۔ کمرے میں بہت گرمی تھی۔ دبیز قالین، فرنیچر سے بھرمار، وال پیپر، ریشمی پردے، پینٹنگز۔ ان سب نے مل کر کمرے کو دہکا دیا تھا۔ یہ امیر لوگ بھی خوب ہیں پہلے پیسے کے زور پر کمرے کو اتنا گرما دیتے ہیں۔ پھر پیسے ہی کے زور پر اسے مصنوعی طور پر ٹھنڈا کرتے ہیں۔ اس نے دیوار میں لگے دو دو ایئر کنڈیشنر کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ اسے اپنا ڈھاکہ کے گھر کا چھوٹا سا ڈرائنگ روم یاد آیا۔ جہاں سادہ فرش تھا۔ بید کے صوفے اور کرسیاں تھیں۔ جہاں قالین کا کام وہ چٹائی سے لیتے تھے۔ کتنی خنکی ہوتی تھی وہاں۔ وہ پسینے میں بھیگی وہاں بیٹھی کتاب کے اوراق بغیر پڑھے الٹتی رہی۔ ٹھیک چالیس منٹ بعد وہی ملازم پھر اندر داخل ہوا۔ "چلیے۔"

وہ کتاب پرس میں رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی ٹانگوں میں ہلکی سی لرزش تھی۔ کمرے سے نکل کر وہ لوگ کوریڈور میں

چلتے چلتے ہوئے ایک بند دروازے کے پاس آکر رک گئے۔ ملازم نے ہلکے سے دستک دی۔

"کم ان۔" اندر سے گمبھیر سی آواز آئی۔ شبنم نے ملک ارشد کی آواز پہچان لی۔ ملازم نے دروازہ کھول کر اسے اندر جانے کو کہا اور خود واپس ہو لیا۔

اندر داخل ہوتے ہی ایئر کنڈیشنڈ کی خنکی نے شبنم کو تروتازہ سا کر دیا۔ کمرے میں تاریکی کے سبب اسے تھوڑی دیر تک کچھ نظر نہ آیا۔ پھر ہولے ہولے منظر واضح ہونے لگا۔ یہ یقیناً ملک کا اسٹڈی روم ہے۔ اس نے سوچا۔ چاروں طرف شیلف میں کتابیں چنی ہوئی تھیں۔ ایک طرف سیاہ آبنوسی لکھنے کی میز تھی۔ اس کے پیچھے سیاہ چرم کی قیمتی کرسی پر ملک ارشد بیٹھا ہوا تھا۔ "ہیلو مس شبنم!" وہ وہیں بیٹھے بیٹھے بولا۔

"ہیلو!"

"کیسی ہیں آپ؟" اس کے لہجے میں اجنبیت تھی۔

"ٹھیک ہوں۔"

"میرے خیال میں رسمی باتوں میں وقت ضائع کیے بغیر آپ وہ ضروری باتیں کریں جن کے لیے آپ اتنی زحمت اٹھا کر یہاں تک آئی ہیں۔" وہ رکھائی سے بولا۔

"اس رات کے بعد سے آپ نے پھر مجھے کبھی فون نہیں کیا۔" بالکل اچانک ہی شبنم کے منہ سے یہ بات نکل گئی۔ اُف یہ کیا کہہ دیا میں نے۔ وہ یہاں یہ بات کہنے تو نہیں آئی تھی۔ وہ اپنے الفاظ پر خود ہی شرمسار ہو رہی تھی۔ ملک ارشد بھی چند ثانیوں کے لیے حیران سا رہ گیا۔

"آپ جو بات کہنے آئی ہیں وہی کہیے۔" وہ کھردرے لہجے میں بولا۔ اس نے ابھی تک شبنم کو بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہا تھا۔ وہ جب سے آئی تھی کھڑی تھی۔ آخر کار اس نے خود ہی ڈھیٹ بن کر ایک کرسی پر نشست سنبھال لی۔ ملک ارشد بھی اپنی کرسی سے اٹھا اور اس کے سامنے والے صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔ شبنم کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ملک کی شخصیت میں ایک قسم کا سحر تھا اور وہ اس سحر میں گرفتار ہوتی جا رہی تھی۔ میرے خدا۔ وہ بڑبڑائی۔ اس کا بدن ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ دل کسی نازک پنکھڑی کی طرح ملک ارشد کی طوفانی شخصیت کے سامنے لرز رہا تھا۔ وہ سامنے بیٹھا بڑے غور سے اس کی بدلتی حالتوں کو دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً شبنم کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ رو رہی تھی۔ سسک رہی تھی۔ اس کی خود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ آخر کس بات پر آنسو بہا رہی ہے۔ تبسم کی موت پر؟ ملک ارشد کے رویے پر؟ یا خود اپنی کمزوری پر کہ ایک ایسے شخص سے متاثر ہو بیٹھی ہے جو اس کی مرحومہ بہن کا شوہر بلکہ ممکنہ حد تک اس کا قاتل تھا۔ وہ روتے روتے خود ہی چپ ہو گئی۔ ملک ارشد خاموش بیٹھا اسے تکتا رہا۔ شبنم نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور اچانک ہی اس کی نظر سامنے والی دیوار پر پڑی جس پر ایک بڑی سی پینٹنگ ٹنگی ہوئی تھی۔ تبسم کی تصویر۔ وہ سحر زدہ سی اٹھی اور تصویر کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ کسی آئینے میں اپنے ہی عکس کو دیکھ رہی ہو۔ ملک ارشد بھی اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر بٹن دبایا اور تصویر روشن ہو گئی۔ جگمگا اٹھی۔ شبنم گم صم سی اسے کھڑی تک رہی تھی۔ تب بالکل اچانک ہی ملک ارشد دھیرے سے بولا۔ "تم نے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی کہ تم تبسم کی بہن ہو؟"

وہ چونک اٹھی۔ اس نے گھبرا کر ملک ارشد کو دیکھا۔

وہ بہت اداس لگ رہا تھا۔ "آپ یہ بات جانتے ہیں؟"

"ہاں۔"

"کب سے؟"

"تقریباً شروع ہی سے۔ پہلی ملاقات کے فوراً بعد سے۔"

"عارف رضا نے ...۔"

"نہیں۔" اس نے بات کاٹی۔ "میرے اپنے بھی کچھ وسائل ہیں۔ پھر میں اس شخص سے اتنا بے تکلف نہیں ہوں۔" شبنم شرمسار سی کھڑی رہی۔ "تم اپنی بہن کی موت کا سبب جاننے آئی ہو نا؟" وہ اب بھی چپ تھی۔ "تم نے مجھے دھوکا کیوں دیا شبنم! جبکہ میں تم سے پوری سچائی سے ملا تھا۔ مجھے دھوکے بازی پسند نہیں۔ تبسم نے بھی مجھے بہت دھوکے دیئے۔ بہت دغا کی اس نے میرے ساتھ۔" ملک ارشد کی آواز جذباتی ہو کر اور بھی بھاری ہو گئی تھی۔ "تم سے مل کر مجھے یوں لگا تھا کہ وہ روپ جو میں تبسم میں دیکھنا چاہ رہا تھا وہ اب دیکھ رہا ہوں، لیکن ... تم بھی اسی کی طرح نکلیں۔ اور میں بار بار بے وقوف بننا پسند نہیں کرتا۔" آخری جملہ اس نے سخت لہجے میں ادا کیا۔ شبنم سہم سی گئی۔ اس کا وجود ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ وہ اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ "میں نفرت کرتا ہوں ان لوگوں سے جو جھوٹے ہیں۔ مکار ہیں۔ میں تبسم سے بھی نفرت کرتا تھا۔ شدید نفرت۔"

"نفرت؟" شبنم نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"ہاں نفرت۔ اتنی شدید کہ جب وہ مری تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر تم ملیں تو میں نے سوچا کہ میری بیقراری کو قرار آجائے گا۔ لیکن تم بھی اسی کی طرح نکلیں۔"

"نہیں" وہ چلائی "میں دھوکے باز نہیں ہوں، میں جھوٹی نہیں ہوں" وہ پھر سے رو دی۔ ملک ارشد نے اسے شانوں سے تھام کر اپنے قریب کر لیا تب وہ بے خودی کے سے عالم میں اس کے سینے سے لگی روتی رہی۔ اس کا جی چاہا کہ وقت ختم جائے۔ لمحے امر ہو جائیں لیکن وہ جلد ہی حواسوں میں آ گئی۔ وہ ایک قاتل کے سینے سے لگی کھڑی تھی۔ وہ گھبرا کر الگ ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں خوف جھلک رہا تھا۔

"تم کس چیز سے اتنی خوفزدہ ہو؟ کیا مجھ سے؟" وہ نرمی سے بولا۔

"پتہ نہیں۔ شاید" وہ اپنی کرسی پر جا بیٹھی "میں یہ کہنے آئی تھی کہ..."

"رہنے دو۔ میں جانتا ہوں تم کیا کہنے آئی تھیں۔ تم جو مرضی آئے کرو" وہ مسکرا دیا۔ شبنم نے سوچا، یہ مسکراتا ہوا کتنا اچھا لگتا ہے "تم مجھ سے مت ڈرو۔ تم سے مل کر مجھے بہت اچھا لگا تھا اور تم بھی میرے جذبوں سے ناواقف نہیں تھیں" وہ اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا "میں تمہیں چاہنے لگا ہوں۔ اور میں جسے چاہتا ہوں اسے اپنا لیتا ہوں" وہ اس کے بالوں سے کھیلنے لگا۔

"اوہ نہیں، پلیز!" وہ کسمسائی "یہ سب اچھا نہیں ہے مناسب نہیں ہے..."

"کیوں؟ آخر کیوں؟"

"تبسم" اس کی نظریں سامنے لگی پورٹریٹ پر جا ٹکیں۔

"اوہ خدا۔ وہ مر کر بھی میری خوشیوں کی دشمن رہی۔"

"آپ بھول رہے ہیں ملک صاحب کہ وہ میری بہن تھی۔"

"کاش میں واقعی یہ بات بھول جاؤں۔ کاش تم سچ مچ اس کی بہن نہ ہوتیں۔ لیکن پھر بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں تمہیں اپناؤں گا۔ ابھی شاید اس پر تم راضی نہ ہو لیکن جلد ہی ہو جاؤ گی۔ تمہیں ہونا پڑے گا۔ میں جس چیز کی بھی خواہش کروں اسے ہر قیمت پر پورا ہونا ہوتا ہے" وہ اٹھا، اس کے ساتھ شبنم بھی کھڑی ہو گئی۔

ملک نے دیوار میں لگی گھنٹی بجائی۔ ملازم اندر داخل ہوا۔

"ڈرائیور سے کہو بیگم صاحبہ کو چھوڑ آئے۔ اوکے شبنم! خدا حافظ" پھر اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ دوبارہ اپنی میز کی طرف مڑ گیا۔

❁

صبح ہی صبح مسز واحدی کا فون آ گیا۔ وہ خوشی سے بے قابو ہو رہی تھیں "شبنم! جلدی آ جاؤ، سب ٹھیک ہو گیا۔ ملک نے رضامندی دے دی۔ ہم شوٹنگ بھی اس کے پیلس پہ ہی کریں گے"

شبنم مسکرا دی۔ جلدی جلدی تیار ہو کر وہ ریان بوانجنسی پہنچ گئی۔ مسز واحدی نے شبنم کے تمام ملبوسات بہت محنت سے بنوائے تھے چاندنی بوتیک والوں نے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو استعمال کیا تھا اور شبنم پر وہ سارے ملبوسات بہت سج رہے تھے۔ وہ لوگ ملک ارشد کی قیام گاہ پر پہنچے تو خود ملک ان کے استقبال کو موجود تھا۔ وہ بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔ مسز واحدی کے لیے اس کا یہ روپ نیا تھا۔

"یہ تو بہت سنجیدہ اور مغرور سا آدمی ہے۔ اتنا خوش مزاج کب سے ہو گیا؟"

شبنم ہنس دی اور مسز واحدی کی تجربہ کار نظروں نے بھانپ لیا کہ ملک ارشد کی آنکھوں کی چمک کس چہرے کو دیکھ کر بڑھ جاتی ہے اور شبنم کا چہرہ کس کی نگاہوں کی تپش سے گلابی ہو جاتا ہے۔

وہ لوگ شام پانچ بجے تک مصروف رہے، لیکن شبنم کو ذرا بھی تھکن کا احساس نہ ہوا۔ ان کی روانگی کے وقت ملک ارشد نے موقع دیکھ کر چپکے سے اس سے کہا۔

"سات بجے ڈرائیور بھیجوں گا، تیار رہنا" اس نے انکار کرنا چاہا لیکن نہ کر سکی۔

ٹھیک وقت پر وہ تیار ہو کر نیچے آئی اس کا دل دوہری کیفیتوں کا شکار ہو رہا تھا۔ یہ میں اچھا نہیں کر رہی۔ مجھے یہ سب نہیں کرنا چاہیے، لیکن کوئی کشش تھی جو اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ ملک کی سیاہ لیموزین گیٹ کے پاس آ کر ٹھہری۔ ڈرائیور نے اتر کر ادب سے سلام کیا اور اس کے لیے دروازہ کھولا۔ گاڑی ملک پیلس کے آہنی گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو اس کا دل ایک بار پھر کانپ کر رہ گیا۔ نامعلوم سا خوف پھر سے دہلانے لگا، لیکن اب واپسی ناممکن تھی۔

ملک ارشد نے بڑی گرمجوشی سے خود دروازے پر آ کر اس کا استقبال کیا۔ وہ آج شلوار قمیض میں ملبوس تھا اور بہت اچھا لگ رہا تھا، لیکن شبنم کے اعصاب پُرسکون نہ ہو سکے۔ وہ کھل کر مسکرا بھی نہ سکی۔ کھانے کی میز بے شمار چیزوں سے اٹی ہوئی تھی۔ دونوں چپ چاپ سے تھے۔ پھر ملک نے خاموشی توڑی "کیا بات ہے؟ بہت چپ ہو؟"

اس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا "یونہی، تھک گئی ہوں۔"

"اتنا کام مت کیا کرو" وہ پیار سے بولا۔ شبنم کا دل بھر آیا پانی پی کر اس نے اپنی رندھی ہوئی آواز پر قابو پایا۔ کھانے کے بعد وہ دونوں پھر اسٹڈی روم میں آ بیٹھے۔ تبسم کی تصویر پر پردہ پڑا ہوا تھا۔

کافی پیتے پیتے ایک دم سے وہ بولی۔ "آپ نے عارف رضا سے درخواست کی تھی کہ وہ مجھے کسی بھی طرح واپس بھجوا دیں؟"

ملک ارشد نے چونک کر اسے دیکھا، پھر شرمندگی سے سر جھکا لیا۔ "ہاں۔"

وہ تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھی۔ "آخر آپ مجھ سے کیا کھیل کھیل رہے ہیں؟ ایک طرف اتنی اپنائیت، اتنی چاہت، اور دوسری جانب ... ؟"

"وہ پہلے کی بات تھی۔ میں تم سے اس وقت بہت خفا تھا۔"

"کیا بگاڑا تھا میں نے آپ کا؟"

"جھوٹ بولا تھا تم نے۔"

"نہیں، میں نے آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔"

"بات چھپائی تھی۔"

"ہاں مجھے حق حاصل ہے کہ میں اپنے بارے میں جو چاہوں بتاؤں، جو چاہوں چھپاؤں۔ پھر وہ ہماری پہلی ہی ملاقات تھی۔"

"لیکن اب اس بات کو دہرانے کا کیا فائدہ؟ اب تو ہم ایک دوسرے کو سمجھنے لگے ہیں۔"

وہ چپ ہو گئی۔ پھر کچھ دیر بعد ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی۔ "آپ مطمئن رہیئے، ملک صاحب! میں جلد ہی واپس چلی جاؤں گی۔"

"نہیں۔" وہ چلایا۔ "تم نہیں جا سکتیں۔ اب تو بالکل نہیں جا سکتیں۔"

"لیکن میں رُک بھی تو نہیں سکتی۔" وہ بیچارگی سے بولی۔

"کیوں آخر؟ کیا مسئلہ ہے، کیا پریشانی ہے؟"

"مسئلہ؟" وہ طنز سے بولی، اور جلتی ہوئی تبسم کی تصویر کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ "مسئلہ یہ ہے۔" پھر ایک جھٹکے سے اس نے پردہ کھینچ دیا۔ "پریشانی یہ ہے۔"

"اگر یہ یہاں نہ رہے تو ... ؟"

"تو بھی کیا فرق پڑے گا۔ اس گھر کی ہر شے سے اس کی یاد وابستہ ہے۔"

"ہم گھر بدل لیں گے۔"

"آپ کے دل سے اس کی یاد نہیں جا سکتی۔ میں خود اسے نہیں بھلا سکتی۔ وہ میری بہن تھی۔" وہ شکست خوردہ سی نظر آنے لگی۔

"اوہ تبسم!" وہ بڑبڑایا۔ "تم نے مر کر بھی مجھے سکون نہ لینے دیا۔ اور وہ عارف رضا! وہ ایک بار پھر مجھے تباہ کرنا چاہتا ہے۔ کاش میں اسے قتل کر دیتا۔" اس نے مٹھیاں بھینچ کر کہا۔

شبنم نے خوف و دہشت سے اسے دیکھا۔ ملک ارشد کے چہرے پر بلا کی نفرت تھی۔ "عارف رضا کا اس معاملے میں کوئی تعلق نہیں۔"

"تبسم نے بھی انکار کیا تھا، لیکن میں جانتا تھا، سب جانتا تھا۔ کاش اس نے تھوڑا سا انتظار کیا ہوتا۔ میں اسے وہ سب دے دیتا جس کی اسے تمنا تھی۔ طلاق۔ دولت۔ دونوں، لیکن ... ؟"

پھر اس نے چونک کر شبنم کو دیکھا۔ "تم بالکل اس جیسی ہو، لیکن تمہارا دل یقیناً اس جیسا سیاہ نہ ہوگا۔ تم میرے خوابوں کی طرح حسین ہو۔ تمہارا دل بھی حسین ہونا چاہیئے۔ ہم دونوں اپنی الگ دنیا بسائیں گے۔" وہ اس کی کرسی کے پاس قالین پر آ کر بیٹھ گیا۔

"نہیں، آپ ناممکن کو ممکن بنانے کی بات کر رہے ہیں۔"

"اپنی دنیا۔" اس نے جیسے شبنم کی بات سنی ہی نہ ہو۔ "جہاں کوئی نہ آ سکے گا، جہاں سے کوئی واپس نہ جا سکے گا۔"

"آپ سب سے کٹ کر زندگی نہیں بتا سکتے۔"

"یہ دنیا مکمل ہوگی، کسی کمی یا خامی کے بغیر۔ ہمیں کسی اور کی ضرورت ہی نہ ہوگی۔" وہ اسی والہانہ انداز میں بولتا رہا۔ شبنم نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ حقیقت سے فرار اب اس کے لیے بھی ممکن نہ رہا تھا۔ ملک ارشد نے اس کے دل کے نازک سے تاروں کو چھیڑ کر محبت کا راگ الاپ دیا تھا۔

وہ ابھی تک اس کے قریب دو زانو بیٹھا تھا۔

"میں اب چلوں گی۔" وہ کھڑی ہو گئی۔

وہ بھی تڑپ کر اٹھا۔ "نہیں، تم نہیں جاؤ۔ خدارا مت جاؤ۔ دیکھو یہاں کتنی تنہائی ہے۔ کتنا کرب ہے۔" اس کی نظریں کمرے میں ادھر ادھر گھومنے لگیں۔

"ماضی کو بھول جائیے ارشد!" اس نے پہلی بار اس کا نام لیا۔ "اسے دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں۔"

"یہ تم کہہ رہی ہو؟ تم جو ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر کے آئی ہو۔ ایک سمندر عبور کر کے آئی ہو۔ کس لیے؟ گڑے مردے اکھاڑنے۔ ماضی کو دہرانے۔ مجھے دوبارہ اسی جہنم میں دھکیلنے اور اب تم کہتی ہو ماضی کو بھول جاؤ۔"

"مجھے افسوس ہے۔" شبنم اس کے علاوہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ پھر اس نے اپنے شانوں پر ارشد کے مضبوط ہاتھوں کا دباؤ محسوس کیا۔ "تم نہیں جاؤ گی نا۔ وعدہ کرو۔ یونہی میرے پاس رہو گی۔" اس کی آنکھیں سرخ انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ شبنم نے اس کے ہاتھ اپنے کندھوں پر سے ہٹانے چاہے لیکن ناکام رہی اور پھر دھیرے دھیرے یہ ہاتھ اوپر کی جانب سرکنے لگے اور اس کی گردن پر آ پڑے۔ شبنم نے چیخنا چاہا، لیکن آواز نہ نکلی۔ اس ساؤنڈ پروف کمرے سے باہر اس کی آواز جا بھی نہیں سکتی تھی۔

پھر یہاں اس کا تھا کون جو مدد کو آتا۔ تب شبنم پر یہ ہولناک انکشاف ہوا کہ ملک ارشد اس لیے اس کی جان لے رہا ہے، اور پھر وہ بے ہوش ہو کر جھول گئی۔

دھیرے دھیرے اندھیرے چھٹنے لگے۔ دور سے آتی ہوئی مدھم سی آواز۔ کوئی اسے پکار رہا تھا شبنم... شبنم۔ اس نے کراہ کر آنکھیں کھولیں۔ کوئی اس پر جھکا ہوا تھا، کون ہے، اوہ ملک ارشد! وہ گھبرا کر اٹھی۔

"شبنم! کیسی ہو تم؟ اوہ خدا میں کتنا پریشان تھا۔"

"کیا ہوا تھا مجھے؟" وہ کھوئی ہوئی سی بولی۔

"تم بے ہوش ہو گئی تھیں، کیوں؟"

"اب میں ٹھیک ہوں۔ میں گھر جانا چاہتی ہوں۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے بال سمیٹے۔

"چلی جانا، لیکن ابھی نہیں۔ تمہیں کیا ہو گیا تھا شبنم؟"

"میں... مجھے پتہ نہیں۔ شاید چکر آ گیا تھا۔ میں جانا چاہ رہی ہوں۔" اس نے دوبارہ اصرار کیا۔ وہ بہت سہمی ہوئی تھی جلد از جلد اس جگہ سے دور جانا چاہتی تھی۔

"جیسی تمہاری مرضی۔" اس نے گھنٹی بجا کر شوفر کو گاڑی نکالنے کو کہا۔ "پھر کب ملو گی؟" وہ اس کی طرف حسرت سے دیکھ رہا تھا۔

"پرسوں۔ امی ابو کے سلسلہ میں ہم لوگ آئیں گے۔"

"اور کل؟"

"کل میں آرام کروں گی۔"

"شہر سے دور میرا فارم ہے۔ بہت پرسکون جگہ ہے۔ اگر چاہو تو...!"

"نہیں، پھر کبھی سہی۔" وہ خدا حافظ کہتی ہوئی نکل گئی۔

ملک ارشد اسے جاتے دیکھتا رہا۔ ہاتھ ملتا رہا۔

ملک ارشد نے اسے قتل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ یہ خوشگوار سا احساس اسے بہت جلد ہو گیا۔ وہ واپس گھر پہنچی تو عجیب سرشاری کے سے عالم میں تھی۔ مجھے غلط فہمی ہوئی تھی، دہشت زدہ ہو کر بے ہوش ہو گئی تھی۔ وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ اس خیال نے اسے بے پناہ تقویت بخشی۔ تب اس سے رہا نہ گیا اور اس نے وقت کی پرواہ کیے بنا فون گھما دیا۔

ملک ارشد نے خود ہی ریسیور اٹھایا۔ "ہیلو!"

"ہیلو۔" وہ خوشدلی سے بولی۔

"شبنم!" وہ اس کی آواز فوراً ہی پہچان گیا۔ "کہاں ہو تم؟ خیریت سے تو ہو نا؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں اور ہاں۔ کل دن میں تو میں آرام کروں گی، لیکن میری شام بالکل فری ہے۔"

"اوہ۔" وہ خوشی سے بولا۔ "ہم پکنک پر تو نہ جا سکیں گے لیکن یہاں گھر پر ہی خوشی منائیں گے۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔"

"میں خود تمہیں لینے آؤں گا۔"

"نہیں، یہ مناسب نہیں، میں خود آ جاؤں گی۔"

"نہیں نہیں۔ میں کم سے کم ڈرائیور تو بھیج ہی سکتا ہوں۔"

"اوکے۔ کل شام چھ بجے۔ خدا حافظ۔"

فون پر بات کرنے کے بعد شبنم خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ وہ جو کوئی بھی ہے، جیسا بھی ہے مجھے اچھا لگتا ہے۔ بہت اچھا لگتا ہے۔

دوسرے دن شبنم بہت ہی اہتمام سے تیار ہوئی تھی۔ ہلکے گلابی رنگ کی ساڑھی میں اس کا سانولا بدن دمک رہا تھا۔ بالوں کو بنگالی طرز کے جوڑے میں بند کیا۔ ماتھے پر بندیا سجائی۔

ملک ارشد باہر لان میں ہی ٹہلتا ہوا مل گیا۔ شبنم کو ہنسی آ گئی۔ یہ بتدریج چاہت کی منزلیں طے کر رہے ہیں پہلے تو ملنا ہی محال تھا۔ پھر پہلی ملاقات چالیس منٹ انتظار کے بعد ہوئی۔ پھر اپنے کمرے میں میرے منتظر تھے۔ اور اب لان میں بے قراری سے ٹہل رہے ہیں۔ وہ لوگ کچھ دیر لان میں بچھی کرسیوں پر ہی بیٹھے رہے۔ دن میں ہلکی بارش سے فضا نکھر گئی تھی۔ ہرا بھرا پھولوں سے ڈھکا لان اپنی پوری بہاروں پر نظر آ رہا تھا۔

"میں ساری رات سو نہیں سکا۔" وہ پیار بھرے انداز میں بولا۔

"اچھا!" وہ ہنسی۔

"اور صبح ہوتے ہی تمہارا انتظار شروع کر دیا۔"

چائے لان پر ہی پی، اور جب شام گہری ہو گئی تو اندر آ گئے۔ اسٹڈی میں آج تازہ پھول سجے ہوئے تھے۔ شبنم کے ہونٹوں پر طمانیت بھری مسکراہٹ تھی۔ اس نے دیکھا تبسم کی تصویر آج پردے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ ملک ارشد نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔

"یہ تصویر تمہیں ڈسٹرب کرتی ہے نا، چلو ہم اسے تمہاری تصویر سمجھ لیتے ہیں۔ وہ بھی بالکل ایسی ہی ہو گی۔"

"نہیں، میری تصویر اتنی دہکتی ہوئی نہیں ہو سکتی۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ تم تو شبنم ہو۔ وہ شعلہ تھی۔" ملک

ارشد ایک بار پھر بے چین سا دکھائی دینے لگا۔ "آخری دنوں میں تو میں اس سے باقاعدہ نفرت کرنے لگ گیا تھا۔" اس نے پھر اپنی نفرت کا اظہار کیا۔ "وہ ہو بھی ایسی گئی تھی۔ قابل نفرت۔"

"ارشد!" شبنم نے ہولے سے اس کا نام لیا۔ "کوئی ایسی بات ہے کیا جو آپ چھپا رہے ہوں؟ کوئی بوجھ ہے ضرور آپ کے دل پر۔"

"تم نے کیسے جانا؟"

"آپ کی بے قراریوں سے۔ آپ میرے پاس ہوتے ہوئے بھی کہیں اور چلے جاتے ہیں۔ کہیں کھو جاتے ہیں۔ کہہ دیجیے، جو آپ کے دل میں ہے۔ میں آپ کو پریشان اور بے قرار نہیں دیکھ سکتی۔"

"کیوں۔ کیوں شبنم؟" اس نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا۔

"اس لیے ارشد... اس لیے کہ میں... میں... میں آپ سے محبت کرنے لگی ہوں۔" شبنم کی آنکھوں میں جھلملاہٹیں سی اتر آئیں۔

"اوہ خدا!" ملک ارشد کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ ہو گیا۔ "کیا واقعی؟ لیکن تم تو مجھے اپنی بہن کا قاتل سمجھتی ہو۔ اس کے باوجود بھی؟"

"ہاں، اس کے باوجود بھی۔" وہ اطمینان سے بولی۔

"میں اتنی معصوم اور عظیم محبت کا اہل تو نہیں ہوں۔"

"آپ پولیس کے پاس جائیں۔" شبنم نے ہونٹ بھینچ کر کہا۔ ملک ارشد اس بات پر اچھل سا گیا۔ "اپنی سب حقیقت بتا دیں۔ مجھے پتہ ہے اس نے خودکشی نہیں کی ہے۔" اس کی آنکھوں سے آنسو برسنے لگے۔ "سب کچھ سچ سچ بتا دیجیے۔"

"سچ!" وہ بڑبڑایا۔ "تم سمجھتی ہو میں نے اسے قتل کیا ہے؟" وہ خاموش رہی۔ "بولو جواب دو شبنم! تم مجھے قاتل سمجھتی ہو نا۔" اس نے بے چارگی سے گردن ہلا دی۔ "لیکن کیوں تم ایسا کیوں سمجھتی ہو؟"

"تبسم نے مرنے سے پہلے مجھے خط لکھا تھا۔"

ملک ارشد چونک اٹھا۔ "کیا لکھا تھا اس میں؟" وہ بے تابی سے بولا۔

"اس نے لکھا تھا کہ وہ آپ سے چھٹکارا حاصل کر کے عنقریب کسی دوسرے آدمی سے شادی کر کے بنگلہ دیش آنے والی ہے۔ اس نے مجھے اس شخص کا نام نہیں لکھا۔ خط اس نے اپنے مرنے سے صرف ایک روز پہلے لکھا تھا۔ ایک روز پہلے مستقبل کے نئے منصوبے بنانے والے اگلے روز اتنے ناامید نہیں ہو جاتے کہ خودکشی کر لیں۔ مجھے اس کی موت کی اطلاع ملی تو مجھے اس خودکشی والی بات پر اعتبار نہ آیا۔ میں یہاں آئی تھی کہ آپ سے مل کر ساری بات پوچھوں گی، لیکن آپ نے ملنے سے انکار کر دیا۔"

"پھر... پھر کیا کیا تم نے؟" وہ تیزی سے بولا۔

"پھر میں پولیس کے پاس گئی۔ ان سے درخواست کی کہ وہ کیس کی نئے سرے سے تفتیش کریں۔"

"اور وہ خط؟"

"وہ بھی میں نے انہیں دکھایا۔ اسی کی بنا پر تو میں کیس دوبارہ اٹھانا چاہتی تھی لیکن ان کی نظر میں خط کا ثبوت کافی نہیں ہے۔"

"لہٰذا تم نے خود اس کیس کو حل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔"

"مجھے کرنا پڑا۔ یہ میرا فرض تھا، لیکن میں نہیں جانتی تھی کہ..."

"کہ تم مجھ سے محبت کرنے بیٹھ جاؤ گی۔" وہ پھیکی سی ہنسی ہنسا۔ "لیکن تم یہ سب تبسم کے لیے کیوں کر رہی ہو؟ تم نہیں جانتیں وہ اس کی اہل نہیں تھی۔ وہ شر تھی، فتنہ تھی۔ ہر ایک کو برباد کرنا چاہتی تھی۔"

"میں اسے بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ میری بہن تھی۔ ہم سولہ سال ایک ساتھ رہے ہیں۔"

"وہ آٹھ سال میرے ساتھ رہی اور ایک بار بھی اس نے تمہارا ذکر نہ کیا۔ میں یہی سمجھتا رہا کہ وہ اپنی سہیلی کے المیہ سے اتنی غمزدہ ہے کہ اسے یاد بھی کرنا نہیں چاہتی۔ لیکن وہ بہت خودغرض تھی۔ وہ صرف اور صرف اپنے بارے میں ہی سوچتی تھی۔ اتنا کچھ مل جانے کے بعد بھی اس کی ہوس کم نہ ہوئی تھی۔ پھر جب وہ مر گئی تو میں بے انتہا خوش ہوا۔"

"کیا وہ آپ کے ہاتھوں مری تھی؟" اس نے ڈرتے ڈرتے یہ سوال کیا۔ اس کے رونئیں رونئیں سے یہ صدا آتی کہ کاش ملک ارشد کا جواب نفی میں آئے۔ لیکن وہ تو ایک بار پھر اپنے خیالوں میں گم ہو چکا تھا۔

"میں نے اسے بے پناہ چاہا تھا، دیوانوں کی طرح۔ پوجا تھا اسے، لیکن وہ اس محبت اور عقیدت کی اہل ثابت نہ ہوئی۔ وہ بگڑی ہوئی مغرور اور خود پرست عورت تھی۔ یہ شادی میرے لیے ایک مستقل عذاب کی صورت اختیار کر گئی۔ اس نے رفتہ رفتہ مجھے تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا تھا۔"

"لیکن تباہ تو وہ خود ہوئی۔"

"ہاں۔ وہ خود تباہ ہو گئی۔ جس راہ پر وہ چل رہی تھی وہ اسی بربادی کو جاتی تھی۔ اس راہ پر چلنے والے کبھی کامران نہیں

ہوتے۔" وہ چند لمحوں کے لیے چپ سا ہو گیا۔ شبنم بھی دم سادھے رہی۔ پھر جیسے ملک ارشد آج کی دنیا سے نکل کر ماضی کے اس زمانے میں پہنچ گیا جہاں وہ تھا اور تبسم تھی۔

"ہماری شادی کو آٹھ برس ہو چکے تھے لیکن صرف پہلے دو سال ہی خوشگوار گزرے۔ وہ بھی اس لیے نہیں کہ تبسم ان دنوں میری بہت وفادار تھی۔ بلکہ اس لیے کہ مجھے اس کی بے وفائیوں کا علم ہی نہ ہو سکا۔ کبھی شک بھی نہ گزرا۔ میں تو اسے پا کر اتنا مدہوش ہوا تھا کہ اردگرد کی خبر ہی نہ رہی۔ پھر دھیرے دھیرے وہ مزید کھلنے لگی۔ اور میری زندگی میں انگارے بھرتے چلے گئے۔ آخری تین سال تو جیسے دوزخ کی تپتی آگ میں کاٹے ہوں۔ جس دن سے مجھے اس کے دوسرے مردوں کے ساتھ تعلقات کا علم ہوا، اسی دن سے اس کی ظاہری شرم بھی ختم ہو گئی۔ ویسے وہ کسی بھی مرد کے ساتھ دیرپا تعلق نہیں رکھتی تھی۔ سب وقتی ہوتے تھے۔ دودھ کے اُبال کی طرح۔ میں خاموش تماشائی بنا دیکھا رہتا۔ پھر اس کی ملاقات عارف رضا سے ہوئی۔ میں نے سوچا تھا کہ یہ طوفانِ عشق بھی جلد ہی جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گا۔ لیکن نہیں۔ اس بار اس نے مجھے چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے طلاق کا مطالبہ کیا۔" ملک ارشد کے چہرے پر بڑا کرب تھا۔ "لیکن میں نے اسے طلاق دینے سے صاف انکار کر دیا۔ اس لیے نہیں کہ مجھے اس سے بہت محبت تھی۔ صرف اس لیے کہ میں خود کو تماشا بنانا نہیں چاہتا تھا۔ تبسم سے شادی کرنے پر بھی بہت سے لوگوں نے میرا مذاق اڑایا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ شادی زیادہ عرصے نہیں چل سکے گی۔ میں نے ان سب کو غلط ثابت کرنے کی کوشش میں خود اپنی زندگی میں کانٹے ہی کانٹے بکھیر لیے۔ میں تبسم کو طلاق دے کر ان سب کو ہنسنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں نے اسے بہت سمجھایا۔ اس کی ہر بات ماننے کا وعدہ کیا۔ اس نے یاد دلایا کہ کبھی ہم دونوں میں بے مثال محبت تھی۔ بے کراں پیار تھا، اور پتہ ہے اس نے کیا جواب دیا؟ 'اچھا! تو تمہیں یہ غلط فہمی ہے کہ میں نے تم سے محبت کی شادی کی تھی۔' وہ حقارت سے ہنسی۔ 'سنو، اور اچھی طرح سنو۔ میں نے تم سے اس لیے شادی کی تھی کہ تم دولت مند آدمی تھے، اور مجھے دولت سے پیار ہے۔'

"تو پھر اب طلاق کیوں لے رہی ہو؟ کیا اب تمہیں دولت کی ضرورت نہیں؟"

"میں تم سے بور ہو گئی ہوں ارشد! اور پھر تمہیں یوں سستا تو نہیں چھوڑوں گی۔"

"کیا کہنا چاہتی ہو؟"

نیشنل بینک آف آئرلینڈ کی پیشکش!
اسی سال سے زیادہ عمر کے افراد کو دس لاکھ پونڈ تک کی رقم قرض دی جا سکتی ہے بشرطیکہ وہ عمر کی تصدیق کے لئے اپنے دادا یا دادی یا دونوں کو لے کر آئیں۔

"تم مجھے طلاق کے ساتھ ساتھ پچاس لاکھ روپیہ بھی دو گے۔" وہ آرام سے بولی۔ میں حیران رہ گیا۔

"تم بے شک طلاق لے لو لیکن رقم تمہیں نہیں ملے گی۔" وہ اس کی نہ حق دار تھی نہ اہل۔ میرے اس جواب پر اسے شدید دھچکا پہنچا۔

"تم ضرور دو گے یہ رقم۔" وہ باقاعدہ دھمکیوں پر اتر آئی۔ "میں تمہیں عدالت میں گھسیٹوں گی۔ تمہیں اچھی طرح بدنام کروں گی۔"

"کس سلسلے میں بدنام کرو گی مجھے؟"

"یہی کہ تمہارے دوسری عورتوں کے ساتھ تعلقات ہیں۔" وہ کس بے حیائی کے ساتھ مجھ پر یہ گھٹیا الزام لگا رہی تھی۔

"تم جانتی ہو یہ جھوٹ ہے۔"

"میں گواہ لاؤں گی۔ بازاری عورتوں سے تمہارے خلاف بیانات دلواؤں گی۔ تمہاری تصویریں اخباروں میں چھپیں گی۔ تم ساری عمر مقدمہ بازیوں میں پھنسے رہو گے۔"

اس نے میری کمزور رگ پکڑ لی۔ وہ جانتی تھی میں صرف ایک چیز سے ڈرتا ہوں۔ بدنامی۔ میں خود بڑے سے بڑا وکیل کر سکتا تھا۔ ان تمام الزامات کو جھٹلا سکتا تھا بلکہ الٹا تبسم کو رسوا کر سکتا تھا لیکن ایک دفعہ اپنا اچھلا ہوا نام لوگوں کے ذہنوں سے کھرچ نہیں سکتا تھا اور تبسم کو تو اپنی بدنامی بھی شہرت نظر آتی تھی۔ لیکن میں پھر بھی اس کے سامنے ڈٹا رہا۔

"ٹھیک ہے تبسم! جو تمہارے دل میں آئے کرو۔ لیکن اس طرح نہ اس طرح میں تمہیں ایک پیسہ بھی نہیں دوں گا۔"

اس نے بے پناہ حیرت سے مجھے دیکھا۔ میرا جواب اس کی توقعات کے بالکل برعکس تھا۔

"اوکے ارشد! یوں تو یونہی سہی۔ میرا خیال ہے کہ اب ہمارے درمیان مفاہمت کی کوئی گنجائش نہیں۔ ہم اب جنگ کی حالت میں ہیں، اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔" اس کی

آنکھوں میں ظالمانہ چمک تھی۔ میں پریشان سا ہو گیا۔ وہ بڑے اعتماد سے اٹھی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"اور اگلی شام جب میں نے اسے دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ وہ اپنے بہترین لباس میں تھی۔ بالوں کو بڑے سلیقے سے سنوار رکھا تھا۔ وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ اس کا اک اک انداز رجھانے والا تھا۔ میں سمجھا وہ ڈنر میں کہیں جا رہی ہے۔ لیکن جب کھانے کی ٹیبل پر پہنچا تو وہ پہلے سے موجود تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی۔ پتہ نہیں اس کی مسکراہٹ میں کیا تھا۔ کچھ عجیب سی کیفیت تھی۔ تضحیک، نفرت، تمسخر، احساسِ برتری۔ میں نے اس پر سے نظریں ہٹا کر کھانے پر مرکوز کر لیں اور دو چار لقمے لے کر اٹھ گیا۔"

"ابھی میٹھا آ رہا ہے سر!" نوکر نے کہا۔

"نہیں شکریہ۔ مجھے سبز چائے بھجوا دو اسٹڈی میں۔"

"میں واپس اسی کمرے میں آ گیا۔ وہاں اس میز پر۔ اس کرسی پر۔" اس نے اشارے سے شبنم کو بتایا۔ شبنم بھی جیسے اس کے ساتھ ہی ماضی میں سفر کرتی اس منظر تک پہنچ گئی۔

"میرے پیچھے ہی وہ بھی آ گئی۔ "میں نے کافی کے لیے کہا ہے۔" اس نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا ہے۔ میں نے چاہا کہ اس سے کہوں میں سبز چائے پینا چاہ رہا ہوں، لیکن میری اس بات سے بحث کے دروازے کھل جاتے اس لیے خاموش رہا ہم دونوں ہی چپ چاپ بیٹھے رہے۔ نوکر کافی لایا تو وہ خود ہی بنانے اٹھ کھڑی ہوئی، جو کہ اس کی فطرت کے خلاف تھا۔ میرے دل میں ایک موہوم سی امید جاگی کہ شاید وہ شرمندہ ہے مفاہمت پر آمادہ ہے۔ اس نے ایک پیالی اپنے لیے بنائی اور ایک میرے سامنے رکھتے ہوئے وہ پھر اسی انداز میں مسکرائی۔ مجھے کافی کے ساتھ سگار پینا بہت اچھا لگتا ہے۔ میں نے نوکر کو بلا کر اپنے کمرے سے سگار منگوائے۔ وہ اپنی مخصوص آرام دہ کرسی پر بیٹھی دھیرے دھیرے جھولتی رہی۔ رہ رہ کر مجھے دیکھتی رہی۔ نوکر سگار لے کر آیا اور ساتھ ہی اس سے مخاطب ہوا۔

"آپ کا فون ہے بیگم صاحبہ! عارف رضا صاحب کا۔"

"وہ تڑپ کر اٹھی۔ کافی کا پیالہ میز پر رکھ کر وہ فون سننے کے لیے باہر نکل گئی۔ حالانکہ فون کا ایک کنکشن یہاں بھی تھا۔ لیکن شاید وہ میرے سامنے بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔" نوکر سگار میز پر رکھ کر واپس مڑا تو اس کا ہاتھ تبسم کی کافی کے پیالہ پر لگا، اور وہ الٹ گیا۔ ساری کافی گر گئی۔ ملازم کی آنکھوں میں خوف جھلک رہا تھا۔ وہ تبسم کے غصے سے واقف تھا۔ اس نے مدد طلب نظروں سے مجھے دیکھا۔ "میر اکپ وہاں رکھ دو، اور یہ خالی کپ ادھر لے آؤ۔ اور گری ہوئی کافی کو جلدی سے صاف کر دو۔" ملازم نے جلدی جلدی یہ کام کیا اور بھاگتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ میں نے سگار سلگایا اور کچھ ضروری کاغذات کے مطالعے میں مصروف ہو گیا۔ چند لمحوں بعد تبسم مسکراتی ہوئی اندر آئی۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ اپنا پیالہ اٹھا کر وہ میرے پاس آ کھڑی ہوئی۔ "اوہ تم نے اکیلے اکیلے ہی کافی پی لی۔ میرا انتظار تو کرتے۔" میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے ایک دو چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرے پھر بولی۔ "میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں، نیند آ رہی ہے۔" وہ اپنے کپ سمیت اوپر چلی گئی۔"

ملک ارشد پھر چند لمحوں کو خاموش ہو گیا۔ پھر شبنم سے براہِ راست مخاطب ہو کر بولا۔

"میں نے تمہیں شاید بتایا نہیں کہ ہماری خواب گاہیں الگ الگ تھیں۔ شادی کے تین سال بعد ہی اس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا۔ ہاں تو وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں اکیلا بیٹھا سوچتا رہا، حیران ہوتا رہا کہ کیا یہ وہی تبسم ہے جس سے ایک زمانے میں مجھے عشق تھا۔ ایک بات تو میں اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اگر اس نے مجھے بدنام کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو وہ ایسا ضرور کرے گی۔ پچاس لاکھ میں اگر عزت بچائی جا سکتی ہے تو سودا برا نہیں۔ پھر میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس کا مطالبہ پورا کر کے اسے اپنی زندگی سے نکال دوں گا۔ یہ طے کر کے میرا دل ذرا ہلکا ہو گیا۔ اگلی صبح میں اسے اس سودے پر اپنی رضامندی دینے والا تھا۔

میں رات گئے تک یہاں بیٹھا رہا۔ پھر اوپر کمرے میں جا کے سو گیا۔ دیر سے سونے کی وجہ سے صبح نو بجے میری آنکھ کھلی۔ میں چاہتا تھا کہ جلد از جلد تبسم کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دوں۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی انتقامی کارروائی کرے میں اس کا منہ دولت سے بھر دوں۔ میں اس کے کمرے کے پاس گیا۔ پھر ہولے سے دروازے پر دستک دی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ میں نے دوبارہ کھٹکھٹایا۔ تبسم عام طور پر صبح جلدی اٹھ جاتی اور لان میں جا کر ورزش کیا کرتی تھی۔ اسے اپنے بدن کی خوبصورتی کا جنون کی حد تک خیال تھا۔ میں نے اب کے قدرے زور سے دستک دی۔ پھر ہینڈل کو گھمایا۔ دروازہ لاک تھا۔ میں نے اسے پکارا۔ کوئی جواب نہ ملا۔ وہ اتنی صبح کہاں جا سکتی ہے؟ مجھے پریشانی سی ہونے لگی۔ میں نے ہاؤس کیپر کو بلایا تو اس نے بھی یہی جواب دیا کہ بیگم صاحبہ صبح سے کمرے سے باہر نہیں نکلیں۔ میں نے اس کے کمرے کی ماسٹر کی منگوائی اور دروازہ کھول دیا۔ سامنے ہی بستر پر وہ ترچھی لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے جسم پر وہی رات والے کپڑے تھے۔

پیروں میں نازک سے سرخ سینڈل تھے، چہرے پر رات کا میک اپ تھا۔ لیکن اس کی سرخ و سفید رنگت اب نیلاہٹ میں بدل چکی تھی۔ میں اس کے پاس گیا، اسے پکارا، بلایا، جھنجھوڑا لیکن بے سود۔ پھر میں نے اس کی نبض ٹٹولی۔ وہ مر چکی تھی۔

"وہ مر گئی، لیکن کیوں؟ یہ سوال مجھے پریشان کرنے لگا۔ میری وجہ سے؟ میرے دل نے جواب دیا۔ اوہ خدا۔ تو کیا وہ اپنی باتوں پر اتنی پشیمان ہو گئی تھی کہ جان سے گزر گئی۔ بستر کے نیچے کافی کا پیالہ اوندھا پڑا ہوا تھا۔ اس کی رائٹنگ ٹیبل پر مجھے چند کاغذات دکھائی دیئے۔ میں نے پہلے ایک ملازم کو ڈاکٹر کو فون کرنے کو کہا اور پھر ان کاغذات کو دیکھنا شروع کیا۔ اوپر ہی ایک سفید کاغذ پر ٹائپ شدہ مختصر سا نوٹ ملا۔ جس پر لکھا ہوا تھا۔

"ہم اب ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ ہماری زندگی جہنم کا نمونہ ہے، اس لیے بہتر یہی ہے کہ میں تمہاری زندگی سے نکل جاؤں۔ یہی ہم دونوں کے حق میں بہتر ہے۔ خدا حافظ۔"

اور بس۔ لیکن مجھ پر حیرانیوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، جب میں نے یہ دیکھا کہ اس نوٹ کے نیچے میرے دستخط ہیں۔ میری کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ میں نے دوبارہ ان کاغذات کی تلاشی لی اور تب ایک اور نوٹ مجھے ملا۔ بالکل اسی مضمون کا۔ لیکن یہ ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ تبسم کی اپنی تحریر میں۔"

ملک ارشد کے چہرے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بے پناہ اذیت سے گزر رہا ہو۔ شبنم نے ایک گہرا سانس لیا۔ "اف خدا۔ اپنی جان خود لینا کتنا اذیتناک مرحلہ ہے۔ تبسم کو کتنی تکلیف ہوئی ہوگی۔" چند لمحوں کے لیے پھر خاموشی طاری ہو گئی۔ ملک ارشد نے گہری نظروں سے شبنم کو دیکھا پھر سرد لہجے میں بولا۔ "تبسم نے خودکشی نہیں کی۔" شبنم ایک بار پھر حیرت کے سمندر میں ڈوب گئی۔ اس نے الجھی نگاہوں سے ملک ارشد کو دیکھا۔ "وہ نوٹ جو ٹائپ شدہ تھا وہ میری لاش پر پایا جانا تھا، تبسم کی نہیں۔ اور وہ جو تبسم کی تحریر میں تھا وہ اس نوٹ کا رف تھا۔"

"کیا مطلب؟ میں کچھ نہیں سمجھی۔"

"تبسم نے بڑی کامیابی سے میری موت کا پلان ترتیب دیا تھا۔ خودکشی کا خط بنایا۔ پھر میرے ہی ٹائپ رائٹر پر اسے ٹائپ کیا۔ نیچے بڑی فنکاری سے میرے دستخط کیے۔ پھر کافی کا پیالہ تیار کیا۔ سب کچھ بالکل ٹھیک تھا لیکن ملازم کی غفلت سے اس کی کافی کا پیالہ گر گیا۔ میں نے اپنا کپ اس کے آگے رکھوا دیا۔ میرا کپ خالی دیکھ کر وہ مطمئن ہو کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور خود ہی اپنے پلان کا شکار ہو گئی۔ پولیس نے کپ کی تہہ میں زہر کے نشانات بھی پا لیے۔ اس نے بڑی فنکاری سے یہ پلان بنایا تھا۔ میری موت کے بعد سب کچھ اس کا ہوتا۔ پھر وہ سودے بازی کیوں کرتی؟ میرا قتل جو بظاہر خودکشی نظر آتا اس کے تمام مسائل کا حل تھا لیکن اسے اس کا موقع ہی نہ ملا۔ وہ حادثاتی موت کا شکار ہو گئی۔"

"حادثاتی موت؟" شبنم نے دہرایا۔ "تو یہ حادثاتی موت تھی۔ نہ قتل، نہ خودکشی۔ ملک ارشد بے گناہ ہے، بے قصور ہے۔ یہ تصور بڑا خوش کن تھا۔"

"تم سوچ رہی ہو گی کہ میں نے اس معاملہ میں خاموشی کیوں اختیار رکھی۔ پولیس کو صحیح واقعات کیوں نہیں بتلائے؟ اس لیے شبنم کہ میں اپنی نیک نامی کی پرواہ تو کرتا ہی ہوں، میں کوئی اسکینڈل نہیں چاہتا۔ یہ بھی نہیں چاہتا کہ مرنے کے بعد تبسم کے کردار پر کیچڑ اچھلے۔ اس نے اپنے گناہوں کی سزا پا لی۔ میں نے تبسم کی اپنی تحریر میں وہ نوٹ اس کی لاش کے پاس رکھ دیا۔ پولیس مطمئن ہو گئی۔ یہ سیدھا سادا خودکشی کا کیس ثابت ہوا۔"

"اوہ ارشد! میں بہت خوش ہوں۔ میرے اندیشے غلط ثابت ہوئے۔ اب ہم... ہم دونوں نئی دنیا بسائیں گے۔" وہ شرماتے ہوئے بولی۔

ملک ارشد کے چہرے پر طمانیت تھی۔ وہ اٹھا اور اپنی

میز کی دراز سے ایک کاغذ نکال کر شبنم کو دکھایا۔ "یہ دیکھو! یہ وہ ٹائپ والا کاغذ ہے جو میری لاش پر پایا جانا تھا۔"
شبنم نے ایک نظر اس کاغذ کو دیکھا۔ پھر بولی "اب یہ سب بھول جائیے۔ ماضی کو مت دہرائیے۔"
"ہاں! میں تمہیں تبسم کے روپ میں نہیں دیکھنا چاہتا۔ تمہاری اپنی حیثیت میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمہاری اپنی منفرد شخصیت میں۔"
شبنم کے کانوں نے یہ امرت برسانے والے الفاظ پہلے کبھی نہیں سنے تھے۔ اس نے سرشاری کے عالم میں پلکیں موند لیں۔

شبنم کو انسپکٹر جہاں زیب کا پیغام دو دن بعد ملا۔ آنٹی کریم الدین نے اسے فون کیا۔ وہ گھر پر نہ تھی۔ عالیہ فلائیٹ پر تھی۔ دوسرے دن پھر انہوں نے فون کیا۔ تب اسے پتہ چلا کہ انسپکٹر جہاں زیب فوری طور پر اس سے ملاقات کا خواہشمند ہے۔ اسے شبنم کے نئے فون نمبر کا علم نہ تھا اور آنٹی کریم الدین نے بھی شبنم کی اجازت کے بغیر اس کا فون نمبر دینا مناسب نہ سمجھا۔ شبنم نے اس کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ پھر اس نے انسپکٹر جہاں زیب سے فون پر بات کی۔ انسپکٹر نے اسے فوری طور پر اپنے آفس آنے کو کہا۔ وہ پوچھتی رہی کہ آخر معاملہ کیا ہے، لیکن اس نے یہ کہہ کر فون پر بات کرنا مناسب نہیں فون بند کر دیا۔
صبح کے گیارہ بجے تھے جب وہ انسپکٹر جہاں زیب کے دفتر میں داخل ہوئی۔ یہ اس کی انسپکٹر کے ساتھ پہلی ملاقات تھی۔ اسے کسی طور یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ معصوم صورت فربہ آدمی سی آئی اے کا انسپکٹر ہے۔ کمرے میں ایک اور شخص بھی موجود تھا۔
"اچھا ہوا مس شبنم آپ آ گئیں۔ ہم دو دن سے آپ سے رابطہ قائم کرنا چاہ رہے تھے۔" پھر اس نے اس دوسرے شخص کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ نیاز علی ہیں۔ نیاز علی آپ مس شبنم کا اچھی طرح جائزہ لے لیں تاکہ بعد میں انہیں پہچاننے میں دشواری نہ ہو۔ ذرا فاصلے سے بھی دیکھ لیں۔" وہ شخص بغور شبنم کا جائزہ لینے لگا۔ وہ حیران پریشان کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ کمرے کے دروازے تک گیا۔ وہاں سے بھرپور نظروں سے اسے گھورا۔
"ٹھیک ہے سر!" اس نے سر ہلایا۔
"او کے نیاز علی! تم جا سکتے ہو۔" نیاز علی سلوٹ مارتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔
"یہ سب کیا چکر ہے؟" شبنم بگڑتے ہوئے بولی۔
"آپ تشریف تو رکھیں۔" وہ بیٹھ گئی۔ "ہم دو دن سے آپ کی تلاش میں تھے۔ آپ نے گھر بدل لیا اور پولیس میں اطلاع بھی نہ دی۔ بڑی مشکلوں سے دستیاب ہوئیں آپ۔"
"کیا مطلب؟ کیا میں مشکوک افراد کی فہرست میں ہوں؟"
"جی نہیں، ممکنہ مقتولوں کی فہرست میں ہیں۔ آپ ملک ارشد سے روز مل رہی ہیں نا؟"
"جی۔" وہ ہچکچائی۔ "کیا اس میں کوئی حرج ہے؟"
"آپ نے انہیں اس خط کے بارے میں تو نہیں بتایا جو آپ کی مرحومہ بہن نے مرنے سے پہلے آپ کو لکھا تھا؟"
"جی میں نے بتا دیا انہیں۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"
انسپکٹر جہاں زیب کھنکارا اور اپنی جذبات سے عاری آواز میں بولا۔ "ہم نے کیس دوبارہ کھول دیا ہے مس شبنم! میں اس نئی تحقیقات کا انچارج ہوں۔ اور ہمیں بھی آپ کی طرح یہ شبہ ہے کہ ملک ارشد نے اپنی بیوی کو قتل کیا تھا۔"
شبنم نے گھبرا کر اسے دیکھا۔ "لیکن آپ لوگ تو کہہ رہے تھے کہ کیس بند ہو چکا ہے۔ پھر اب کیا ہو گیا؟"
"وہ خط جو مرحومہ نے آپ کو لکھا اور یہ خودکشی کی تحریر، دونوں نے ہمیں مجبور کیا کہ ہم کیس دوبارہ کھولیں۔" انسپکٹر جہاں زیب نے فائل میں سے خط اور خودکشی والا نوٹ نکال کر شبنم کے سامنے رکھ دیا۔
"لیکن یہ تو کوئی نئی چیز نہیں۔ آپ پہلے بھی ان کے بارے میں جانتے تھے۔" شبنم نے خودکشی والی تحریر کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اسی طرح کی ٹائپ شدہ تحریر وہ ملک ارشد کے پاس دیکھ چکی تھی۔
"جی ہاں! ہم پہلے سے جانتے تھے ان کے بارے میں۔ لیکن ہم نے کبھی اس پہلو سے اس پر غور نہیں کیا اور یوں بھی حال ہی میں یہ کیس میرے پاس آیا ہے۔ دونوں تحریروں کے کاغذ دیکھیے۔ یہ خط جو آپ کے نام ہے بہت نفیس کاغذ پر لکھا گیا ہے۔ اس طرح کا پورا رائٹنگ پیڈ ہمیں تبسم کے کمرے سے مل گیا لیکن یہ خودکشی والا نوٹ۔ اس کا کاغذ غور سے دیکھیں، یہ بہت معمولی سا گھٹیا قسم کا کاغذ ہے اور اس قسم کا دوسرا کاغذ پورے گھر میں ہمیں کہیں نظر نہیں آیا۔"
"لیکن یہ تبسم کی اپنی ہینڈ رائٹنگ ہے۔"
"یقیناً یہ ان کی رائٹنگ ہے لیکن یہ ان کی خودکشی کا اعتراف نامہ نہیں ہے۔" انسپکٹر کی سرد آواز شبنم کے اعصاب منجمد کیے دے رہی تھی۔ "آپ اسے پڑھیں اور غور سے پڑھیں۔"

اس میں یہ کہاں لکھا ہے کہ وہ خودکشی کرنے والی ہے" شبنم نے پڑھنا شروع کیا۔

"ہم اب ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ ہماری زندگی جہنم کا نمونہ ہے، اس لیے بہتر یہی ہے کہ میں تمہاری زندگی سے نکل جاؤں۔ یہی ہم دونوں کے حق میں بہتر ہے۔ خدا حافظ!"

یہ وہی تحریر تھی، وہی الفاظ تھے، جو ملک ارشد نے اسے سنائے تھے۔

"انہوں نے مرنے سے تقریباً دو ہفتے پہلے یہ نوٹ تحریر کیا تھا۔ ہم نے اس کے بارے میں تحقیقات کی ہیں۔ وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ ایک ریسٹورنٹ میں دوپہر کا کھانا کھا رہی تھیں، وہیں انہوں نے ویٹر سے کاغذ قلم منگوا کر یہ تحریر لکھی۔ ان کے دوست نے بھی اس بات کی تصدیق کر دی۔ آپ بھی شاید ان سے واقف ہوں۔ مسٹر عارف رضا۔" شبنم نے بے چارگی سے سر ہلایا۔ "مسٹر عارف رضا نے بتایا کہ تبسم ملک اپنے شوہر کو چھوڑنا چاہتی تھیں۔ ان کے شوہر طلاق دینے پر راضی نہیں تھے۔ اس لیے انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ خود ان سے الگ ہو جائیں گی۔" انسپکٹر ذرا دیر کو رکا۔ "ہمارا خیال ہے کہ ملک کو کسی طرح یہ تحریر مل گئی اور انہوں نے نہایت چالاکی سے اسے خودکشی کا اعتراف نامہ بنا کر اپنی بیوی کو قتل کر ڈالا۔"

شبنم کے دل کی دھڑکن بے ترتیب سی ہو گئی۔ وہ دم سادھے بیٹھی تھی۔

"ہم جلد ہی ملک ارشد کو سوالات کے لیے یہاں بلانے والے ہیں، ویسے ہم ان کی کڑی نگرانی رکھے ہوئے ہیں۔"

شبنم کا دل ڈوب رہا تھا۔ یہ کیا ہو گیا؟ کبھی کبھی انسان کی آنکھیں دھوکا کھا جاتی ہیں۔ ضروری نہیں کہ جن باتوں کو آپ ٹھوس ثبوت سمجھ رہے ہیں وہ واقعی اتنے ٹھوس ہوں۔ یقیناً کوئی کوئی اور بھی ایسی بات ہے جو ابھی نظروں سے اوجھل ہے۔ یا بالکل سامنے ہے لیکن نظر نہیں آ رہی۔"

"اچھا۔" وہ حیرت سے بولا۔ "چلیے آپ ہمیں بھی کچھ بتا دیجئے۔"

"مجھے نہیں پتہ۔ فی الحال میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔" وہ شدید الجھن کا شکار تھی۔ کل تک اسے یقین تھا کہ ملک ارشد بے گناہ ہے، لیکن انسپکٹر کی باتیں سن کر اس کی حیثیت مشکوک نظر آنے لگی تھی اور یہ خیال ہی بے حد تکلیف دہ تھا۔ تو کیا ملک ارشد نے جو بات اسے بتائی تھی وہ ایک من گھڑت کہانی تھی۔ کیا واقعی وہ تبسم کا قاتل ہے؟

"میں جاؤں یا ابھی اور سوالات باقی ہیں؟"

"جی ہاں آپ جائیے۔ ویسے یہ کہنے کی ضرورت تو باقی نہیں رہ جاتی کہ آپ، لوگوں سے ملنے جلنے میں ذرا محتاط رہیں۔"

وہ جاتے جاتے دروازے پر رک گئی۔ کوئی ایسی بات ضرور تھی جو اس کے دماغ میں کلبلا رہی تھی۔ لیکن واضح نہیں ہو رہی تھی۔ کوئی خیال جو بار بار اس کی گرفت میں آتے آتے رہ جاتا تھا۔

وہ باہر نکل کر آئی اور پیدل ہی چلنا شروع کر دیا۔ وہ اپنے خیالوں میں گم چلی جا رہی تھی۔ یکلخت اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ وہ بات جو اسے پریشان کر رہی تھی اب روشن ہو کر سامنے آ گئی تھی۔ ایک ٹیکسی اس کے قریب سے گزری۔ اس نے ہاتھ دے کر اسے روک لیا۔ اس کی منزل رین بو ایجنسی تھی۔

شبنم کا خیال تھا کہ اگر یہ بات صحیح ہوئی تو ملک ارشد کی بے گناہی ثابت ہو سکے گی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ یہ ثبوت خود اس کی اپنی خوشیوں کے لیے کتنا اہم ہے۔ اس نے گھڑی دیکھی سہ پہر کے تین بجے تھے۔ جمعرات کی وجہ سے آج ہاف ڈے تھا۔ اسے جلد از جلد ایجنسی پہنچنا تھا اگر دیر ہو گئی تو آفس بند ہو جائے گا۔ کل جمعہ ہے اور اتنے میں پتہ نہیں کیا سے کیا ہو جائے۔

آفس تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ عارف رضا بھی جا چکا تھا۔ مسز واحدی اپنے کمرے میں موجود تھیں اور جلدی جلدی کام نمٹا رہی تھیں۔

"ہیلو شبنم کیسی ہو؟"

"بالکل ٹھیک۔ یہاں سے گزر رہی تھی سوچا آپ سے پوچھ لوں کہ اسٹلز کب بنیں گی۔"

"میں تمہیں فون کر کے بتا دوں گی۔"

شبنم نے ان کی میز پر نظر دوڑائی۔ وہاں ایجنسی کا لیٹر پیڈ پڑا تھا۔ اس نے وہ اٹھا لیا اور یوں ظاہر کرنے لگی گویا کوئی ضروری بات یا حساب کتاب لکھ رہی ہو۔ مسز واحدی اپنے کام میں مصروف تھیں۔ "چائے پیو گی؟"

"نہیں۔" اس نے لیٹر پیڈ کا صفحہ پھاڑ لیا۔ "اچھا میں اب چلوں۔ خدا حافظ۔"

وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ اس کی ٹیکسی باہر کھڑی تھی، اور اب اس کی اگلی منزل ملک پیلس تھا۔

اس نے ٹیکسی سے اتر کر کرایہ ادا کیا۔ ذرا سے فاصلے پر ایک آدمی بظاہر لاپروا بنا کھڑا تھا۔ لیکن شبنم نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی شخص تھا جو انسپکٹر جہاں زیب کے آفس میں تھا، نیاز علی۔

وہ دوڑتی ہوئی بنگلے کے اندر داخل ہو گئی۔ چوکیدار اور دیگر ملازمین کو یقیناً ملک ارشد کی خصوصی ہدایات تھیں۔ اسے سیدھا اسٹڈی روم میں پہنچا دیا گیا۔

"آپ بیٹھیں، میں صاحب کو اطلاع کرتا ہوں۔ وہ اوپر اپنے کمرے میں ہیں۔" ہاؤس کیپر اسے احترام سے بٹھا کر اُلٹے قدموں واپس ہولیا۔
شبنم نے بیرونی کھڑکی کا پردہ ذرا سا سرکا کر جھانکا۔ وہ شخص اپنی جگہ پر مستعد کھڑا تھا۔
"شبنم!" ملک ارشد نے پکارا۔ "کیا ہوا؟ خیریت تو ہے تم اس قدر پریشان کیوں نظر آ رہی ہو؟"
"وہ دیکھیے باہر۔ ایک آدمی کھڑا آپ کے گھر کی نگرانی کر رہا ہے۔ وہ پولیس کا آدمی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ آپ نے تبسم کو قتل کیا ہے۔"
"کیا کہہ رہی ہو تم؟" ملک ارشد نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔
"آج مجھے انسپکٹر جہاں زیب نے بلوایا تھا۔ میں اس سے ملنے گئی تھی۔ وہ آپ کو بھی تھانے بلواتے گا۔ مزید سوالات کے لیے۔ انہوں نے... انہوں نے کیس دوبارہ کھول دیا ہے۔" ملک ارشد یہ بات خود بھی جانتا تھا۔
"انہوں نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ وہ خودکشی والا خط تبسم نے مرنے سے بہت پہلے لکھا تھا۔ عارف رضا نے اس کی گواہی دی ہے کہ وہ نوٹ تبسم نے اس کی موجودگی میں ایک ریسٹورنٹ میں لکھا تھا اور وہ خودکشی کا اعتراف نہ تھا۔ وہ آپ کو چھوڑنے والی تھی۔ انسپکٹر جہاں زیب کا خیال ہے کہ آپ کو کسی طرح یہ تحریر مل گئی اور آپ نے تبسم کو قتل کر کے اس سے فائدہ اٹھا لیا۔" وہ سانس لینے کو رکی۔ پھر بے پناہ اداسی سے بولی۔ "اب آپ کو سب حقیقت بتانی پڑے گی ارشد! یہ خاموشی توڑنی پڑے گی۔"
"تم نے دیکھا۔" وہ سرگوشی میں بولا۔ "اس نے مر کر بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔"
"نہیں نہیں۔ ایسا مت کہیں ارشد! تبسم مر چکی ہے لیکن آپ زندہ ہیں۔ اپنی زندگی کے لیے آپ کو لڑنا ہوگا۔ پلیز! میری خاطر۔ ہم آپ کی بے گناہی ثابت کر سکتے ہیں۔ میں جانتی ہوں اس تمام چکر میں کس کا ہاتھ ہے۔ کون آپ کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ عارف رضا۔"
"عارف رضا؟" ملک ارشد نے چونک کر پوچھا۔ "یہ تم کیسے کہہ رہی ہو۔ اس رات یہاں صرف میں اور تبسم تھے۔"
"وہ ٹائپ والا نوٹ جو آپ کی لاش پر پایا جانا تھا۔ وہ جس پر آپ کے دستخط بنائے گئے تھے وہ کاغذ ریز ایجنسی کے لیٹر پیڈ کا کاغذ ہے۔ جب آپ نے مجھے وہ کاغذ دکھایا تھا جب سے ہی وہ میرے ذہن میں کھٹک رہا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ میں اسے پہلے بھی دیکھ چکی ہوں۔ وہ عام قسم کا بازار میں پایا جانے والا کاغذ نہیں ارشد! یہ دیکھیے میں اپنے ساتھ اسی طرح کا دوسرا کاغذ لائی ہوں۔" اس نے پرس میں سے کاغذ نکالا۔ "آپ دونوں کو ملا کر دیکھ لیں۔" ملک ارشد اسے خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا۔
"تم نے کیوں یہ سب کیا شبنم! تبسم کا کیس ختم ہو چکا تھا۔ تم نے آ کر اسے کھلوایا۔ اور... اور اب...؟"
"مجھے بہت افسوس ہے ارشد! لیکن اگر میں ایسا نہ کرتی تو آپ سے کیسے مل پاتی؟ آپ مجھے کیسے ملتے؟"
"کسی قتل کے ملزم سے محبت کرنے سے تو بہتر ہے انسان کبھی محبت ہی نہ کرے۔" شبنم کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ وہ تڑپ کر اس کے پاس آیا۔ "سوری شبنم! میرا مطلب تمہیں دکھی کرنا نہیں تھا۔ ٹھہرو، میں وہ کاغذ نکالتا ہوں۔" ملک ارشد اپنی دراز کھولنے لگا۔ شبنم نے ایک بار پھر کھڑکی سے باہر جھانکا۔ وہ شخص ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔
"یہ لو۔" اس نے کاغذ شبنم کو دیا۔ شبنم نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا دوسرا کاغذ اس کے ساتھ میز پر بچھا دیا۔
"یہ دیکھیے۔" ملک ارشد نے بھی جھک کر دیکھا۔ دونوں کاغذ ایک جیسے تھے۔ پھر اس نے ٹیبل لیمپ جلا کر روشنی میں اس کا جائزہ لیا۔ "ہاں، یہ دونوں بالکل ایک جیسے ہیں۔"
"یہ کاغذ جو میں لائی ہوں ریز ایجنسی کا لیٹر پیڈ ہے۔ اس کے بالائی حصے پر ایجنسی کا نام اور مونوگرام وغیرہ ہے جب کہ آپ کے پاس جو کاغذ ہے وہ سادہ ہے اور لمبائی میں اس سے چھوٹا ہے۔ دونوں کو اوپر تلے رکھیں صرف یہ چھپا ہوا حصہ اضافی ہے۔ یعنی انہوں نے اس کے اوپر کا حصہ کاٹ ڈالا۔ اور سادہ حصہ اپنے مصرف میں لے آئے۔"
"بہت ذہین ہو۔" وہ مسکرایا لیکن شبنم نہ مسکرا سکی۔ "لیکن شبنم میری جان! ایک بات ذرا سوچو۔ اگر یہ واقعی عارف رضا کا پلان ہے تو آخر اس نے اپنی ہی ایجنسی کا کاغذ کیوں استعمال کیا؟ وہ بہت ذہین اور چالاک آدمی ہے۔ وہ یہ غلطی کیوں کرنے لگا۔" وہ دفعتاً خاموش ہو گیا۔ پھر جیسے کسی نکتے کو پا گیا ہو۔ اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ "اوہ... ہاں... ٹھیک تو ہے نہ اسے میرے دستخط کرنے کے لیے کسی آرٹسٹ کی ضرورت پڑی ہوگی، اور وہ آرٹسٹ اسے اپنی ایجنسی سے ہی ملا ہوگا۔ پہلے بھی دو چار بار ایسا ہوا کہ میں ملک سے باہر ہوا تو انہیں کسی کام کے لیے میرے دستخطوں کی ضرورت پڑی۔ ایسی سچویشن پر میرا سیکرٹری میری اجازت لے کر انہیں جعلی دستخط بنانے کو کہہ دیتا تھا۔ اوہ خدا۔ یقیناً یہی بات ہوگی۔ عارف رضا نے کسی بہانے اپنے آرٹسٹ سے سادہ کاغذ پر میرے دستخط کروا لیے ہوں گے۔"

"ہم جیت گئے ارشد!" وہ خوشی سے چہکی۔ "ہم نے سارا معمہ حل کر لیا۔ عارف رضا نے جعلی سائن بنوا کر وہ تبسم کو دیا۔ تبسم نے آپ کے ٹائپ رائٹر پر اسے ٹائپ کیا۔"

"لیکن عارف رضا کو میری موت سے کیا فائدہ ہوتا۔ وہ تبسم کو طلاق مانگنے پر زور دے رہا تھا اور جلد یا بدیر مجھے بھی تبسم کی بات ماننی پڑتی۔"

"آپ بھول رہے ہیں کہ آپ بہت امیر آدمی ہیں اور عارف رضا کی نظریں یقیناً آپ کی دولت پر ہوں گی۔"

"ہاں اور عین ممکن ہے وہ تبسم سے زیادہ دولت کا خواہشمند ہو۔ کس قدر مایوس ہوا ہوگا وہ جب تبسم خود ہی اس زہر کو پی گئی۔ دولت اور عورت دونوں اس کے ہاتھ سے نکل گئیں۔ اور اب... اب وہ دوبارہ مجھے پھنسانا چاہ رہا ہے۔ تبسم کے قتل کے الزام میں گرفتار کروانا چاہتا ہے۔ غضب کا شاطر ہے۔"

"لیکن اب اسے مات ہو جائے گی۔ آخری مات۔ آپ کے پاس ثبوت ہے۔"

"ثبوت!" وہ پھیکی سی ہنسی ہنسا۔ "یہ کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے شبنم!"

"کیوں آخر؟ آپ نے خود دیکھا کہ دونوں کاغذ ایک جیسے ہیں۔ ریمن بولا ایجنسی کے لیٹر پیڈ کے۔ یہ واضح ثبوت ہے کہ عارف رضا اس میں ملوث ہے۔"

"پولیس اسے ذرا سی بھی اہمیت نہیں دے گی۔"

"کیوں؟" وہ روہانسی ہو گئی۔

"ایجنسی کے لیٹر پیڈ کا کاغذ کوئی بھی وہاں سے بآسانی اڑا کر لا سکتا ہے، جیسے تم لے آئی ہو۔ اور میرا تو وہاں اکثر ہی آنا جانا رہتا ہے۔ میں خود بھی تو یہ کاغذ لا سکتا تھا۔"

شبنم بے جان سی صوفے پر بیٹھ گئی۔

کوئی اور ثبوت۔ کوئی ایسا ٹھوس ثبوت جو یہ ثابت کر دے کہ تبسم اور عارف رضا کا باہم گٹھ جوڑ تھا۔

ملک ارشد کا ڈرائیور اسے گھر چھوڑ کر جا چکا تھا۔ شبنم بلڈنگ کے گیٹ پر ہی کھڑی رہی، اوپر فلیٹ پر نہیں گئی۔ جب ڈرائیور اور گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئے تو وہ پھر چل پڑی۔ عارف رضا کا فلیٹ اس کے فلیٹ سے زیادہ دور نہ تھا۔ وہ پیدل چلتی ہوئی چند منٹ میں وہاں پہنچ گئی۔ عارف رضا کی گاڑی نیچے گیراج میں موجود تھی۔ وہ بڑی جوانمردی سے اوپر اس کے فلیٹ کے دروازے تک جا پہنچی۔ وہ جانتی تھی کہ عارف رضا اپنے فلیٹ میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اگر اس کے لیے شبنم کی جان لینا ضروری ہی ہوا تو وہ اس قتل کو بھی خودکشی ہی ظاہر کرے گا۔ اس خیال نے اسے دلیر بنا دیا تھا۔ دروازہ خود عارف رضا نے کھولا۔ "آہا! میں ابھی تمہارے ہی بارے میں سوچ رہا تھا۔ صبح سے تین بار فون کر چکا ہوں۔ بہت مصروف رہیں آج!"

"ہاں۔" وہ دبی ہوئی آواز میں بولی۔

"کوئی خاص قسم کی مصروفیت تھی کیا؟" اس کی آواز میں دبا ہوا ہلکا سا طنز تھا جسے شبنم نظرانداز کرتی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"میں اپنے لیے کافی بنانے جا رہا تھا، تم بھی پیو گی؟"

اس نے سر کو نفی میں ہلا دیا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر اس نے بولنے کی کوشش کی تو شاید آواز ساتھ نہ دے۔ کافی کے نام پر اسے تبسم کا انجام یاد آ گیا۔ اس کے چہرے کی بدلتی ہوئی رنگت عارف رضا نے بھی تاڑ لی۔

"پریشان نظر آ رہی ہو تم۔ کیا بات ہے؟" پھر خود ہی جواب بھی دے دیا۔ "وہی تبسم کا مسئلہ ہوگا۔ ہے نا؟" شبنم خاموش رہی۔ "کچھ بولو تو۔ کوئی نئی بات معلوم ہوئی ہے کیا؟ خدا کے لیے شبنم! ہم دونوں ہی اس قصے میں ملوث ہیں۔ اب تم مجھ سے ہی چھپا رہی ہو؟"

"ہم دونوں نہیں عارف!" شبنم نے بمشکل اپنی آواز پر قابو پایا۔ "تم... صرف تم۔"

"کیا مطلب؟" وہ تیزی سے بولا۔

"میں ملک ارشد کے بارے میں کھوج لگانے میں اتنی گم ہوئی کہ کسی اور جانب دیکھ ہی نہ سکی۔"

"پہیلیاں مت بجھواؤ۔" وہ اب باقاعدہ ناراض ہو رہا تھا۔

"میں تم سے تو سوال جواب کرنا بھول ہی گئی تھی عارف! تمہیں تو میں نے الگ ہی کر دیا تھا، لیکن اب... اب میں سب کچھ سمجھ گئی ہوں، سب جان گئی ہوں۔ مجرم ملک ارشد نہیں، تم ہو۔" اس کا لہجہ سرد ہو گیا تھا۔ "تم نے اور تبسم نے ملک ارشد کو ٹھکانے لگانے کی سازش کی۔ تبسم نے اس کی کافی میں زہر ملایا لیکن پھر گڑبڑ ہو گئی اور وہ خود اس زہر کو پی گئی۔"

"تم جانتی ہو کہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"اچھی طرح جانتی ہوں عارف! اور میرے پاس اس کا ثبوت بھی ہے۔"

"اوہ۔" وہ ہولے سے بولا۔ "اور وہ ثبوت کیا ہے؟ کیا میں جان سکتا ہوں؟"

"میں اسی لیے آج یہاں آئی ہوں، تمہیں بتانے۔" وہ ذرا سا رکی پھر بولی۔ "تبسم نے مرنے سے پہلے مجھے ایک خط لکھا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ اب اسے طلاق وغیرہ کے لیے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ مسئلے کا ایک دوسرا حل نکل آیا ہے اور یہ کہ وہ جلد ہی دوسری شادی کرنے والی ہے اور وہ دونوں ڈھاکہ آنے والے تھے۔ وہ خط

اس نے مرنے سے ایک روز پہلے لکھا تھا اور عارف! وہ جس کسی سے بھی شادی کرنے والی تھی وہ جانتا تھا کہ ملک ارشد مرنے والا ہے۔۔ قتل ہونے والا۔ ان کے راستے سے ہٹنے والا ہے اور پولیس اس قتل کو خودکشی سمجھ لے گی۔"

عارف رضا کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ "کیا واقعی؟" وہ بولا۔

"ہاں۔ اس سارے کھیل کے پیچھے تم تھے عارف! تم نے تبسم سے وہ خودکشی والا خط لکھوایا۔ پھر ملک ارشد کے جعلی دستخط بنوالیے۔ تم نے اور تبسم نے یہ سارا منصوبہ مل کر بنایا تھا۔ صرف دولت کی خاطر۔"

"ہونہہ!" عارف رضا کے ہونٹوں پر وہی تضحیک آمیز ہنسی تھی۔ "یہ کہانی اس قدر لغو اور مضحکہ خیز ہے کہ میں اس کی تردید کرنا بھی حماقت سمجھتا ہوں۔ اچھا تو تبسم نے تمہیں لکھا تھا کہ وہ شادی کر کے ڈھاکہ آنے والی ہے۔ ہو سکتا ہے اس کا یہی ارادہ ہو لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ وہ شخص میں نہیں تھا۔ اس کے درجنوں دوست تھے۔ یہ تو اس کا دل پسند مشغلہ تھا مرغوب ترین کھیل تھا تمہیں خود بھی یہ بات پتہ ہوگی۔ پھر کسی طرح ملک کو بھی اس کی سن گن مل گئی ہوگی کہ اس بار تبسم سچ مچ اسے چھوڑ کر جانے والی ہے اور اس نے اسے زہر دے دیا۔" بات پوری کرنے کے بعد عارف رضا نے ایک جماہی لی۔ "اف! مجھے تو سخت بھوک لگ رہی ہے۔ چلو ہائیڈ آؤٹ پر اسٹیک کھاتے ہیں لیکن پہلے کافی پی لیں۔"

"لیکن وہ خودکشی والا خط۔" شبنم نے اسے دوبارہ موضوع پر لاتے ہوئے کہا۔ وہ اب الجھ سی گئی تھی۔ اس کے لیے عارف رضا کا رد عمل بہت حیران کن تھا۔ وہ اس سارے قصے کو مضحکہ خیز بنا رہا تھا۔ وہ بور نظر آ رہا تھا اسے بھوک لگ رہی تھی۔

"ہاں وہ... وہ تو اس نے میرے سامنے ہی لکھا تھا لیکن وہ خودکشی وغیرہ کا اعتراف نہیں تھا۔ وہ تو خدا حافظ کہنا چاہ رہی تھی ملک کو۔" وہ ذرا سا رکا، پھر سنجیدگی سے بولا۔ "مجھے تو گمان بھی نہیں تھا کہ ملک ارشد اتنا چالاک ثابت ہوگا کس ہوشیاری سے اس نے تمہاری برین واشنگ کر ڈالی۔ خود کو معصوم اور مظلوم بنا کر مجھے مجرم ٹھہرا دیا، لیکن سی آئی اے انسپکٹر جہان زیب اس کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ چھوڑے گا نہیں اسے۔" وہ کافی بنانے کچن میں چلا گیا اور شبنم دروازہ کھول کر باہر چلی گئی۔

○

صبح صبح فون کی گھنٹی کی آواز سے شبنم کی آنکھ کھلی۔ لائن پر ملک ارشد تھا۔ "صبح بخیر شبنم!"

"صبح بخیر۔"

"سوری میں نے تمہیں نیند سے اٹھا دیا۔"

"اچھا کیا آپ نے، نو بج رہے ہیں۔ مجھے اب اٹھ ہی جانا چاہیے تھا۔"

"بات یہ ہے۔" وہ ذرا سا ہچکچایا۔ "کل تمہارے جانے کے بعد مجھے خیال آیا میں نے تبسم کی ڈائری میں ایک جگہ ش۔گ لکھا دیکھا تھا۔ یہ یقیناً تمہارے نام کا مخفف ہے۔"

"ہاں، ہو تو سکتا ہے، لیکن یہ کس سلسلے میں لکھا تھا اس نے؟"

"یہ ڈائری اس کی اپائنٹمنٹ بک تھی۔ اس نے ۱۸ر جولائی کے صفحے پر اپنے ہاتھ سے ش۔گ لکھا ہوا ہے۔ یعنی وہ اس روز تم سے ملاقات کرنے والی تھی۔"

"اوہ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس نے ۱۸ر جولائی کی کسی پرواز سے ڈھاکہ کے لیے سیٹ بک کروائی ہوگی۔"

"ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔"

"کراچی سے ڈھاکہ پی آئی اے اور بیمان کی پروازیں جاتی ہیں۔ ہمیں دونوں ایئر لائنوں کو چیک کرنا چاہیے۔" اس کی آواز میں جوش سا آ گیا تھا۔

"کیا ان کے پاس ریکارڈ ہوگا؟"

"یقیناً۔ بیمان سے تو میں فوراً ہی پتہ کروا لوں گی۔ ویسے بھی زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ اس نے بنگلہ دیش ایئر لائن سے ہی بکنگ کروائی ہوگی۔"

"ٹھیک ہے۔ تم انکوائری کرو، کچھ پتہ چل جائے تو مجھے بتانا۔"

فون کا ریسیور رکھتے ہی پھر گھنٹی بجنے لگی۔ یہ مسز واحدی تھیں۔

"شبنم کچھ کلوز اپس بنانے ہیں تمہارے۔ یہاں اسٹوڈیو میں ہی۔ فری ہو تو آ جاؤ۔"

شبنم نے گھڑی دیکھی اور پھر انہیں ایک بجے دوپہر کا وقت دے دیا۔

○

ایئر پورٹ پر بیمان کے کاؤنٹر پر عبدالحئی موجود تھا۔ شبنم کو دیکھ کر وہ بڑی گرمجوشی سے مسکرایا۔

"آپ ابھی کراچی میں ہی ہیں؟"

"ہاں، بس تھوڑے دن باقی ہیں۔ تم سے ایک ضروری کام آ پڑا ہے۔"

"جی جی فرمائیے۔"

"۱۸ر جولائی کی کراچی ڈھاکہ فلائیٹ پر دو ٹکٹ بک ہوئے تھے۔" شبنم جانتی تھی کہ تبسم تنہا نہیں بلکہ کسی کے ساتھ ڈھاکہ

جانے والی تھی۔ "مجھے ان کے ناموں کی کنفرمیشن چاہیئے۔"

"لیکن یہ تو بہت مشکل ہے۔ مسافروں کی لسٹ تو اب تک محفوظ نہیں رہی ہوگی۔"

"نہیں، یہ مشکل نہیں ہے کیونکہ یہ "نوشو" ہوا تھا۔ مسافر اس فلائیٹ سے روانہ نہیں ہوتے۔ تم کوشش کرو تو ٹکٹ کا کاؤنٹر پارٹ ڈھونڈ لوگے۔ اور اگر ٹکٹ کینسل کروائے گئے ہیں تو ان کی کینسلیشن کا بھی ریکارڈ ہونا چاہیئے اور یوں بھی یہ بات زیادہ پرانی نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے مس شبنم! میں کوشش کروں گا۔ مسافروں کے نام؟"

"تبسم اور عارف رضا۔ مجھے آج ہی جواب چاہیئے۔"

"تھوڑا وقت دیں مجھے۔ پرانا ریکارڈ نکالنا پڑے گا شاید ٹاؤن آفس جانا پڑے۔ شام تک انشاء اللہ معلوم کرلونگا۔"

"اوکے۔ ٹیک یور ٹائم۔ پھر مجھے فون کردینا۔ ایک بجے سے چھ بجے تک میں اس نمبر پر ملوں گی۔" اس نے ایک کاغذ پر رین بو ایجنسی کا نمبر لکھا۔ "اور چھ بجے کے بعد گھر پر ہوں گی۔ وہاں کا نمبر یہ ہے۔" شبنم نے دوسرا نمبر بھی لکھ دیا۔

ایئرپورٹ سے ٹیکسی کرکے وہ سیدھی رین بو ایجنسی پہنچی۔ ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ اسنے صبح ناشتہ تک نہیں کیا تھا۔ مسز واحدی نے پہلے اس کے لیے لنچ منگوایا۔ "تمہارے تو منہ پر بھی بارہ بج رہے ہیں شبنم کلوز اپس خاک اچھے آئینگے۔"

"کھانا کھا کر منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو جاؤں گی مسز واحدی! آپ بالکل فکر نہ کریں۔"

"ٹھیک ہے تم جلدی سے کھانا کھالو۔ پھر میک اپ کروالینا۔"

"لباس بھی تبدیل کرنا ہوگا کیا؟"

"ہاں صرف ایک ہی لباس۔ جیولری بھی وہی پہن لینا۔ اور بال... بال کیسے تھے تمہارے؟"

"بال تو کھلے ہوئے ہی تھے۔"

"چلو ٹھیک ہے پھر۔ وقت بچ جائے گا۔"

شبنم بے صبری سے کھانے پر ٹوٹ پڑی۔ اسی وقت عارف رضا کمرے میں داخل ہوا۔

"ہیلو شبنم!" وہ یوں بولا جیسے گذری ہوئی رات کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

"ہیلو۔" وہ رکھائی سے بولی۔

"مسز واحدی! یہ کس وقت تک فری ہو جائیں گی؟"

"پتہ نہیں۔ ڈھائی تین گھنٹے تو لگیں گے ہی۔"

"ٹھیک ہے، میرا بھی کام جب تک ختم ہو جائے گا۔ شبنم! میں تمہیں گھر ڈراپ کردوں گا۔"

"نہیں، میں خود چلی جاؤں گی۔"

"تمہارا گھر میرے گھر کے راستے میں پڑتا ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔ "اور مجھے تم سے کچھ باتیں بھی کرنی ہیں۔" وہ جواب کا انتظار کیے بغیر کمرے سے نکل گیا۔

ساڑھے چار بجے کے قریب تقریباً آدھا کام ختم ہو گیا تھا۔ شبنم پسینے میں نہا گئی تھی۔ "بھئی اب مجھے تھوڑی سی بریک دے دیں۔"

"اوکے۔ چلو میرے کمرے میں چائے منگواتی ہوں۔"

مسز واحدی کے ایئرکنڈیشنڈ کمرے میں آکر شبنم نے سکون کا سانس لیا۔ چائے آئی تو اس کے ساتھ ہی عارف رضا بھی آگیا۔ "مجھے پتہ چلا کہ چائے منگوائی گئی ہے تو میں بھی حصہ بٹانے آگیا۔"

شبنم نے ناگواری سے اسے دیکھا اور چائے پینے لگی۔ تب ہی فون کی گھنٹی بجی۔ مسز واحدی نے فون اٹھایا۔ "ہیلو۔ جی! جی، ہاں ہیں... ایک منٹ..." پھر شبنم سے مخاطب ہو کر بولیں۔

"تمہارا فون ہے۔" شبنم کا دل پہلو میں یکبارگی زور سے دھڑکا اس نے ایک نظر عارف رضا پر ڈالی جو اسے ہی تک رہا تھا۔ فون عبدالحی کا تھا۔

"مس شبنم!"

"ہاں بول رہی ہوں۔"

"وہ میں نے چیک کرلیا ہے۔ مسٹر عارف رضا اور مسز تبسم عارف رضا نے ۱۸ جولائی کی فلائیٹ سے سیٹیں بک کروائی تھیں۔" شبنم کے چہرے پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔ "ٹکٹ کینسل نہیں کروائے گئے۔ رقم بھی ری فنڈ نہیں ہوئی۔"

"اوکے۔ تھینک یو ویری مچ۔ میں بعد میں بات کروں گی۔"

شبنم نے فون بند کردیا۔ اس کی ہتھیلیاں پسیج گئی تھیں۔ اس نے بمشکل خود پر قابو پایا۔ چائے ختم ہو چکی تھی۔

"بس شبنم دو سائیڈ پوز اور۔ پھر تمہاری چھٹی۔"

"اچھا پھر جلدی کریں۔ میں بہت تھک گئی ہوں۔"

وہ میک اپ مین سے پوڈر کا ٹچ کرواکر اسٹوڈیو میں چلی گئی۔

عارف رضا وہیں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ وہ کس کا فون تھا جسے سن کر شبنم کے چہرے کی رنگت بدل گئی تھی۔ وہ یکایک بیحد نروس اور بے چین سی نظر آنے لگی تھی۔ وہ چائے کا آخری گھونٹ بھر کر پیالی رکھ رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔

"ہیلو... جی... جی وہ ابھی ابھی اسٹوڈیو میں گئی ہیں

آپ پیغام چھوڑ دیں، میں انہیں دے دوں گا۔" دوسری جانب عبدالحئی تھا۔

"جی میری ابھی اُن سے بات ہو چکی ہے۔ میں یہاں کے آفس سے بول رہا ہوں۔ بس ایک بات کہنا بھول گیا تھا انہیں بتا دیجئے گا کہ وہ دونوں ٹکٹ یکطرفہ تھے اور فرسٹ کلاس کے تھے۔"

عارف رضا کو بات کی تہہ تک پہنچنے میں ذرا بھی دیر نہ لگی۔ دو ٹکٹ۔ بنگلہ دیش ایئر لائن۔ ون وے۔ فرسٹ کلاس۔ اس کے چہرے پر بلا کی نفرت اُمڈ آئی۔ "ٹھیک ہے میں انہیں بتا دوں گا۔" اس نے فون بند کر دیا۔

✿

ساڑھے چھ بجے شبنم کا کام ختم ہوا۔ عارف رضا وہیں بیٹھا تھا۔ وہ میک اپ صاف کرنے لگی۔

"تھینک یو شبنم! مجھے یقین ہے بہت اعلیٰ کلوز اپس بنے ہیں۔" مسز واحدی بولیں۔

"لیکن میں چور چور ہو گئی ہوں۔ چند تصویروں کے لیے چار پانچ گھنٹے۔ اُف توبہ۔"

"سوری۔ یہ کام ہی ایسا ہے۔ ایک ایک تصویر میں گھنٹوں لگ جاتے ہیں۔"

شبنم نے دیکھا عارف رضا خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر کچھ ہی عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ "چلیں؟" وہ شبنم سے مخاطب ہوا۔ ہزار چاہنے کے باوجود وہ انکار نہ کر سکی۔ اس نے بیگ اٹھایا اور مسز واحدی کو خدا حافظ کہتی ہوئی باہر نکل آئی۔

عارف رضا خاموشی سے کار چلاتا رہا۔ شبنم نے بھی اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ تو گھر پہنچنے کے لیے بے چین تھی۔ اسے ملک ارشد سے بات کرنے کی جلدی تھی۔ یہ نئی اطلاع یقیناً ٹھوس ثبوت تھا۔ اب کوئی ملک ارشد کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" وہ اچانک بولا اور شبنم اچھل پڑی۔

"کوئی خاص بات نہیں۔"

"اچھا۔" وہ لاپرواہی سے بولا اور پھر خاموش ہو گیا۔

کلفٹن کے پُل سے اتر کر سیدھے ہاتھ کو مڑنے کے بجائے وہ گاڑی سیدھا نکالتا ہوا لے گیا۔

"کدھر جا رہے ہو عارف!" وہ گھبرائی۔

"اتنی جلدی گھر جا کر کیا کرو گی۔ ابھی تو شام جوان ہوئی ہے۔"

"لیکن تمہیں پتہ ہے میں بہت تھک گئی ہوں۔"

"اوہ، تو میں تم سے کون سا مشقت کروانے جا رہا ہوں۔ ذرا سی تفریح کریں گے۔" شبنم اپنی دلی پریشانی اس پر ظاہر نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔ یہ مجھے کہاں لے جا رہا ہے؟ شاید ساحل پر۔ تنہا، مجھے غرق کرنے۔ شبنم کے رگ و پے میں سنسنی سی دوڑ گئی لیکن پھر اس نے خود کو تسلی دی۔ ابھی رات اتنی نہیں ہوئی۔ ساحل پر بھی لوگ ہوں گے۔ پھر میں کوئی بے جان مورتی نہیں ہوں جسے وہ ہاتھ بڑھا کر سمندر میں پھینک دے۔ ننھی بچی بھی نہیں ہوں کہ دھوکے سے مار ڈالے۔ وہ مطمئن ہو کر بیٹھ گئی۔ پھر اس کے تمام خدشات دم توڑ گئے۔ عارف رضا نے گاڑی ایک ریسٹورنٹ کے سامنے روک دی۔ "چلو تمہیں آئس کریم کھلائیں۔"

"لیکن مجھے آئس کریم بالکل پسند نہیں ہے۔"

"مجھے تو ہے۔ چلو تم کافی پی لینا۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

یہ کافی کا ذکر کس قدر عجیب طرح کرتا ہے۔ شبنم نے گاڑی سے اترتے ہوئے سوچا۔ ریسٹورنٹ میں بہت کم لوگ تھے۔ پھر بھی مکمل تنہائی سے یہ صورتحال بہت بہتر تھی۔ عارف رضا نے آئس کریم منگوانے کے بجائے ڈنر کا آرڈر دیا۔

"ابھی ڈنر ٹائم تو نہیں ہوا؟" اس نے احتجاج کیا۔

"ہو جائے گا ٹائم بھی۔ یہاں کی سروس کافی سست ہے جب تک یہ کھانا لے کر آئے گا وقت بھی ہو جائے گا۔"

"مجھے بھوک بھی تو نہیں ہے۔"

"مجھے ہے۔" اس کی آواز میں غراہٹ تھی۔ شبنم نے خاموش ہو جانا بہتر سمجھا۔

کھانا واقعی کافی دیر سے آیا۔ شبنم کی بھوک تو کب سے مری ہوئی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے ساتھ دینا پڑا۔

"کل تم اچانک بھاگ گئیں۔" وہ پلیٹ پر جھکا جھکا بولا۔

"ہاں۔ وہ کل... میرے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔"

"چچ چچ! اب کیسا ہے تمہارا سر درد؟"

"اب تو ٹھیک ہوں۔"

"تمہاری چھٹی ختم ہو رہی ہو گی؟"

"ہاں۔"

"پھر؟"

"پھر یہ کہ میں پڑھاؤں گی۔" اس نے ناگواری سے جواب دیا۔

"کیوں؟"

"اس لیے کہ..."

"کہ ابھی تبسم کا قاتل پکڑا نہیں جا سکا ہے نا؟" وہ ہنسا۔

شبنم کو اس کی ہنسی سے خوف سا آنے لگا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

کھانا بہت سست رفتار میں ختم ہوا۔

"کچھ سویٹ کھاؤ گی؟"
"نہیں۔ اور اگر ابھی یہاں سے اٹھنے کا تمہارا موڈ نہیں ہے تو میں جا رہی ہوں۔"
"ارے ارے۔ ٹھہرو بابا! بل تو دے دوں۔"
وہ باہر آئے تو اندھیرا پھیل چکا تھا۔ عارف رضا اسے سیدھا گھر لے آیا۔ شبنم تیزی سے کار سے اتر گئی۔
"خدا حافظ۔ بہت بہت شکریہ۔"
"کافی اوپر چل کر پئیں گے۔ کیوں؟"
وہ چکرا گئی۔ رات تھی۔ تاریکی تھی۔ نزدیک میں کوئی دکھائی بھی نہیں دے رہا تھا۔ "نہیں عارف! بہت دیر ہو گئی۔ پھر کبھی سہی۔"
"کچھ زیادہ دیر تو نہیں ہوئی۔" وہ گاڑی سے اتر آیا۔
"نہیں۔" وہ گھبرا کر بولی۔ "آج نہیں۔ میں وعدہ کرتی ہوں، پھر کبھی۔۔"
"آج کیوں نہیں؟"
"میں بہت تھکی ہوئی ہوں۔ تم جانتے ہو میرا دن کتنا مصروف گزرا ہے۔"
"اچھا تمہاری مرضی۔" وہ پھر ہنسا۔ اس کی ہنسی شبنم کے اعصاب خور دکیسے رہی تھی۔
"چلو تمہیں اوپر تک تو چھوڑ آؤں۔" شبنم کا دل ڈوبنے لگا۔ اور عین اسی وقت ایک گاڑی پورچ میں آ کر رکی اور اس میں سے ایک عورت اپنے دو بچوں کے ساتھ اتری۔ شبنم نے سکھ کا گہرا سانس لیا۔ عارف رضا نے ایک نظر نووارد عورت اور اس کے بچوں پر ڈالی اور دوسری شبنم پر۔ پھر تیزی سے اپنی گاڑی کی طرف پلٹا۔ جب تک لفٹ اوپر سے نیچے آتی شبنم کے کانوں نے عارف رضا کی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے اور پھر چلے جانے کی آواز سنی۔ یہ عورت اور اس کے بچے اس کے لیے نجات دہندہ ثابت ہوئے تھے۔ لفٹ کے اندر داخل ہو کر شبنم نے چوتھی منزل کا بٹن دبایا۔ اس عورت کا قیام چوتھی منزل پر تھا۔ راستہ خاموشی سے کٹا۔ چوتھی منزل پر اس کی ہمسفر خاتون اپنے بچوں کے ہاتھ پکڑ کر اتر گئی۔ لفٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ چوتھی منزل سے پانچویں منزل تک کا یہ سفر شبنم کے لیے طویل ترین اور کٹھن ترین ثابت ہوا۔ لفٹ رکی تو اپنی تمام تر طاقت مجتمع کر کے وہ باہر نکلی۔ اس کی ٹانگیں ہولے ہولے کانپ رہی تھیں۔ کانپتے ہی ہاتھوں سے اس نے فلیٹ کی چابی پرس میں سے نکالی۔ بمشکل اس نے لاک کھولا اور اندر داخل ہو گئی۔ اندر جا کر اس نے دروازے کو اچھی طرح لاک کیا۔ پھر اوپر کی کنڈی لگائی۔ بدقسمتی سے عالیہ کل ہی اپنی دس روزہ لندن فلائیٹ پر گئی تھی۔ شبنم کا بے اختیار دل چاہا کہ کاش عالیہ نہ گئی ہوتی۔ کاش وہ یہاں اکیلی نہ ہوتی۔ اسے تنہائی سے بے تحاشا خوف آ رہا تھا۔ شبنم کچھ دیر بند دروازے سے ٹیک لگائے لمبی لمبی سانسیں بھرتی رہی۔ اس کا انگ انگ تھکن اور خوف سے ٹوٹ رہا تھا۔ اس میں ہلنے کی بھی سکت نہ تھی۔
مجھے ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔ اس نے خود کو حوصلہ دیا۔ مجھے پامردی سے مقابلہ کرنا ہے۔ ملک ارشد کو فون کر کے ساری صورت حال بتانی ہے۔ پیاس سے اس کے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ وہ کچن میں گئی۔ فریج سے پانی کی بوتل نکالی اور دو تین گلاس پی ڈالے۔ اسے قدرے سکون ملا۔ وہ کمرے میں واپس آئی۔ جلد از جلد ملک ارشد کو فون کر کے ساری بات بتانی ہے۔
وہ فون کی طرف بڑھی اور عین اسی وقت فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ وہ چونک گئی۔ کچھ دیر فون کو گھورتی رہی۔ پھر آہستہ سے ریسیور اٹھا لیا۔ "ہیلو!"
"ہیلو شبنم! میں ملک بات کر رہا ہوں۔" اس کی آواز بہت ہلکی اور بھرائی ہوئی سی آ رہی تھی۔ شبنم کے لیے ملک ارشد کا فون ایک مژدہ جانفزا بن کر آیا۔
"اوہ ارشد! شکریہ۔"
"تم کہاں تھیں۔ میں دوپہر سے تمہیں کال کر رہا ہوں۔"
"ارشد!" وہ سسک اٹھی۔ "میری بات غور سے سنیے۔ وہ عارف رضا ہی ہے۔ یہ سارا چکر اس کا ہی چلایا ہوا تھا۔ میں نے ایک بہت بڑا ثبوت پا لیا ہے۔ وہ اور تبسم شادی کرنے والے تھے۔ دونوں نے مسٹر اینڈ مسز عارف رضا کے نام سے بیمان کی ڈھاکہ فلائیٹ سے دو ٹکٹ بک کروا رکھے تھے ۱۸ جولائی کے۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا میری بات۔ ہمارے ہاتھ ٹھوس ثبوت آ گیا ہے۔" جذبات کی شدت سے اس کے منہ سے الفاظ بھی صحیح طور پر ادا نہیں ہو رہے تھے۔
"اچھا۔" دوسری جانب سے آواز آئی۔ پھر کچھ بڑبڑاہٹ سی ہوئی۔
"آواز صاف نہیں آ رہی ارشد! لائن میں کچھ خرابی ہے۔"
"میں کہہ رہا ہوں کیا اور بھی کسی کو اس بات کا پتہ ہے؟" اس کی آواز جیسے بہت دور سے آ رہی ہو۔
"نہیں۔ کسی کو پتہ نہیں۔ میں ابھی ابھی گھر میں داخل ہوئی ہوں۔"
"سنو شبنم!" وہ بولا۔ "تم وہیں ٹھہرو۔ میں فی الفور آ رہا ہوں۔ کسی اور کو اندر آنے نہ دینا اور فون کی گھنٹی بجے تو ہرگز نہ اٹھانا۔"
"ٹھیک ہے، آپ فوراً آ جائیے۔ مجھے بہت ڈر لگ

رہا ہے۔" دوسری جانب سے فون بند ہو گیا تو اس نے بھی ریسیور رکھ دیا۔ وہ پلٹی تو اس کی نظر سامنے کی کھڑکی پر پڑی۔ کھڑکی کا پردہ ہلتا ہوا محسوس ہوا۔ اسے غور سے دیکھا۔ پردہ کے پیچھے ایک انسانی جسم کا ابھار تھا اور پردے کے نیچے سے کسی کے مردانہ جوتے نظر آ رہے تھے۔ شبنم کے منہ سے چیخ نکلی۔ پردہ زور سے ہلا اور اس کے پیچھے چھپا ہوا شخص سامنے آ گیا۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھے ہسٹریائی انداز میں چیخے جا رہی تھی، تب وہ شخص روشنی میں آیا تو حیرت سے شبنم کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ وہ انسپکٹر جہاں زیب تھا۔ وہ بہت شرمندہ اور پریشان نظر آ رہا تھا۔

"مجھے بہت افسوس ہے مس شبنم! میرا مقصد آپ کو خوفزدہ کرنا نہ تھا۔"

شبنم کی چیخیں بند ہو گئیں، لیکن وہ اب بھی ہانپتے ہوئے سسک رہی تھی۔

"آپ... آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ اور کس طرح میرے اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے؟"

"مس شبنم! میں یہاں آپ کو ڈرانے کی خاطر نہیں بلکہ آپ کی حفاظت کے لیے چھپا ہوا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ آپ جس شخص کے ساتھ کھانے پر گئی ہیں اسے اندر لے آئیں گی، لیکن آپ تنہا تھیں۔ میں باہر نکل کر آپ کے سامنے آنا چاہ رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ جو کوئی بھی آپ کو فون کر رہا ہے وہ میری یہاں موجودگی سے باخبر ہو۔ اس لیے میں وہیں ٹھہرا رہا۔ اور یہ سوال کہ میں کیسے اندر داخل ہوا تو یہ زیادہ مشکل کام ثابت نہیں ہوا۔" اس نے شرمندگی سے سر جھکا دیا۔

"میں سمجھی نہیں کہ میری حفاظت کے لیے آپ نے یہاں آ کر چھپنا کیوں ضروری سمجھا؟ آپ نیچے بھی تو انتظار کر سکتے تھے۔"

"میرا خیال تھا کہ آپ عارف رضا کو اندر انوائٹ کریں گی۔ ایک کپ چائے یا کافی کے لیے..."

"انوائٹ کروں گی؟" وہ چلائی۔ "اوہ خدا! میں تو بمشکل جان بچا کر بھاگی ہوں۔ آپ کو پتہ ہے میں نے آج کیا معلوم کیا؟ اس نے اور تبسم نے بنگلہ دیش جانے کے لیے ٹکٹ بک کرائے ہوئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ملک ارشد اس وقت تک ختم ہو چکا ہو گا ان دونوں نے مل کر اسے زہر دینے کی سازش کی تھی۔" پھر شبنم نے مختصر لفظوں میں زہریلی کافی اور تبسم کی حادثاتی موت کے بارے میں انسپکٹر جہاں زیب کو بتایا۔

"ہمیں ٹکٹ ریزرویشن کے بارے میں پہلے سے علم تھا۔"

"علم تھا؟" وہ حیرت سے چیخی۔ "اور آپ نے ابھی تک کچھ نہیں کیا۔ آپ کو چاہیے تھا کہ فوراً عارف رضا کو گرفتار کرتے۔"

"ٹکٹوں کی بکنگ سے یہ بات تو ثابت ہوتی ہے کہ وہ اور تبسم بنگلہ دیش فرار ہو رہے تھے لیکن ہم یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ ان دونوں نے مل کر ارشد کے قتل کی سازش کی تھی اور یہ کہ تبسم کی موت اسی سازش کا نتیجہ تھی۔"

شبنم کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی۔ ہر وہ ثبوت جو اس کی نظر میں ٹھوس ثبوت ہوتا تھا، قانونی نکتہ نگاہ سے بالکل بودا نکلتا۔

"اس کا مطلب ہے بات اب بھی وہیں ہے جہاں تھی۔ اور میں سخت ناکام رہی۔"

"آپ تبسم کیس دوبارہ کھلوانے میں تو کامیاب رہی ہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔ "وہ کون تھا جس سے آپ فون پر بات کر رہی تھیں؟ غالباً ملک ارشد!"

"ہاں، وہ جاننا چاہتے تھے کہ سب ٹھیک ٹھاک ہے۔"

"ہوں۔ اور وہ آ بھی رہے ہیں؟"

"ہاں۔ لیکن آپ..." وہ کسی انجانے اندیشہ میں مبتلا ہو گئی۔ "آپ کیا سوچ رہے ہیں؟"

"بات یہ ہے مس شبنم کہ آپ نے خود کو اس معاملے میں بہت زیادہ ملوث کر لیا۔ شروع دن سے بے شمار سوالات کیے۔ بہت سوں کے جواب پا بھی لیے۔ خود ایسے مردوں کے ساتھ میل جول بڑھایا جو آپ کی بہن کے قاتل ہو سکتے ہیں۔ ملک ارشد اور عارف رضا یہ سب کچھ بہت زیادہ تھا۔ ٹو مچ" وہ ذرا سا رُکا پھر بولا۔ "عین ممکن ہے کہ عارف رضا کے بارے میں آپ کے تمام اندیشے درست ثابت ہو جائیں اور وہ واقعی مجرم ہو۔" شبنم نے اطمینان کا سانس لیا۔ "لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ بے قصور ہو۔"

"عجیب شخص ہے یہ۔" وہ الجھ کر رہ گئی۔

"یہی بات ملک ارشد کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے وہ ساری باتیں درست ہوں۔ ان کی بیوی اور عارف رضا نے مل کر اسے زہر دینے کی سازش کی ہو اور تبسم کی موت حادثاتی ہی ہو۔ لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ غلط بیانی کر رہے ہوں۔ مجرم کون ہے؟ یہی جاننے کے لیے میں آج رات یہاں آیا ہوں۔"

"کیا مطلب؟ کیا آج رات...؟"

"ہاں۔ ہمیں یقین سا ہے کہ آج رات آپ کی زندگی پر قاتلانہ حملہ ضرور ہو گا۔ کیونکہ ملزم کے پاس اب زیادہ وقت نہیں ہے۔ دونوں یعنی عارف رضا اور ملک ارشد آپ کے گھر کے آس پاس ہیں۔ اور ان میں سے جو بھی مجرم ہے وہ آج رات یہاں ضرور آئے گا اور آپ کو قتل کرنے کی کوشش کرے گا۔" شبنم نے خوف سے جھرجھری لی۔ رات کے سناٹے میں انسپکٹر جہاں زیب کے یہ الفاظ

اور بھی دہشت ناک سے لگے۔ وہ شخص جو اب سے تھوڑی ہی دیر بعد اس کے اپارٹمنٹ کی گھنٹی بجائے گا اس کی جان لینے آئے گا کیا وہ ملک ارشد ہوگا؟

"میں کچن میں چھپ جاتا ہوں۔ وہاں سے میں بہ آسانی ادھر نظر رکھ سکوں گا۔" اس نے اپنی پتلون کی ایک پھولی ہوئی جیب کو تھپتھپایا۔ شبنم سمجھ گئی کہ اس میں پستول ہے۔ "آپ کو ڈرنے کی کوئی قطعی ضرورت نہیں مس شبنم! میں آپ کو چارے کے طور پر ضرور استعمال کر رہا ہوں لیکن آپ کو ہرٹ ہو جانے نہیں دوں گا، اور ہاں، آپ سے آخری گذارش۔ آنے والا خواہ آپ کی توقعات اور خواہشات کے خلاف ہی ہو، آپ اس پر میری یہاں موجودگی ظاہر نہیں کریں گی۔ خود کو اگر خطرے میں دیکھیں تب بھی مجھے مت پکاریں۔ میں اسے رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہتا ہوں۔ مناسب موقع پر میں خود کو ظاہر کردوں گا۔" وہ کچن کی جانب بڑھا پھر مڑ کر بولا "گھبرائیں نہیں، آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔"

وہ کچن کی طرف چل دیا، اور اس کے جانے کے چند ہی لمحوں بعد شبنم نے لفٹ کا دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے کی مدھم سی آوازیں سنیں۔ پھر قدموں کی آہٹ۔ جو پہلے آہستہ تھی پھر لمحہ بہ لمحہ تیز اور نزدیک تر ہو رہی تھی۔ پھر یہ چاپ رک گئی ٹھیک اس کے دروازے کے سامنے آکر۔ شبنم اچھل سی گئی۔ اس کا دل اتنی زور سے دھڑکا۔ گویا ابھی باہر نکل آئے گا۔ وہ کرسی کے ہتھوں کو مضبوطی سے پکڑے بیٹھی رہی۔ کون آیا ہے؟ وہ سوچ رہی تھی۔ اٹھو دروازہ کھولو۔ دیکھو باہر کون ہے۔ لیکن وہ ڈرتی تھی کہ آنے والا اگر ملک ارشد ہوا تو شاید وہ صدمے کی تاب نہ لا سکے۔ گھنٹی دوبارہ بجی۔ دروازہ کھولو۔ وہ خود سے بولی۔ جو کچھ بھی ہے اب ختم ہونے والا ہے۔ اچھا ہے جلدی سے کھیل ختم ہو جائے۔ وہ اٹھی اور دروازے کی جانب بڑھی۔ آنے والا اب دستک بھی دے رہا تھا۔ پھر اسے اپنا نام بھی سنائی دیا۔

"شبنم، شبنم!" آواز سرگوشی سے زیادہ نہ تھی۔ "دروازہ کھولو شبنم میں ارشد ہوں۔ کھولو دروازہ۔"

شبنم کی آنکھیں تر ہوگئیں۔ اس نے آہستگی سے دروازہ کھول دیا۔ آنے والا ادھ کھلے دروازے کو جوتے سے دھکیلتا ہوا اندر داخل ہوا۔ شبنم نے ڈبڈباتی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ عارف رضا تھا۔

عارف رضا نے دروازہ مقفل کیا، اور شبنم کو بازو سے پکڑتا ہوا صوفے کے نزدیک لے آیا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت کی چنگاریاں تھیں۔

"تم؟" شبنم بہ مشکل اتنا ہی کہہ سکی، اور صوفے پر ڈھیر ہوگئی۔

"ہاں میں۔ فون بھی میں نے کیا تھا۔ تمہیں اپنے عاشق کا انتظار تھا۔ ملک ارشد کا۔ کیوں ہے نا؟" اس کی آواز میں اتنی نفرت تھی کہ اس کا لہجہ بھی بدل سا گیا تھا۔ "میں صرف یہ چاہتا تھا کہ میرے آنے تک تم کسی اور کو ٹکٹوں کی بکنگ کے بارے میں نہ بتا سکو۔"

"لیکن وہ تو ملک ارشد کی سی آواز تھی۔"

وہ ہنسا۔ "تم نہیں جانتیں میں آواز بدلنے میں ماہر ہوں۔ سنو۔" پھر شبنم کے کانوں نے وہ پھنسی پھنسی سی آواز سنی، عارف رضا کہہ رہا تھا۔ "چلی جاؤ یہاں سے۔ اس سے پہلے کہ تمہارا حشر بھی تبسم کا سا ہو۔"

"تو وہ تم تھے؟ تم نے کیا تھا وہ دہشت ناک مذاق؟"

"وہ مذاق نہیں تھا، وہ مشورہ تھا۔ مخلصانہ مشورہ، لیکن تم نے میری بات نہیں مانی، اور اب... اب بہت دیر ہوگئی۔" پھر وہ اس کے اور قریب آکر بولا۔ "عبدالحئی کا دوبارہ فون آیا تھا۔ ایجنسی پر۔ اچھا آدمی ہے۔ بے چارہ ہر ایک پر اعتماد کر لیتا ہے۔ وہ تمہیں یہ بتانا بھول گیا تھا کہ بیمان کے کراچی ڈھاکہ کے وہ دونوں ٹکٹ فرسٹ کلاس کے تھے اور یکطرفہ تھے۔ ون وے ٹکٹ۔" وہ گاتا ہوا بولا، پھر ہنسا۔ اس کی ہنسی میں کوئی ایسی بات تھی جو سننے والے کے رونگٹے کھڑے کر دیتی تھی۔ پھر وہ بہت ٹھہر ٹھہر کر ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولا۔ "مس شبنم گل! جاسوسہ اعظم! آج کے دور کی ماتا ہری۔ تم نے بالکل صحیح اندازہ لگایا تھا۔ میں نے تبسم کے ساتھ مل کر ملک کی موت کا اتنا شاندار منصوبہ بنایا تھا۔ میں اس سے شادی کرنے والا تھا۔ صرف اس کی خاطر نہیں۔ دولت کی خاطر۔ میں نوکری کرتے کرتے اکتا گیا ہوں۔ دوسروں سے حکم لینا اب مجھے کسر شان نظر آتا ہے۔ میں اپنی ایجنسی کھولنا چاہتا تھا اور کیوں نہیں۔ میں ان سب سے قابل ہوں ان سب سے بہتر ہوں۔ میں نے وہ خودکشی والا خط تبسم سے لکھوایا تھا اور تبسم نے اسے ملک کے ٹائپ رائٹر پر ٹائپ کیا تھا۔ یہ بھی بالکل درست ہے کہ میں نے آرٹ سیکشن کے آدمی سے سادہ کاغذ پر ملک کے سائن کروائے۔ ہم ایسا کرتے رہتے تھے۔ ہمیں ملک ارشد کی جانب سے اجازت حاصل تھی۔ میرا منصوبہ بہترین تھا خامیوں سے پاک، لیکن اس احمق گدھی نے سب خاک میں ملا دیا۔ وہ غلطی سے ملک کا کپ پی گئی، اُلّو۔" وہ نفرت زدہ ہنسی دوبارہ اس کے منہ سے نکلی۔ "مجھے پہلے ہی پتہ تھا کہ عورت پر اعتماد کا نتیجہ ہمیشہ ناکامی کی صورت میں نکلتا ہے۔ میں نے اسے اس رات فون بھی کیا تھا۔ یہ پوچھنے کے لیے کہ سب ٹھیک ٹھاک ہے نا۔ وہ کہنے لگی ہاں سب ٹھیک ہے۔ بس چند گھنٹوں کی بات ہے۔ اس

کا مطلب یہ تھا کہ اس نے زہر پیالے میں ملا دیا ہے اور ملک ارشد کو بس اتنا کرنا تھا کہ وہ پیالہ اٹھا کر منہ سے لگا لیتا تھا۔" اب اس کی آواز میں مایوسی اتر آئی تھی "لیکن وہ اتنا بھی نہ کر سکا اور وہ احمق عورت یہ آخری کام بھی خود ہی کر گئی۔" پھر وہ چند لمحوں کے لئے ساکت ہو گیا۔

شبنم نے حیرت سے دیکھا اس کا خوبصورت اور وجیہہ چہرہ بگڑ کر کس قدر نفرت انگیز ہو گیا تھا۔

"پھر جب پولیس نے یہ بیان دیا کہ تبسم کی موت خودکشی یا حادثاتی نہیں تب مجھے پریشانی ہوئی۔ مجھے خیال آیا کہ شاید ملک ارشد کو شک ہو گیا تھا کہ میں بھی اس میں ملوث ہوں مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے پھنسانے کی کوشش کرے گا، لیکن اس نے بھی پولیس کے بیان کی تصدیق کی کہ یہ خودکشی ہی ہے بلکہ تبسم کا لکھا ہوا وہ نوٹ بھی پیش کر دیا جو خود اس کے لیے لکھا گیا تھا۔ میں مطمئن ہو گیا تھا۔ میں جان گیا تھا کہ ملک ارشد اپنے نام اور شہرت کو بچانے کی خاطر مجھے بھی بچائے گا۔ میں محفوظ تھا خودکشی والی کہانی ہم سب کو ہی سوٹ کر گئی تھی۔ لیکن افسوس کہ یہ تمہیں سوٹ نہ کر سکی۔ پھر ملک ارشد کے اکاؤنٹ کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر تم آ گئیں۔ اور میں نے ایک اور چال چلی اور ایک اور بازی جیت لی۔ اکاؤنٹ ہمیں مل گیا۔ لیکن تم... تم کسی چور دروازے سے ملک ارشد کی دنیا میں داخل ہو گئیں۔ مجھے مات ہونے لگی۔ تم نے پولیس تک کو جگا دیا۔ وہ سب کچھ جو میں نے اپنی محنت اور عرق ریزی کے بعد حاصل کیا ہے سب داؤ پر ہے۔ میری زندگی، میری نوکری، میری شہرت، میری مقبولیت، سب ایک طرف ہے اور دوسری طرف تم! صرف تم۔ اور آج فیصلے کی رات ہے۔"

خوف سے شبنم کا چہرہ پیلا پڑ گیا "نہیں... نہیں تم اب اور کوئی جرم مت کرو۔" وہ سہمی سہمی سی بولی۔

"جرم!" وہ ہنسا "یہ جرم نہیں ہے۔"

"تم مجھے قتل کرو گے یہ جرم ہی تو ہوا۔"

"نہیں نہیں۔ یہ قتل تو نہیں۔ یہ تو خودکشی ہوگی اور اللہ کا شکر ہے کہ تمہاری اور کوئی بہن نہیں جو حقیقت جاننے کے لیے گڑے مردے اکھاڑنے اور میری زندگی برباد کرنے آ جائے۔" وہ سامنے کھڑکی کو کچھ دیر دیکھتا رہا پھر بولا "چلو اب اس کھڑکی سے چھلانگ لگا دو۔ یہ پانچویں منزل ہے نا۔ مر تو جانا چاہیئے تمہیں فوراً ہی۔"

وہ تھرتھرا کر اٹھی "نہیں نہیں۔ یہ دیوانگی ہے۔ تم ایسا نہیں کر سکتے۔"

"میرا کام مشکل مت بناؤ۔" وہ نرمی سے بولا۔ پھر وہ اسے دھکیلتا ہوا کھڑکی تک لے آیا۔ شبنم کا سر چکرانے لگا۔ سارا کمرہ اس کی نظروں کے سامنے گھومنے لگا۔ پھر کھڑکی کھلنے کی آواز آئی اور کوئی اس کا بازو پکڑ کر کھینچنے لگا۔ وہ مزاحمت کرنا چاہ رہی تھی۔ شاید کر بھی رہی تھی۔ پھر اس کے چہرے پہ زوردار تھپڑ لگا۔ وہ اسے کھڑکی سے باہر کی جانب دھکیل رہا تھا۔ ایک آخری چیخ اس کے منہ سے نکلی اور پھر گہری تاریکی خاموشی۔

چہرے پر پھواریں سی برسیں۔ تن من میں خنکی سی اتر آئی۔ دھیرے دھیرے، بہت ہی ڈرتے ڈرتے اس نے آنکھیں کھولیں۔ انسپکٹر جہاں زیب ہی وہ پہلا شخص تھا جو اسے نظر آیا۔ کچھ اور لوگ بھی تھے، وردیوں میں۔ "مس شبنم! سب ٹھیک ہو گیا۔ ہم نے اسے گرفتار کر لیا۔" پھر وہ معصومیت سے مسکرایا "جی ہاں عارف رضا کو۔ اسے ہم نے فی الحال اقدام قتل کے کیس میں پکڑا ہے۔ بعد میں دوسرے الزامات بھی عائد ہو جائیں گے۔ آپ کو یوں چارہ بنانے پر میں معذرت خواہ ہوں۔"

وہ کچھ نہ بولی۔ بس ایک تشکر آمیز مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی۔" اس کے ساتھ ہی یہ بھی ثابت ہو گیا کہ تبسم نے خودکشی نہیں کی تھی۔ کوئی بھی اس کی موت کا ذمہ دار نہیں اس نے خود ہی پیالے میں زہر ملایا اور خود ہی غلطی سے اسے پی گئی۔ دیکھا جائے تو درپردہ عارف رضا ہی اس کی موت کا ذمہ دار ہے لیکن قانون کی نگاہ میں یہ محض حادثہ ہے۔"

تب ہی دروازے کی گھنٹی بجی۔ شبنم نے خوف زدہ نظروں سے انسپکٹر جہاں زیب کو دیکھا۔ اس نے قریب آ کر اس کا کندھا تھپتھپایا۔

"مس شبنم! اب کوئی خطرے والی بات نہیں ہے۔ یہ ملک صاحب ہوں گے۔ ہم نے انہیں اطلاع دے دی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ فوراً پہنچ رہے ہیں۔"

آنے والا دروازے سے اندر داخل ہوا۔ شبنم نے دیکھا وہ ملک ارشد ہی تھا۔

"شبنم!" وہ اس کے قریب آ کر میٹھی آواز میں بولا۔ "سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ بالکل ٹھیک۔" وہ اس کے پاس بیٹھ گیا اور زندگی میں پہلی بار شبنم نے خود کو اتنا محفوظ پایا۔

اس کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپکے۔ یہ آنسو تبسم کے لیے تھے۔ تبسم جس نے اپنی زندگی دے کر جیسے سب گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا۔ شبنم اور ملک ارشد کو ایک کر دیا۔
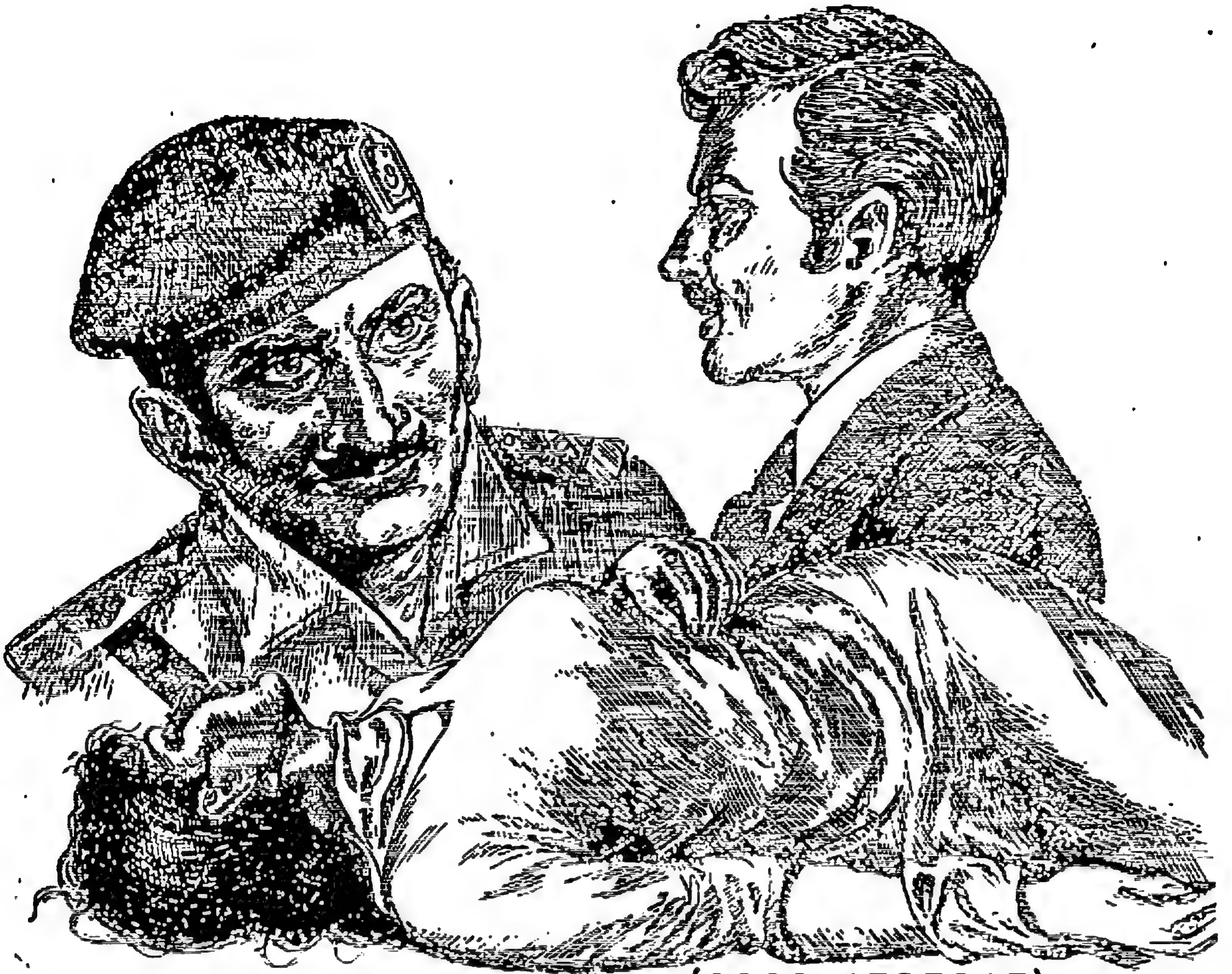
ش. صغیر ادیب

ہر مجرم یہ سمجھتا ہے کہ اس کا منصوبہ
بے داغ ہے اور وہ جرم کر کے آسانی سے قانون
کی گرفت میں آنے سے بچ جائے گا۔ وہ بھول جاتا ہے
کہ قانون کے محافظ بھی اسی کی طرح ذہین
ہو سکتے ہیں اور قدم بہ قدم اس کے منصوبے
کی تمام جزویات سے آگاہی حاصل کر سکتے ہیں۔
جرم و سزا کے موضوع پر ایک خوبصورت تحریر

انسپکٹر غمزدہ نے ٹھنڈی سانس بھر کر غمگین لہجے میں کہا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ عورتوں کو کیوں قتل کرتے ہیں، خاص طور پر ایسی عورتوں کو جو حد درجہ نیک گھر گرہست اور محبت کرنے والی ہوں۔ ایسی عورتوں سے تو محبت کی جانی چاہیے۔ لیکن بعض کم بخت کمین افراد ایسے بھی ہوتے ہیں جو اتنی اچھی عورتوں کو بھی قتل کرنے سے نہیں چوکتے۔“

میں نے سر اٹھا کر چھت کو گھورا اور انسپکٹر غمزدہ سے بھی زیادہ ٹھنڈی بلکہ یخ بستہ سانس بھر کر کہا۔ ”آپ ٹھیک کہتے ہیں جناب۔“

انسپکٹر میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”جو باتیں اب تک مجھے معلوم ہوئی ہیں۔“ اس نے کہنا شروع کیا۔ اس کی آواز اس کے چہرے کی طرح سپاٹ اور کھردری تھی۔ ”ان کے مطابق آپ کی اہلیہ نہایت خوش اخلاق اور ملنسار خاتون تھیں۔ وہ ہمیشہ دوسروں کے

کام آتی تھیں۔ آپ کے تینوں ملازموں کا بیان ہے کہ وہ کبھی کسی کو ڈانٹتی تک نہیں تھیں۔ اتنی خوبیوں والی خاتون کا ایسا انجام ہو، یہ بڑی ہی افسوسناک بات ہے۔ میں نے اپنی بیس سالہ پرانی ملازمت کے دوران ان گنت لاشیں دیکھی ہیں مگر کبھی مجھ پر وہ اثر نہیں ہوا، جو آج ہوا ہے سچ تو یہ ہے کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔"

میں نے زور سے سسکی لی اور ہاتھ اٹھا کر آنکھوں کے کنارے صاف کیے۔ خوش قسمتی سے دو تین آنسو پتہ نہیں کیسے نکل آئے تھے (میں دل ہی دل میں ان آنسوؤں کا بیحد مشکور تھا) پھر آنسو پونچھ کر میں نے کہا۔ "انسپکٹر صاحب! آپ ٹھیک کہتے ہیں میری بیوی واقعی بہت نیک تھیں۔ ان گنت خوبیوں کی مالک تھیں میرے لیے تو وہ خوش قسمتی کی علامت بھی تھیں، کیونکہ جب میں نے شادی کی ہے تو ایک دفتر میں کلرکی کیا کرتا تھا۔ آج میرا اپنا بزنس ہے اور بیس کلرک میرے دفتر میں کام کرتے ہیں (جن میں نور بدن بھی شامل تھی) لیکن اب میں خوش قسمتی کی دیوی سے محروم ہو گیا ہوں۔ اب میرے لیے کوئی خوشی باقی نہیں رہی۔ زندگی گزارنا مشکل ہو جائے گا۔"

میں نے زور زور سے دو تین سسکیاں لیں جن میں ایک چھوٹی سی ہچکی بھی شامل تھی۔ "آپ یقین کیجیے انسپکٹر صاحب! یہ غم میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ اگر وہ کم بخت ذلیل بدمعاش مجھے مل جائے جس نے میری پیاری بیوی کی جان لی ہے تو میں اس کی بوٹیاں بوٹیاں کر ڈالوں، اس کا خون پی جاؤں، اس کے پورے خاندان کو جہنم۔۔۔"

"حوصلہ رکھیے۔۔۔ حوصلہ رکھیے۔۔۔" انسپکٹر نے یکایک ہاتھ اٹھا کر بات کاٹ دی۔ "آپ کے جذبات کو میں سمجھتا ہوں، واقعی یہ زبردست سانحہ ہے آپ کے لیے مگر اپنے دل و دماغ کو قابو میں رکھیے۔ قاتل کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کا کام آپ کا نہیں! قانون کا ہے۔ اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ قانون اپنا فرض نباہنے میں کوتاہی نہیں کرے گا۔"

میں سرد آہ بھر کر چپ ہو گیا۔

اتنے میں ایک سب انسپکٹر آیا اور جھک کر انسپکٹر غمزدہ کے کان میں کچھ کہنے لگا۔ فاصلہ گو زیادہ نہیں تھا تاہم آواز کی بھنبھناہٹ ہی مجھ تک پہنچ سکی۔ الفاظ سمجھ میں نہیں آئے۔ میں ذرا لاتعلق سا ہو کر دروازے سے باہر دیکھنے لگا۔ دروازہ راہداری میں کھلتا تھا۔ اور ڈائننگ روم میں جس جگہ میں بیٹھا تھا۔ وہاں سے میرا سونے کا کمرہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میں چپ چاپ ان لوگوں کو دیکھتا رہا جو میری خوابگاہ اور راہداری اور بیرونی برآمدے میں بکھرے ہوئے تھے اور اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ ایک صاحب آڑے ترچھے ہو کر تصویریں اتارنے میں جٹے ہوئے تھے۔ دو تین حضرات نشاناتِ انگشت کی تلاش میں کمرے کی ایک ایک شے کا تیا پانچہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

چند افراد کمرے، راہداری، برآمدے اور باغیچے کی ایک ایک انچ زمین کو یوں گھور رہے تھے گویا انہیں توقع تھی کہ قاتل نے کہیں نہ کہیں کوئی ایسی چیز ضرور گرائی ہوگی جس سے اس کی شخصیت کا فوراً پتہ چل جائے گا۔ میں ان حضرات کی تندہی اور جانفشانی پر دل ہی دل میں ہنسا کیونکہ میں جانتا تھا کہ انہیں کوئی ایسی چیز ہرگز نہیں ملے گی۔ ملنے کا امکان تو تب ہوتا جب واقعی قاتل نے کوئی لاپروائی کی ہوتی مگر قاتل بڑا ذہین تھا۔ اس نے قتل بڑی ہوشیاری سے کیا تھا۔ اور یوں نہیں کہ بس اچانک ارادہ کیا، اٹھے اور قتل کر دیا۔ جی نہیں، قتل کرنے اور پالش کی ڈبیا خریدنے میں یہی فرق ہے۔ پالش کی ڈبیا آپ کسی بھی جگہ سے خرید سکتے ہیں۔ جب کہ قتل کرنے سے قبل آپ کو سوچنا پڑتا ہے۔ تمام عوامل اور عواقب اور نتائج اور امکانات کا جائزہ لینا پڑتا ہے۔ ان گنت، کیوں اور کیسے اور، اگر مگر اور فرض کرو وغیرہ آپ کا راستہ روکتے ہیں اور جب آپ اتنے مرحلوں سے کامیابی سے گزر چکے ہیں تو تب کہیں جا کر آپ قتل کرتے ہیں میری پیاری بیوی کے معاملے میں بھی قاتل نے ان تمام شرائط کو بخوبی پورا کیا تھا۔ اس نے کئی ہفتے منصوبہ بندی کی تھی۔ ایک ایک پہلو پر غور کیا تھا۔ خدشات و خطرات کی ان گنت کھائیاں عبور کی تھیں اور پھر ایک ایسا منصوبہ بنایا تھا جس میں کہیں کوئی جھول نہیں تھا کوئی خامی نہیں تھی۔ گو قتل جیسے معاملات میں دو اور دو مل کر ہمیشہ چار نہیں ہوتے کبھی کبھی پانچ بھی ہو جاتے ہیں (اکثر تین بھی رہ جاتے ہیں) مگر قاتل نے اس معاملے میں نہایت ذہانت سے دو اور دو ملا کر چار ہی بنائے تھے۔ پھر اس نے بڑی احتیاط اور ہوشیاری سے اپنے منصوبے پر عمل کیا تھا۔ اس طرح کہ کہیں کوئی حماقت نہیں کی تھی۔ نہ اپنا رومال گرایا تھا نہ سگریٹ کا ٹکڑا اور نہ ہی اسے کسی نے دیکھا تھا۔ ارے صاحب دیکھنا تو درکنار، قاتل کا کمال تو یہ تھا، کہ جب اس نے قتل کیا ہے تو میرے گھر میں تو کیا، وہ سرے سے میرے شہر ہی میں نہیں تھا۔

چند منٹ بعد انسپکٹر غمزدہ میری جانب متوجہ ہوا۔ "مسٹر منظور نظر! اگرچہ یہ وقت بڑا غیر مناسب سا ہے لیکن آپ میری مجبوریوں کو سمجھتے ہیں۔ ضابطے کی کارروائی تو پوری کرنی ہی ہے، چنانچہ کیا میں آپ سے چند باتیں پوچھ سکتا ہوں، ویسے آپ کا نام، اگر برا نہ مانیں تو عرض کروں کہ مجھے ذرا عجیب سا لگتا ہے؟"

"اب کیا کہوں۔" میں نے تھوڑا سا پشیمان ہونے کی خاصی کامیاب اداکاری کی۔ "دراصل میرا نام منظور شاہ قادری تھا، لیکن اب زمانہ بدل چکا ہے۔ آج کل زندگی کے ہر شعبے میں جدت اور فیشن کا رواج ہے اور یہی حال ناموں کا بھی ہے، پہلے آنسہ مہرالنسا

بیگم جیسے نام رکھے جاتے تھے، اب مہناز، ثمرانہ، نغمہ اور فائزہ وغیرہ جیسے نام رکھے جاتے ہیں۔ خود میری بیوی کا نام پری رُخ تھا چنانچہ احساسِ کمتری سے بچنے کے لیے میں نے بھی اپنا نام بدل کر منظور نظر کر لیا۔"

انسپکٹر غمزدہ نے اطمینان کی سانس لی۔ "شکر ہے، ورنہ میں تو سمجھا تھا کہ شاید آپ بھی شاعری وائری کرتے ہیں۔"

"ارے صاحب! توبہ کیجیے۔ شاعری تو میری سات پشتوں میں بھی کسی نے نہیں کی۔"

انسپکٹر تھوڑی دیر چپ رہا اور غور کرتا رہا، پھر اس نے کہا، "خیر، تو آپ اس وقت دارالحکومت میں تھے جب یہ افسوسناک واردات ہوئی۔"

"جی نہیں۔" میں نے غور کرتے ہوئے جواب دیا۔ "آپ کا قیاس ہے کہ قتل کی واردات کسی وقت صبح چار بجے اور چھ بجے کے درمیان ہوئی۔ اس کا مطلب ہوا کہ اس وقت میں ٹرین میں تھا کیونکہ میری گاڑی دارالحکومت سے بارہ بجے چلی تھی، اور ساڑھے چھ بجے یہاں پہنچی تھی۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" انسپکٹر نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔ "آپ دارالحکومت کس سلسلے میں گئے تھے۔"

"کاروباری سلسلے میں۔" میں نے جواب دیا۔ "دراصل پچھلے کچھ دنوں سے ہم دولت اینڈ حکومت اینڈ کمپنی سے کچھ آرڈر حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کا صدر دفتر دارالحکومت میں ہے میں اسی مقصد کے تحت وہاں گیا تھا۔"

"کچھ کامیابی بھی ہوئی؟"

میں نے زور سے آہ بھری۔ "ہاں تقریباً پچاس ہزار کے آرڈرز ملے ہیں۔ واپسی کے سفر میں میں یہ سوچ سوچ کر بے حد خوش ہو رہا تھا کہ جب پری رُخ کو یہ خبر سناؤں گا تو وہ کتنا خوش ہوگی۔ مگر کسے علم تھا یہاں مجھے اس کی لاش ملے گی۔ اب یہ آرڈر کس کام کے۔ یہ دولت کس کام کی۔ جس کے لیے میں شب و روز محنت کرتا تھا جب وہی نہیں رہی تو اب ہر چیز بیکار ہے، بے مصرف ہے۔ دولت سے سب کچھ مل سکتا ہے مگر پری رُخ نہیں مل سکتی انسپکٹر صاحب!" میں نے رقت بھری آواز میں بات ختم کی۔ اور گردن جھکا کر زمین کو گھورنے لگا۔

انسپکٹر غمزدہ نے قدرے توقف کے بعد اگلا سوال پوچھا۔ "آپ وہاں کس جگہ ٹھہرے تھے؟"

"ہوٹل عالیشان میں۔" میں نے گردن اٹھائے بغیر جواب دیا۔ "وہ میرا پسندیدہ ہوٹل ہے جب بھی دارالحکومت جاتا ہوں، وہیں ٹھہرتا ہوں۔"

"کل رات آپ نے کس وقت ہوٹل چھوڑا تھا؟"

میں نے چند لمحے غور کرنے کے بعد کہا۔ "میرا خیال ہے، گیارہ بجے تھے۔ دراصل ہوٹل سے ریلوے اسٹیشن کافی دور ہے اس لیے میں ایک گھنٹہ قبل ہی روانہ ہو گیا تھا۔"

"دوسرے الفاظ میں۔" انسپکٹر غمزدہ نے ہاتھ اٹھا کر ناک کی پھننگ کھجائی۔ "ہوٹل کا مینجر یہ گواہی دے گا کہ آپ گیارہ بجے ہوٹل عالیشان میں موجود تھے۔"

میں سمجھ رہا تھا، سب سمجھ رہا تھا، یہ کم بخت نامعقول انسپکٹر یہ سارے سوالات کیوں کر رہا ہے تاہم مجھے کوئی فکر نہیں تھی۔ جانتا تھا کہ مجھے بھی مشکوک افراد کی فہرست میں رکھنے کے باوجود وہ کچھ بھی ثابت نہ کر سکے گا کیونکہ یہ بالکل سچ تھا کہ میں نے واقعی تین دن دارالحکومت میں گزارے تھے، وہاں درجنوں افراد نے مجھے دیکھا تھا اور وہ ایک بار نہیں ہزار بار گواہی دے سکتے تھے۔ چنانچہ میں نے بڑے سکون سے کہا۔ "جی ہاں ہوٹل کا مینجر گواہی دے گا کہ میں گیارہ بجے اس کے ہوٹل میں تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ میں نے تقریباً دس بجے گھر پر ٹرنک کال کر کے عبدالشکور سے بات بھی کی تھی۔ دراصل گفتگو تو پری رُخ سے کرنا تھی مگر اس وقت وہ اپنی کسی سہیلی کے ہاں گئی ہوئی تھی اسی بنا پر عبدالشکور سے ہی بات ہو سکی تھی۔"

"ہاں عبدالشکور نے مجھے بتایا تھا۔" انسپکٹر نے اثبات میں گردن کو جنبش دی۔ پھر اضافہ کیا۔ "مسٹر منظور نظر! اب میں کچھ ایسے سوالات کروں گا جو شاید آپ کو اچھے نہیں لگیں گے لیکن یہ محض ضابطے کے تحت ہیں امید ہے آپ بُرا نہ مانیں گے۔ اس قسم کے واقعات میں ہمیں سوال کرنے ہی پڑتے ہیں۔"

"پوچھیے۔"

"کیا آپ اپنی بیوی کو بہت چاہتے تھے؟"

مجھے علم تھا کہ انسپکٹر غمزدہ اس قسم کے سوالات کرے گا، لیکن انسپکٹر کو یہ نہیں معلوم تھا کہ میں نے جواب دینے کی خاصی تیاری کر رکھی ہے۔ ریہرسل کے دوران میں پولیس افسر بن کر خود سے سوال کرتا تھا اور پھر بے حد ستم رسیدہ اور مظلوم بن کر ان کے جواب دیتا تھا۔ وہ ساری اداکاری اس وقت کام آئی۔ میں نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "انسپکٹر صاحب! اگر آپ کا خیال ہے کہ میں اپنی بیوی کو ضرورت سے زیادہ چاہتا تھا، تو میرا جواب نفی میں ہے۔ میں اسے بس اس حد تک چاہتا تھا جس حد تک ایک عام آدمی اپنی بیوی سے محبت کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ ہماری محبت نارمل قسم کی تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ میری بیوی بھی مجھے بس اسی حد تک چاہتی تھی۔ ہمارے درمیان اکثر جھگڑے بھی ہوتے تھے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے ناراض بھی ہوتے تھے۔ کبھی کبھی دو چار روز بات بھی

بند رہتی تھی لیکن آپ جانتے ہیں کہ یہ ساری باتیں تو گھریلو زندگی کا ایک ضروری اور فطری جزو ہے۔"

"جی ہاں جی ہاں۔" انسپکٹر نے زور زور سے اس طرح سر ہلایا گویا میں نے ریاضی کا کوئی پیچیدہ ترین مسئلہ بیان کیا تھا اور خوش قسمتی سے وہ اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ پھر اس نے کہا: "جھگڑے کس بنا پر ہوتے تھے؟"

"عموماً اختلاف رائے کی بنیاد پر۔ (نور بدن کے متعلق پری رخ کو بالکل علم نہیں تھا) مثلاً یہ کہ مجھے ایک چیز پسند ہے اور وہ اسے پسند نہیں۔ مگر یہ اختلافات محض عارضی ہوتے تھے۔"

انسپکٹر نے چند ثانیے غور کرنے کے بعد اگلا سوال کیا: "آج کل آپ اپنی بیوی کے ساتھ نہیں بلکہ علیحدہ کمرے میں سوتے تھے۔ اس کی وجہ کیا تھی؟"

اگر موقع میری بیوی کی المناک موت کا نہ ہوتا تو اس سوال پر میں ضرور ہنستا کیونکہ اس سوال کا جو جواب مجھے دینا تھا وہ خاصا دلچسپ تھا۔ مجبوراً میں نے ہنسی ضبط کی اور لہجے کی افسردگی میں کچھ اور اضافہ کر کے کہا: "یہ فیصلہ میرا اپنا تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ سوتے وقت میں زور زور سے خراٹے لینے کا عادی ہوں۔ کبھی کبھی خراٹوں کی آواز اتنی اونچی ہوتی تھی کہ پری رخ کی آنکھ کھل جاتی تھی اور پھر ساری رات اسے بے آرامی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ لہٰذا میں نے الگ سونا شروع کر دیا تاکہ میری بیوی کو پریشانی نہ ہو۔"

انسپکٹر نے آہستہ سے "ہوں" کہا۔ پھر وہ اگلا سوال کرنا ہی چاہتا تھا کہ پہلے والا سب انسپکٹر لپکتا ہوا آیا اور جھک کر انسپکٹر غمزدہ کے کان میں کچھ کہنے لگا۔ جتنی دیر ان کی کھسر پھسر چلتی رہی، اتنی دیر میں خشمگیں نظروں سے انسپکٹر کو گھورتا رہا۔ ان کی سرگوشیاں مجھے اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔ دل میں وسوسے سر اٹھا رہے تھے۔ پتہ نہیں کم بخت ایک دوسرے سے کیا کہہ رہے تھے۔ کہیں ان ابلیس کے بچوں نے کوئی بات تو نہیں معلوم کر لی۔ جرم کرنے والے کی نفسیات بڑی عجیب ہوتی ہے۔ وہ ایک بے داغ منصوبہ بنا سکتا ہے، ایک مکمل جرم کر سکتا ہے لیکن ایک بات کا علاج نہیں کر سکتا اور وہ ہے دل کا چور۔ میری حالت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ ایک طرف تو مجھے پورا اطمینان تھا کہ انسپکٹر غمزدہ کچھ بھی معلوم نہیں کر سکے گا۔ دوسری طرف دل میں دھکڑ پکڑ ہو رہی تھی۔ کون جانے کہیں کوئی بھول چوک ہو گئی ہو۔ مگر وہ بھول چوک کیا ہو سکتی ہے؟ میرے لیے یہ قیاس کرنا تقریباً ناممکن تھا۔

سب انسپکٹر جب واپس چلا گیا تو انسپکٹر غمزدہ میری طرف متوجہ ہوا: "مسٹر منظور نظر! میرے آدمیوں نے اپنا کام تقریباً ختم کر لیا ہے لہٰذا اب میں چلتا ہوں۔ لاش کا پوسٹ مارٹم غالباً آج شام تک ہو سکے گا۔ لہٰذا لاش آپ کو کل صبح مل جائے گی۔" پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "ویسے آپ اطمینان رکھیے مجرم کوئی چور ہے یا پاگل، مجھ سے بچ کر نہیں جا سکے گا۔ میں بہرحال اسے تلاش کر لوں گا۔"

میں بھی اٹھا اور اس کے ساتھ چلتا ہوا دروازے کی جانب بڑھا۔ "انسپکٹر صاحب! میں جانتا ہوں اب پری رخ واپس نہیں آ سکتی۔ میری زندگی میں جو اندھیرا چھا گیا ہے وہ اب دور نہیں ہو سکتا لیکن اگر میری بیوی کا قاتل آزاد گھومتا رہا تو میرا دکھ دوگنا ہو جائے گا۔ آپ اسے ہر حال میں تلاش کیجیے۔ یہ میری آپ سے التجا ہے۔"

❁

انسپکٹر غمزدہ نے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا تھا کہ کچھ لوگ آخر نیک اور محبت کرنے والی عورتوں کو کیوں قتل کر دیتے ہیں۔ (ویسے یہ خیال متنازعہ ہے کہ عورتیں محبت بھی کرتی ہیں) یہ بات انسپکٹر نے دراصل اس بنا پر کہی تھی کیونکہ اسے عورتوں اور خاص طور پر بیویوں کا کوئی خاص تجربہ نہیں تھا۔ سنا ہے کہ اس نے ایک لڑکی سے محبت کی تھی مگر وہ بے وفا نکل گئی۔ پھر اس نے شادی کر لی، شنید ہے کہ اس کی بیوی ایک نہایت قناعت پسند قسم کی گائے ہے۔ کبھی گھر سے باہر نہیں نکلی، کبھی شوہر سے کسی بات پر اختلاف نہیں کیا، دوسرے الفاظ میں اس کا ہونا اور نہ ہونا برابر ہے لہٰذا انسپکٹر غمزدہ کو باوصف اس کے کہ وہ کرائمز برانچ کا سب سے کامیاب افسر تھا، اس بات کا کوئی تجربہ نہیں ہو سکتا تھا کہ لوگ صرف مکار، خود غرض، ظالم، بے وفا، نفرت کرنے والی موٹی، کالی، بدصورت، ناٹی، لمبی اور عمر رسیدہ وغیرہ وغیرہ عورتوں کو ہی نہیں، بلکہ کبھی کبھی خوبصورت، گھر گرہست، محبت کرنے والی (بظاہر) عورتوں کو بھی قتل کر دیتے ہیں۔ ان کا انحصار دراصل حالات و اسباب پر ہے۔ میری بیوی پری رخ، جیسا کہ آپ نے اندازہ لگایا ہوگا، واقعی اچھی عورت تھی۔ سلیقہ مند بھی تھی، خوبصورت بھی تھی اور مجھ سے محبت بھی کرتی تھی (کم ازکم وہ کہتی یہی تھی) مگر کیا کیا جائے کبھی کبھی تریاق زہر بھی تو بن جاتا ہے۔ اسی طرح اچھائی کے نتیجے میں بھی کبھی کبھی نقصان بھی اٹھانا پڑتا ہے۔ تاریخ کے صفحات کھول کر دیکھیے۔ بس ایسا ہی کچھ میری بیوی کے معاملے میں ہوا۔ وہ اچھی عورت تھی (ویسے برا میں بھی نہیں ہوں) مگر اس کی اچھائی میرے راستے میں رکاوٹ بننے لگی تھی لہٰذا۔۔۔۔۔

یہ آخر آپ ناک بھوں کیوں چڑھا رہے ہیں؟ میں نے یہ ساری وضاحت اپنی صفائی یا آپ کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے نہیں کی ہے۔ میں نے تو صرف حقیقت حال عرض کی ہے۔ اس دنیا میں ہر روز ایسا ہوتا ہی رہتا ہے گیہوں کے ساتھ گھن بھی پستے ہیں۔ یہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا، لہٰذا مجھے گھوریے مت۔ دل ہی دل میں گالیاں

مت دیجیے اور صبر و سکون سے میری کہانی سنیے۔ ویسے میں جانتا ہوں کہ آپ کوئی دھرماتما نہیں ہیں میرے ہی جیسے انسان ہیں اور ہر چند کہ اس وقت مجھ پر ناک بھوں چڑھا رہے ہیں تاہم کل کو اگر میری جیسی صورتِ حال سے آپ کو بھی دوچار ہونا پڑے تو آپ بھی اپنی نیک گھر گرہست محبت کرنے والی (وغیرہ وغیرہ) بیوی کو قتل کر دیں گے۔ جی ہاں! وقت اور حالات کا جبر اسی کو کہتے ہیں (شاید) اور جب ایسا ہوتا ہے تو آدمی کا بس نہیں چلتا۔ اور۔۔۔۔ مگر خیر — میں آپ کو پوری کہانی ہی سناتا ہوں۔

یہ سارا قصہ دراصل اس وقت شروع ہوا جب میں نے اپنی پیاری بیوی، پری رُخ سے کہا۔

"میں نورِ بدن سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

اس نے رسانیت سے کہا۔ "ضرور کرو پہلے مجھے طلاق دے دو۔"

جب میں نے اس بات کا ذکر نورِ بدن سے کیا تو وہ کہنے لگی۔

"تو پھر پری رُخ کو طلاق دے دو۔"

"مگر یہ ناممکن ہے۔"

"ناممکن کو ممکن بناؤ۔" نورِ بدن نے آنکھیں نکال کر کہا۔ "کیونکہ تمھیں مجھ سے شادی تو کرنا ہی پڑے گی اور وہ بھی بہت جلد۔ کیونکہ میں تمھارے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔ اگر تم نے مجھے دھوکہ دینے کی کوشش کی تو میں پولیس کے پاس جاؤں گی۔ اخباروں میں بیان دوں گی اور تمھیں اتنا بدنام کروں گی کہ تم خودکشی کر لو گے لہٰذا بہتر ہے کہ پری رُخ سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کرو۔"

"مگر کیسے؟"

"یہ میں کیا جانوں؟" نورِ بدن نے تنک کر کہا۔

چھٹکارا حاصل کرنے کی دو ہی صورتیں تھیں، طلاق یا قتل۔

طلاق میں دے نہیں سکتا تھا۔ اس کی دو وجہیں تھیں۔ اوّل یہ کہ میرے بزنس میں پری رُخ پچاس فیصد کی قانونی شراکت دار تھی۔ دوم یہ کہ میں نے پری رُخ کی زندگی کا بیمہ کرا رکھا تھا جو کہ دو لاکھ روپے کا تھا۔ اس صورت میں آپ خود سوچیے کہ اگر میں اسے طلاق دے دیتا تو مجھے کیا ملتا۔ جھنجھنا۔ اب اگر میری عمر دو ڈھائی سال ہوتی تو کوئی بات بھی تھی۔ میں جھنجھنے سے کھیل کے بھی خوش ہو لیتا مگر بدقسمتی سے میری عمر چالیس کے لگ بھگ ہے۔ اس عمر میں آدمی نورِ بدن جیسے کھلونوں سے کھیلتا ہے جس کے لیے پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ یہ کھلونے ذرا قیمتی ہوتے ہیں۔ اگر آپ کی جیب میں پیسے ہیں تو آپ نورِ بدن، گل بدن (اور حتیٰ کہ سبز قدم) نام کے کھلونے حاصل کر سکتے ہیں ورنہ یاد رکھیے آپ کو مٹی کے کھلونے بھی نہیں ملیں گے۔ میں نے جب ان تمام نتائج و عواقب پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کیا تو بحالتِ مجبوری ایک ہی نتیجے پر پہنچا۔ یعنی قتل،

"میں کل رات گھر میں اکیلا تھا۔ اچانک میں نے ایک چور کی آہٹ سنی اس وقت میری تیز رفتاری قابلِ دید تھی۔ ایک ایک چھلانگ میں تین تین اور چار چار سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے پہنچ گیا۔"

"اور چور کو پکڑ لیا؟"

"نہیں۔ میری تیز رفتاری کے باعث چور اوپر ہی رہ گیا۔"

محمود

اپنی پیاری دلآرام، دلربا بیوی پری رخ کا قتل۔

مگر سوال یہ تھا کہ اسے قتل کیسے کروں؟

میں نے کسی جگہ پڑھا تھا کہ مکمل جرم کرنا ناممکن ہے۔ مجرم خواہ کتنا بھی ہوشیار اور زیرک ہو، جرم کرتے وقت کہیں نہ کہیں اور کوئی نہ کوئی ایسی غلطی ضرور کر جاتا ہے جو انجام کار اس کی گرفتاری کا سبب بن جاتی ہے۔ میں نے جب ذرا غور کیا تو مجھے اس نظریے میں کچھ زیادہ جان نظر نہیں آئی۔ وہ بیوقوف ہوتے ہیں جو کوئی نہ کوئی غلطی کر جاتے ہیں جب کہ میں اگر کوشش کروں تو ایک ایسا منصوبہ بنا سکتا ہوں کہ جرم بھی کروں اور صاف بچ بھی جاؤں یعنی یہ کہ پولیس مجھ پر شبہ کرے تو ضرور مگر کچھ ثابت نہ کر سکے۔ مثلاً میں یہ کر سکتا ہوں کہ جس وقت قتل کروں، اس وقت اپنی موجودگی گھر سے ہی نہیں بلکہ اپنے شہر سے بھی دور کسی اور شہر میں ثابت کر دوں۔ اور یہ ثبوت بالکل سچا ہو۔ جھوٹی گواہیوں کا کوئی چکر نہ ہو۔ اس صورت میں پولیس میرا کچھ نہ بگاڑ سکے گی مگر یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے میں نے سوچنا شروع کر دیا۔ میں ایک ہی وقت میں دو جگہ کس طرح ہو سکتا ہوں بظاہر یہ بات بالکل ناممکن تھی تاہم مجھے اس ناممکن کو ممکن بنانا تھا۔ میں سوچتا رہا۔ اور آخر ایک ایسا منصوبہ بنانے میں کامیاب ہو گیا جو نہ صرف میرے بیک وقت دو جگہ ہونے کی تھیوری کو قابلِ عمل بناتا تھا بلکہ ہر طرح سے بے داغ اور مکمل تھا۔ پھر میں نے اس منصوبے پر بتدریج عمل کرنا شروع کر دیا۔

آپ نے کچھوے اور خرگوش والی کہانی ضرور سنی ہو گی اسی طرح کے اہم منصوبے میں جیسا کہ مجھے درپیش تھا خرگوش کی سی تیز رفتاری ہمیشہ نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ جرم کے ہر منصوبے میں اور بطورِ خاص قتل کے منصوبے میں کچھوے کی سست رفتاری والی حکمتِ عملی کی ضرورت ہوتی ہے۔ دھیرے دھیرے ٹھنڈے دل سے

سوچ سمجھ کر منصوبے کو زیرِ عمل لانا چاہیے آخر کو آپ قتل کر رہے ہیں کوئی ہنسی کھیل تو ہے نہیں۔ آپ کی اپنی زندگی بھی داؤ پر لگی ہوتی ہے لہٰذا اگر آپ نے خرگوش والی عجلت پسندی کا مظاہرہ کیا تو تو یقیناً بازی ہار جائیں گے۔ ہاں اگر کچھوے جیسے صبر و تحمل سے کام لیا تو منزلِ مقصود تک ضرور پہنچیں گے۔ مجھے یہ نکتہ معلوم تھا اور میں نے حرف بہ حرف اس پر عمل کیا۔ پورے پانچ ہفتے اپنے منصوبے کے ابتدائی مرحلوں کی تکمیل میں صرف کیے جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ تیاری ہر پہلو سے مکمل ہو چکی ہے تو میں دارالحکومت روانہ ہو گیا۔

میں نے انسپکٹر عزیز زدہ سے کہا تھا کہ مجھے دولت اینڈ حکومت اینڈ کمپنی سے اپنی کمپنی کے لیے کچھ آرڈر لینے تھے۔ میں نے یہ بات غلط نہیں کہی تھی۔ واقعی یہ سچ تھا اور شاید ایسے ہی موقعوں کے لیے ایک تیر سے دو شکار والی کہاوت کہی گئی تھی (ویسے ضروری نہیں کہ دوسرا شکار ہر حال میں بیوی ہی ہو۔ آپ سالے، دوست، رقیب وغیرہ کو بھی فرض کر سکتے ہیں) خیر تو میں نے تین دن دارالحکومت میں گزارے۔ دولت اینڈ حکومت اینڈ کمپنی سے پچاس ہزار کے آرڈر حاصل کیے پھر واپسی کے لیے رختِ سفر باندھا جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، روانہ ہونے سے قبل میں نے ٹرنک کال کیا مقصد تھا بیوی روح سے گفتگو کرنا (ثبوت کے لیے ضروری تھا) مگر وہ موجود نہ تھی، میں نے عبدالشکور سے گفتگو کی اور اسی کو غنیمت جانا۔ میں نے عبدالشکور کو مطلع کیا کہ بارہ بجے کی گاڑی سے روانہ ہو رہا ہوں۔ صبح ساڑھے چھ بجے پہنچوں گا۔ میں نے اسے یہ بھی تاکید کی کہ مجھے لینے کے لیے کسی کو آنے کی ضرورت نہیں۔ میں خود ہی ٹیکسی لے کر گھر پہنچ جاؤں گا پھر میں ہوٹل ہی کی کار میں اسٹیشن کے لیے روانہ ہوا۔ (گواہی کے لیے یہ بھی ضروری تھا) فرسٹ کلاس میں میں نے ایک کیبن جو دو برتھ پر مشتمل تھا، پہلے ہی ریزرو کرا لیا تھا ——

یہ بہت ضروری تھا کہ میں جس کیبن میں سفر کروں اس میں میرے سوا کوئی نہ ہو اور یہ اسی صورت میں ممکن تھا جب میں صرف ایک برتھ کے بجائے پورا کیبن ہی بُک کرا لوں۔ اس میں گو کچھ زیادہ پیسے خرچ ہوئے لیکن نورین جیسا کھلونا اور لاکھوں روپے کا فائدہ حاصل کرنے کے لیے اتنا خرچ تو برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔ (کیا آپ نہیں کریں گے؟)

جب ٹرین روانہ ہوئی تو میں نے اپنا بڑا بیگ کھول کر کمبل اور تکیہ نکالا اور اوپر والی برتھ پر رکھ دیا۔ (منصوبے کے تحت میں کمبل اور تکیہ ساتھ لے گیا تھا) پھر میں کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا اور باہر دُور تک جگمگاتی ہوئی روشنیوں کو دیکھنے لگا۔ میرے ہاتھ میں سگریٹ تھی اور ذہن میں خیالات کا ہجوم۔ لیکن کسی قسم کا انتشار یا خوف بالکل نہیں تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ میرا منصوبہ بڑا مکمل اور بے عیب تھا۔ میں اپنے مقصد میں پوری کامیابی حاصل کروں گا۔ اس طرح کہ اگر پولیس نے مجھ پر شک کیا بھی تو کچھ ثابت نہ کر سکے گی۔ کیونکہ جس وقت بیوی روح کی موت واقع ہو گی اس وقت میں ٹرین میں سفر کر رہا ہوں گا اور اس بات کا میرے پاس ناقابلِ تردید ثبوت ہو گا۔

غالباً ایک بجا تھا جب ٹکٹ چیکر نے دروازے پر دستک دی۔ وہ ایک موٹا اور گنجا آدمی اور خاصا بے وقوف نظر آتا تھا۔ جماہی لینے کے دوران اس نے میری ریزرویشن سلپ دیکھی، نشان لگایا اور احمقوں کی طرح مسکراتا ہوا چلا گیا۔ یہ ایک اچھی علامت تھی کیونکہ میں جانتا تھا کہ اب صبح تک کوئی مجھے پریشان نہیں کرے گا۔ پھر میں کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا اور باہر دیکھنے لگا۔ گاڑی شہر سے نکل آئی تھی اور رات کی تاریکی، ویرانی اور سناٹے میں تیز رفتاری سے شادات نگر کی طرف بھاگ رہی تھی۔ میں نیم وا آنکھوں سے درختوں کے ان سیاہ ہیولوں کو دیکھتا رہا جو مخالف سمت میں بھاگ رہے تھے۔ اب مجھے اگلے ڈیڑھ گھنٹے تک کچھ بھی نہیں کرنا تھا سوا انتظار کے۔ گاڑی شاداب نگر ڈھائی بجے کے بعد پہنچتی تھی اور میرے منصوبے کا اگلا مرحلہ شاداب نگر پہنچنے کے بعد ہی شروع ہوتا تھا۔

گاڑی جب شاداب نگر پہنچی تو رات کے دو بج کر پینتیس منٹ ہوئے تھے۔ میں ساری تیاری پہلے ہی مکمل کر چکا تھا۔ اوپر والی برتھ پر میں نے تکیہ رکھ کر کمبل ایک طرف ڈال دیا تھا۔ تاکہ دیکھنے والے کو ایسا محسوس ہو کہ سونے والا ابھی ابھی اٹھ کر ٹوائلٹ گیا ہے۔ پھر میں نے کپڑے تبدیل کیے تھے۔ ایک عام قسم کی پتلون بھوری قمیص، ہونٹوں پر مونچھیں چپکا لی تھیں جو دیکھنے میں بالکل اصلی لگتی تھیں۔ آنکھوں پر چشمہ بھی چڑھا لیا تھا۔ یہ احتیاط ٹکٹ کلکٹر کے لیے تھی تاکہ وہ میری اصلی صورت سے واقف نہ ہو سکے۔ پھر میں نے کیبن کی بتی بجھائی۔ دروازہ بند کیا اور کمپارٹمنٹ سے باہر آیا۔ ٹکٹ کلکٹر ایک ناٹے قد کا آدمی تھا۔ اُس کی آنکھیں مندی مندی سی تھیں۔ لگتا تھا جیسے وہ جاگتے میں بھی سو رہا ہے۔ میں نے اس کے ہاتھ تھرڈ کلاس کا ٹکٹ رکھ دیا جو اسی مقصد کے لیے دارالحکومت سے خریدا تھا اور اگرچہ ٹکٹ چیکر نے اسے پنچ نہیں کیا تھا لیکن ٹکٹ کلکٹر نے اس بات پر کوئی توجہ نہیں دی۔ میں اسٹیشن سے باہر آ کر بائیں جانب والی اس سڑک پر تیز رفتاری سے چلنے لگا جو ریلوے اسٹیشن کے جنگلے کے ساتھ ساتھ چلی گئی تھی۔ اس طرف آبادی نہیں تھی۔ کچھ گودام تھے، ایک فیکٹری تھی اور کچھ خالی پلاٹ تھے۔ فیکٹری سے آگے دو گوداموں کے درمیان ایک مختصر

سا پلاٹ تھا۔ جس پر پندرہ سولہ چھوٹے بڑے چوبی کیبن بنے ہوئے تھے جنھیں لوگ کرائے پر لے کر مختلف مقاصد کے لیے استعمال کرتے تھے۔ میں نے جیب سے چابی نکال کر سات نمبر کیبن کا دروازہ کھولا سامنے میری ٹویوٹا کھڑی تھی۔

دس منٹ بعد میری کار اسی سڑک پر فراٹے بھر رہی تھی جو سیدھی میرے شہر کو جاتی تھی۔

آپ شاید حیران ہو رہے ہیں، ہے نا! حالانکہ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ ذرا غور کریں تو میرا منصوبہ بہ آسانی آپ کی سمجھ میں آسکتا ہے جیسا کہ میں نے عرض کیا میری ٹرین دو بج کر پینتیس منٹ پر شاداب نگر پہنچی۔ چونکہ شاداب نگر جنکشن ہے اس لیے ٹرین یہاں پینتالیس منٹ ٹھہرتی ہے پھر سوا تین بجے شاداب نگر سے روانہ ہو کر چھوٹے بڑے مختلف اسٹیشنوں پر رکتی ہوئی چھ بجے بیگم پورہ پہنچتی ہے جو کہ میرے شہر کا ایک مضافاتی اسٹیشن ہے۔ اور سینٹرل اسٹیشن سے کوئی آٹھ نو میل کے فاصلے پر ہے۔ بیگم پورہ میں پانچ منٹ ٹھہر کر ٹرین ساڑھے چھ بجے سینٹرل اسٹیشن پہنچتی ہے۔ میرا خیال ہے اب تو آپ میرے منصوبے کے اہم نکتوں کو سمجھ گئے ہوں گے (اگر جواب اثبات میں ہے تو اس کا مطلب ہے کہ آپ میں قتل کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے اور آپ اپنی بیوی کو قتل کر سکتے ہیں) جیسا کہ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میرے منصوبے میں شاداب نگر اور بیگم پورے کی بہت زیادہ اہمیت تھی۔ ٹرین کو شاداب نگر سے روانہ ہو کر پونے تین گھنٹے کے بعد بیگم پورہ پہنچنا تھا اور میرے لیے انتہائی ضروری تھا کہ چھ بجے ہر حال میں بیگم پورہ پہنچ جاؤں۔ چند منٹ کی تاخیر سارا منصوبہ چوپٹ کر سکتی تھی۔ یہاں میں یہ بھی عرض کر دوں کہ پانچ ہفتے میں نے صرف ہوائی قلعے بنانے میں صرف نہیں کیے تھے منصوبہ تو خیر ہفتے بھر میں ہی مکمل ہو گیا تھا۔ باقی وقت میں نے تیاری میں صرف کیا تھا۔ سب سے پہلے تو میں نے ایک کار خریدی تھی، اس کا علم نور بدن تک کو نہیں تھا۔ پھر میں نے کئی سفر شاداب نگر کے کیے تھے۔ اور آخر کار اسٹیشن کے قریب ہی (خوش قسمتی سے) ایک کیبن حاصل کر لینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ میں نے بیگم پورہ اسٹیشن کے قریب ایک ایسی جگہ بھی تلاش کر لی تھی جہاں میں اپنی کار ایک دو دن کے لیے بے فکر ہو کر چھوڑ سکتا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا قطعۂ زمین تھا۔ یہاں ہر وقت کچھ نہ کچھ کاریں، وان، اور اکا دکا پرائیویٹ بسیں کھڑی رہتی تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میری کار ایک دو دن وہاں کھڑی رہتی تو کسی کو بھی پروا نہیں ہوتی۔

خیر اب آیئے اس قصے کی طرف اس وقت جب میں اپنے شہر کی طرف سفر کر رہا تھا تو میرے دل میں کوئی ہیجان نہیں تھا۔ کوئی خوف نہیں تھا، اتنا پرسکون تھا، گویا میں قتل کرنے نہیں فلم دیکھنے جا رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ مجھے اپنے منصوبے پر پورا بھروسا تھا۔ یقین تھا کہ اپنے مقصد میں کامیاب رہوں گا۔ پری رخ میری زندگی سے یوں نکل جائے گی جیسے مکھن میں سے بال نکلتا ہے (ویسے میں تسلیم کرتا ہوں کہ بال اور بیوی میں بڑا فرق ہے) سارا کاروبار بلا شرکت غیرے میرا ہو گا۔ دو لاکھ روپے انشورنس سے بھی وصول ہوں گے اور پھر نور بدن کا نور و نکہت اور حسن و شباب سے بھرپور بدن میرے پہلو میں ہو گا... نور بدن... میری دلربا، تم نے کہا تھا، ناممکن کو ممکن بناؤ۔ دیکھو میں نے یہ کارنامہ کر دکھایا ہے... کچھ ہی دیر کی بات اور ہے پھر وہ بات سچ مچ ممکن ہو جائے جو بظاہر ناممکن نظر آتی تھی۔

میں نے زور سے سانس لے کر کار کی رفتار اور بھی بڑھا دی۔

جب میں اپنے شہر کے مضافات میں داخل ہوا تو بدستور رات تھی۔ سناٹا سڑکوں پر مسلط تھا۔ سرکاری لیمپ پوسٹوں کی مدھم روشنیاں چپ چاپ اونگھ رہی تھیں۔ میں نے بیگم پورہ عبور کیا۔ اور شہر کے مرکزی حصے میں داخل ہوا۔ میرا بنگلہ شہر کے اس حصے میں ہے جہاں امرا اور رؤسا رہتے ہیں۔ اس علاقے میں اور بھی زیادہ سناٹا تھا، روشنی بھی نسبتاً کم تھی۔ میں نے اپنی کار ایک بنگلے کی عقبی گلی میں کھڑی کی اور پھر سنسان اور تاریک گلیوں میں ہوتا اپنے بنگلے کی جانب روانہ ہو گیا۔

آپ شاید سوچ رہے ہیں کہ اس وقت جب میں اپنے بنگلے کی طرف بڑھ رہا تھا ضرور میرے دل میں گھبراہٹ پیدا ہوئی ہو گی، ارادہ متزلزل ہوا ہو گا کیونکہ قتل کرنا اور وہ بھی اپنی بیوی کو قتل کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے لیکن آپ کا خیال غلط ہے میں پہلے ہی کی طرح پرسکون اور پر اعتماد تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بنگلے تک پہنچنے، عقبی چہار دیواری پھاند کر پائیں باغ میں اترنے اور پھر روش اور راہداری طے کر کے پری رخ کے کمرے تک پہنچنے میں مجھے کسی الجھن اور تذبذب کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ یہ تمام مراحل میں نے اس طرح طے کیے گویا کوئی خاص بات ہی نہ تھی پھر میں نے ہینڈل گھما کر خواب گاہ کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ (پری رخ خوابگاہ کا دروازہ اندر سے لاک کرنے کی عادی نہیں تھی) کمرے میں ہلکی نیلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ سامنے جہازی سائز کی مسہری تھی اور اس پر میری پیاری دلربا بیوی پری رخ سو رہی تھی۔ میں دبے قدموں آگے بڑھ کر مسہری کے قریب کھڑا ہو گیا اور غور سے پری رخ کو دیکھنے لگا۔ اس نے کمر تک ایک مخملی دلائی اوڑھ رکھی تھی

اُس کے سیاہ لمبے بال تکیے پر بکھرے ہوئے تھے اور بالوں کے درمیان اس کا صبیح چہرہ، جو حالتِ خواب میں اور بھی دلکش ہو گیا تھا۔ ایک نشیلے چاند کی طرح نظر آتا تھا۔ میں ایک لمحے کے لیے مبہوت ہو گیا۔ جی چاہا اُسے قتل کرنے کے بجائے پیار کروں مگر میں نے اس خیال کو فوراً ہی دل سے نکال دیا۔ وہ لوگ کبھی کوئی اہم کام نہیں کر سکتے جو وقتی جذباتیت سے مغلوب ہو جاتے ہیں۔ کسی بھی مہم کو سر کرنے کے لیے ارادے کی مضبوطی، جذبے کی پختگی اور عمل کی ناقابلِ شکست صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں اس نکتے سے آگاہ تھا لہٰذا میں نے پری رخ کو پیار کرنے کے لمحاتی اور احمقانہ خیال کو ایک طرف جھٹک دیا اور آگے بڑھ کر مسہری کے کنارے پر ٹک کر بیٹھ گیا۔ پری رخ کے مخملی تکیے کے قریب ایک موٹی سی کتاب پڑی ہوئی تھی۔ غالباً سونے سے پہلے اس نے مطالعہ کیا ہوگا اور پھر بجائے میز پر رکھنے کے وہیں تکیے کے پاس چھوڑ کر سو گئی تھی۔ میں نے کتاب اُٹھا کر ایک نظر اس پر ڈالی۔ ایک دو صفحے کھول کر دیکھے۔ توقع کے مطابق وہ کتاب بھی پھولوں کے متعلق تھی۔ پری رخ کو پھولوں سے بے حد دلچسپی تھی اور یہ اُسی کا ہی کارنامہ ہے کہ میرے بنگلے میں ہر طرف پھول ہی پھول نظر آتے ہیں۔ میں نے کتاب احتیاط سے میز پر رکھ دی، پھر بغل میں پڑا ہوا کُشن اٹھایا اور پری رخ کے چہرے پر رکھ دیا۔

موت کا منظر کبھی خوشگوار نہیں ہوتا۔ خاص طور پر اُس وقت جب آپ خود کسی کو موت کے گھاٹ اتار رہے ہوں، یہ منظر اور بھی تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔ میرا بھی کچھ ایسا ہی حال ہوا۔ چند لمحوں کے لیے ارادہ متزلزل ہوا۔ دل نے چلا کر کہا "ہاتھ ہٹالو"، دماغ نے ڈانٹ کر حکم دیا "خبردار حماقت نہ کرنا"۔ اور میں نے حماقت نہیں کی۔ دراصل اردو محاورے کے مطابق میں اتنا آگے جا چکا تھا کہ اب واپسی ناممکن تھی چنانچہ پری رخ ہاتھ پیر پٹختی رہی۔ اُس کے گلے سے خرخراہٹ کی آوازیں نکلتی رہیں۔ اس کا جسم بار بار جھٹکے لیتا رہا۔ مگر میں نے اپنی گرفت کمزور نہیں پڑنے دی حتیٰ کہ چند منٹ بعد وہ ساکت ہو گئی۔ اس کی سانس کی آمد و رفت منقطع ہو گئی۔ تب میں اٹھا، زور زور سے کئی سانسیں لیں، چہرے سے پسینہ پونچھا اور حواس بحال کرنے کے لیے ایک دو چکر لگائے۔ جب ذرا سکون ہوا تو میں نے پری رخ کی سنگار میز کی درازیں کھولیں کیونکہ بہر حال واردات کو چوری کا رنگ دینے کے لیے کچھ نقدی اور زیورات غائب کرنا ضروری تھا۔

پھر میں جس طرح دبے قدموں بنگلے میں داخل ہوا تھا اسی طرح باہر بھی آگیا۔

بعد ازاں جو کچھ ہوا وہ بھی میرے منصوبے اور خواہش کے عین مطابق تھا۔ جب میں بیگم پورہ اسٹیشن پر پہنچا تو صبح کا اجالا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ پانچ منٹ بعد گاڑی آئی اور میں اپنے کمپارٹمنٹ میں چلا گیا۔ کپڑے تبدیل کیے، جوتے کھڑکی سے باہر پھینکے اور انتظار کرنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ گھر پہنچ کر میں خود ہی لاش دریافت کروں گا اور پولیس کو اطلاع دے دوں گا۔ لیکن یہ ایک بات توقع کے مطابق نہیں ہوئی۔ گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ بی بی سلیمن (جو کہ دراصل ہماری ملازمہ ہیں اور صبح جلد اٹھنے کی عادی ہیں) لاش دریافت کر چکی ہیں اور عبدالشکور پولیس کو ٹیلی فون بھی کر چکے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی چاچی سلیمن نے سینے پر دو ہتڑ مار کر کہا۔

"ہائے۔ ہائے میاں۔ ستم ہو گیا۔ ہماری بیگم ہم سے جدا ہو گئیں۔"

❁

پورے واقعے سے اب آپ واقف ہو گئے ہیں اور آپ نے دیکھ لیا ہے کہ میرا منصوبہ کتنا اچھوتا اور مکمل تھا۔ اس میں کہیں کوئی خامی نہیں تھی، کوئی ایسا کمزور پہلو نہیں تھا جو میرے پکڑے جانے کا سبب بن سکتا۔ انسپکٹر غمزدہ مجھ پر شک تو کر سکتا تھا لیکن مجھے مجرم ثابت کرنا اس کے لیے ناممکن تھا کیونکہ واردات کے وقت میں ٹرین میں تھا۔ ویسے مجھے امید نہیں تھی کہ مجھ پر شبہ کرے گا۔ کیونکہ اس نے چوری والے نظریے کو تقریباً مان لیا تھا۔ میں نے تقریباً پانچ ہزار کے زیورات کے علاوہ کچھ نقد رقم غائب کی تھی۔ انسپکٹر غمزدہ کا خیال تھا کہ چور جب پری رخ کے کمرے میں داخل ہوا، تو اتفاق سے پری رخ کی آنکھ کھل گئی مگر اسے مسہری سے اٹھنے کا موقع نہ مل سکا۔ چور نے دہشت اور گھبراہٹ میں فوراً ہی اُسے دم گھونٹ کر مار ڈالا اور پھر جو نقد رقم اور زیورات ہاتھ لگے انہیں لے کر فرار ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ انسپکٹر غمزدہ اسی نظریے پر کام کرے گا اور آخر تھک ہار کر بیٹھ جائے گا۔ کیونکہ اس چور کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے، جس کی اُسے تلاش ہوگی۔

دو روز گزر گئے۔ انسپکٹر غمزدہ کیا کر رہا تھا، اس کا مجھے کوئی علم نہیں کیونکہ اس نے اس ضمن میں کچھ بھی نہیں بتایا۔ ہاں وہ دو بار میرے بنگلے پر آیا ضرور، مجھ سے کچھ سوالات کرنے جو بظاہر بے ضرر قسم کے تھے۔ میری بیوی کے مشاغل کیا تھے؟ اس کی خاص خاص سہیلیوں کے نام اور پتے، لائف انشورنس کی تفصیلات وغیرہ۔ دوسری بار جب وہ آیا تو اس نے کچھ وقت پری رخ کی خوابگاہ میں بھی گزارا۔ جب جانے لگا تو میں نے پوچھا۔

"انسپکٹر صاحب کیسے کچھ کامیابی ہوئی؟"

"گھبرائیے مت" اس نے کہا۔ "میرا خیال ہے میں نے چور کو تقریباً تلاش کر لیا ہے۔"

"ج... جی..." میں تقریباً ہکا بکا رہ گیا۔

تیسرے دِن اُس نے مجھے پولیس اسٹیشن طلب کر لیا۔

جب میں اُس کے آفس میں داخل ہُوا تو وہ اپنی میز کے پیچھے خاموش بیٹھا ہُوا تھا۔ اُس کا چہرہ حسبِ معمول جذبات سے عاری تھا۔ کھُردرا اور سپاٹ، آنکھوں میں وُہی بے مروّتی تھی جس کے لیے طوطا ساری دُنیا میں مشہور ہے۔ میں نے سلام کیا تو اُس نے مسکرا کر جواب دیا مگر اس کی مسکراہٹ بھی ایسی تھی گویا اُس نے مستعار لے کر اپنے ہونٹوں پر چپکا لی ہو۔ بالکل رُوکھی پھیکی مسکراہٹ تھی۔ میں نے دل ہی دل میں اُس پر لعنت بھیجی اور سامنے والی کرسی پر بیٹھ کر آہستہ سے کہا۔

"فرمایئے انسپکٹر صاحب آپ نے مجھے کیوں یاد کیا ہے؟"

اُس نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا چند لمحے غور کرتا رہا اور مجھے گھُورتا رہا، پھر کہنے لگا۔ "دراصل ایک دو باتیں ہیں جن کی وضاحت کے لیے میں نے آپ کو زحمت دی ہے' اِن سوالوں کا جواب مِل جائے تو میرا خیال ہے' میں مجرم کی نشاندہی کر سکتا ہوں۔"

"جی۔" میرا دل ہولے سے کانپا۔ "کیا آپ نے چور کو۔ ۔ ۔ میرا مطلب ہے میری بیوی کے قاتل کو تلاش کر لیا ہے؟"

"جی ہاں، کچھ ایسی ہی بات ہے۔" وہ مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "لیکن دو ایک اُلجھنیں ہیں۔"

"کیا؟" میں نے تھوک نگلا۔ "آپ پوچھیے میں جواب دینے کی پوری کوشش کروں گا۔ مگر وہ ہے کون؟ کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں؟"

"ابھی نہیں۔" اُس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ پہلے یہ پُورا معاملہ سلجھ جائے۔" وہ اُٹھ کر اور کمر کے پیچھے ہاتھ باندھ کر دھیرے دھیرے ٹہلنے لگا۔ "مسٹر منظور نظر!" اس نے ٹہلتے ٹہلتے کہنا شروع کیا۔ "آپ کی بیوی کی موت کا سانحہ جتنا افسوسناک ہے اُتنا ہی پیچیدہ بھی۔ جب میں نے اس اُلجھی ہوئی واردات کی چھان بین شروع کی تو دو ایک باتیں ایسی میرے علم میں آئیں جنھوں نے مجھے پس و پیش میں مبتلا کر دیا۔ پہلے میرا خیال تھا کہ مجرم محض ایک عادی چور ہے اور قتل کا ارتکاب اُس نے وقتی اضطراب اور ہیجان کے عالم میں کیا ہے لیکن تفتیش کے نتیجے میں جو سُراغ ملے انہوں نے مجھے اپنا خیال بدلنے پر مجبور کر دیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ مجرم کا مقصد چوری ہرگز نہیں تھا، درحقیقت وہ قتل ہی کرنا چاہتا تھا لیکن پولیس کو مغالطہ دینے اور غلط راہ پر ڈالنے کے لیے اس نے قصداً زیورات غائب کر کے واردات کو چوری کا رنگ دینے کی کوشش کی ہے جب میرے ذہن نے اس نکتے کو ایک حقیقت کے طور پر قبول کر لیا تو سوال پیدا ہوا کہ آخر وہ کون شخص ہے اور اُس نے قتل کا ارتکاب کیوں کیا؟"

اتنا کہہ کر انسپکٹر غمزدہ رُک گیا اور غور سے مجھے دیکھنے لگا۔

> "میری دلی خواہش ہے کہ سال میں چھُٹی اور آرام کے تین سو پینسٹھ دن ہوا کریں۔"
>
> "بے وقوف انسان! اس طرح تو تمہیں ہر چوتھے سال کام کرنا پڑے گا۔"

میں نے دل ہی دل میں کہا۔ "لعنت ہے۔"

انسپکٹر نے قدرے توقف کے بعد آخر کار سلسلۂ کلام آگے بڑھایا۔ "خیر، تو میں نے تحقیقات جاری رکھی، ایک دو سُراغ اور ملے اور اُن سے یہ انکشاف ہُوا کہ مجرم کا تعلق ہر چند کہ اسی شہر سے ہے اور اُس نے اس بات کو چھُپانے کی کوشش بھی نہیں کی ہے لیکن اُس نے جُرم کے وقت اس شہر میں اپنی غیر موجودگی کو ثابت کرنے کا اہتمام ضرور کیا ہے۔ (لعنت ہو، کم بخت، مردود، ناہنجار، میں نے دل ہی دل میں پھر کہا) اور میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس کوشش میں وہ ضرور کامیاب ہُوا ہے۔ وہ اگرچہ ارتکاب جرم کے وقت یہاں تھا مگر پھر بھی نہیں تھا۔ یا اس بات کو یوں کہیں کہ وہ یہاں نہیں تھا اور پھر بھی تھا میرے خیال میں اس ہونے نہ ہونے کے چکر میں پڑنے کے بجائے میں اپنی تحقیقات کی تفصیلات ہی بیان کروں تو زیادہ بہتر رہے گا اور مجرم کا منصوبہ ذرا بہتر طور پر واضح ہو سکے گا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ مجرم کے منصوبے کا بنیادی نکتہ اسی شہر میں ہونے نہ ہونے پر ہے تو میں نے سوچنا شروع کیا کہ اس تھیوری پر عمل کی کیا صُورت ہو سکتی ہے۔" انسپکٹر غمزدہ ایک لمحے کے لیے رکا، غور سے مجھے دیکھا، پھر بولا۔ "میں نے سوچا اگر میں کسی کو قتل کرنا چاہوں تو مذکورہ تھیوری پر عمل کرنے کے لیے میں کیا کروں میرے ذہن میں کئی منصوبے آئے لیکن ان میں صرف ایک ایسا تھا جو جی کو لگا۔ میں نے سوچا سب سے پہلے میں کسی دُوسرے شہر کو روانہ ہو جاؤں گا پھر چند روز کے بعد واپس آؤں گا لیکن واپسی میں کسی بڑے اسٹیشن پر ٹرین چھوڑ دُوں گا اور کسی اور ذریعے سے مثلاً کار یا ٹیکسی سے اپنے شہر آؤں گا، قتل کروں گا اور پھر اپنے شہر کے کسی مضافاتی اسٹیشن سے وہی ٹرین دوبارہ پکڑ لوں گا، جو پہلے بڑے اسٹیشن پر چھوڑی تھی اور اس طرح میں یہ ثابت کر دوں گا کہ واردات کے وقت میں ٹرین میں تھا۔ اور۔ ۔ ۔"

"مگر۔ ۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے انسپکٹر صاحب!" میں نے تھوک نگل کر اور ذرا سراسیمہ ہو کر کہا۔ "یہ ناممکن ہے۔"

"سُنتے رہیے۔" انسپکٹر نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ "بظاہر یہ ناممکن ہی

نظر آتا ہے لیکن درحقیقت نہیں ہے، خیر تو میں جب اس منصوبے کے تمام امکانی پہلوؤں پر غور کر چکا تو میں نے سوچا کہ اگر یہ مفروضہ درست ہے تو پھر وہ کون سی ٹرین ہو سکتی ہے جو مجرم نے استعمال کی ہو رات کے اوقات میں کئی گاڑیاں مختلف شہروں سے یہاں آتی ہیں تاہم واردات کے وقت کے پیش نظر صرف ایک گاڑی ایسی تھی جس پر مجرم سفر کر سکتا تھا اور وہ تھی دارالحکومت سے آنے والی گاڑی۔ جس پر آپ نے بھی سفر کیا تھا اور جو یہاں صبح ساڑھے چھ بجے پہنچی تھی۔"

میں یکایک سٹپٹا کر بولا (اداکاری بھی یقیناً اچھی تھی) "آپ کا مطلب ہے کہ میں اور قاتل اس رات ایک ہی ٹرین میں سفر کر رہے تھے۔"

انسپکٹر پراسرار انداز میں مسکرایا۔ "جی ہاں بات کچھ ایسی ہی ہے۔" اس کے لہجے میں نشتر کی سی طنز تھی۔ "مجھے یقین ہے کہ قاتل اسی ٹرین میں تھا۔ جب میں نے اس کی جگہ خود کو تصوّر کر کے سوچنا شروع کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ ٹرین چھوڑنے کے لیے شاداب نگر سب سے موزوں اور مناسب اسٹیشن ہے مجرم نے شاداب نگر میں ٹرین چھوڑی اور غالباً کار کے ذریعے یہاں آیا صرف اسی صورت میں اسے اتنا وقت مل سکتا تھا کہ وہ آپ کی بیوی کو قتل کر کے ٹھیک وقت پر مضافاتی اسٹیشن تک پہنچ سکے۔ اب چونکہ شاداب نگر سے آنے والی گاڑی بیگم پورہ اسٹیشن پر ٹھہرتی ہے لہٰذا میں نے سوچا کہ ممکن ہے بیگم پورہ اسٹیشن پر کوئی سراغ مل سکے۔ ہم نے چھان بین کی مگر کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ ہاں ہمیں ایک کار ضرور ملی ہے جو وہاں دو دن سے کھڑی ہے۔ ہم نے فوراً رجسٹریشن آفس سے معلومات حاصل کیں تاہم مایوسی ہوئی۔ جس شخص کے نام وہ گاڑی رجسٹرڈ ہے، اس نے صرف سات دن قبل وہ کار فروخت کر دی تھی اور نئے مالک نے ابھی تک اپنے نام رجسٹریشن نہیں کرائی ہے مگر یہ کوئی اہم بات نہیں ہے۔ ہم بہرحال اس شخص کو ڈھونڈ لیں گے، جس نے گاڑی خریدی ہے، دوسری بات یہ ہے کہ ہم نے اپنا ایک آدمی آج ہی شاداب نگر روانہ کیا ہے، مجھے یقین ہے کہ وہاں بھی کوئی نہ کوئی گواہ ایسا ضرور مل جائے گا جس نے اس گاڑی کو شاداب نگر اسٹیشن کے آس پاس ضرور دیکھا ہوگا۔"

انسپکٹر غمزدہ چُپ ہو گیا، میں بھی خاموش رہا مگر بظاہر، ورنہ اندر اندر میں لاوے کی طرح کھول رہا تھا۔ کم بخت ذلیل، شیطان تو بلا وجہ بدنام ہے یہ شخص انسپکٹر غمزدہ شیطان سے بھی چار ہاتھ آگے ہے۔ میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ اگر بچّہ سقہ کی طرح مجھے ایک دن کی بادشاہت مل جائے تو میں سب سے پہلے اس مردود کو پھانسی پر لٹکا دوں۔ اس کی کھال کھنچوا کر گوشت چیل کوّوں کو کھلا دوں اور کھال سے جوتے بنوا لوں۔ لوگ ٹھیک ہی کہتے تھے کہ یہ شخص اگر چاہے تو بال کی بھی کھال اتار سکتا ہے مگر تعجب کی بات تو یہ ہے کہ اس دُنیا میں اتنے بدمعاش ہیں، چور، ڈاکو، قاتل ہیں، بجتے لفنگے، اٹھائی گیرے وغیرہ وغیرہ ہیں۔ کیا کہیں بھی ایک شخص ایسا نہیں جس میں اتنی ہمت ہو کہ اس نابکار کے سینے میں ایک گولی اتار دے۔

جب میں خاموش ہی رہا تو انسپکٹر کہنے لگا۔ "مسٹر منظور نظر! کیا خیال ہے میری اس تھیوری کے بارے میں؟"

میں بمشکل تمام حلق سے آواز نکالنے میں کامیاب ہو سکا۔ "میں کیا کہہ سکتا ہوں انسپکٹر صاحب ویسے آپ تو یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ نے قاتل کو تلاش کر لیا ہے۔"

انسپکٹر پھر کرسی پر بیٹھ گیا اور سپاٹ لہجے میں بولا۔ "جی ہاں! مگر قاتل کی نشاندہی کرنے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوا کہ یہ تمام تفصیلات بھی آپ کو سنا دوں، ویسے تفتیش مکمل نہیں ہوئی ابھی کچھ وقت اور لگ جائے گا مگر صرف مزید ثبوت حاصل کرنے میں۔ قاتل کو تلاش کرنے میں نہیں، اسے تو میں تلاش کر چکا ہوں۔"

"کون ہے وہ؟" میں نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

انسپکٹر نے میز کی دراز کھولی اور دو تین تصویریں اور ایک کتاب نکال کر میرے سامنے ڈال دی۔

میں نے دیکھا یہ وہی پھولوں والی کتاب تھی، جو بری رُخ کی مسہری پر مجھے ملی تھی۔ میں نے چہرے پر مصنوعی حیرت طاری کر کے کہا۔ "یہ کیا ہے؟"

"یہ تصویریں اُنگلیوں کے نشانات کی ہیں۔" انسپکٹر غمزدہ نے جواب دیا۔ "اور یہ ایک نئی کتاب ہے جو پندرہ دن پہلے چھپی تھی اور صرف سات دن پہلے پبلک لائبریری میں آئی تھی اور آپ کے دارالحکومت جانے کے بعد دوسرے دن آپ کی بیوی نے اپنے نام پر نکلوائی تھی۔ آپ اتوار کو دارالحکومت گئے ہیں اس پر پیر کی تاریخ پڑی ہے اور جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں اس کتاب پر سفید پلاسٹک کا کور چڑھا ہوا ہے لہٰذا ہمیں اس پر پڑے ہوئے انگلیوں کے نشانات کے فوٹو لینے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی لیکن ان نشانات نے ہمیں ایک اُلجھن میں ڈال دیا ہے آپ اپنے بنگلے میں برس ہا برس سے رہ رہے ہیں وہاں کی ہر چیز پر آپ کی انگلیوں کے نشانات کا ہونا قرین قیاس ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس کتاب پر آپ کی انگلیوں کے نشانات کیسے آئے کیونکہ یہ کتاب اس وقت آپ کے گھر میں آئی، جب آپ وہاں نہیں تھے اور نہ ہی آپ نے اس کتاب کو پہلے کبھی دیکھا تھا کیا آپ ہمیں اس سوال کا جواب دیں گے؟"

میں گردن جھکا کر کتاب کے کور پر بنے ہوئے پھولوں کو گھورنے لگا۔

اقبال کاظمی

پرانا حساب

اتفاق مُجرم کو تو کبھی کبھی قدرت معاف بھی کر دیتی ہے لیکن عادی مُجرم قانونِ قدرت سے نہیں بچ سکتا۔ اگر ایک جرم کی سزا سے بچ نکلتا ہے تو کسی دوسرے جُرم میں پھنس جاتا ہے۔ ایک مُجرم کا قصّہ جو مکافاتِ عمل کا شکار ہو گیا تھا۔

وہ فروری کا سرد ترین دن تھا۔ یخ بستہ ہوا نوکِ نشتر کی طرح ہڈیوں کے گودے تک میں اتری جا رہی تھی۔ ستم یہ کہ بارش نے بھی اس شہر کے باشندوں کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ کبھی چھاجوں پانی برسنے لگتا اور کبھی یہی موسلا دھار بارش ہلکی پھوار میں بدل جاتی۔ کونوں کھدروں میں دُبکے ہوئے لوگ موقع ملتے ہی سڑکوں پر آجاتے۔

اینٹیک شاپ کے سامنے کھڑا ہوا میلکن بڑی توجہ سے شوکیس میں رکھی ہوئی ان پُرانی چیزوں کو دیکھ رہا تھا جنہیں غالباً زیادہ قیمت وصول کرنے کے لیے دوکان کے مالک نے نوادرات کا نام دے رکھا تھا۔ حالانکہ اس کے خیال میں پوری دکان میں ایسی کوئی چیز نہیں ہو گی جسے قدیم یا تاریخی قرار دیا جا سکتا۔ دُبلے پتلے میلکن کے جسم پر پرانا سا لباس بھیگ کر اس کے لیے خاصا تکلیف دہ ثابت ہو رہا تھا۔ سر کے بالوں سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں اور کیچڑ میں لت پت ٹوٹے ہوئے جوتوں سے ٹھنڈک اس کے پیروں سے ہوتی ہوئی پورے جسم میں پھیل رہی تھی۔ سردی سے وہ کینچوے کی طرح ٹھٹھرا جا رہا تھا لیکن شوکیس میں رکھے ہوئے اس پرانے پستول پر نظر پڑتے ہی وہ سر سے پیر تک اس طرح کپکپا اٹھا جیسے اسے برف کے پانی میں غوطہ دے کر نکالا گیا ہو۔ پستول کو اس نے دیکھتے ہی شناخت کر لیا تھا۔ فلنٹ لاک والا یہ پستول اگرچہ اتنا پُرانا نہیں تھا کہ اسے نوادرات میں شامل کیا جا سکتا لیکن اس وقت اس کی قدر و قیمت کا اندازہ صرف وہی لگا سکتا تھا۔ میلکن کو یقین تھا کہ اس پستول کے اندر چھپی ہوئی دولت کا اس کے علاوہ دُنیا کے کسی فرد کو علم نہیں تھا اس کے اور اس قیمتی پستول کے درمیان صرف شوکیس کا شیشہ حائل تھا۔ ایک لمحہ کو اس کے جی میں آیا کہ شیشے کی یہ نازک سی دیوار توڑ کر پستول اٹھائے اور بھاگ نکلے، لیکن دوسرے ہی لمحہ اپنے جذبات کو قابو میں لاتے ہوئے میلکن نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا کیونکہ اسے یقین تھا کہ اس طرح قسمت اس کا ساتھ نہیں دے گی اور وہ فوراً ہی پکڑ لیا جائے گا۔ کسی جرم میں پکڑے جانے کا مطلب یہ ہوتا کہ اسے زندگی کے کچھ دن، چند مہینے یا چند سال جیل کی کوٹھری میں گزارنا پڑتے۔ میلکن کو جیل کا خاصا تجربہ تھا۔ وہ پولیس والوں کے اس مشفقانہ برتاؤ سے بھی واقف تھا جو سچ اگلوانے کے لیے وہ ملزم سے روا رکھتے ہیں۔ پولیس والوں کی محبت اور چھتر سے متاثر ہو کر پکڑا جانے والا ان جرائم کا اعتراف بھی کر لیتا ہے جو اس کی گزشتہ سات پشتوں میں سے کسی نے نہیں کیے ہوتے اور

Jasoosi Digest February 1983

نہ آنے والی سات نسلوں میں کسی کا ارادہ ان جرائم کے ارتکاب کا ہوتا ہے۔ میلکن اپنے دل کے دھڑکنے کی رفتار کو کنٹرول کرتا ہوا اپنے ساتھی کی طرف بڑھا جو فٹ پاتھ کے کنارے کھڑا ششتہ ایونیو کی طرف سے آنے والے ٹریفک کے سیلِ رواں کو دیکھ رہا تھا۔

"پپ... پیکی... تمہاری جیب میں... کک... کیا ہے؟ میرا مطلب ہے کتنی... ر... رقم ہے؟" کچھ سردی کے اثر اور کچھ جذبات کی سنسنی سے اس کا لہجہ ٹھٹھرا ہوا تھا۔

میلکن کا دوست پیکی اس سے بھی زیادہ خستہ حالت میں تھا۔ کسی غریب کے جھونپڑے کی ٹپکتی ہوئی چھت کی طرح اس کے کوٹ سے پانی کی موٹی موٹی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ سردی کے ساتھ اس کے دماغ پر وہسکی کا بھی کچھ اثر تھا۔ اس نے میلکن کی طرف دیکھا اور پھر بھیگے ہوئے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر چند بھیگے ہوئے نوٹ اور سکے نکال کر میلکن کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔

"چھ ڈالر پینتیس سینٹ!" میلکن نوٹ اور سکوں کی گنتی کرتے ہوئے بولا۔ "چار ڈالر ساٹھ سینٹ میرے پاس ہیں۔ اس طرح ہمارا کل سرمایہ دس ڈالر پچانوے سینٹ بنتا ہے!"

کئی روز کی بے کاری کے بعد پچھلے دو دن میں انہیں سڑکوں پر سے برف ہٹانے کا کام ملا تھا جس کی انہیں سولہ ڈالر فی کس مزدوری ملی تھی۔ آج صبح تک وہ بتیس ڈالر کے مالک تھے لیکن فکرِ فردا کو ذہن پر مسلط کیے بغیر وہ دونوں دن بھر شراب پیتے رہے تھے اور برف کی ٹھٹھرن میں کمائی ہوئی دولت ہاتھ سے پھسلتی رہی اور اب ان کے پاس پورے گیارہ ڈالر بھی نہیں تھے لیکن ان کی یہ مالی پوزیشن میلکن کے لیے زیادہ تشویشناک نہیں تھی۔ اس نے دکان کے شوکیس میں جو پرانا پستول دیکھا تھا اس سے منسلک لیبل پر صرف ساڑھے سات ڈالر قیمت لکھی ہوئی تھی۔

میلکن کو پستول کے بارے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ ٹوٹے ہوئے ٹرائیگر گارڈ، اسٹیل کے نیلے بیرل کے منہ پر اوپر کی طرف زنگ کا نشان اور بھاری دستے پر لگے ہوئے براس پر ڈینٹ کے متعدد نشانات کی بنا پر اس نے اس پستول کو دیکھتے ہی شناخت کر لیا تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ پستول کے دستے پر یہ ڈینٹ اس وقت پڑے تھے جب جین کو فلیٹ کو دیواروں پر تصویریں آویزاں کرنے کے لیے اور کچھ نہیں ملا تھا تو کیل ٹھونکنے کے لیے اس نے پستول ہی کو ہتھوڑی کے طور پر استعمال کیا تھا۔ وہ اس وقت جین کی اس حرکت پر مسکرا دیا تھا جو اس کی بے قاعدہ زندگی کو باقاعدہ بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ اس جیسے سیلانی کے دل میں ایک گھر کا احساس پیدا کرنا چاہتی تھی۔ چاہت کے اظہار کی آڑ میں جین اس کی جیبوں سے وہ تمام رقم نکال لیتی جسے وہ چوری چکاری اور دھوکے فراڈ سے لوگوں سے ہتھیا لیا کرتا تھا۔ جین کی اس ادا پر اس نے کبھی اعتراض نہیں کیا تھا۔ وہ بڑی خوشی سے اپنی سپردگی کے ساتھ اپنی جیبیں بھی اس کے حوالے کر دیتا لیکن اس نے جین کو اس راز سے آگاہ کرنے کی حماقت کبھی نہیں کی تھی کہ اس پرانے پستول کی نال میں وہ ہیرے پوشیدہ تھے جو اس نے چند روز قبل ہی چرائے تھے۔ اس کے خیال میں چوری کے ہیرے چھپانے کے لیے اس سے بہتر اور کوئی جگہ ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اس کے لیے اسے کچھ محنت بھی کرنی پڑی تھی۔ موم سے ملتا جلتا مادہ پگھلا کر ہیروں کے ساتھ پستول کی نال میں بھر دیا تھا پھر بڑی احتیاط سے نال کو اس طرح صاف کیا تھا کہ ہیرے نال کے اوپر کی طرف چپکے رہ گئے تھے۔ یہ آج سے دس سال پہلے ویسٹ چیسٹر کی بات تھی۔ اس کے اندازے سے آج ان ہیروں کی مالیت ساٹھ ستر ہزار ڈالر کے لگ بھگ ضرور رہی ہوگی۔ دس سال کے اس عرصہ میں یہ پستول نجانے کس کس کے ہاتھ لگا ہوگا۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اب ہیرے نال کے اندر موجود تھے یا کسی کی قسمت سنوار گئے تھے۔ اس کے جسم میں سنسنی کی عجیب سی لہریں برقی رو کی طرح حرکت رہی تھیں۔ وہ اپنے آپ کو تسلی دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ ہیرے اب بھی پستول میں موجود تھے۔

"پیکی!" وہ لہجے کو پُرسکون بنانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "ہم اس رقم سے وہ پستول خریدنے جا رہے ہیں۔ وہ دیکھ رہے ہو؟ وہ جو سامنے شوکیس میں رکھا ہوا ہے۔"

پیکی اس طرح ہنس دیا جیسے میلکن کی اس خواہش کا مذاق اڑا رہا ہو۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا موقع تھا کہ اس نے سمجھداری کا ثبوت دیتے ہوئے میلکن کی بات کا مضحکہ اڑا کر گویا اسے یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ مفلسی اور عسرت کے اس دور میں وہ ایسی کوئی خواہش دل میں نہیں لا سکتے جو ان کے دائرہ اختیار سے باہر ہو۔ پیکی جیسے شخص کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جو دوسروں کے پاس کوئی اچھی چیز دیکھ کر اسے پانے کی خواہش بھی دل میں نہیں لا سکتے۔ اس نے کبھی یہ سوچنے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کی تھی کہ ایسا کیوں ہے؟

"ایک ڈرنک کے بارے میں کیا خیال ہے؟" وہ میلکن کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔

"فی الحال ہم شوکیس میں رکھا ہوا وہ پستول خرید رہے ہیں" میلکن لہجے میں زہد پیدا کرتے ہوئے بولا۔ "اس کا شمار تاریخی نوادرات میں ہوتا ہے اور میں ایک ایسے آدمی کو جانتا ہوں جو بلا چوں چرا اسے پچاس ڈالر میں خرید لے گا۔ اس میں آدھی رقم تمہاری ہوگی یعنی پچیس ڈالر! ذرا سوچو تو پیکی! تصور کرو۔ پچیس ڈالر کتنی بڑی رقم ہوتی ہے!"

"میں پچیس ڈالر کا کیا کروں گا۔" بیکی بولا۔" میرے پاس رقم موجود ہے۔" اس نے اپنی دی ہوئی رقم میلکن کے ہاتھ سے جھپٹتے ہوئے کہا۔" میں کوئی پستول نہیں خریدوں گا۔ نہ ہی مجھے اس کی ضرورت ہے۔ مجھے اس وقت شراب کی ضرورت ہے۔"

میلکن کا دل ایک بار پھر اچھلنے لگا۔ بیکی کی حماقت پر اس کا دماغ سلگ اٹھا۔ اس کا جی چاہا کہ بیکی کا گلا دبوچ لے اور اسے سڑک پر لٹا کر اتنے گھسیٹے دے کہ وہ سب کچھ بھول جائے، لیکن یہ وقت غصے کے اظہار کا نہیں محبت، ہمدردی اور ترغیب سے اسے راہِ راست پر لانے کا تھا۔ وقت پڑے گدھے کو باپ بنانے والی مثل اس نے اکثر سنی تھی اور اب وہ اس گدھے کو باپ بنانے کی سوچ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میلکن کو اپنا وہ وقت یاد آ گیا جب بیکی جیسے گدھے اس کے طویلے میں بندھے رہتے تھے۔ اس وقت وہ بیکی کی طرح راندۂ درگاہ تھا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مالی لحاظ سے بیکی سے کسی حد تک کمتر تھا۔ وہ گزرے ہوئے ان ماہ و سال کے بارے میں سوچنے لگا جب وہ ایک سنڈیکیٹ کا معزز اور اہم رکن تھا۔ اس کی جیب نوٹوں کی گرمی کا احساس دلاتی رہتی۔ وہ دن میں دو مرتبہ لباس بدلتا، اچھے سے اچھا کھاتا اور دوسروں سے بات کرنے کا انداز بھی مختلف تھا لیکن، اب وہ دن رخصت ہو چکے تھے۔ اب تو صورتِ حال یہ تھی کہ جسم نئے یا اچھے لباس کے لمس کو ترس گیا تھا۔ اچھے کھانوں کی مہک نتھنوں تک ضرور پہنچتی مگر نصیب نہ ہوتے۔ بیکی جیسے گھٹیا شخص سے بات کرتے ہوئے بھی اس کی آواز بھیک مانگتی ہوئی محسوس ہوتی لیکن اسے امید ہو چلی تھی کہ یہ وقت بھی گزر جائے گا اور وہ ایک بار پھر پہلے کی طرح آسائش کی زندگی گزارے گا۔

"اے خدایا!" وہ اوپر دیکھتے ہوئے زیرِ لب بڑبڑایا۔" اب تو کئی سال سے میں صراطِ مستقیم پر چل رہا ہوں اور آئندہ بھی اسی سیدھے راستے پر چلتا رہوں گا۔ میری مدد کر خدایا!"

وہ چشمِ تصور سے اپنے آپ کو ایک بار پھر شاہانہ زندگی گزارتے ہوئے دیکھنے لگا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ پستول کی نال سے برآمد ہونے والے ہیرے فروخت کر کے شریفانہ زندگی بسر کرے گا اور کاروبار کے منافع سے حاصل ہونے والی رقم سے ان لوگوں کا نقصان بھی پورا کرے گا، دس سال پہلے جن کے ہیرے چرائے تھے۔" اے اللہ!" وہ ایک بار پھر توبہ کے انداز میں بڑبڑایا۔" میں اپنے بوڑھے باپ کو بھی تلاش کروں گا، اور زندگی کے آخری سانس تک اس کی خدمت کرتا رہوں گا۔" پانچ سال میں پہلی مرتبہ اسے پوری شدت سے اپنے بوڑھے باپ کی یاد ستانے لگی تھی جسے وہ بھول چکا تھا۔" اللہ میاں جی! تم تو دل کا حال جانتے ہو اور یہ بھی جانتے ہو کہ میں شروع ہی سے مجرمانہ زندگی نہیں اپنانا چاہتا تھا۔" یہ جھوٹ تھا۔ میلکن نے چوریوں اور دیگر جرائم کے ارتکاب سے محض اس لیے توبہ کی تھی کہ جیل کی سختیوں نے اس کا کچومر نکال دیا تھا۔ اب اتنی ہمت نہیں رہی تھی کہ دو چار دن کے لیے بھی سرکار کا مہمان بن سکتا اور نہ ہی اتنی جرأت برقرار رہی تھی کہ کامیابی سے کسی واردات کا ارتکاب کر سکتا۔ اسے یقین تھا کہ اس کی ایسی کوئی معمولی سی کوشش بھی اسے دوبارہ اونچی فصیلوں کے پیچھے پہنچا دے گی۔ پانچ سال پہلے آخری مرتبہ جیل سے نکلنے کے بعد اس نے عہد کر لیا تھا کہ اب وہ ایسا کوئی کام نہیں کرے گا جس سے قانون کا سامنا کرنا پڑے۔ پانچ سال کے اس عرصے میں وہ خوفِ خدا سے نہیں، اپنی بزدلی اور پولیس کے تشدد اور جیل کی سختیوں کے ڈر سے دھتکارے ہوئے شریف آدمی کی سی زندگی گزارنے کی کوشش کر رہا تھا، اب دوبارہ دولت مند بننے کا تصور ایک بار پھر اس پر غالب آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ایک لمحہ کو اپنی توبہ استغفار بھول گیا اور بیکی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے غرایا۔" یہ رقم چپکے سے میرے حوالے کر دو ورنہ مار مار کر تمہارا بھرکس نکال دوں گا۔"

"یہ... یہ میری ہے۔" بیکی ہکلایا۔ اس نے مٹھی بند کر لی لیکن میلکن کے تیور دیکھ کر اسے مٹھی تو کھولنا ہی پڑی تھی۔ میلکن چند لمحے اس کے میلے ہاتھ پر بھیگے ہوئے مسلے ہوئے نوٹوں کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے نوٹ اس طرح جھپٹ لیے جیسے اگر ایک لمحہ کی بھی تاخیر ہو گئی تو کاغذ کے یہ ٹکڑے چڑیا کی طرح پھر سے اڑ جائیں گے۔ وہ دونوں دکان میں داخل ہوئے۔ بیکی کو ایک بار پھر خیال آیا کہ چونکہ یہ رقم اس کی ہے اس لیے اس سے خریدی جانے والی چیز بھی اس کی ملکیت ہونی چاہیے۔ وہ میلکن کی طرف دیکھ کر ہکلایا۔" رقم میری ہے... اس لیے پس... پستول بھی میرا ہی ہو گا۔"

میلکن کے ذہن میں ہیرے جگمگا رہے تھے۔ ایک لمحہ کو اس کے ذہن میں خیال آیا کہ اگر پستول کی نال میں ہیرے موجود نہ ہوئے تو پستول اس کے لیے بے کار ہو گا۔ دوسری صورت میں بیکی سے پستول حاصل کرنا دشوار ہو جائے گا۔ اس نے دل کو تسلی دی کہ ہیرے ابھی تک پستول ہی میں ہوں گے۔ دراصل وہ اس کے علاوہ کچھ اور سوچنے کو تیار ہی نہیں تھا۔ وہ اپنے آپ کو یقین دلا چکا تھا کہ اس نے مستقبل کے جو سہانے خواب دیکھے تھے ان کی تعبیر پستول کی نال میں پوشیدہ تھی۔

"اس پستول کی کک... کیا قیمت ہے؟" اس نے اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے دکاندار سے پوچھا۔

دکاندار نے سر سے پیر تک ان دونوں کا بغور جائزہ لیا جو لباس اور صورت ہی سے اچکے نظر آ رہے تھے۔ پھر داڑھی کھجاتے ہوئے دھتکارنے والے لہجے میں بولا۔ "قیمت اس پر لکھی ہوئی ہے، سات ڈالر پچاس سینٹ!"

"میرا مطلب تھا میں اسے خریدنا چاہتا ہوں۔" میلکن نے کپکپاتے ہوئے ہاتھ سے مطلوبہ رقم اس کی طرف بڑھا دی۔ اس میں چھ ڈالر پینتیس سینٹ پیکی کے تھے اور باقی ایک ڈالر پندرہ سینٹ اس نے اپنے سے ملائے تھے۔ دکاندار نے انہیں گھور کر دیکھا اور پھر شوکیس سے پستول نکال کر اس کا جائزہ لینے لگا جیسے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہو کہ اس میں ایسی کیا خاص بات تھی۔ میلکن کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اسے یقین ہو چکا تھا کہ ہیرے پستول کی نالی میں موجود تھے۔ وہ دل ہی دل میں دکاندار کے اندھا ہونے کی دعائیں مانگنے لگا۔ اسے خدشہ ہو رہا تھا کہ آتی ہوئی دولت کہیں عین آخری لمحوں ہاتھ سے نہ نکل جائے۔

"تم یہ پستول کیوں خریدنا چاہتے ہو؟" دکاندار کی نظریں ان کے چہروں سے پھسلتی ہوئی فرش پر پہنچ گئیں جہاں ان کے لباس اور جوتوں سے نچڑنے والا پانی جمع ہو رہا تھا۔

"شش... شوق..." پیکی ہکلایا۔ "بس میں یہ پستول خریدنا چاہتا ہوں۔" ساتھ ہی اس نے ہاتھ آگے بڑھا دیا تھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے یہ پستول تمہارے ہاتھ بیچنا چاہیے یا نہیں؟" دکاندار ایک بار پھر پستول کا جائزہ لیتے ہوئے پُرسوچ لہجے میں بولا۔

میلکن کے دل کی دھڑکن کچھ اور بھی بڑھ گئی۔ اگر دکاندار نے پستول بیچنے سے انکار کر دیا تو اس کے سارے خواب بکھر جائیں گے۔ وہ تنکے کا سہارا لیتے ہوئے بولا۔ "لیکن یہ تو بہت پرانا پستول ہے، غالباً استعمال کے قابل بھی نہیں۔ اسے ہم ہتھیار سمجھ کر نہیں خرید رہے ہیں۔"

"ہاں ہاں! ہم نوادرات جمع کرنا چاہتے ہیں۔" پیکی نے اس کی تائید میں گردن ہلائی۔ اس وقت وہ کسی ایسے بچے کی طرح خوش نظر آ رہا تھا جسے اس کا پسندیدہ کھلونا ملنے والا ہو۔ "ہم یہ پستول ضرور خریدیں گے۔" کہنے کے ساتھ ہی اس نے دکان دار کے ہاتھ سے پستول جھپٹ لیا۔

"خدا کے لیے!" دکاندار سہم کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا چہرہ ایک دم متغیر ہو گیا تھا۔ پیکی کسی کاؤ بوائے کی طرح پستول کو چاروں طرف اس طرح حرکت دے رہا تھا جیسے دشمنوں پر فائرنگ کر رہا ہو۔ "اس پستول کو کھلونا سمجھ کر بچگانہ حرکتیں مت کرو۔ ہو سکتا ہے پرانا ہونے کے باوجود اس میں کوئی گولی اٹکی رہ گئی ہو جو کسی بھی لمحہ چل سکتی ہے۔"

"نہیں، یہ تو ناکارہ ہتھیار ہے جسے اب محض سجاوٹ کے طور پر ہی استعمال کیا جا سکتا ہے۔" پیکی بچوں کی طرح ہنستے ہوئے بولا۔ پھر وہ پستول کو اس طرح تھپکنے لگا جیسے بہت مدت بعد ملاقات ہوئی ہو۔

"کیا واقعی اس میں کوئی چیز موجود ہے؟" میلکن نے دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے دیکھا نہیں تھا۔ دکان میں آنے والی ایسی چیزوں کو کبھی اس نظر سے دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔" دکاندار نے پستول کی نال پکڑ لی جبکہ پیکی نے دستہ پر گرفت جما رکھی تھی۔ دکاندار نے پنسل اٹھا کر پستول کی نال میں داخل کی۔ چند لمحے اسے آگے پیچھے حرکت دیتا رہا پھر پنسل نکال کر اس کی نوک پر لگی ہوئی میل یا ایسی ہی کسی چیز کا جائزہ لیتے ہوئے پُرخیال لہجے میں بولا۔ "یہ پستول پچاس سال پرانا ہے۔ ممکن ہے اس میں کچھ بارود جما رہ گیا ہو۔ کیچڑ یا کوئی ایسی چیز بھی ہو سکتی ہے۔"

"یہ... یہ میرا پستول ہے۔" پیکی نے احمقوں کی طرح قہقہہ لگایا پھر پستول کو بغل میں دباتا ہوا دکان سے باہر بھاگ گیا۔

میلکن بھی اس کے پیچھے لپکا۔ اس کا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔ اب اسے یقین ہو چکا تھا کہ ہیرے پستول کی نال کے اندر موجود تھے۔ وہ ایک بار پھر درخشاں مستقبل کے خواب دیکھنے لگا۔ اس نے سوچا کہ سب سے پہلے صرف ایک ہیرا فروخت کرے گا۔ اس سے ملنے والی رقم سے رہائش کے لیے شاندار مکان خریدے گا، نئے کپڑے بنائے گا اور زندگی کی دیگر ضروریات کا بندوبست کرے گا۔ اب وہ اتنا بے وقوف بھی نہیں تھا کہ باقی ہیروں کو بھی اونے پونے فروخت کر دینے کا خیال دل میں لاتا۔ وہ سمجھتا تھا کہ جو شخص قیمتی ہیرے فروخت کر رہا ہو اس کی ظاہری حالت ایسی ہونی چاہیے کہ کوئی اس پر شبہ نہ کر سکے اور اگر شبہ نہ بھی کرے تو اسے ٹھگنے کی کوشش نہ کرے۔ اسے یہ تاثر دینا تھا کہ وہ بہت بڑا رئیس ہے۔ اسے پیسوں کی ضرورت نہیں محض فالتو ہیرے فروخت کرنا چاہتا ہے۔ اگر اسے ہیروں کی پوری قیمت وصول کرنا تھی تو بڑی ہوشیاری اور ذہانت سے کام لینے کی ضرورت تھی۔

اپنی دوبارہ آبادکاری کا احساس اس کے دل میں کچھ اس شدت سے پیدا ہوا تھا کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے اپنے گرد و نواح کو بھول کر کیچڑ میں کھڑا صرف اسی موضوع پر سوچتا رہ گیا۔ شاندار مکان، عمدہ لباس، لذیذ کھانے اور دنیا کے بڑے بڑے خوبصورت

شہروں کی سیاحت۔ سیاحت کے خیال سے اس کے ذہن میں پیرس کا دھندلا سا نقشہ ابھر آیا۔ وہ بچپن میں ایک مرتبہ پیرس گیا تھا اور ایک بار دیکھا تھا، دوسری بار دیکھنے کی ہوس دل میں لیے بیٹھا تھا لیکن آج تک ایسا موقع نصیب نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنے آپ کو پیرس کی طرف محوِ سفر بحری جہاز میں محسوس کرنے لگا۔ اس نے سوچا کہ وہ پیرس کے جواخانوں میں بھی جائے گا لیکن اس نے ابھی سے طے کر لیا تھا کہ وہ صاف گیم کھیلے گا اور کسی قسم کی بے ایمانی نہیں کرے گا۔ اگر کوئی شخص اس وقت میلکن کے ذہن میں جھانک سکتا تو اسے پتہ چلتا کہ یہ دنیا کا معصوم ترین اور انتہائی سادہ لوح بے ضرر آدمی ہے جس کے دل یا دماغ میں بددیانتی یا کسی بدی کا شائبہ تک نہیں۔ اسے دنیا کا وہ واحد آدمی کہا جا سکتا تھا جو برائیوں سے دور رہ کر شریفانہ زندگی گزارنے کا متمنی تھا۔

میلکن کی عمر اس وقت انتالیس سال تھی جس میں سے سات سال جیل میں گزرے تھے۔ جیل کا خیال آتے ہی وہ سوچنے لگا کہ اس کی مجرمانہ زندگی کا آغاز کیوں اور کیسے ہوا تھا۔ وہ ایک شریف آدمی تھا۔ کسی چیز کی کمی بھی نہیں تھی۔ زندگی کی ہر خواہش جیسے تیسے پوری ہو رہی تھی۔ ذہین اور چالاک آدمی تھا۔ نجانے اس کے ذہن میں اپنی چالاکیوں سے فائدہ اٹھانے کا خیال کس طرح آیا تھا۔ سب سے پہلے اس نے مختلف لوگوں کے ناموں سے جعلی چیک کیش کروانے شروع کر دیئے پھر تاش کے کھیل میں ہاتھ کی صفائی دکھلانے لگا جو اس کے لیے زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا تھا۔ پھر جواخانے ہی میں میلکن کی ملاقات اس شخص سے ہوئی تھی جو اس کے لیے قطعی اجنبی تھا لیکن تاش میں اس کے ہاتھ کی صفائی دیکھ کر اس نے مشورہ دیا تھا کہ اگر وہ تجوریوں پر بھی ہاتھ صاف کرنا شروع کر دے تو چند ہی دنوں میں لکھ پتی بن سکتا ہے۔ اس وقت میلکن کی عمر صرف تیئس سال تھی لیکن پچیس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے وہ ایک ماہر مجرم بن چکا تھا۔ جرائم کی دنیا میں اس کی دھاک بیٹھ گئی اور اس حلقے میں اس کا نام عزت و احترام سے لیا جانے لگا۔ قسمت کی دیوی واقعی اس پر مہربان ہو رہی تھی۔ دولت نے گویا اس کے گھر کا راستہ دیکھ لیا تھا۔ اس دولت کی ریل پیل میں وہ پہلی مرتبہ جیب پکڑے جانے پر جیل پہنچا تو اسے اندازہ ہوا کہ مجرم بن کر دولت حاصل کرنا بھی کچھ آسان نہیں۔ جیل کی سختیاں جھیلتے ہوئے اس نے عہد کیا تھا کہ اس چار دیواری سے نکلتے ہی جرائم کی دنیا کو خیرباد کہہ کر شریفانہ زندگی بسر کرنے کی کوشش کرے گا، لیکن جیل سے باہر آتے ہی وہ نیکی اور شرافت کے یہ تمام درس بھول گیا اور ایک بار پھر ناجائز ذرائع سے دولت سمیٹنے لگا، لیکن ناتوں! وہ ایک بار پھر جیل پہنچ گیا اور پھر تو آمد و رفت کا یہ سلسلہ چل نکلا۔ مگر بالآخر اس کے اعصاب جواب دے گئے اور اب وہ زندگی کے اس دوراہے پر کھڑا تھا جہاں کوئی شخص یہ فیصلہ تو کر لیتا ہے کہ اسے کس طرف جانا ہے لیکن ایک عجیب سی کشمکش الجھن بن کر اس کے پیروں سے لپٹ جاتی ہے۔

"او خدایا!" اس کے منہ سے بے اختیار کراہ خارج ہوئی۔ "میں اپنی زندگی سنوارنا چاہتا ہوں۔ کچھ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ میری مدد کر۔"

پھر یکایک جیسے وہ ہوش میں آ گیا۔ اس نے پستول لینے کے لیے پیکی کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

"یہ... مم... میرا پستول ہے۔" پیکی نے احمقانہ انداز میں کہتے ہوئے پستول پر گرفت مضبوط کر لی پھر اسے اوورکوٹ کی اندرونی جیب میں ڈال کر دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ "یہ پستول میرا ہے۔ میں تمہیں نہیں دوں گا۔ اس سے شہر بھر کے ٹیکسی ڈرائیوروں کو شوٹ کر دوں گا۔" شہر کے ٹیکسی ڈرائیوروں سے وہ خاصا شاکی تھا۔ گزشتہ دو دنوں میں سڑکوں پر برف ہٹانے کے دوران متعدد ٹیکسیاں اس پر چھینٹے اڑاتے ہوئے گزر گئی تھیں۔ چند ٹیکسیاں ایسی بھی تھیں جنہوں نے اسے کچلنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

میلکن کی بھنویں سکڑ گئیں۔ وہ چند لمحے اسے ناگوار نگاہوں سے گھورتا رہا پھر اچانک ہی اس کے ذہن میں خیال آیا کہ یہ احمق اس طرح قابو نہیں آئے گا۔ اس سے پستول حاصل کرنے کے لیے ذہانت کی ضرورت تھی۔ اس نے یہی دوسرا طریقہ اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا اور چہرے کے تاثرات بدلتے ہوئے بولا۔

"پیکی! میرے پاس کچھ پیسے بچے ہوئے ہیں۔ ایک ڈرنک کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

پیکی کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ خاموشی سے اس کے ساتھ چل دیا۔ دونوں ایک گھٹیا سے بار روم میں جا کر بیٹھ گئے۔ چند سیکنڈ بعد ہی ان کے سامنے "جن" کے دو گلاس رکھے ہوئے تھے۔ جن میں سے ہر گلاس کی قیمت تیس سینٹ تھی۔ کچھ عرصہ پہلے جب اسی گلاس کی قیمت دس سینٹ ہوا کرتی تھی تو اس وقت یہ بہت مہنگا لگتا تھا لیکن میلکن کو اب یہ تیس سینٹ میں بھی بہت سستا نظر آ رہا تھا۔

"میں اسے جن پلا کر نشے میں دھت کر دوں گا۔" میلکن نے کن اکھیوں سے پیکی کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ "اس کے مدہوش ہوتے ہی پستول لے اڑوں گا اور پھر کسی دن اسے تلاش کر کے سو ڈالر کا نوٹ چپکے سے اس کی جیب میں ڈال دوں گا۔"

تصور میں پیکی کو سو ڈالر کا نوٹ دیئے جانے کے ساتھ ہی میلکن کو اس دولت کا خیال آ گیا جو عنقریب اس کی ہونے والی

تھی۔ یہ سوچ کر کہ کہیں وہ خود بھی نشے میں نہ بہک جائے اس نے فوراً ہی فیصلہ کر لیا کہ وہ خود ایک گھونٹ بھی نہیں چکھے گا۔ اس نے دونوں گلاس بیکی کو پلا دیئے۔ پھر اس کے لیے مزید شراب کا آرڈر دیا۔ بیکی اس کے منصوبے سے بے خبر غٹا غٹ شراب پیتا رہا۔ چوتھے گلاس کے بعد یہ سوچ کر کہ بیکی کا ذہن اب سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہا، میلکن بڑے رسیلے لہجے میں بولا۔

"بیکی! ذرا یہ پستول دینا، دیکھوں تو ہے کیا؟"

بیکی نے انگاروں کی طرح دہکتی ہوئی سرخ آنکھوں سے میلکن کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے نشہ تو چھلک رہا تھا لیکن ابھی دماغ بے قابو نہیں ہوا تھا۔

"پپ... پستول؟" وہ کوٹ کی پستول والی جیب پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "نہیں... یہ بیکی کا پستول ہے... بیکی یہ پستول کسی کو نہیں دے گا بلکہ اس سے خود نیویارک کے تمام ٹیکسی ڈرائیوروں کو شوٹ کرے گا۔"

"لاؤ پستول مجھے دو۔ میں تمہیں بتاؤں کہ اسے لوڈ کیسے کیا جاتا ہے۔" میلکن امید کا دامن تھامتے ہوئے بولا۔

"تم... بیکی کو بتانا چاہتے ہو کہ پستول کس طرح لوڈ کیا جاتا ہے لیکن بیکی جانتا ہے کہ یہ پستول اسے واپس نہیں ملے گا۔ کبھی نہیں ملے گا۔ پستول بھرا ہوا ہے۔ اس میں سینکڑوں گولیاں موجود ہیں۔ بیکی دن رات فائرنگ کرکے شہر کے ٹیکسی ڈرائیوروں کو شوٹ کرتا رہے گا۔" وہ جیب کو تھپتھپانے لگا۔ پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "بیکی کے پاس پستول ہے۔ وہ اس دنیا میں اکیلا ہے' اس کا کوئی نہیں۔ وہ ایسا دوست چاہتا ہے جو اس کے ساتھ مل کر ٹیکسی ڈرائیوروں کو شوٹ کر سکے۔ بیکی اکیلا ہے۔ اسے دوست کی ضرورت ہے۔"

میلکن عجیب سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ بیکی کی آنکھوں سے آنسو لڑھکتے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ جن اپنا اثر دکھا رہی تھی اور اب تب میں وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہونے ہی والا تھا۔ اچانک ہی اس کے ذہن میں خیال آیا کہ اگر بیکی مدہوش ہو بھی گیا تو کیا دوسروں کی نظروں میں آئے بغیر وہ یہاں اس کی جیب سے پستول نکال سکتا تھا؟ وہ اس معاملہ میں کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس نے دوسرا قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔

"بیکی!" وہ اسے ہمدردانہ لہجے میں مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "میری جیب خالی ہو چکی ہے۔ کیا تم اپنے پیسوں سے مزید ایک ڈرنک خرید سکتے ہو؟"

بیکی کا ذہن اب نشے کی زد میں آنے لگا تھا۔ اپنا مفہوم سمجھانے کے لیے میلکن کو کئی مرتبہ یہ بات دہرانی پڑی۔ بیکی جھومتے ہوئے اپنے لباس کی مختلف جیبیں ٹٹولنے لگا لیکن ہر مرتبہ اس کا ہاتھ خالی ہی باہر آیا۔ اس کی کسی جیب سے ایک سینٹ تک برآمد نہیں ہو سکا تھا۔

"جیب خالی ہے نا؟" میلکن دل ہی دل میں صورت حال سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔ "تم بھی خالی، میں بھی خالی۔ ہم دونوں کی جیبیں خالی ہیں جبکہ ہم دونوں ہی بڑی شدت سے ایک ایک ڈرنک کی طلب محسوس کر رہے ہیں۔" وہ خاموش ہو کر بیکی کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بیکی کو کم از کم اتنا وقت دینا چاہتا تھا کہ یہ نازک صورتِ حال اس کی سمجھ میں آ سکے۔

بیکی کا منہ لٹکا ہوا تھا۔ چند لمحوں بعد بات شاید اس کی سمجھ میں آ گئی۔ "ہم واقعی ایک ڈرنک کی طلب محسوس کر رہے ہیں لیکن ڈرنک کہاں سے آئے گا۔ جیب میں ایک سینٹ تک نہیں۔" وہ ایک لمحہ کو خاموش ہوا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھری اور وہ سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔ "وہ آدمی کہاں ہے جو مجھ سے یہ پستول پچاس ڈالر میں خریدنا چاہتا تھا؟"

"میرے ساتھ چلو۔" میلکن اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ "وہ پارک کے دوسری طرف رہتا ہے۔ میرا خیال ہے اس وقت مل جائے گا۔"

وہ دونوں اٹھ کر بار روم سے باہر آ گئے۔ ہلکی ہلکی پھوار اب بھی پڑ رہی تھی۔ میلکن اسے کولمبس سرکس کے چوراہے پر لے آیا۔ ٹریفک کا سیلاب تھا کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا میلکن شام کے دھندلکے میں جگمگاتی روشنیوں کے اس خوبصورت منظر کو دیکھ رہا تھا۔ کاروں کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں فضا میں قوسِ قزح کے رنگ سے بکھرے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ اس کے دل پر چوٹ سی لگی۔ بہت عرصہ بعد اسے کسی منظر کی خوبصورتی کا احساس ہوا تھا۔ مفلسی اور عسرت نے اس کی جمالیاتی حس کو بھی سلا دیا تھا۔ لیکن اب زندگی سے بھرپور جذبات ایک بار پھر اس کے سینے میں انگڑائی لے کر بیدار ہو رہے تھے۔ سامنے سے گزرتی ہوئی چمچماتی ہوئی کاروں اور ان میں بیٹھے ہوئے قیمتی ملبوسات والے لوگوں کو دیکھ کر وہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ زیادہ سے زیادہ ایک ماہ بعد وہ بھی قیمتی لباس میں ملبوس اپنی چمکتی ہوئی کار میں اسی طرح شہر کی سڑکوں پر گھوم رہا ہوگا۔ عین ممکن ہے اس وقت اس کے پہلو میں شہر کی کوئی حسین عورت بھی بیٹھی ہو۔

عورت کا خیال آتے ہی اس کے دل و دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ وہ عورتوں کا رسیا تھا۔ پہلی مرتبہ جب وہ جیل

گیا تھا تو اس نے جرائم سے توبہ کر لی تھی لیکن باہر آتے ہی وہ ایک عورت کی زلف کا اسیر ہو گیا تھا۔ اس عورت کی خاطر ہی میلکن نے توبہ کو بھلا کر نیک بننے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے دوبارہ چوریوں کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ وہ جو کچھ بھی کماتا عورتوں پر لٹا دیتا لیکن اب اسے بڑی شدت سے یہ احساس ہو رہا تھا کہ اس کی تباہی اور اسے اس حال تک پہنچانے کی ذمہ دار بھی ایک عورت ہی تھی۔

ٹریفک رکتے ہی میلکن، پیکی کا ہاتھ پکڑ کر سڑک عبور کر کے پارک کے گیٹ میں داخل ہو گیا۔ بجری والی روش پر قدم بڑھاتے ہوئے وہ ایک بار پھر عورتوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ اب دولت ملتے ہی وہ اپنے آپ کو سنبھال لے گا اور کسی عورت کو اس طرح اپنی زندگی میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دے گا کہ اسے ایک بار پھر تباہی کا سامنا کرنا پڑے۔ پارک کے ایک بنچ پر بیٹھتے ہوئے سرخ بالوں والی جینی کا تصور اس کے ذہن میں ابھر آیا۔ پیکی بھی منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر اس کی تقلید کرتا ہوا بنچ پر بیٹھ چکا تھا۔ میلکن نے آسمان کی طرف دیکھا۔ پھوار رک چکی تھی۔ بادل ہلکے ہو چکے تھے جس سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ مطلع جلد ہی صاف ہونے والا تھا۔

میلکن کے منصوبے کا اہم ترین مرحلہ ابھی باقی تھا۔ دفعتاً اسے یوں محسوس ہوا جیسے آسمان پر چھٹتے ہوئے بادلوں کے ساتھ اس کے ذہن پر چھائی ہوئی دھند بھی صاف ہو رہی ہو۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ رات گئے تک یا کم از کم اس وقت تک اس بنچ پر بیٹھا رہے گا جب تک کہ پیکی سو نہیں جاتا۔ پیکی کے دماغ پر جن کا نشہ طاری ہو رہا تھا اسے یقین تھا کہ وہ جلد ہی مدہوشی کی آغوش میں پہنچ جائے گا اور پھر اس کی جیب سے پستول نکالنا اس کے لیے دشوار نہیں ہو گا۔ وہ اپنی جگہ پر خاموش بیٹھا کن انکھیوں سے پیکی کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا ذہن ماضی اور مستقبل کا موازنہ بھی کرتا جا رہا تھا۔ ماضی میں جیل میں بیتے ہوئے ماہ و سال کے علاوہ جینی کی یاد بھی بڑی نمایاں تھی۔ جینی ہی وہ عورت تھی جس نے اسے سب سے زیادہ متاثر کیا تھا۔ سب سے پہلے اس نے ایک فلیٹ کرائے پر لیا تھا جسے آراستہ کرنے کے بعد وہ میلکن کو گھریلو زندگی کی ترغیب دلاتی رہی۔ وہ اسے راہ راست پر چلنے کی تلقین کرتی لیکن پیار و محبت کے جذبات کے اظہار کی آڑ میں ہمیشہ اس کی جیبیں خالی کر دیتی۔ اس نے چوری کی رقم کے بارے میں کبھی میلکن سے کچھ پوچھنے کی زحمت تک گوارا نہیں کی تھی۔

آخری مرتبہ جیل سے نکلنے کے بعد سے اسے اب تک جینی کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے۔ اسے اگرچہ جینی سے اب کوئی جذباتی لگاؤ باقی نہیں رہا تھا لیکن کبھی کبھی خیال آتا تو اس کے بارے میں سوچتا ضرور تھا۔ اسے ویسٹ چیسٹر کی وہ رات اچھی طرح یاد تھی جب آخری مرتبہ پولیس نے اسے گرفت میں لیا تھا۔ اس سے ایک رات پہلے اس نے کارٹر نامی ایک رئیس کی تجوری سے چند قیمتی ہیرے اڑائے تھے مگر جینی کو ان کی ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی۔ وہ ہیرے اس نے پگھلے ہوئے موم سے ملتے جلتے مادے کی مدد سے پستول کی نال میں اس طرح چھپائے تھے کہ ہیرے نال کے اندر اوپر کی طرف چپک گئے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ ایک دو ماہ بعد جب ہیروں کی چوری کا ہنگامہ سرد پڑ جائے گا تو وہ ان ہیروں کو فروخت کر دے گا۔

ان دنوں میلکن کا شمار ایسے تجربہ کار جرائم پیشہ افراد میں ہوتا تھا جو احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی بچ بچا کے کام کرنے کا عادی تھا لیکن اس نے اپنے آپ کو ہمیشہ قانون کا سامنا کرنے کے لیے تیار رکھا تھا۔ نجانے کس وقت اچانک پولیس چھاپہ مار کر اسے آہنی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دے۔ کسی ایسی ہی ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کے لیے وہ ہمیشہ چند ہزار ڈالر کی رقم الگ رکھا کرتا تھا جو یا تو فرار میں اس کے لیے مددگار ثابت ہو سکتی تھی یا گرفتاری کی صورت میں اپنے دفاع کے لیے کسی ماہر وکیل کی خدمات حاصل کی جا سکتی تھیں۔

کارٹر کے ہیرے چوری ہونے کے دوسرے دن پولیس نے اچانک ہی اسے دھر لیا تھا۔ اسے حیرت تھی کہ پولیس اتنی جلدی اس تک کیسے پہنچ گئی تھی حالانکہ ہیروں کی چوری کے سلسلے میں اس نے اپنا کوئی معمولی سا سراغ بھی نہیں چھوڑا تھا۔ پولیس تو کیا کسی کو بھی اس پر شبہ نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن گرفتاری کے بعد انکشاف ہوا کہ وہ ایک ایسے جرم میں پکڑا گیا تھا جو بہت پہلے اس سے سرزد ہوا تھا۔ جرم بہت معمولی سا تھا اور میلکن اسے بھول چکا تھا لیکن اسے شاید خیال نہیں رہا تھا کہ پولیس مدتوں بعد بھی کسی جرم کو نہیں بھولتی خواہ وہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ رہا ہو۔ جرم ثابت ہو گیا اور ایک مختصر سی مدت کی سزا سنا کر اسے جیل پہنچا دیا گیا۔

جیل میں رہتے ہوئے میلکن کسی نہ کسی طرح اپنے زیرزمین حلقے کے ایک آدمی سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے ذریعے دراصل وہ جینی سے رابطہ قائم کرنا چاہتا تھا تاکہ اسے پستول کی نال میں ہیروں کی موجودگی سے آگاہ کرتے ہوئے اسے ہدایت کرے کہ ہیرے فروخت کر کے اس کی رہائی کا بندوبست کیا جائے لیکن چند روز بعد اس کے دوست نے انکشاف کیا کہ جینی اس کے فلیٹ کی ہر چیز فروخت کر کے غائب ہو چکی ہے اس کے بعد میلکن نے جینی کے بارے میں کبھی کچھ نہیں سنا۔ ویسے اسے حیرت

ضرور تھی کہ اسے راہِ راست پر لانے کی کوشش کرنے والی جینی خود بے راہ کیسے ہوگئی تھی۔ بہرحال کئی مہینوں سے وہ خود بھی جینی سے پیچھا چھڑانے کی سوچ رہا تھا اور جینی نے اسے چھوڑ کر اس کا مسئلہ خود ہی حل کر دیا تھا۔

بیکی اونگھ رہا تھا۔ میلکن نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا اور بنچ پر سرکتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا اور بڑی احتیاط سے اس کے کوٹ کی طرف ہاتھ بڑھانے لگا لیکن اس کی انگلیوں نے ابھی جیب کو چھوا ہی تھا کہ بیکی یکدم سیدھا ہوگیا۔

"یہ پستول میرا ہے" وہ جیب پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "اسے میرے پیسوں سے خریدا گیا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے یہ تمہارے ہی پیسوں سے خریدا گیا تھا" میلکن منہ بگاڑ کر بولا۔ بہرحال غنیمت تھا کہ بیکی کو وہ شخص یاد نہیں آ گیا تھا جو بقول میلکن، پچاس ڈالر میں پستول خریدنا چاہتا تھا۔

"اگر تم جانتے ہو کہ پستول میرے پیسوں سے خریدا گیا تھا اور میری ملکیت ہے تو تم میری جیب کی طرف ہاتھ کیوں بڑھا رہے تھے؟" بیکی سر جھٹکتے ہوئے بولا۔

یوں محسوس ہوتا تھا جیسے پستول کی حفاظت کے معاملے میں اس کی تمام حسیں پوری طرح بیدار تھیں۔ میلکن کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اس وقت اگر بیکی کو جو عام حالات میں ایک دو گلاس پی کر ہی مدہوش ہو جایا کرتا تھا، اگر دس ہزار ڈالر کی شراب بھی وہ پلا دے تو وہ پستول کی حفاظت سے غافل نہ ہوگا۔

میلکن کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا کہ اس نے بیکی کی جیب کی طرف ہاتھ بڑھانے میں بڑی جلد بازی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اسے کم از کم اس وقت تک انتظار کرنا چاہیے تھا جب تک کہ وہ گہری نیند نہ سو جاتا۔ اس نے بیکی کی طرف دیکھا جو ایک بار پھر اونگھنے لگا تھا۔ اس مرتبہ اس نے بڑی عقلمندی کا ثبوت دیا تھا۔ اس کا سر سینے پر جھکا ہوا تھا اور ٹھوڑی کوٹ کی اس جیب کو چھو رہی تھی جس میں پستول تھا۔ ظاہر ہے اگر میلکن جیب کو ذرا سا بھی چھوتا تو وہ بیدار ہو جاتا۔ میلکن ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ بیکی گڑبڑا کر سیدھا ہو گیا۔ اور اچانک ہی میلکن کے گریبان پر ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا۔

"تت... تم نے مجھے مارا کیوں تھا؟"

"میں نے تمہیں نہیں مارا بیکی!" میلکن اپنا گریبان چھڑاتے ہوئے نرمی سے بولا۔

"تم نے نہیں مارا تھا؟" بیکی کے لہجے میں حیرت تھی۔ "تو پھر مجھے کس نے مارا تھا؟" وہ سر سہلانے لگا۔ چند لمحے خاموشی رہی پھر بیکی ہی بڑبڑانے والے انداز میں بولا "اوہ! یہ جن تھی... جن مجھ پر حملے کر رہی ہے" وہ ایک بار پھر خاموش ہو کر سوچنے لگا۔ چند منٹ بعد وہ دور کی کوڑی لاتے ہوئے بولا "جن بیچنے والے تمام لوگوں کو شوٹ کر دینا چاہیے۔ بیکی کے پستول سے۔ کسی کو بھی زندہ نہ چھوڑا جائے۔ وہ جن کیوں بیچتے ہیں؟"

"پستول مجھے دے دو پھر دیکھو اس شہر میں جن بیچنے والا ایک بھی شخص زندہ نہیں بچے گا۔ میں سب کو چن چن کر اس پستول سے شوٹ کر دوں گا۔" میلکن بولا۔

"تم جھوٹ بکتے ہو" بیکی مشتبہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا ہوا بنچ پر پیچھے ہٹنے لگا۔ "تم کسی کو شوٹ نہیں کر سکتے۔ میں جانتا ہوں تم کیا چاہتے ہو۔ اس طرح تم غریب بیکی کا پستول ہتھیانا چاہتے ہو۔"

میلکن اسے گھور کر رہ گیا۔ اس نے بات بڑھانے کی کوشش نہیں کی۔ خدشہ تھا کہ کہیں بحث میں الجھ کر بیکی کا نشہ ہرن ہی نہ ہو جائے۔ اسے خاموش پا کر بیکی ایک بار پھر اونگھنے لگا۔ اس مرتبہ میلکن نے جلد بازی سے کام لینے کی کوشش نہیں کی۔ دیر آید درست آید کے مصداق وہ کچھ دیر انتظار کر لینا چاہتا تھا۔ وہ کن انکھیوں سے بیکی کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے بارے میں سوچنے لگا۔ یہ اس کی زندگی کا بدترین دور تھا کہ وہ بیکی جیسے بھکاری کا محتاج ہو رہا تھا۔ اسے وہ وقت یاد آ گیا جب بیکی جیسے نہ جانے کتنے لوگ اس کے ٹکڑوں پر پلتے تھے۔ اس نے تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ خود بھی بھکاری بن کر رہ جائے گا۔ نان شبینہ کو محتاج، میلے کچیلے کپڑے، ٹوٹے ہوئے جوتے اور چار دن سے شیو بنانا بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس نے اس حالت کو پہنچنا کس طرح گوارا کر لیا تھا۔ اس کے خیال میں یہ اس کا ایک اخلاقی مسئلہ تھا۔ وہ اس مسئلے کے حل کی تلاش میں ہونٹوں کو حرکت دیئے بغیر اپنے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہہ رہا تھا "جب میں ایک مجرم تھا تو میرے پاس دولت کی ریل پیل تھی۔ کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ پلک جھپکتے ہی ہر خواہش پوری ہو جاتی۔ پھر جب میں نے اچانک نیک اور شریف بننے کا فیصلہ کر لیا تو قسمت نے ساتھ چھوڑ دیا۔ میں نہ تو کوئی جرم کر سکتا تھا اور نہ ہی مجھے کوئی باعزت کام مل سکا۔ میں گہرائیوں میں گرتا چلا گیا اور آج بھکاریوں سے بھی بدتر حالت میں ہوں۔ مجھ پر ظلم و ستم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے لیکن اب بھی شریفانہ زندگی بسر کرنے کے فیصلے پر قائم ہوں۔"

اس معاملے میں بھی میلکن دیانت کا ثبوت دینا چاہتا تھا اس نے اپنے ذہن کو دو حصوں میں تقسیم کر لیا تھا۔ ایک حصہ وہ تھا جو کبھی کبھار اسے شریفانہ زندگی اپنانے کی ترغیب دیتا، اور دوسرا وہ جو اسے کسی اور وجہ سے جرائم سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے شرافت کا درس دینے والے حصے کو یہ احساس تک نہیں

ہونے دیا کہ وہ اس کی ترغیب پر نہیں جیل اور پولیس کی سختیوں سے ڈر کر شریفانہ زندگی اپنانے کی کوشش کر رہا تھا۔

" بہر حال! " وہ ایک بار پھر اپنے آپ سے ہمکلام ہوا۔ " مجھے خوشی ہے کہ میں ابھی تک اپنے نیک اور شریف بننے کے فیصلے پر قائم ہوں۔ اور شاید اسی لیے مجھے اپنی اس دیانت کا انعام ملنے والا ہے۔"

ملنے والی متوقع دولت کا خیال آتے ہی اس کا ذہن ایکبار پھر کلبلانے لگا۔ وہ ان نیک کاموں کے بارے میں سوچنے لگا جو وہ دولت ملنے کے بعد کرنے والا تھا۔ سب سے پہلے تو وہ اپنے بوڑھے باپ کو تلاش کرے گا۔ اسے امید نہیں تھی کہ اس کا باپ اب تک زندہ بھی ہوگا۔ اگر زندہ ہوگا بھی تو اس کے اندازے کے مطابق کم از کم پینسٹھ سال کا ہو چکا ہوگا۔ اسے یاد تھا کہ جب وہ بچہ تھا تو اس کا باپ اس سے بڑی محبت اور شفقت سے پیش آیا کرتا تھا۔ اسے بچپن کا وہ واقعہ بھی یاد تھا جب اس نے گاؤں کے لڑکوں کو برف گاڑی چلاتے دیکھ کر باپ سے برف گاڑی کی فرمائش کی تھی۔ باپ کے مالی حالات کچھ بہتر نہیں تھے لیکن اس نے بیٹے کو احساس کمتری سے بچانے کے لیے اسی روز اسے برف گاڑی خرید دی تھی لیکن وہ کیسا بدبخت تھا کہ جوان ہونے کے بعد جب اس کے پاس دولت آئی تو اس نے باپ کی خبر تک نہ لی تھی لیکن اب جبکہ وہ نیک اور دیانت دار بننے کا فیصلہ کر چکا تھا تو اس نے سوچا کہ اپنی نیکی کے صلے میں ملنے والی دولت ہاتھ آتے ہی شہر کی گناہ آلود زندگی سے دور گاؤں چلا جائے گا اور زندگی کے آخری لمحوں تک باپ کی خدمت کرتا رہے گا۔ وہ کوئی منافع بخش تجارت شروع کر دے گا جس سے اس کی بستی کے لوگ بھی فائدہ اٹھائیں گے۔ کاروبار میں ہونے والے منافع کی رقم سے کارٹر کے چوری شدہ ہیروں کا نقصان بھی پورا کر دے گا۔

" میں چور نہیں تھا۔ دل سے کبھی چور نہیں بنا۔" اس نے ایک بار پھر اپنے آپ کو تسلی دی۔ یہ محض اتفاق تھا کہ ایک جعلی چیک اس کے ہاتھ میں آ گیا تھا جسے اس نے کیش کروالیا۔ اس کے بعد اس قسم کے اتفاقات رونما ہوتے رہے۔ یہ بھی محض اتفاق تھا کہ وہ ہیروں اور عورتوں کا رسیا تھا اور اپنے یہ شوق پورے کرنے کے لیے وہ ایک کے بعد دوسرے اتفاق کا شکار ہوتا رہا اور وہ گناہوں کی دلدل میں دھنستا رہا لیکن بقول اس کے اب وہ اپنے دامن سے یہ تمام گناہ جھٹک چکا تھا اور اب خلوص دل سے لوگوں کی خدمت کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اکیلے ہی دنیا کو سدھارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ پیکی جیسے گم کردہ راہ لوگوں کو سیدھے راستے پر لگا کر وہ دنیا کی بہت بڑی خدمت کر سکتا تھا۔

ان خیالات نے میکن کے ذہن کا بوجھ ہلکا کر دیا اور وہ اپنے آپ کو ایک شریف اور معزز آدمی تصور کرنے لگا۔

اس نے پیکی کی طرف دیکھا جو سینے پر سر جھکائے اونگھ رہا تھا۔ میکن کے خیال میں اب عمل کرنے کا وقت آ گیا تھا لیکن اس کا یہ خیال درست ثابت ہوا کہ اس وقت اگر وہ پیکی کو بیرل کے حساب سے بھی شراب پلا دیتا تو پستول کی حفاظت کے خیال سے اس کی تمام حسیں بیدار رہتیں۔ نیند میں ہونے کے باوجود اس کے قرب کا احساس ہوتے ہی پیکی ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔

" ہٹو۔" وہ دیوانوں کی طرح چیخا۔ " مجھ سے دور ہٹ کر رہو۔ میں جانتا ہوں تم پستول پر قبضہ کرنا چاہتے ہو۔"

" پستول مجھے دیدو۔" میکن کے حلق سے بھیڑیئے کی سی غراہٹ نکلی۔ اس کی قوت برداشت جواب دے چکی تھی چند لمحے پہلے اس کے ذہن میں نیکی اور شرافت کے جو جراثیم کلبلا رہے تھے ان کا وجود تک مٹ چکا تھا۔ " پستول مجھے دے دو ورنہ میں تمہیں قتل کر دوں گا۔" غصے اور جذبات کی شدت سے اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔

پیکی سہم کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ میکن نے جو دھمکی دی تھی وہ اس پر عمل کرنے کی جرأت بھی رکھتا تھا۔ وہ راہِ فرار اختیار کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ میکن نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ دونوں گتھم گتھا ہو کر نیچے گرے۔ میکن نے دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبوچ رکھا تھا۔ پیکی ایک ہاتھ سے اپنا گلا چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا اور دوسرا ہاتھ جیب کی طرف بڑھا رہا تھا۔ پستول ان دونوں کے سینوں کے درمیان دبا ہوا تھا۔ دفعتاً ایک دھماکہ ہوا اور پستول کی نال میں چھپے ہوئے ساٹھ ہزار ڈالر مالیت کے ہیرے چھوٹی چھوٹی کرچیوں کی صورت میں گولی کے ساتھ اس کے دل میں پیوست ہو گئے۔ مرنے سے پہلے میکن کو یہ بھی سوچنے کا موقع نہ مل سکا کہ کیا یہ بھی محض اتفاق تھا کہ اس نے شریفانہ زندگی اپنانے کا جو خواب دیکھا تھا وہ اس طرح بکھر کر رہ جائیگا۔

ایک شرابی :۔ آج تاریخ کیا ہے بھی؟

دوسرا شرابی :۔ مجھے پتہ نہیں۔ تمہارے ہاتھ میں جو اخبار ہے اس میں تاریخ کیوں نہیں دیکھ لیتے؟

پہلا شرابی :۔ یہ اخبار تو کل کا ہے۔ ہمارے کسی کام کا نہیں۔

دیوتا

Jasoosi Digest February 1983

اقلیم علیم

ایک کیمیاگر کی زندگی کے سنسنی خیز واقعات۔
حصولِ مقصد کے لیے ایک شخص کی جدوجہد
کی عبرتناک داستان۔ جاسوسی ڈائجسٹ
کا مقبولِ عام سلسلہ

آج مجھے اپنا ماضی گناہوں اور لغزشوں کی دھند میں لپٹا ہوا ایک خواب محسوس ہوتا ہے اور یہ یقین کرنا دشوار نظر آتا ہے کہ میں نے اپنے عالمِ شباب میں ایسے ایسے کام کئے ہوں گے۔ اسمگلنگ، کیمیاگری، جوئے اور قتل و غارت سے کسی زمانے میں مجھے گہرا شغف رہا اور پھر ایسے لمحات بھی آئے جب میں نے ان ہنگاموں سے تائب ہو کر امن و سکون کی زندگی گزارنی چاہی مگر میں مقدر کے اس خوفناک گرداب سے نہ نکل سکا۔ ہاں مجھے اتنا ضرور یاد ہے کہ میرے ہاتھوں نہ کسی معصوم کا دامن داغدار ہوا نہ کوئی بے گناہ مارا گیا اور یہی طمانیت آج میرے زندہ رہنے کا سبب ہے ورنہ میں ضمیر کی خلش سے تنگ آ کر خود کو بحیرۂ عرب کی بے رحم موجوں کے حوالے کر چکا ہوتا مگر اس طمانیت کے باوجود میں اپنے لہو میں نہائے ہوئے ہولناک اور لرزہ خیز ماضی سے فرار چاہتا ہوں لیکن زندگی کے ہر موڑ پر ماضی کا کوئی نہ کوئی شناسا ماحول کی اندھیری رات میں آوارہ گردی کرنے والے کسی آسیب کی طرح میرے سامنے آ جاتا ہے اور مجھے یاد دلاتا ہے کہ میں وہی رسوائے زمانہ مسعود علی ہوں جس کی سوانح مسلمہ سماجی، معاشی اور اخلاقی اقدار سے کھلی بغاوت کی کہانی ہے۔

لاہور میری آبائی سرزمین ہے جہاں میرے بزرگ مدتوں سے تجارت کرتے آ رہے تھے۔ میں تین بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہونے کے باعث شروع ہی سے سرکش تھا۔ بے جا لاڈ پیار اور پیسے کے معاملے میں والدین کی فراخ دلی نے میری ذات پر ایسے ستم ڈھائے کہ میں نے لڑکپن میں ہی ایک فاحشہ کی چاہت میں اپنا گھر بار چھوڑ دیا اور آوارگی کے سرانداز کو اپنانا شروع کر دیا۔ معاشی تنگدستی سے گھبرا کر میں نے لاہور سے کراچی کا رخ کیا۔ مگر انسانوں کے اس خودرو جنگل میں جائز ذرائع سے مجھے دو وقت کی روٹی بھی میسر نہ آ سکی اور میں اسمگلنگ کے شرمناک پیشے سے منسلک ہو گیا اور کافی عرصہ تک عیش و عشرت کے بعد جب مجھ پر بدنصیبی کا سایہ پڑا تو میں تن کے کپڑوں کے ساتھ کوچے کوچے میں پولیس سے چھپتا پھرا۔ مفلسی اور درماندگی کے اسی دور میں لیاقت آباد کے ایک سینما سے ملحق تنگ و تاریک گلیوں میں ایک کیمیاگر سے میری دوستی ہوئی جسے اپنے بنائے ہوئے سونے میں نرمی لانے کے لئے بھاندرناس نامی ایک جوگی درکار تھا۔ اس کا تجربہ اور میرا حوصلہ یکجا ہوا تو ہم دونوں نیپال کے پہاڑوں کی طرف چل دیئے۔ وہ کیمیاگر پیشہ ورانہ رقابت کی بنا پر مارا گیا اور میں مشرقی پاکستان میں سندربن کے جنگل میں پھنس کر ہندوستانی قید خانوں کا اسیر ہو گیا۔

قید سے فرار ہو کر میں بمشکل کھٹمنڈو پہنچا اور وہاں ایک ہنگامہ خیز دور گزرنے کے بعد انندلم نامی ایک رشی کے تعاقب میں ہمالیہ کے پُرہول اور ویران پہاڑوں میں جا پہنچا۔ برف پوش وادیوں میں برفانی انسانوں اور آدم خور قبائل سے بھیانک معرکوں میں مجھے فتح نصیب ہوئی مگر میں ان پہاڑوں کی آغوش میں پروان چڑھنے والی الھڑ اور پُرکشش لڑکی سیتا سے دل ہار گیا۔ میں ہمالیہ کی اس خوابناک وادی سے روانہ ہوا تو سیتا میرے ہمراہ تھی۔ بھاندرناس کی ساری متاع مجھے مل چکی تھی مگر اس سے بھی بڑھ کر سیتا کی بن بیاہی ماں نے مجھے ایک انگوٹھی دی جس میں نگینے کی جگہ چھوٹا سا پارس پتھر جڑا ہوا تھا۔ پارس پتھر کے لمس سے لوہے کو حیرتناک طور پر سونے میں تبدیل کیا جا سکتا تھا۔ بھاندرناس کا ذخیرہ راستے میں تباہ ہو گیا۔ سیتا اور پارس میرے ہمراہ تھے۔ ویران پہاڑی راستوں پر سفر کرتے ہوئے میں نے سیتا کو اپنی بیوی بنا لیا۔ مگر جب ہم ہندوستان میں داخل ہوئے تو مجھ سے پارس پتھر حاصل کرنے کے لئے ہندوستان کے سرکاری محکمے حرکت میں آ گئے۔ قید، تشدد اور فرار کے لامتناہی سلسلوں سے گزرتے ہوئے ایک مرحلے پر کچھ دیسی ہرکارے بھی میری بو پر لگ گئے مگر میں نہایت ہوشیاری کے ساتھ آگے بڑھتا ہوا انبالہ تک جا پہنچا جہاں سے میرے وطن کی سرحد چند گھنٹوں کی مسافت پر تھی۔

اسرائیل میں اپنی تربیت کے دوران میں مجھے بن حیان کا علم ہوا جو یہودی سازشوں کا منصوبہ ساز تھا۔ پھر تل ابیب میں ہی میرا واسطہ افواجِ آزادیٔ فلسطین کے ایک رکن سے ہوا اور اس نے میری مخبری کے سہارے اسرائیل میں دہشت و بربادی کا بازار گرم کر دیا پھر جب میری ذات شبہات کی زد میں آ گئی تو میں جعلی کاغذات کے سہارے ریڈ آرمی کے اراکین کے ساتھ ال ال کے طیارے میں فرار ہوا۔ طیارہ اغوا کیا گیا اور شرائط منوانے کے بعد سوئٹزرلینڈ میں مجھے آزادی مل گئی۔ طویل بری سفر کے بعد میں فرانس کے شہر نیس پہنچا جہاں عبداللہ نامی فلسطینی میری رہنمائی کے لئے موجود تھا۔ مگر بدقسمتی سے وہاں مجھے پہچان لیا گیا۔ اسرائیلی سیکرٹ ایجنٹوں سے خون آشام مقابلوں کے دوران مجھے دو اطلاعات ملیں۔ اسرائیل کا بہت بڑا منصوبہ ساز بن حیان ہتھیاروں کی کھلی خریداری کے لئے پیرس میں موجود تھا اور میری سیتا ڈھونڈ کر لیبیا پہنچا دی گئی تھی۔ میں عبداللہ کے ہمراہ بن حیان کے خاتمے پر تل گیا۔ پیرس پہنچ کر میں نے بن حیان کی بھتیجی ایلیزا جوناس سے دوستی کی۔ اور جانگسل جدوجہد کے بعد ایک ہسپتال میں بن حیان کو جہنم واصل کر دیا۔ عبداللہ نے ایلیزا کے باپ کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

میں ایلیزا کو معصوم سمجھ رہا تھا لیکن اسرائیلی اہلکار اسے میری حقیقت سے آگاہ کر چکے تھے اس نے میری بے خبری سے فائدہ اٹھا کر مجھے قید کرنا چاہا مگر خود میرے جال میں آ گئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کی ماں نے اپنی بیوگی کا انتقام لینے کے لئے منشیات فروشوں کے مضبوط ترین گروہ کی سربراہی کرنے والی عورت کو میرے پیچھے لگایا ہے۔ میں نے ایلیزا کو دھمکی دے کر زندہ چھوڑ دیا۔ پھر مجھے اطلاع ملی کہ شاہدہ نامی دوغلی نسل کی ایک لڑکی کو لیبیا تک میری رہنمائی پر مامور کیا گیا ہے۔ اس لڑکی کا انتخاب سادک کے ایجنٹ علی نقی کے مشورے پر عمل میں آیا تھا۔ اس پر میرا ماتھا ٹھنکا اور میں عبداللہ کے معاون عبدالعزیز کو ساتھ لے کر علی نقی کی طرف روانہ ہو گیا۔

علی نقی کی رہائش گاہ کا جائزہ لے کر ہم لوٹ آئے۔ پھر میں فرانس سے باہر نکلنے کے سلسلے میں الفانسو میں شاہدہ سے جیمس بائرن کی حیثیت سے ملا۔ مگر نصف شب کو جب ہم ایک ہی کمرے میں سوئے ہوئے تھے۔ عبدالعزیز وہاں آ پہنچا اور مجھے ایک اور ٹھکانے پر چھوڑ آیا۔ یہاں سے میکفرسن نامی ایک شخص مجھے ایک پرانی عمارت میں لے آیا۔ اس نے جونی ہان کے روپ میں میرا میک اپ کیا اور پھر میں گونگے کی حیثیت سے اس کے ہمراہ بذریعہ ٹرین برسیلز پہنچ گیا۔ یہاں ایک سیاہ کار والے نے مجھے اغوا کرنے کی کوشش کی۔ میکفرسن بھی مادام لواری کا آدمی ثابت ہوا۔ میں نے انہیں ٹھکانے لگایا اور ایک ٹرک پر لفٹ لے کر آگے بڑھا مگر ٹرک والے مجھے مشکوک سمجھ کر پولیس اسٹیشن چھوڑ گئے جہاں مجھے حوالات میں بند کر دیا گیا۔

زینی نے عبدالباقر کے کان میں کوئی اعتراف کرنے کے بہانے اس کا کان دانتوں سے کاٹ پھینکا۔ ہم نے اسے مار مار کر ادھ موا کر دیا تھا لیکن اسرائیلی ایجنٹ ہونے کے ناتے وہ ہمیں کچھ بھی بتانے پر آمادہ نہ ہو سکی۔ اگلی صبح فائرنگ کی آواز سے آنکھ کھل گئی۔ اسرائیلی ایجنٹوں نے عبدالباقر کے گھر میں بارود کی سرنگیں بچھانے کی کوشش کی تھی جس پر محافظوں نے فائر کھول دیا تھا۔ اس تمام ہنگامے میں عبدالباقر کے کچھ ملازم مارے گئے اور کچھ زخمی ہوئے۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ لوگ میری اور سیتا کی جان کے درپے ہیں۔ ان سے کھلی فضا میں ٹکرانے کو ہم لوگ حویلی سے باہر نکلنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ اسی دوران میں فوج کے ایک دستے نے کسی کی اطلاع پر عبدالباقر کے گھر چھاپہ مارا۔ ہم پچھلے دروازے سے نکل کر عبدالباقر کی بیوک میں دشمنوں کی بھار کی طرف چل پڑے۔ ایک جگہ بالآخر ہماری مڈبھیڑ اسرائیلی ایجنٹوں سے ہو گئی۔ ہم نے ان میں سے ایک کو زخمی حالت میں پکڑ لیا اور ایک ویران جگہ پہنچ کر اس سے ضروری معلومات حاصل کرنے کے بعد ٹھکانے لگا دیا۔ پھر یوسف مجھے اور سیتا کو چھپانے کے لیے ایک ترکی پاکستانی کے گھر کی طرف چل دیا۔

اس پاکستانی کا نام عبداللطیف تھا۔ وہ معقول معاوضے کے عوض ہمیں گھر پہ ٹھہرانے پر آمادہ ہو گیا۔ رات کو وہ میرے کمرے میں آ گیا جب اس نے اپنی داستان سنائی تو میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ میرے ایک کلاس فیلو کا بھائی تھا جو اپنے بھائی کے قاتلوں کو قتل کرنے کے بعد فرضی نام سے ملک سے فرار ہو گیا تھا اور اب رحیم الدین بن کر زندگی گزار رہا تھا۔ اگلے روز کچھ لوگوں نے وہاں پٹرول ڈال کر آگ لگا دی اور ہم جیسوں کو جو سب دالان میں پھنس کر ان کے ہتھے چڑھ گئے۔ وہ لوگ ہمیں ایک وین میں بند کر کے وہاں سے نکل پڑے۔ راستے میں زہریلی سوئیوں کا ہتھیار میرے کام آیا اور ہم نے انھیں ٹھکانے لگا دیا۔ ڈرائیور کو یرغمال بنا کر ہم نے وین ویرانے میں کھڑی کر دی اور خود راستے سے گزرنے والی ایک کار پر قبضہ کر کے صنعا واپس آ گئے۔ حسین المرتضیٰ نامی یرغمالی اپنی جان کے عوض ہمیں درمنہ میں اپنے بھتیجے کے پاس پناہ دینے پر آمادہ ہو گیا۔ صنعا پہنچ کر میں اور حسین اور یوسف اور سیتا دو مختلف ٹولیوں میں بٹ گئے۔ ہم درمنہ جانے والی بس میں سوار ہو گئے تو آخر وقت تک یوسف اور سیتا وہاں نہ پہنچ سکے۔ بس روانہ ہونے کے بعد ایک جگہ رک گئی اور ایک فوجی اندر گھس آیا۔ میری چھٹی حس بیدار ہو گئی تھی۔

لیکن وہ فوجی ہماری طرف توجہ دیے بغیر ایک نشست پر بیٹھ گیا۔ بس چل پڑی اور راستے میں سیتا اور یوسف بھی اس میں سوار ہو گئے۔ ہم رات کو درمنہ پہنچے اور حسین المرتضیٰ کے ہمراہ اس کے بھتیجے کے گھر پہنچے جو ایک فارم ہاؤس میں واقع تھا۔ رات وہیں قیام کیا۔ اگلے دن صباح المرتضیٰ نے سیتا کے ساتھ بدتمیزی کی کوشش کی تو اپنا بازو تڑوا بیٹھا۔ تب صباح سے خطرہ محسوس ہوا تو اسے باندھ کر غسل خانے میں ڈال دیا۔ اگلے روز وہاں عبداللطیف آ گیا۔ وہ میرے اور سیتا کے سفر کے انتظامات کی تکمیل کے سلسلے میں آیا تھا۔ وہ لوٹ گیا تو رات کو ایک اور شخص آ گیا۔ اس نے بتایا کہ اسے عبداللطیف نے بھیجا ہے کہ وہ ہمیں صنعا لے جا کر ایک خفیہ مقام پر پہنچا دے۔ میں اور سیتا اس کے ہمراہ چل پڑے اور احتیاط کے طور پر یوسف اور حسین المرتضیٰ ہمارے پیچھے پیچھے آنے لگے۔ صنعا واپس پہنچ کر ہم اس اجنبی کے ساتھ ایک عمارت کے احاطے میں پہنچے لیکن فوراً ہی کچھ لوگوں نے ہمیں ہتھیاروں کی زد میں لے لیا جو ہمیں عمارت کی طرف دھکیلنے لگے۔

یہ لوگ مائیکل ٹرمپ کے آدمی تھے۔ انھوں نے اندر لے جا کر ہمیں ایک بوڑھے اسرائیلی سائنس دان ڈاکٹر آسٹن کے حوالے کر دیا جس نے مجھے اور سیتا کو مشروب میں کوئی دوا ملا کر بے بس کر دیا۔ ہم صرف سن سکتے تھے ورنہ جانے پہچانے جسم بے کار ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر آسٹن نے ہمیں بتایا کہ وہ دواؤں کے ذریعے ہماری برین واشنگ کر کے ہمیں اسرائیل پہنچائے گا۔ یہاں اس کی بہت بڑی لیبارٹری تھی جس میں خطرناک گیس [illegible] کا اسٹاک تھا۔ پھر عبداللطیف کو شدید زخمی حالت میں وہاں لایا گیا۔

وہ کچھ دیر بعد انتقال کر گیا۔ اگلے روز وہاں خطرے کے الارم بج اٹھے۔ فوجی ٹرک عمارت میں داخل ہو گئے تھے اور ان لوگوں میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ ڈاکٹر آسٹن مجھے اور سیتا کو لے کر تہ خانے میں واقع لیبارٹری کے ایک کمرے میں گھس گیا۔ اس نے [illegible] سب کچھ تباہ کرنے کے انتظامات بھی کر رکھے تھے۔ یہ سب کچھ ایک تجوری میں بند تھا۔ ڈاکٹر آسٹن جیسے ہی وہ خوفناک ہتھیار اٹھانے تجوری کی طرف بڑھا میرے زہریلے تیر نے اسے ٹھکانے لگا دیا۔ پھر مائیکل ٹرمپ کا ایک آدمی اندر داخل ہوا تو اس کا بھی یہی حشر ہوا۔ پھر میں اور سیتا اس تجوری کی طرف بڑھے جس میں وہ خوفناک زہریلی گیس والا ہتھیار موجود تھا۔

ہوش میں آنے کے بعد مجھے بریگیڈیئر محسن الخاتم کے سامنے پیش کیا گیا۔ زیر زمین تجربہ گاہ کے اسرار سن کر وہ سناٹے میں رہ گیا۔ تہ خانے کا معائنہ کرنے کے بعد مجھے انٹیروگیشن سیل میں ڈال دیا گیا جہاں جنرل حسین العمادی نے مجھ سے ملاقات کی اور طے ہوا کہ میں اسرائیلیوں کو مجبور کر دوں کہ وہ اپنی تجربہ گاہ کا سامان خفیہ طور پر یہاں سے اسرائیل منتقل کر لیں۔ جنرل نے سیتا کو اپنے پاس یرغمال رکھنے کے علاوہ مجھے بھی مکمل تحفظ فراہم کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ پروگرام تھا کہ اسرائیلی جیسے ہی یہ خوفناک سائنسی سامان لے کر جائیں گے انھیں راستے ہی میں تباہ کر دیا جائے گا۔ سیتا کو جنرل حسین العمادی کی تحویل میں چھوڑ کر میں اپنے محافظوں کے ساتھ تجربہ گاہ کے تفصیلی معائنے کے لیے روانہ ہو گیا لیکن راستے ہی میں اسٹیشن ویگن پر حملہ ہو گیا اور ہمارے چاروں طرف گولیاں برسنے لگیں۔ لیکن میں اس وقت بھی کچھ اور سوچ رہا تھا۔

ہم اس عمارت میں گھر گئے۔ چاروں طرف سے مشین گنوں سے فائرنگ ہونے لگی۔ میرے تمام ساتھی مارے گئے۔ اس حملہ آور گروہ کا سربراہ یوسف تھا۔ اس نے تجویز پیش کی کہ لیبارٹری کا سامان اسرائیلیوں کے بجائے خفیہ طور پر روسیوں کے حوالے کر دیا جائے۔ پروگرام کے تانے بانے بننے کے بعد میں اپنے محافظوں کے ساتھ فندق الذہبی میں آ گیا۔ اسی رات جنرل حسین العمادی نے مجھے اپنے مکان پر طلب کیا۔ وہ جلد از جلد اس لیبارٹری سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ رات گئے جب میں ہوٹل واپس پہنچا تو احاطے میں پولیس والوں کی ایک بھاری تعداد دیکھ کر دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

پولیس نے ہوٹل پر چھاپہ دراصل کسی اور مقصد سے مارا تھا۔ میرے لیے پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ یوسف کمرے میں میرا منتظر تھا۔ دوسرے روز میں اور یوسف لیبارٹری کا قضیہ نمٹانے کے لیے آندرے سسلوف سے خفیہ ملاقات کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہ بھی دھوکہ دینا چاہتا تھا جس کی اسے بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ لیبارٹری والے معاملے سے نمٹنے کے بعد میں اور سیتا جنرل حسین العمادی کے گھر والوں سے رخصت ہو کر جدہ کے لیے روانہ ہو گئے لیکن دوران پرواز طیارے میں آندرے سسلوف کو دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے وجود میں یک بیک خلا پیدا ہو گیا ہو۔

دوران پرواز آندرے سسلوف کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ طائف میں مختصر سے قیام کے بعد ہم قاہرہ اور فرینکفرٹ میں رکتے ہوئے کراچی کے لیے روانہ ہو گئے۔ دوران پرواز پرانی یادوں نے میرے ذہن پر یلغار کر دی۔ کراچی پہنچنے کے دو تین دن بعد ایک حادثے نے مجھے اسپتال پہنچا دیا۔ سیتا کو میری دیکھ بھال اور اسپتال کے اخراجات برداشت کرنے کے لیے جیب تراشی کا سہارا لینا پڑا۔ اسپتال سے چھٹی ملتے ہی ہم اس نرس کے فلیٹ میں منتقل ہو گئے جو سیتا کی دوست بن چکی تھی۔ شام کو باہر نکلے تو ایک اوباش گاڑی والے نے ہمیں لفٹ کی پیشکش کی۔ سیتا کے لیے اس کی نگاہوں میں ہوس دیکھ کر میں نے بلا تردد اس کی ناک پر زبردست گھونسہ رسید کر دیا۔ بوکھلاہٹ میں اس کے حلق سے عجیب سی آوازیں نکل کر رہ گئیں۔

فورڈ مستانگ میں سوار اوباش صفت نوجوان کی ناک سے خون کی دھار بہہ نکلی مگر میرے لیے اپنی وہ غیرارادی حرکت خاصی مہنگی پڑی۔

دونوں ٹانگوں پر توازن یکبارگی تبدیل ہوا تھا جس کے باعث میری داہنی پنڈلی میں درد کی شدید ٹیس اٹھی اور میں بے اختیار زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔

درد کی وہ لہر جتنی شدید تھی اسی قدر مختصر بھی ثابت ہوئی مگر اس دوران میں سیتا اس شخص کا حلیہ بگاڑ چکی تھی۔

اس کا اوپری دھڑ کھڑکی کے اُترے ہوئے شیشے میں سے باہر لٹکا ہوا تھا مگر اس نے اپنے دونوں پنجے اسٹیرنگ وہیل میں پھنسا کر خود کو منہ کے بل باہر گرنے سے روکا ہوا تھا۔

ناک سے بہنے والے خون نے اس کا چہرہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ رہی سہی کسر سیتا کے زناٹے دار تھپڑ نے پوری کر دی تھی۔ اس نے بائیں ہاتھ سے اس کے بال جکڑے ہوئے تھے اور داہنے ہاتھ سے اس کے چہرے پر تھپیڑ برسا رہی تھی۔

وہ سکون اور قدرے سناٹے کا وقت تھا مگر پھر بھی اسی اثنا میں نہ جانے کہاں سے کئی افراد وہاں آ گئے۔

سیتا کے حسین اور غصے سے تمتماتے ہوئے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی ان میں سے کسی نے صورتِ حال دریافت کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ دو افراد نے آگے بڑھ کر بے رحمی سے اسے کھڑکی سے باہر گھسیٹ لیا اور سیتا اسے چھوڑ کر میری طرف متوجہ ہو گئی۔

”پسلیاں توڑ دو سالے کی۔“ ایک تماشائی نے مٹی پر پڑے ہوئے لفنگے کی طرف دیکھ کر حقارت آمیز لہجے میں ہانک لگائی۔

مکوں، تھپڑوں اور لاتوں سے جس انداز میں اس کی تواضع ہو رہی تھی اور وہ جیسی دردناک آوازیں نکال رہا تھا اُن سے یہی تاثر ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ لوگ اسے سُرمہ بنائے بغیر ہاتھ نہیں روکیں گے۔

وہ لاکھ بدطینت اور اوباش صفت سہی مگر ایک انسان ہی تھا اور میری دانست میں اسے ایسا سبق مل چکا تھا کہ آئندہ وہ عمر بھر کسی عورت کے ساتھ گستاخی کا تصور نہیں کر سکتا تھا لہٰذا مجھے دخل انداز ہونا پڑا۔

لوگ ہاتھ جھاڑ کر ایک طرف ہو گئے اور وہ خاک و خون میں آلودہ نیچے پڑا کربناک انداز میں کراہتا رہا۔

”کیا ہوا تھا بہن جی!“ اس کی ٹھکائی کرنے والوں میں سے ایک نے قابلِ اعتراض حد تک سیتا کے قریب ہو کر مربیانہ لہجے میں دریافت کیا۔

”دُور رہ کر سوال کرو۔“ سیتا نے اسے کہنی سے پیچھے دھکیل کر تلخ لہجے میں کہا۔ ”جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اوسان بحال ہوں گے تو یہ خود ہی بتا دے گا۔“

جمع ہونے والوں میں سے ایک آدھ بلند آواز میں ہنسا اور سوال کرنے والا سر جھٹک کر بڑبڑاتا ہوا ان میں شامل ہو گیا۔

میں سیتا کے ساتھ ہولے ہولے سڑک کی طرف بڑھ گیا۔

”درندے ہیں۔“ سیتا سڑک کے کنارے پہنچ کر قہر آلود لہجے میں بولی۔ ”اکیلی عورت کو تو اپنی جاگیر سمجھتے ہیں۔“

”ہو سکتا ہے تمھارا خیال درست ہو۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔

”تو کیا اس میں غلطی کا امکان بھی ہے؟“ اس نے تیز نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”قصور معاشرے کا ہے۔ ہمارے یہاں ابھی تک اکیلی عورت کا تصور رواج نہیں پا سکا ہے۔“ میں نے اپنے لیے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

”اکیلی عورت؟“ اس نے تحیر آمیز انداز میں آنکھیں جھپکاتے ہوئے سوال کیا۔

”عورت اگر ثانوی درجہ رکھتی ہو، یعنی کسی مرد کے حوالے سے پہچانی جائے۔ خواہ وہ باپ ہو، بھائی یا شوہر۔ تو معزز قرار پاتی ہے مگر وہ خود اپنی شناخت منوانے سے قاصر ہے۔ اسے استہزا، اور تضحیک کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔“

”مگر کیوں؟“ اس کے لہجے میں احتجاج نمایاں تھا۔ ”دفتروں میں کام کرنے والی ہزاروں لڑکیاں بھی تو ہیں۔ بہت سی ایسی بھی ہیں جن کے گھرانے اُن ہی کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں۔“

”وہ غول کی صورت میں رہتی ہیں اور ایک دوسرے کے حوالے سے عافیت میں رہتی ہیں۔ میری بات کی صداقت آزمانی ہو تو مردوں کی بھیڑ میں گھری اکا دکا لڑکیوں کو دیکھو جو ہر لمحہ سہمی سہمی سی اپنی ذات کے حصار میں سمٹی رہتی ہیں۔“

”پتہ نہیں تم کیا کہہ رہے ہو؟“ اس نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”یہ اُلجھی ہوئی باتیں میرے لیے ناقابلِ فہم ہیں۔ میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ عورت کی طرف اٹھنے والا ہر ہاتھ بے رحمی سے توڑ دینا چاہیے۔ اور جب ایسی مثالیں عام ہوں گی تو لوگ اُن کے احترام پر مجبور ہو جائیں گے۔“

اسی وقت ایک خالی ٹیکسی رینگتی ہوئی ہماری طرف آئی۔ اور میں ڈرائیور کو کینٹ اسٹیشن چلنے کی ہدایت کر کے سیتا کے ساتھ عقبی نشست پر بیٹھ گیا۔

تین بجے میں کینٹ اسٹیشن کی پُرہجوم عمارت میں موجود تھا۔ دو کھڑکیوں کے بعد تیسری پر لاہور کے لیے بکنگ کے آثار نظر آتے جو تخمینے کی حد تک محدود تھے۔ اکا دکا افراد مسلسل اس کھڑکی پر آ رہے تھے۔ ہر شخص فریادی لہجے میں چند سوال کرتا اور مشینی جوابات سن کر

وہاں سے بے نیل و مرام لوٹ رہا تھا۔

میرے کھڑکی پر پہنچنے تک صرف ایک شخص ایسا آیا جس نے قدرے طویل گفتگو کے بعد چند نشستوں کی پیشگی بکنگ کرائی۔

میں نے جب کھڑکی کے عقب میں بیٹھے ہوئے شخص پر اپنا عندیہ ظاہر کیا تو اس نے بیزاری کے عالم میں اپنے داہنے کان میں انگلی گھمائی پھر جھک کر پنڈلی سہلاتے ہوئے مطلع کیا کہ تین دن بعد تو درکنار لاہور کے ٹکٹ بارہ دن تک میسر نہیں ہیں۔

اس کے لب و لہجے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ صبح سے شام تک اس کا بیشتر وقت اسی ایک مکالمے کی تکرار میں گزرتا تھا۔

وہاں خوشامد اور التجا کا جواب بھی ایک بیزاری تھی میرے لیے یہ معاملہ خاصی کوفت کا باعث بنا اور میں مایوسانہ انداز میں کھڑکی سے ہٹ گیا۔

کھڑکی سے ہٹتے ہوئے داہنی طرف ایک ہجوم سا دکھائی دیا۔ جو کچھ پرجوش معلوم ہوتا تھا۔ ان میں کچھ چہرے وہی تھے جنھیں میں بکنگ کی کھڑکی سے مایوس و نامراد لوٹتے دیکھ چکا تھا۔

غیر ارادی طور پر میں بھی اس بھیڑ میں شامل ہو گیا اور چند ہی لمحوں میں یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ چند بے نیاز قسم کے رضاکار اس ہجوم میں خدمتِ خلق پر مامور تھے، اور محض چند روپیوں کے بدلے کراچی سے ہر شہر تک ہر دن کے ٹکٹ فراہم کرنے کے دعویدار تھے اور جس ضرورت مند سے اضافی رقم کی مالیت کا تعین ہو جاتا تھا' اسے چند ہی منٹوں میں نہ جانے کہاں سے ٹکٹ لا دیتے تھے۔

میری زبان سے منزل اور دن کے بارے میں سن کر اس قماش کے ایک موصوف نے ساڑھے تیرہ روپے فی ٹکٹ حق الخدمت طلب کیا، جسے ادا کرنا میرے لیے دشوار نہیں تھا لیکن ایک سہولت میسر آ جانے کے بعد مزید کا مطالبہ کرنا انسانی فطرت کی بدترین کمزوری ہے لہٰذا میں نے قدرے تردد کا اظہار کیا۔

اُس نے چند لمحوں تک میرے سراپا کا جائزہ لیا پھر میری گردن تھام کر اپنا دہانہ میرے ایک کان سے لگا دیا۔

میرے لیے خوفزدہ ہونے کا کوئی مقام نہیں تھا کہ اس چھت کے سائے میں ایسی رازدارانہ سرگوشیوں کے مناظر عام تھے۔

"دس سے کم نہیں ہوں گے' لینا ہے لو، ورنہ جاؤ۔" سرگوشیانہ آواز میں تحکم تھا۔

میں نے رقم گن کر اس کے حوالے کی اور چند منٹ بعد ہی ٹکٹ میرے ہاتھ میں تھے۔

اس صورتحال سے گزر جانے کے بعد میرے خون میں دھیرے دھیرے ابال پیدا ہوا کہ ٹکٹ حاصل کرنے کے جائز ذرائع پر اژدہام کے آثار تھے جب کہ کھلے بازار میں آزاد داموں پر ہر شہر، ہر درجے اور ہر ٹرین کے ٹکٹ دستیاب تھے۔

میں ایک اضطراری لہر کے تحت دوبارہ بکنگ کی کھڑکی پر جا پہنچا۔

وہ شخص میری طرف متوجہ ہوئے بغیر میرے بولنے کا منتظر رہا۔

"تم نے تین دن بعد لاہور کے ٹکٹ۔۔۔" میں نے طنزیہ لہجے میں اپنی حکایت کی ابتدا کی ہی تھی کہ اس نے درمیان میں میری بات کاٹ دی۔

"تین دن بعد نہیں مل سکتا۔ تیرہ دن بعد بک کرا لو۔" مشینی جواب برآمد ہوا۔

"میں یہی بتانے آیا ہوں۔" میں نے قدرے غصیلے لہجے میں کہا۔ "تم نہ کر رہے ہو مگر مجھے باہر سے ہی ٹکٹ مل گئے ہیں۔ تین دن بعد کے۔"

"بڑی خوشی کی بات ہے۔" اس نے خشک لہجے میں کہا۔ "پھر میرے پاس کیوں آتے ہو؟" اس کی اکتاہٹ زدہ بیزار نگاہیں میرے چہرے پر جم گئیں۔

"تمہارے پاس نہیں ہیں تو باہر کیسے مل رہے ہیں؟"

"بہت سے مسافر جانے کا ارادہ منسوخ یا ملتوی کر کے اپنے ٹکٹ بیچ دیتے ہیں۔" اس کا لہجہ مشینی ہی تھا مگر تیور بگڑ کر غیر مشینی ہو گئے تھے۔

"باہر ٹکٹ زیادہ داموں پر بک رہے ہیں۔" میں نے غصے اور جھلاہٹ کے عالم میں کہا۔

"اچھا!" یہ انکشاف اس کے لیے تحیر آمیز ثابت ہوا۔ "بلیک ہو رہی ہے باہر؟" پھر اس کے لب و لہجے میں نرمی آمد آئی۔ "معاف کیجیے، میں تو محض بکنگ کلرک ہوں' میری تنخواہ اور ذمہ داریاں بہت محدود سی ہیں جن سے تجاوز کرنا میرے لیے ناممکن ہے آپ اسپیشل یا ریلوے پولیس کے کسی آدمی کو فوراً اس کی اطلاع دیں۔"

اُس کے اخلاق نے مجھ پر فوری اثر کیا۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، درست ہی تھا۔ ساری بدمعاشی ان مسافروں کی تھی جو دس بیس روپے کے لالچ میں سفر ملتوی کر کے اپنے ٹکٹ بلیک کر رہے تھے۔

سیتا نے مجھے روکنا چاہا لیکن میں جذباتی طور پر اس معاملے میں اس قدر ملوث ہو گیا تھا کہ فوراً کسی سپاہی کی تلاش پر تل گیا۔

اس شیڈ میں ریلوے پولیس کی موجودگی کے آثار مفقود تھے۔ البتہ ایک ستون کے ساتھ ایک لحیم شحیم سادہ پوش شخص موٹی سی بید سنبھالے کھڑا تھا۔

مجھے شبہ ہوا کہ وہ خصوصی پولیس کا کوئی کارندہ تھا۔ لہٰذا میں اسی سے جا بھڑا۔

"یہاں ٹکٹوں کی بلیک ہو رہی ہے۔" میں نے جاتے ہی اُس پر اپنا مدعا ظاہر کر دیا۔

"ثبوت؟" اس نے بید کو ہولے ہولے اپنی پنڈلی پر مارتے ہوئے کہا۔

"یہ رہے۔" میں نے اپنی مٹھی اس کے سامنے کھول دی۔ "یہ میں نے ابھی بلیک میں خریدے ہیں اسی جگہ سے۔"

"اوئے حمید!" اس شخص نے کسی کو پکارا۔ اُس کی آواز اس چھت کے نیچے گونجتی ہوئی ہر بھنبھناہٹ پر حاوی تھی۔

"جی صاحب!" کسی دور افتادہ گوشے سے گونجیلا جواب آیا۔

"کہاں مرا ہوا ہے؟... دیکھ ادھر بلیک ہو رہی ہے ٹکٹوں کی۔" اس نے اسی بلند آہنگ لہجے میں ہدایت جاری کی جس کے نتیجے میں بھیڑ بھاڑ میں افراتفری کا سا سماں پیدا ہو گیا۔ کھڑے ہوئے اور ٹہلتے ہوئے بہت سے لوگوں نے اچانک مختلف سمتوں میں تیزی سے چلنا شروع کر دیا تھا۔

حمید کو ہدایت دینے کے بعد اس نے میرے ہاتھ سے ٹکٹ لے لیے اور چند ثانیوں تک انہیں بغور دیکھنے کے بعد نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز کر دیں۔

"تو یہ تم نے بلیک میں خریدے ہیں؟"

"ہاں۔" میں نے اعتراف کیا۔ "دس روپے فی ٹکٹ زائد رقم ادا کی ہے۔"

"کس سے لیے ہیں؟" اس کا لہجہ سنگین ہو گیا۔

"ایک دبلا پتلا دراز قامت تھا، مونچھوں والا۔" میں نے اپنے لہجے میں پیدا ہونے والی لکنت پر غالب آتے ہوئے جلدی سے کہا۔

"بتاؤ کدھر ہے وہ؟"

میں اس کی طرف سر گھمایا جدھر وہ دھندا ہو رہا تھا تو میدان تقریباً صاف ہو چکا تھا۔ ٹکٹ بیچنے والوں کا دور تک پتہ نہیں تھا اور ضرورت مند مسافر حیران و پریشان ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔

پھر بھی میں نے اس کے ساتھ ایک چکر لگا ہی ڈالا مگر مجھے مطلوبہ شخص کا سایہ تک نظر نہ آسکا۔ اور میں نے اس سے اپنی ناکامی کا اعتراف کر لیا۔

"جائے گا کہاں؟ دو چار روز میں پکڑا ہی جائے گا۔" وہ گویا باآوازِ بلند بڑبڑایا، پھر مجھ سے مخاطب ہو گیا۔ "چلو میرے ساتھ۔"

"کہاں؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"رپورٹ درج کرانے۔" اس نے روا روی میں کہا۔ "ان بلیک کرنے والوں نے ہماری زندگی اجیرن کی ہوئی ہے۔ ویسے تو بلیک سے ٹکٹ خریدنا بھی جرم ہے لیکن میں تمہیں بند نہیں کروں گا۔

تم نے میرے پاس آکر اپنی فرض شناسی کا ثبوت دیا ہے۔ تین چار روز میں تمہاری مدد سے وہ پکڑا جائے گا، اور ایک ہاتھ آ جائے تو ہم اُن کے تمام ساتھیوں کو دھر لیں گے۔"

"میری مدد سے؟" میں نے حیرت اور بیچارگی سے سوال کیا۔ "وہ تو غائب ہو گیا، میں اس سلسلے میں کیا مدد کر سکوں گا؟"

حقیقت یہ ہے کہ جوش کے عالم میں فراموش کیے ہوئے نکتے کی یاد دہانی نے مجھے خائف کر دیا تھا۔ اگر وہ شریف النفس نہ ہوتا، تو مجھے بلیک سے ٹکٹ خریدنے کے اقبالی مجرم کے طور پر باآسانی سزایاب کرا سکتا تھا۔

"وہ کب تک ادھر نہیں آئے گا۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "اُسے تم ہی پہچان سکتے ہو۔ دو چار دن صبح سے شام تک میرے ساتھ یہاں رہو گے تو اندر قدم رکھتے ہی ہم اُسے دھر لیں گے۔"

اس کا مفہوم سمجھ کر میرا سر چکرا گیا اور میں نے فوراً دفاعی حکمت عملی اختیار کر لی۔ "ہو سکتا ہے کہ وہ ادھر کا رخ ہی نہ کرے۔ صورت سے بیچارہ ضرورت مند معلوم ہوتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ چار چھ ٹکٹ بلیک میں بیچنے کے بعد اپنا ٹکٹ مفت حاصل کرنے کے لیے اس نے یہ سب کیا ہو؟"

"مگر قانونی لحاظ سے اُس کی گرفتاری ضروری ہے۔" اس نے میرے دونوں ٹکٹ اپنی جیب میں ڈال لیے۔

"ہو سکتا ہے... مم... مگر ابھی تو میں نے باضابطہ رپورٹ بھی درج نہیں کرائی اس سارے واقعہ کی۔" میں بوکھلا گیا۔

"معزز شہریوں کی شکایت پر بھی ہم کارروائی کر لیتے ہیں۔ ضابطے کی خانہ پری بعد میں کر لی جاتی ہے۔" اس نے اپنی مستعدی سے آگاہ کیا۔

معاملہ اُلجھ گیا تھا۔ اس کا لہجہ لمحہ بہ لمحہ سنگین تر ہوتا جا رہا تھا۔ اصل مجرم کے فرار کے بعد ساری فردِ جرم مجھے اپنے سر آتی نظر آ رہی تھی۔ غنیمت یہ ہوا کہ میں نے پوری گفتگو کے دوران ان دونوں ٹکٹوں کی واپسی کا مطالبہ نہیں کیا تھا جو اس کی جیب میں منتقل ہو چکے تھے۔

آخر یہی طے پایا کہ میں جلد از جلد وہاں سے غائب ہو جاؤں اور وہ میرے چلے جانے کے بعد دونوں ٹکٹ "تلف" کر کے پورے واقعہ کو بھول جائے گا۔

میں سیتا کے ساتھ تیزی سے اس ہال سے باہر نکلا تو چند خشمگیں نگاہوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان میں سے ہر ایک نے مجھے شکایت کرنے پر ملامت کی۔ وہ ایسے پریشان حال مسافر تھے جو دس بیس روپے کی پروا کیے بغیر جلد از جلد اپنی منزل پر پہنچنا چاہتے تھے مگر میری شکایت کے بعد ٹکٹ فروشوں کا ٹولہ غائب ہو

چکا تھا اور ان بے چاروں کی روانگی معرضِ التوا میں پڑتی نظر آ رہی تھی۔

ناکردہ گناہ کی معذرت کرتے ہوئے میں اُن غصیلے مسافروں کے سامنے خود کو پرلے درجے کا احمق محسوس کر رہا تھا مگر دیگر لوگوں کی طرح وہ بھی فراخ دل ثابت ہوئے اور رسمی ملامت کے بعد ہمیں روانگی کی اجازت دے دی۔

اسٹیشن کی عمارت سے باہر سڑک پر آتے ہی سیتا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"کیا بیہودگی ہے یہ؟" میں نے چڑچڑے لہجے میں اُسے ڈانٹا۔

"سوچ رہی تھی کہ ہمارے معاشرے میں ابھی تک اکیلی عورت کے علاوہ معزز شہری کا تصور بھی رواج نہیں پا سکا ہے۔" وہ متوسط نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے بولی اور میں بے بسی کے ساتھ خاموش رہنے پر مجبور ہو گیا۔

اس کا تبصرہ طنز کے زہر میں ضرور ڈوبا ہوا تھا مگر حقیقت سے خاصا قریب تھا۔

بہادر آباد کے فلیٹ میں ہماری وہ رات سکون سے گزری۔ مجھے موہوم سا اندیشہ تھا کہ کہیں فورڈ مستانگ والا اپنی تذلیل کا بدلہ لینے کے لیے کوئی انتقامی کارروائی نہ کر گزرے مگر اس خدشے کی نفی نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ یا تو بزدل تھا یا اس حد تک شریف کہ بے رحمانہ پٹائی کو اس نے اپنی کمینگی کا ایک منطقی نتیجہ تسلیم کر لیا تھا۔

مقررہ دن پر ہم دونوں ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے ایک ساتھ فلیٹ سے نیچے آئے تو مجھے فورڈ مستانگ والا یاد آ گیا۔

"پھر تو نہیں بلاوہ؟" میں نے سیتا سے سوال کیا کیونکہ اس دوران میں روزمرہ ضروریات کی اشیا خریدنے کے لیے دن میں کم از کم دو بار باہر جاتی رہی تھی۔

"ابھی تک تو شاید زخموں کی سیوا ہی کر رہا ہو گا۔" اس نے لاپروائی سے جواب دیا۔

"اُسے ضرورت سے زیادہ سزا دی گئی۔" میں نے اُسے چھیڑنے کی نیت سے کہا۔ "ورنہ اُس نے تمھیں اتنا زیادہ تنگ تو نہیں کیا تھا۔"

"عملاً تو کوئی چھیڑ چھاڑ کر ہی نہیں سکا تھا مگر مجھے اس نے شدید ذہنی اذیت پہنچائی تھی۔ آخر اُسے کیا حق تھا کہ مجھے تیسرے درجے کی عورت سمجھ کر میرا پیچھا کرتا۔"

میں خاموش ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہم ہسپتال میں ڈاکٹر کے سامنے موجود تھے۔ اس نے پوری توجہ سے میری پنڈلی کا معائنہ کیا۔ ٹانگ کو مختلف زاویوں سے گھما کر اور مجھے چلوانے کے بعد وہ مطمئن ہو گیا۔

اس کے قیاس کے مطابق میری پنڈلی کی ہڈی کا جوڑ کامیابی کے ساتھ بحال ہو چکا تھا مگر احتیاط کا تقاضا تھا کہ فوری طور پر اس سے بھرپور کام لینے کی کوشش نہ کی جائے۔

اگلے چھ ماہ کے لیے تدریجی ورزشوں کا طریقہ کار سمجھا کر اس نے ہمیں رخصت کر دیا۔

"اب کدھر کا ارادہ ہے؟" ڈاکٹر کے کمرے سے باہر آ کر میں نے سیتا سے سوال کیا۔

"فلیٹ جانے سے پہلے کسی اچھے ہوٹل میں کھانا کھائیں گے۔ تمھاری صحت یابی کی خوشی میں۔" اس نے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"کھانا ضرور کھا لینا لیکن میرا خیال ہے کہ اب فلیٹ جانا بے سود ہو گا۔" میں نے کہا۔ "کیوں نہ چابی اسی وقت فلیٹ کی مالک کو دے دی جائے۔"

"سوٹ کیس اور کپڑوں کا کیا ہو گا؟" اس نے مجھے یاد دلایا۔

"اس وقت ہمیں کفایت سے کام لینا چاہیے بلکہ اچھے ہوٹل میں کھانا کھانے کا ارادہ بھی منسوخ سمجھو۔ بلاوجہ کافی پیسے خرچ ہو جائیں گے اور بعد میں تنگی محسوس ہو گی۔"

فلیٹ کے بارے میں اس کی تجویز معقول تھی لیکن پھر بھی اس نے صفیہ سے ملنا مناسب سمجھا جس کے بارے میں پتہ چلا کہ اس کی ڈیوٹی دوپہر سے شروع ہونے والی تھی۔

نرسنگ کوارٹرز اسی احاطے میں بنے ہوئے تھے۔ سیتا چند ہی منٹ میں میرے ہمراہ صفیہ کے مکان کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔

خلافِ توقع کئی دستکوں کے بعد تاخیر سے دروازہ کھلا اور صفیہ کھلے ہوئے دروازے کی اوٹ سے نمودار ہوئی۔

اس کا چہرہ قدرے تمتمایا ہوا تھا، بال بھی منتشر تھے۔ چہرے سے گھبراہٹ ہویدا تھی اور جب وہ مسکراتے ہوئے سیتا سے مخاطب ہوئی تو اس کے لہجے میں بوکھلاہٹ کا عنصر خاصی حد تک نمایاں تھا۔

"ارے تم! اس وقت یہاں؟" اس نے حیرت سے کہا۔

"ہاں۔ آج ڈاکٹر سے ملنے آئے تھے، سوچا تم سے بھی ملتے چلیں۔" یہ کہہ کر سیتا لحظہ بھر رُکی پھر بولی۔ "کیا اندر نہیں بلاؤ گی؟"

"ہاں ہاں ضرور۔" اس نے سٹپٹا کر کہا۔ غیر ارادی طور پر گردن پیچھے گھما کر کچھ دیکھا اور پھر ہمیں راستہ دے دیا۔

اُس کا مکان بہت مختصر مگر صاف ستھرا تھا۔ صحن اور برآمدے سے گزرنے کے بعد صرف ایک کمرہ تھا جس میں مسہری کے علاوہ چند کرسیاں بھی موجود تھیں۔

کمرے کی فضا دھوئیں کی بُو سے بوجھل ہو رہی تھی اور فرش پر جا بجا سگریٹ کے ادھ جلے مسلے ہوئے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔

"ہم آج تمھارا فلیٹ چھوڑ رہے ہیں۔" سیتا نے بیٹھنے کے

بعد کہا۔ کسی بھی وقت چابی لوٹانے دوبارہ آؤں گی۔"

"اتنی جلدی!" اس نے کہا مگر اس کی غلافی نگاہیں بار بار صحن کے ایک گوشے میں بنے ہوئے مختصر سے اسٹور روم کے بند دروازے کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔

سیتا اس سے باتیں کرتی رہی اور میں خاموش بیٹھا رہا۔ وہ نرس بظاہر تو سیتا سے باتیں کر رہی تھی مگر ہم دونوں کی موجودگی پر خاصی مضطرب نظر آ رہی تھی اور شاید سیتا نے بھی یہ بات نوٹ کر لی اور جلد ہی روانگی کے لیے اُٹھ گئی۔

صفیہ نے اُسے روکنے کی رسمی سی کوشش بھی نہیں کی اور ہم دونوں اس کے گھر سے واپس روانہ ہو گئے۔

"یہ سگریٹ بھی پیتی ہے؟" کچھ دُور نکل آنے کے بعد میں نے معنی خیز لہجے میں سیتا سے سوال کیا۔

"انجان نہ بنو۔" وہ پھیکی سی ہنسی کے ساتھ بولی۔ "اصل صورتحال کا اندازہ تم نے بھی بآسانی لگا لیا ہو گا۔"

"کیسی صورتِ حال؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"ہمارے پہنچنے سے پہلے اندر کوئی موجود تھا جسے اس نے چھپا دیا، اسی لیے دروازہ کھولنے میں اسے تاخیر ہوئی تھی۔"

"صورت سے تو شریف لگتی ہے؟"

"پتہ نہیں۔" اس نے بے دلی سے کہا۔ "طویل تنہائیوں سے اُکتا کر اس نے کسی لڑکے سے دوستی کی ہوئی ہے۔ میں نے ہسپتال میں پچھلے قیام کے دوران دوسری نرسوں سے یہ ذکر سُنا تھا مگر آج اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیا۔"

وہ موضوع بہت نازک تھا۔ میں کافی دیر تک سیتا سے تبادلۂ خیال کرتا رہا اور مجھے یہ اندازہ کر کے خوشی ہوئی کہ وہ صفیہ کی اس خیانت کو کوئی بھی رعایت دینے پر آمادہ نہیں تھی جو وہ اپنے شوہر کے ساتھ کر رہی تھی۔

دوپہر کا کھانا ایک ہوٹل میں کھانے کے بعد ہم بہادر آباد پہنچے اور فلیٹ سے اپنا سامان سمیٹ کر سوٹ کیس سمیت باہر آ گئے۔

ہسپتال کے دروازے پر میں ٹیکسی میں بیٹھا رہا اور سیتا فلیٹ کی چابی صفیہ کو لوٹا کر چند منٹ میں واپس آ گئی۔

اس بار ٹیکسی کا رُخ کینٹ اسٹیشن کی جانب تھا۔

مجھے اسٹیشن پر چند روز قبل پیش آنے والے واقعات اچھی طرح یاد تھے لہٰذا اس بار میں نے کسی اُلجھن میں پڑے بغیر ٹکٹ حاصل کر لیے اور یوں ہم شام کو لاہور کے لیے روانہ ہونے والی ٹرین میں آرام دہ جگہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

کراچی سے لاہور تک کا ٹرین کا سفر بہت طویل اور تھکا دینے والا تھا۔ اگر ہمارے پاس سونے کے لیے برتھ کے ٹکٹ نہ ہوتے تو کم از کم میرے لیے بیٹھ کر سفر کرنا ناممکن ہوتا کیونکہ زیادہ دیر تک ٹانگیں لٹکا کر بیٹھنے سے میری داہنی پنڈلی میں ورم کے ساتھ ہی درد شروع ہو جاتا تھا۔

ٹرین پاکستان کی سرزمین پر تیزی سے دوڑتی رہی۔ دیہی اسٹیشنوں سے ٹرین اس قدر تیز رفتاری سے گزر رہی تھی کہ پلیٹ فارم پر نصب تختیوں پر لکھے ہوئے نام تک پڑھنے ناممکن ہو رہے تھے۔ اور پھر کوٹری پر ٹرین جا رُکی۔

سندھ کے خشک اور ریتیلے علاقے کے بعد شاداب خطے بھی آئے مگر رات ڈھل جانے کے باعث باہر کے مناظر دیکھنا ممکن نہ رہا۔

اگلی دوپہر کو ٹرین لاہور اسٹیشن کی حدود میں رینگتی ہوئی داخل ہوئی تو میرا دل مسرت اور سنسنی کے ملے جُلے اثرات کے تحت کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔

"تو یہ ہے تمہارا شہر۔" سیتا نے مسافروں کی بھیڑ سے الگ ہوتے ہی مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں امرتسر سے لاہور بھی آئی تھی مگر اسٹیشن نہیں دیکھا تھا۔" یہ کہتے ہوئے وہ ہنسی۔ "اور اس وقت میں بالکل وحشی تھی، آدمیوں سے بھڑک کر دُور بھاگتی تھی۔"

"شہر پسند آیا تھا میرا؟" میں نے پُرشوق لہجے میں سوال کیا۔

"کہا ناکہ اس وقت تو میں خوفزدہ تھی، اپنے سائے تک سے بھڑکتی تھی۔ ہر شخص اپنی طرف لپکتا ہوا بھوکا درندہ محسوس ہوتا تھا۔ مگر اس وقت تمھارا ساتھ ہے اور میں دنیا دیکھ چکی ہوں لہٰذا میرا مشاہدہ ہی بدلا ہوا ہے۔"

"اب تو شاید درندے بھی انسان لگ رہے ہوں گے۔"

"لاابالی لوگوں کا شہر معلوم ہوتا ہے۔" وہ ہنس کر بولی "دھوتی اور شلوار سے انگریزی وضع کے سوٹ تک بھانت بھانت کے لباس نظر آ رہے ہیں مگر ہر ایک اپنے حال میں مست ہے۔ کسی کو دوسرے کی پرواہ نہیں ہے۔"

"جہاں ہر شخص اپنی پسند کے خول میں جیتا ہو اور دوسروں کی پسند کا احترام کرتا ہو وہاں خوش دلی اور بے فکری ہی نظر آتی ہے۔"

اسٹیشن سے باہر بھانت بھانت کی آوازوں اور سواریوں کا میلہ لگا ہوا تھا اور جوں ہی سیتا نے تانگوں کی طرف نگاہ اٹھائی کئی تانگے اپنی جگہ سے حرکت میں آئے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں ہمارے پاس آ رکے۔

میں نے سیتا کی نگاہیں پہچان لیں اور دمکتے ہوئے سفید پتروں سے آراستہ تانگے میں سوار ہو گیا جس میں سفید رنگ کا ایک توانا گھوڑا جتا ہوا تھا۔

میرے ذہن میں جس ہوٹل کا نام تھا وہ اسٹیشن سے زیادہ دور نہیں تھا اور فیملی والوں میں نیک شہرت کا حامل تھا۔

کراچی میں میرا خیال تھا کہ سیتا کے سرخی مائل بھورے بال اور نیلی آنکھیں زیادہ ممتاز نظر آ رہی تھیں لیکن لاہور میں شاید ایسا نہ ہو کیونکہ وہاں سرخ و سفید رنگت کے ساتھ حسین خدوخال بکثرت نظر آتے ہیں لیکن اسٹیشن سے ہوٹل میں داخل ہونے تک ہی میرا یہ قیاس غلط ثابت ہو گیا۔

لاہور پہنچنے کے بعد سیتا کی انفرادیت اور زیادہ ابھر آئی تھی۔

ہوٹل میں دوہرے بستر کا کمرہ حاصل کر کے ہم نے غسل کیا اور باہر نکل آئے۔

وقت کافی تھا لہٰذا میں نے رنگ محل کے علاقے کا رخ کیا۔ جہاں ایک مارکیٹ میں میرے والد مرحوم کی دکان ہوا کرتی تھی۔

پچھلے چند برسوں میں لاہور کی ہیئت ہی بدل کر رہ گئی تھی نت نئی تعمیرات اور پرانی عمارات میں ترمیم و اضافے نے پرانی شناختوں کو بدل ڈالا تھا لیکن میں مارکیٹ کے نام کے سہارے مطلوبہ دکان پر پہنچ ہی گیا جہاں ایک صاف ستھرا میڈیکل اسٹور قائم تھا۔

دکان میں داخل ہوتے ہی ایک معنک سیلزمین ہماری طرف متوجہ ہوا تھا۔

"فرمایئے، کیا چاہیے؟" اس کے خشک لہجے سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ مسکراہٹ کے استعمال میں کفایت شعار واقع ہوا تھا۔

"ہمیں دکان کے مالک سے ملنا ہے۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔

"وہ تو میں ہی ہوں۔" اس نے ایسے لہجے میں کہا جیسے اپنی ملکیت کے بارے میں وہ زیادہ پُریقین نہ ہو۔

"پہلے یہ دکان وجاہت علی مرحوم کی ہوا کرتی تھی۔۔۔" میں نے تمہید کا آغاز کیا اور اسی وقت غازہ و سرخی میں لتھڑی ہوئی ایک سن رسیدہ خاتون ہانپتی ہوئی دکان میں داخل ہوئیں اور وہ مجھے چھوڑ کر اس عورت کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"ذرا یہ نکال دو جلدی سے۔" خاتون نے اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک رقعہ اسے تھما دیا۔

میں نے اندازہ لگایا کہ اس نسخے میں کچھ اہم ادویات درج ہوں گی جو خاتون کے بدن سے فاضل وزن چھانٹنے میں مددگار ہوں گی مگر مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ سیلزمین ڈمامنز کے علاوہ خورد و نوش کی وزن افزا اشیا کاؤنٹر پر ڈھیر کرتا جا رہا تھا۔

خوردنی اشیاء کی فہرست سے فراغت کے بعد اس نے لپ اسٹک وغیرہ کی ابتدا کی مطلوبہ رنگوں کے نمبر فہرست میں شاید مندرج تھے۔

فرصت کے ان لمحات کو غنیمت جان کر وہ خاتون بیرونی کاؤنٹر سے آئسکریم خرید کر کھانے میں مصروف ہو چکی تھیں۔

آئسکریم خوری کی تکمیل سے قبل ان کا مطلوبہ سامان تھیلیوں میں ڈال دیا گیا۔ اور انھوں نے بلاتامل سات سو سے زائد کی رقم ادا کر دی۔

دکان میں ملازم خوش شکل مگر کمسن لڑکا سامان اٹھا کر خاتون کے پیچھے ہو لیا۔ جنھوں نے اپنا پرس بائیں بغل میں دبا لیا تھا، اور بائیں ہاتھ میں تھامے ہوئے آئسکریم کپ کے باقیات کو داہنے ہاتھ کی مدد سے اپنے خوف آور معدے میں منتقل کرنے میں مصروف تھیں۔

"کیا مانگ رہے تھے آپ؟" عورت سے نمٹنے کے بعد اس دکان کا سیلزمین نما مالک دوبارہ ہماری طرف متوجہ ہو گیا۔

یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ ہم کسی جنس کے خریدار نہیں تھے اس کے لہجے میں پائی جانے والی اخلاق کی موہوم سی رمق بھی مفقود ہو چکی تھی۔

"میں وجاہت علی مرحوم کا ایک قریبی عزیز ہوں۔" میں نے پہلا جملہ دہرائے بغیر بات آگے بڑھائی اور دانستہ یہ اظہار نہیں کیا کہ میں وجاہت علی مرحوم کا سب سے چھوٹا بیٹا ہوں۔

"یہ وجاہت صاحب کون تھے؟" اس نے بات آگے بڑھنے سے قبل اپنے تجسس کی تشفی ضروری سمجھی اور سوال داغ دیا۔

"کئی برس پہلے اس دکان کے مالک ہوا کرتے تھے۔" میں نے کہا۔

"مگر میں نے تو چوہدری بشیر سے خریدی تھی یہ دکان۔"

"شاید انھوں نے وجاہت صاحب کے لڑکوں سے لی ہو۔"

"مگر آپ یہ سب کیوں کرید رہے ہیں؟" وہ چڑ سا گیا۔

"میں برسوں بعد پاکستان آیا ہوں اور اُن کے گھر والوں سے ملنا چاہتا ہوں۔" میں نے اپنا لب و لہجہ نرم بلکہ خوشامدانہ رکھتے ہوئے اُس سے کہا۔

"یہ چوہدری بشیر سے آگے مجھے کچھ معلوم نہیں۔" اس نے دو ٹوک لہجے میں جواب دیا۔ "وہ یہاں موٹر گاڑیوں کے فاضل پرزوں کا کاروبار کرتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ میں کہیں سے اُن کا رہائشی پتہ تلاش کر سکوں۔"

"میں آپ کا احسان مند رہوں گا۔"

"فوراً کچھ نہیں ہو گا۔" اس نے مجھے انتظار پر آمادہ پا کر جلدی سے کہا۔ "گھر پر اس دکان کی خریداری کے کاغذات دیکھوں گا، پتہ وغیرہ اسی میں ہو گا۔"

"تو میں دوبارہ کب زحمت دوں آپ کو؟"

"کل اسی وقت ......" اس نے کہا اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر "خدا حافظ" کہہ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

اس دکان سے نکل کر ہم رنگ محل کے علاقے میں گھومتے رہے پھر شاہ عالمی سے تانگہ پکڑ کر انارکلی آ گئے۔

انارکلی بازار میں دکانوں کے ظاہری خدوخال اور آرائشی انداز میں نمایاں تبدیلیاں نظر آئیں لیکن وہاں کا اجتماعی جغرافیہ تبدیل نہیں ہوا تھا۔

شام ڈھلے ہم ہوٹل واپس لوٹے تو سیتا کے ذہن پر لاہور اور اس کے شہریوں کے بارے میں اچھا تاثر قائم ہو چکا تھا۔

اگلے روز صبح کا وقت ہمارے پاس فاضل تھا لہٰذا میں ایک بار پھر چو برجی کے رہائشی علاقے کی طرف چل دیا جہاں ابا جان کی زندگی میں ہمارا قیام تھا۔

پہلے بھی ایک بار میں نے اس علاقے میں کوچہ پیمائی کی تھی مگر قدیم پڑوسیوں سے بھی بس اسی قدر معلوم ہو سکا کہ ابا جان کی وفات کے بعد میرے بڑے بھائیوں نے پہلے دکان بیچی۔ اس کے بعد مکان کی نوبت آ گئی اور اس کا تیاپانچہ کر کے انھوں نے مزنگ کے علاقے نزولی بازار میں ایک مکان کرائے پر لے لیا۔ اس کے بعد وہ سب کدھر گئے۔ یہ مجھے کوئی بھی نہ بتا سکا تھا۔

پرانے محلے داروں میں بچے بڑے ہو چکے تھے، جوانوں کے بالوں میں چاندی کے تار جھلملانے لگے تھے مگر ان تمام فطری تبدیلیوں کے باوجود چند چہروں کو پہچاننا میرے لیے دشوار ثابت نہ ہوا۔

یہ اور بات تھی کہ نگر نگر کی ٹھوکروں نے میرا حلیہ اس حد تک بدل کر رکھ دیا تھا کہ اُن میں سے کوئی بھی مجھے نہ پہچان سکا اور میں نے بھی فرضی تعارف ہی میں بہتری سمجھی۔

اس مرتبہ بھی ان لوگوں سے کوئی نئی بات معلوم نہ ہو سکی۔ نزولی بازار کے بعد میرے گھر والے کہاں گئے تھے، یہ کوئی نہ بتا سکا۔

میں تشویش اور پریشانی کے عالم میں محلے کی ایک دکان پر کھڑا ہوا تھا۔ مجھے ان چار پانچ رشتہ دار گھرانوں کا خیال آ رہا تھا۔ جو لاہور ہی میں آباد تھے لیکن بدقسمتی یہ تھی کہ ابا جان کی زندگی ہی میں اُن سے ہمارے مراسم خوشگوار نہیں تھے اور مجھے مجبوری کے ان لمحات میں اُن کے دروازوں پر دستک دینے میں حجاب مانع تھا۔

"میرے ساتھ آؤ۔" ایک بھاری بزرگانہ آواز اور شانے پر ہاتھ کے نرم دباؤ نے مجھے چونکا دیا۔

میں پلٹا تو حاجی اللہ داد میرے سامنے موجود تھے جن سے چند منٹ پہلے میری بات ہو چکی تھی۔ شاید میری پریشانی بھانپ کر وہ مجھ سے تفصیلی گفتگو کرنی چاہتے تھے۔

وہ میرے والدِ مرحوم کے پڑوسی اور گہرے دوست تھے مگر میں نے ارادہ کیا ہوا تھا کہ اُن پر اپنی اصلیت ہرگز منکشف نہ کروں گا۔

وہ چند گلیوں سے گزر کر مجھے اپنے مکان کی بیٹھک میں لے گئے۔

میرے مقابل چارپائی پر بیٹھ کر چند ثانیوں تک حاجی صاحب بغور میرا جائزہ لیتے رہے پھر دھیمے ہمدردانہ لہجے میں بولے۔ "تم کون ہو اور ان لوگوں کے بارے میں کیوں پریشان ہو؟"

"وجاہت علی مرحوم میرے چچا تھے۔" میں نے غمناک لہجے میں کہا۔

"چچا؟" حاجی اللہ داد نے حیرت سے دہرایا۔ "مگر ان کا تو کوئی بڑا بھائی نہیں تھا۔ کم از کم مجھے تو یہی معلوم ہے کہ وہ اپنے باپ کی اکلوتی اولادِ نرینہ تھے۔"

"میرے ابا بچپن ہی میں کسی بات پر چھوٹے بھائی سے لڑ کر گھر سے نکل گئے تھے۔ پھر پلٹ کر ادھر کا رخ ہی نہیں کیا۔" میں نے ندامت آمیز لہجے میں مفروضہ قصہ سنایا۔

"کہاں رہ رہے تھے وہ؟" حاجی اللہ داد کی نگاہوں میں حیرت اور تجسس کا سمندر انگڑائیاں لینے لگا تھا۔

"زمانے بھر کے دکھ جھیلتے بغداد جا پہنچے۔ وہاں حالات سازگار ہو گئے اور آخری وقت تک وہیں مقیم رہے۔"

"ناقابلِ یقین..... ناقابلِ یقین۔" حاجی صاحب بڑبڑائے۔ پھر بلند آواز میں مجھ سے پوچھا۔ "تو تم بغداد سے آئے ہو؟"

"ہاں۔ والدِ مرحوم سے اکثر چچا کا ذکر سنتا تھا۔ انہیں کسی طرح علم ہو گیا تھا کہ شادی کے بعد وجاہت علی مرحوم نے اس طرف رہائش اختیار کر لی تھی۔ لہٰذا میں سیدھا یہیں آیا مگر افسوس کہ ان کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔"

حاجی صاحب نے ایک گہرا سانس لیا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ گھروں سے بھاگنا تمہارے خاندان کی پرانی روایت رہی ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔" میں نے ان کا مدعا پوری طرح سمجھتے ہوئے بھی حیرت کا مظاہرہ کرنا ضروری تصور کیا۔

"وجاہت علی مرحوم کا چھوٹا لڑکا بھی بہت ناہنجار تھا۔" حاجی صاحب نے دکھ بھرے لہجے میں بتانا شروع کیا۔ "آوارگی کے چکر میں گھر سے بھاگ گیا اور اسی صدمے نے ان کی جان لے لی۔ اس کا نام صفدر علی تھا اور وہ آج تک لاپتہ ہے۔"

"بہت بدنصیب لڑکا تھا۔" میں نے دل کی گہرائیوں سے کہا۔ "جسے بزرگوں کا سایہ نصیب ہو اور وہ اس کی قدر نہ کرے، اس سے بڑا سرکش اور رو سیاہ کون ہوگا۔"

"یہ سعادت مند بچوں کی سوچ ہے۔" حاجی اللہ داد میرے خیالات سے متاثر ہو کر مربیانہ لہجے میں بولے۔ "مگر صفدر علی گستاخ تھا..... باپ کے مرنے کے بعد صفدر علی کے دو بڑے بھائیوں سطوت علی اور مظہر علی نے کاروبار سنبھالا مگر آپس میں پھوٹ پڑ گئی۔ سطوت علی ریس اور جوئے میں رقمیں ہار کر دکان کو زیرِ بار کر رہا تھا لہٰذا دکان بک گئی۔ مظہر علی ملتان چلا گیا۔ ایک برس بعد ہی کمرے میں دھواں بھر جانے سے وہ بیوی اور بچوں سمیت دم گھٹ کر مر گیا۔ سطوت علی کی جوئے کی لت نے اسے اتنا مقروض کیا کہ اس نے اپنی ماں کی مرضی کے خلاف مکان بھی بیچ دیا۔ وہ غیر شادی شدہ تھا، بس ماں کو لے جا کر نزد ہی کے ایک غلیظ اور سستے کرائے کے مکان میں ڈال دیا جہاں وہ بے چاری سسک سسک کر مر گئی۔ اس کے بعد سطوت علی کا کچھ پتہ نہیں چلا۔"

اپنے بھرے گھر کی تباہی کی وہ لرزہ خیز کہانی سن کر میری آنکھیں نمناک ہو گئیں۔

"وجاہت علی میرا جگری دوست تھا۔" حاجی اللہ داد کا لہجہ رازدارانہ ہو گیا۔ "میں اس کا بہی خواہ ہوں۔ تم اس کے بھتیجے ہو، اس لیے تمہیں بتا رہا ہوں کہ کافی دن پہلے میں نے اخبار میں چھوٹی سی خبر پڑھی تھی کہ سطوت علی کراچی کے ایک بینک میں ڈاکا ڈالتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔ یہ خبر تمہیں کہیں سے نہیں مل سکے گی لیکن میرا اندازہ ہے کہ وہ تمہارے چچا کا بڑا لڑکا ہی تھا۔ ہو سکتا ہے کہ کراچی جیل میں سزا بھگت رہا ہو یا مقدمہ چلنے کا منتظر ہو۔"

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ایک باپ کے تین بیٹوں میں جو نیک نام تھا وہ بیوی بچوں سمیت دم گھٹ کر مر گیا اور دو بے ننگ و نام زندہ تھے۔

ایک خون اور بارود کی برسات میں سفاکیوں کے شاہکار بنا تا اپنے مرحوم باپ کی دہلیز پر آیا تھا اور دوسرا جیل میں سزا یافتہ ڈکیت کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔

"یہ خبر کب کی ہے؟" میں نے اپنے کرب کو چھپاتے ہوئے سوال کیا۔

"دو ڈھائی برس پہلے کی بات ہے۔" حاجی اللہ داد نے نرمی سے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ہو سکتا ہے کہ اب تک کی سزا نے اس کا دماغ ٹھکانے لگا دیا ہو۔ وہ چچازاد سہی مگر تمہارا بڑا بھائی ہے..... ہو سکتا ہے کہ اس پر جرمانہ بھی ہوا ہو جس کی عدم ادائیگی پر وہ مزید قید بھگت رہا ہو..... تم بغداد سے آئے ہو، آسودہ حال لگتے ہو، اگر اس بدنصیب کی مدد کر سکو تو شاید تمہارے چچا کی نسل بھی چلتی رہے۔ صفدر علی تو جانے کہاں کس کے ہاتھوں مارا گیا ہوگا۔"

"مارا گیا ہوگا؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔ "یہ آپ کس بنا پر کہہ رہے ہیں؟"

حاجی اللہ داد کے چہرے پر تحقیر آمیز لکیریں ابھر آئیں۔ "وہ بھی بڑا شوریدہ پشت نکلا۔ اس نے بھی اخباروں میں اپنے باپ دادا کا نام اچھالا تھا..... ایک زمانے میں پیرس بھر کے حوالے سے اس کی بڑی خبریں چھپی تھیں۔ اس پر کئی آدمیوں کے خون کا الزام تھا اور ہندوستان میں پولیس کے علاوہ پیرس کے متلاشی سیکڑوں خوفناک لوگ اس کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے پھر ایکا ایکی اس کے بارے میں خبریں آنا بند ہو گئیں۔"

"یہ کیسے کہہ سکتے ہیں آپ کہ وہ اسی محلے کا صفدر علی تھا؟"
میرا دل حلق میں دھڑکنے لگا تھا اور دورانِ خون کنپٹیاں پھاڑ کر باہر آنے کے لیے بے چین تھا۔

"اس کی تو تصویریں چھپی تھیں اخباروں میں۔" حاجی اللہ داد نے کہا۔ "ہندوستان سے نکل آتا تو یہاں کی پولیس اس کی منتظر تھی۔ پاکستان میں قانون کی نظروں میں وہ ایک رسوائے زمانہ مفرور اسمگلر تھا۔ تصویروں میں اس کا حلیہ ضرور بدلا ہوا تھا مگر نام اور خدوخال تو ہزاروں میں بھی پہچانے جا سکتے ہیں۔"

وہ درست کہہ رہے تھے مگر ان کی غلطی صرف اتنی تھی کہ سامنے بیٹھے ہوئے صفدر علی کو نہیں پہچان رہے تھے۔ بلکہ اس کے مفروضہ ارشاداتِ عالیہ پر اسے شرافت اور سعادت مندی کی سند بھی دیتے جا رہے تھے۔

گزرے ہوئے واقعات اور ماضی کی چھوٹی چھوٹی خبروں کے بارے میں حاجی اللہ داد کی یادداشت قابلِ رشک تھی مگر میں خطرہ محسوس کر رہا تھا کہ کہیں کسی بات سے وہ میری اصلیت کا سراغ نہ لگا لیں۔

برسوں کی روپوشی اور جدوجہد کے دوران میں نے جب بھی پاکستان کے بارے میں سوچا جہاں میری دانست میں میرے ماضی کا کوئی شناسا نہیں تھا۔ رہا نام تو ایک ملک میں ہزاروں ہم ناموں کا ہونا بھی بعید از امکان نہیں تھا، اسی وجہ سے میں نے پاکستان پہنچنے کے بعد ہر جگہ اپنا اصل نام درج کرایا تھا جب کہ سیتا کا نام لیلیٰ صفدر ظاہر کرتا رہا تھا۔ لیکن حاجی اللہ داد سے گفتگو کے بعد میں شدت سے اپنے نام کی تبدیلی کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔

یہ محض ایک اتفاق ہی تھا کہ جوبرجی آتے ہوئے میں نے سیتا کو ہوٹل میں چھوڑ دیا تھا کیونکہ ہندوستان میں قیام کے دوران میرے ساتھ سیتا کا نام بھی بہت اچھالا گیا تھا اور اگر پاکستانی اخبارات میں اس کی تصویریں نہیں تو تفصیلات ضرور میرے حوالے سے چھپی ہوں گی۔ جن کی بنا پر حاجی اللہ داد جیسے گھاگ شخص کے لیے معاملے کی تہہ تک پہنچنا دشوار ثابت نہ ہوتا۔

"جو کچھ مجھ سے بن پڑے گا، میں کروں گا۔" میں نے اٹھتے ہوئے حاجی صاحب سے کہا۔ "دعا کیجیے کہ میں سطوت علی کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو جاؤں۔"

"مجھے یقین ہے کہ وہ نابکار ابھی تک جیل ہی میں سڑ رہا ہوگا۔" حاجی اللہ داد کے لہجے میں حقارت اور تاسف کے ملے جلے اثرات نمایاں تھے۔

"میں اب کراچی ہی جاؤں گا۔ وہ وہاں ہو یا نہ ہو، مجھے اس کی تلاش کا آغاز تو وہیں سے کرنا ہوگا۔"

"نام نہیں بتایا تم نے اب تک اپنا۔" اچانک حاجی صاحب کو خیال آ گیا۔

"سلطان کہتے ہیں مجھے۔" میں نے فوری طور پر اپنے لیے ایک مستقل نیا نام سوچ لیا۔

"کہاں ٹھہرے ہوئے ہو؟"

"لاہور پہلی بار دیکھا ہے، علاقوں کے نام سے ناواقف ہوں۔ ایک دوست کے ساتھ بغداد سے آیا تھا، اسی کے گھر ٹھہرا ہوا ہوں۔"

"یہاں رہو یا دوبارہ لاہور آنا ہو تو مجھ سے ضرور ملنا۔" حاجی اللہ داد گھٹنوں پر زور دے کر ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اٹھ گئے۔

"انشاءاللہ ضرور حاضر ہوں گا۔" میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

میں حاجی اللہ داد کے گھر سے نکلا تو دل کی عجیب سی کیفیت تھی۔

میرے گھر والے زندہ تھے یا مردہ، خوشحال تھے یا تباہ کار — وہ جیسے بھی اور جہاں بھی تھے۔ کم از کم مجھے ان کے بارے میں پوری معلومات مل گئی تھیں مگر دکھ اس بات کا تھا کہ بھائی جان نے زندہ رہنے کے لیے مجھ سے بھی بدتر اور رسوا کن راہ اختیار کی تھی۔

میں ذہن میں قیاس اور امکانات کے گھوڑے دوڑاتا اس بستی سے باہر آ گیا۔

اگر صفدر علی کا نام اور اس پر عائد الزامات کی برسوں قدیم فہرست حاجی اللہ داد جیسے سیدھے اور امن پسند شہری کو یاد تھی تو یہ کیسے ممکن تھا کہ قانون کا نفاذ کرنے والے اداروں کے متعلقہ حکام اس نام کو بھول گئے ہوں۔

اس اعتبار سے حاجی اللہ داد کی ذات میرے لیے بہت بڑی رہنما ثابت ہوئی تھی کہ مجھے اپنے محفوظ مستقبل کے لائحہ عمل پر نظرِ ثانی کرنے کا بروقت موقع مل گیا تھا ورنہ میں بے خبری کے عالم میں کسی بھی وقت کسی ناگہانی شکنجے میں جکڑا جا سکتا تھا۔

جوبرجی سے نکلنے کے بعد میں نے تانگہ پکڑا اور لٹن روڈ سے ہوتا ہوا پرانی انارکلی کے نکڑ پر مال روڈ کے چوراہے پر اتر گیا۔

لاہور کی سرزمین میری جنم بھومی تھی جس کا چپہ چپہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ ماضی کی خوشگوار یادوں کو دل میں سمیٹے میں ایک کافی ہاؤس میں جا بیٹھا جہاں موجود لوگوں میں صنفِ نازک کا کوئی گزر نہیں تھا۔ مگر جن دنوں میں کالج میں پڑھ رہا تھا اور اکبر کے ذریعے گلنار کے نظر فریب شباب کا شکار ہوا تھا، ان دنوں اس کافی ہاؤس میں مستورات کے ساتھ آنے والوں کے لیے خصوصی چوبی کیبن بنے ہوئے تھے جن کا ماحول ہی رومان پرور ہوا کرتا تھا۔

بارہا میں نے ان کیبنوں میں گلنار کے ہاتھوں کا نرم لمس محسوس کیا تھا اور اس لمس کی دیوانگی میں اپنی حدود سے تجاوز کر کے گھر والوں کی خفگی مول لے بیٹھا۔

گلنار کو بعد میں بازارِ حسن کی جنس کے طور پر دیکھنے کے بعد ہی میری آنکھیں کھلی تھیں۔ اسے مجھ سے متعارف کرانے والا کوئی اور نہیں، خود اس کا شوہر تھا۔

مگر وہ عورت جو شوہر کی موجودگی میں اس کے دوست سے حجاب برتے۔ دونوں دوست کار میں ساتھ ہوں تو شرم و حیا کے ساتھ عقبی نشست پر خاموش بیٹھی رہے مگر شوہر کی غیر موجودگی میں اس کے دوست کو میٹھی مسکان کے ساتھ دیکھے۔ چیتوں کے نت نئے انداز اپنائے اور سوچی سمجھی غلطیوں کے تحت اپنے بدن کے لمس سے اسے آشنا کرے۔ وہ سب کچھ ہو سکتی ہے مگر کسی کی وفا شعار بیوی نہیں۔

گلنار سے تعارف کرانے کے بعد اکبر غائب ہوا تو گلنار کے بدن سے رفتہ رفتہ مجھے خاصا تفصیلی تعارف حاصل ہوا۔ اس کی نرم و سفید کلائیوں کی بے داغ ملائمت موئی تہہ کے ذریعے رواں صاف کرنے کی مرہونِ منت تھی۔ اس کی تیکھی اور خمدار بھنویں تراش خراش کا کمال تھیں۔ اس کی تمام تر نہیں تو بیشتر ادائیں خود ساختہ تھیں جن کے سہارے وہ اس وقت میری ذات کا طواف کرتی رہی جب تک میں اس کی فرمائشیں پوری کرنے کا اہل تھا اور جب مجھے والدِ محترم نے نافرمانیوں کے باعث عاق کیا تو وہ اندھیری رات میں سائے کی طرح خاموشی سے میرا ساتھ چھوڑ گئی۔ وہ بے وفا تھی اور اس کی ذات وفا کا بوجھ نہ سہار سکی۔

مگر ایک رات کے اندھیرے میں میں نے اسے بے نقاب دیکھ ہی لیا۔ اس کا تعلق پائل اور گھنگھرو کی تال پر ادائیں فروخت کرنے والیوں کے طائفے سے تھا۔ میں نے اشتعال کے عالم میں اس کے لیے ایک برا سوچی اور میرے وہی ہاتھ جو اسے اپنے رخساروں پر نرم تر محسوس ہوتے تھے اس کی خوبصورت گردن کے گرد موت کے حصار بن کر جم گئے۔

اس رات کا خیال آتے ہی میں پھریری لے کر رہ گیا۔

کافی ہاؤس آنے والوں سے بھرتا جا رہا تھا مگر میں اپنے خیالات کی رو میں ڈوب کر خود کو بالکل تنہا محسوس کر رہا تھا۔ مجھے ڈر سا ہوا کہ کہیں کوئی خیالات کے ساتھ میرے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات نہ پڑھ رہا ہو اور میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔

مگر کافی ہاؤس کی دنیا ہی نرالی تھی۔

وہاں ہر ٹولی اپنی مختصر سی کائنات میں کھوئی ہوئی تھی۔ کسی کو دوسروں سے کوئی واسطہ نہیں تھا اور میرے لیے یہ مشاہدہ تسلی بخش تھا۔

سگریٹ کے دو کشوں کے بعد میرا ذہن سیتا کی طرف بھٹک گیا۔

بندروں اور لنگوروں کی ٹولیوں پر حکمرانی کرنے والی وہ لڑکی تہذیب کی روشنی سے دور ہمالیہ کی برف پوش وادیوں میں پروان چڑھی تھی۔ اسے قدرت نے فیاضی کے ساتھ حسن سے نوازا تھا، اور وفا تو شاید اس کا پیدائشی مزاج ہی تھی۔ مجھ سے شادی کے بعد اس نے انسانوں کا ماحول اس تیزی کے ساتھ اختیار کیا تھا کہ میں کبھی کبھی حیرت سی محسوس کرنے لگتا تھا۔

میں نے اپنے دل کو ٹٹولا کہ جب مجھے سیتا جیسی بیوی ملی ہوئی تھی تو مجھے آبرو باختہ گلنار کا پیکر کیوں بار بار یاد آتا تھا۔

دو سگریٹوں کو دھوئیں میں اڑا دینے کے بعد ایمانداری کے ساتھ ایک نتیجے پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ مجھے سیتا کو اپنانے کے بعد کوئی خلش نہیں تھی بلکہ میں خود کو خوش نصیب تصور کرتا تھا کہ مجھے ایک مثالی بیوی ملی ہوئی تھی جب کہ گلنار کا خیال ہر بار احساسِ شکست کی کوکھ سے جنم لیتا تھا۔

اس کے بارے میں میری نگاہیں حقیقت کا ادراک نہیں کر سکی تھیں جو کچھ اس نے خود کو ظاہر کیا، میں نے اسے وہی تسلیم کر لیا لیکن غلط فہمی کا پردہ چاک ہوتے ہی میں نے اپنی مردانہ انا کو لہولہان محسوس کیا۔ میں سچے جذبوں کے ساتھ ایک جھوٹے بدن کو پوجتا رہا تھا۔ مجھے رہ رہ کر اپنا کی وہ پرانی شکست پریشان کرتی تھی ورنہ گلنار کے بارے میں میرے دل کے کسی حصے میں کوئی نیک خواہش موجود نہیں تھی۔

میں خیالات کی یلغار میں مبتلا کافی ہاؤس سے نکلا تو رنگ محل کی طرف روانہ ہو گیا جہاں والدِ مرحوم کی قدیم دکان میں معنک سیلز مین نے اجنبی نگاہوں مگر مسکراتے چہرے کے ساتھ اٹھ کر میرا استقبال کیا۔

”فرمائیے، کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”میں کل اس دکان کے پرانے مالک کے۔۔۔“

میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے اس کے چہرے پر سجی ہوئی مسکراہٹ معدوم ہو گئی۔ ”ہاں ہاں۔ پتہ مل گیا ہے۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے شوکیس کی ایک دراز کھولی اور ایک مڑا تڑا کاغذ میری طرف بڑھا دیا جیسے وہ مجھے فوراً وہاں سے رخصت کر دینا چاہتا ہو۔

پرچے پر چوہدری بشیر کا اقامتی پتہ پڑھ کر میں نے اس سیلز مین کو گھورا اور اس دکان سے باہر آ گیا۔

حاجی اللہ داد کی فراہم کردہ معلومات پر مجھے پورا یقین تھا مگر میں چوہدری بشیر سے بھی مل لینا چاہ رہا تھا تاکہ لاہور چھوڑنے سے قبل اپنے گھر والوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات اکٹھی کر سکوں۔

چوہدری بشیر کی اقامت گاہ گلبرگ کے علاقے میں تھی۔ میں رنگ محل ہی سے ایک رکشے میں ادھر روانہ ہو گیا۔

اس کا مکان وسیع و عریض اور خوشنما تھا۔ دربان نے میرا نام اور آمد کا مدعا معلوم کر کے مجھے برآمدے میں بٹھایا اور خود اندر چلا گیا۔

چند ثانیوں بعد اس کے ہمراہ ایک ادھیڑ عمر شخص باہر آیا اور تپاک سے ہاتھ ملا کر مجھے نشست گاہ میں لے گیا۔

"میں آپ کو پہچان نہیں سکا سلطان صاحب!" اس نے مسکراتے ہوئے بااخلاق لہجے میں مجھ سے اپنی اجنبیت کا اظہار کیا۔

"میں بغداد سے آیا ہوں۔" میں نے اپنی پرانی کہانی برقرار رکھی۔ "سطوت علی اور مظفر علی سے ملنا چاہتا تھا مگر وہ دکان بیچ چکے ہیں۔ موجودہ مالک کے لیے تو اُن کے نام بھی اجنبی نکلے، اس کی معرفت آپ تک پہنچا ہوں۔ شاید آپ اُن کی نشاندہی کر سکیں!"

"وہ دونوں محلے کے مقروض تو نہیں تھے!" چوہدری بشیر کے چہرے پر سنجیدگی کی گہری تہہ جم گئی اور لہجہ گمبھیر ہو گیا۔

میرے لیے قابلِ غور نکتہ یہ تھا کہ میری زبان سے میرے بڑے بھائیوں کے نام سنتے ہی وہ شخص آپ سے تم پر اتر آیا تھا۔

"نہیں۔" میں نے قدرے خشک لہجے میں کہا۔ "وہ میرے عزیز ہیں۔"

"دکان اُن سے میں نے ہی خریدی تھی۔" اس نے کہا۔ "سطوت میرا گیارہ ہزار روپے کا مقروض تھا اور کئی ماہ گزرنے کے باوجود رقم ادا نہ کر سکا تھا۔ آخرکار اس نے مجھے دکان بیچنے کی پیشکش کی اور میں نے سودے کی رقم میں سے اپنا قرضہ وضع کر لیا۔"

"مقروض ہونے کی وجہ کیا تھی؟"

چوہدری بشیر کے چہرے پر ناگواری کی لکیریں اُبھر آئیں۔ "یہ میرا اور اس کا ذاتی معاملہ تھا، کیا اتنا کافی نہیں کہ وہ میرا مقروض تھا۔"

"جوئے وغیرہ کا سلسلہ؟" میں نے اس کے اعتراض کو نظرانداز کر کے دھیمے لہجے میں سوال کیا۔

"جانتے ہو تو پوچھ کیوں رہے ہو؟" وہ قدرے جھلا گیا۔

"معاملہ براہِ راست یا بلاواسطہ، صرف یہ جاننا چاہتا ہوں۔" میں نے محسوس کیا کہ میرے لہجے میں سرد اور سفاکانہ انداز پیدا ہو گیا تھا۔

"اتنی گاڑھی اردو میری سمجھ میں نہیں آتی۔" وہ چڑچڑے لہجے میں بولا۔ "جو پوچھنا ہے صاف صاف دریافت کرو۔"

"اس نے تم سے رقم لی تھی یا کھیل میں مقروض ہوا تھا؟"

"ایک ہی بات ہے۔" وہ دونوں ہتھیلیاں آپس میں جوڑ کر بولا۔ "کھیل میں ہاری ہوئی رقم نقد سے کم نہیں ہوتی۔"

"دکان کے بعد اُس نے گھر بھی بیچ ڈالا؟"

"مقدر کی بات ہے۔" چوہدری بشیر ڈھٹائی سے بولا۔ "اور شاید نیت کی بھی۔ وہ جیتنے کے لیے بے ایمانی کی فکر میں رہتا تھا۔"

"وہ اب کہاں ہے؟"

وہ تلخ انداز میں ہنسا پھر ناصحانہ لہجے میں بولا۔ "میری مانو تو اس کی فکر چھوڑ دو، اس کی تلاش میں کہیں کسی دل جلے قرض خواہ سے نہ ٹکرا جانا۔ وہ نزدلی محلے میں کرائے کے مکان میں رہتا تھا۔ دن پھرنے کی امید میں اس نے ادھار لینا نہ چھوڑا اور جب دس پندرہ ہزار کے چکر میں آ گیا تو اپنے قرض خواہوں سے مُنہ چھپا کر کہیں بھاگ گیا۔"

چوہدری بشیر کے تضحیک آمیز اندازِ گفتگو پر میرا خون کھول اُٹھا لیکن میں نے ضبط سے کام لیا۔ کم از کم مجھے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ چوہدری بشیر بھائی جان کو بگاڑنے اور ہمارے گھرانے کو تباہی کے غار میں دھکیلنے والوں میں سے ایک تھا۔

"تمہیں تو اُس کا معلوم ہو گا؟"

"توبہ کرو۔" وہ تلخ لہجے میں بولا۔ "لاہور میں ہوتا تو اب تک کسی نہ کسی کے ہاتھ لگ گیا ہوتا۔ اگر اس کو تلاش کرنا ہی چاہتے ہو تو انسانوں کے سمندر میں جاؤ۔ وہ کراچی کے علاوہ کہیں نہیں گیا ہو گا۔ سارے ناکام شکاری اسی منڈی میں اپنے مقدر کی آخری بولی لگوانے جاتے ہیں۔"

"معلومات فراہم کرنے کا شکریہ۔" میں تلخ لہجے میں یہ کہتے ہوئے صوفے سے اُٹھ گیا۔ "میں نے تمہاری ساری ہرزہ سرائی اس لیے برداشت کر لی کہ میرا نام سلطان ہے۔ کسی روز سطوت کو ڈھونڈتے ہوئے صفدر علی ادھر آ نکلے تو اس کے سامنے زبان بند رکھنا۔۔۔ وہ اپنے گھر کی بربادی کے ذمے داروں کی تلاش میں ہے۔ تمہارا خون پی جائے گا۔"

"وہ بھگوڑا!" چوہدری بشیر احمد استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ "اس کی دھمکی نہ دو مجھے۔ سطوت تو اکثر کہتا رہتا تھا کہ صفدر ہندوستان سے زندہ نہ نکل پائے گا۔"

میں غصے میں بل کھاتا اس مکان سے باہر نکل آیا۔

چوہدری بشیر اپنے طور طریقوں سے مجھے عادی جواری نظر آیا تھا اور مجھے اعتماد تھا کہ اس بارے میں میری نگاہیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔

اس کے عالیشان مکان کی بنیادوں میں مجھے اپنے گھر، اور دکان کی موجودگی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی تھی کہ چوہدری بشیر نے دکان پر نگاہ رکھتے ہوئے بھائی جان کو چالبازی سے اپنا مقروض کیا تھا تاکہ نادہندگی کا دباؤ ڈال کر وہ بیش قیمت دکان اپنی مرضی کے داموں پر حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکے۔

اس سے گفتگو کرتے ہوئے غصے میں مجھے اس سے پوچھنا یاد نہیں رہا ورنہ مجھے شبہ تھا کہ کہیں مکان بھی اسی نے نہ خریدا ہو۔ اور اگر مکان اس نے نہیں خریدا ہو تو اس کی فروخت میں کسی نہ کسی طرح اس کا ہاتھ ضرور تھا۔

چوہدری بشیر کے بارے میں میرا دماغ اتنا بھرا ہوا تھا کہ میں فوری طور پر اس شبہ کی تصدیق یا تردید حاصل کرنے پر تل گیا۔

دوبارہ چوہدری بشیر سے رجوع کرنا تو بے سود تھا لہٰذا میں گلبرگ سے سیدھا چوبرجی جا پہنچا۔

دستک کے جواب میں حاجی اللہ داد باہر آئے تو مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ "سلطان میاں! تم دوبارہ کیسے؟"

"جاتے ہوئے ایک بات معلوم کرنی بھول گیا تھا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کہو" وہ بڑھ کر میرے قریب آ گئے۔

"چچا کا مکان کس نے خریدا تھا؟"

"اس کی کیا ضرورت پیش آگئی اچانک؟" انھوں نے حیرت سے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بزرگانہ شفقت سے سوال کیا۔

"یہ مکان چچا جان مرحوم کی نشانی ہے۔" میں نے فوری طور پر بات بناتے ہوئے کہا۔ "ہو سکا تو اسے موجودہ مالک سے خریدنے کی کوشش کروں گا۔ تاکہ مرحوم کی یہ یادگار ہمارے خاندان ہی کے کسی فرد کے تصرف میں رہے۔"

"بہت اچھا خیال ہے۔" حاجی صاحب نے تحسین آمیز لہجے میں کہا پھر معذرت خواہانہ لہجے میں بولے۔ "ایمان داری کی بات تو یہ ہے کہ نئے مالک کا نام مجھے بھی نہیں معلوم، فروخت ہونے کے بعد کافی دن مکان خالی رہا تھا۔ پھر بکنے کے بعد دو بچے کئی کرائے دار آتے جاتے رہے۔۔۔ چند منٹ ٹھہرو تو ابھی معلوم کیے لیتا ہوں۔"

مجھے رضامند پا کر انھوں نے اندر بٹھانے پر اصرار کیا مگر میں نے باہر ہی انتظار کرنے کو ترجیح دی۔ اور وہ تیز تیز قدموں سے ہمارے مکان کی طرف چل دیے۔

ان کی واپسی میں واقعی چند منٹ سے زیادہ صرف نہیں ہوئے۔

کرائے دار عورتوں سے پتہ چلا کہ مالک مکان کوئی چوہدری بشیر ہے جو گلبرگ میں رہتا ہے۔

مجھے حاجی اللہ داد کی آواز کسی گہرے کنوئیں سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ "مرد کام سے واپس آئیں گے تو پتہ بھی لے لوں گا، کسی وقت ادھر سے گزر ہو تو مجھ سے لے لینا۔"

میں حاجی اللہ داد کا شکریہ ادا کر کے لوٹ آیا۔

اس وقت میرے دل و دماغ میں فساد کی سی کیفیت طاری تھی۔ چوہدری بشیر کا کردار سامنے آجانے کے بعد صفدر علی کی خوابیدہ حیوانی جبلتیں پوری طرح بیدار ہو چکی تھیں اور میرے دل میں بار بار یہ خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ چوہدری بشیر کو لاہور کے کسی مضافاتی ویرانے میں برہنہ کر کے اس کے جسم پر اس وقت تک دُرّے برساتا رہوں جب تک اس کے سانسوں کی آخری لڑی بھی اس کا ساتھ نہ چھوڑ دے۔

مگر اس وقت میں خود حالات کا قیدی تھا۔ میں نے اپنے ذہن میں ابھرنے والی ہر سرکش لہر کو بدقت تمام دبایا ورنہ میں فوری طور پر بدترین مشکلات سے دوچار ہو سکتا تھا جن سے نکلنا میرے لیے ممکن نہ ہوتا۔

چوہدری بشیر کو نقصان پہنچنے کی صورت میں فوری طور پر میرے خلاف دو گواہ پیدا ہو جاتے۔ جن میں پہلا دکان میں قائم میڈیکل سٹور کا عینک زدہ مالک تھا اور دوسری شخصیت حاجی اللہ داد کی تھی۔ جو میری ذات سے تمام تر ہمدردیاں رکھنے کے باوجود یہ ہرگز پسند نہ کرتے کہ میں کسی کو ایذا پہنچاؤں۔

پولیس کی گرفت میں آنے کے بعد میں نہ خود کو بغداد سے آیا ہوا سلطان علی ثابت کر سکتا تھا اور نہ ہی پاکستانی شہریت کا کوئی ٹھوس ثبوت فراہم کر سکتا تھا۔ میں پاسپورٹ جو قانونی اعتبار سے ہر طرح جائز تھا پیش کیا جاتا تو میرا اصل نام سامنے آجاتا اور نئے جرم کے ساتھ ہی ماضی کا مواخذہ بھی شروع ہو جاتا۔

لہٰذا بہتر یہی تھا کہ عارضی طور پر چوہدری بشیر کو بھلا دیا جائے تاکہ وہ مزید لوگوں کو گمراہ کر کے اپنے لیے بدترین سزا کا مضبوط تر اخلاقی جواز خود ہی فراہم کر سکے۔

میں تھکا ہارا ہوٹل واپس پہنچا تو سیتا میرے انتظار میں اکتاہٹ کی منزل سے گزر کر تشویش کا شکار ہو چکی تھی۔

"کہاں رہ گئے تھے تم؟" میری صورت دیکھتے ہی وہ بے اختیار میرے سینے سے آلگی۔

"شہر کے راستوں کو پہچاننے کی کوشش کرتا رہا سارا دن۔" میں نے تھکی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

وہ ایک دم الگ ہو گئی اور اپنی بڑی بڑی غلافی آنکھیں میرے چہرے پر جما کر بولی۔ "کیا بات ہے؟ آج کچھ پریشان لگ رہے ہو؟"

"ذرا دم تو لینے دو، آتے ہی جرح شروع کر دی!"

اس نے جوتے اتارنے میں میری مدد کی اور میں تکان سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے غسل خانے میں داخل ہو گیا۔

نہا کر باہر نکلا تو سیتا اس اثنا میں کمرے میں ہی گرم گرم چائے منگوا چکی تھی۔ اور سلیقہ شعار مشرقی بیوی کی طرح میری منتظر تھی۔

مجھے اندازہ تھا کہ وہ میری دن بھر کی کارگزاریوں کی رپورٹ سننے کے لئے بے چین تھی۔ مگر چائے نوشی کے دوران اس نے ایک بار بھی زبان نہیں کھولی۔

"آج بڑی دردناک خبریں ملی ہیں مجھے اپنے گھر والوں کے بارے میں!" چائے ختم کر کے میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"کیا؟" میرے الفاظ سنتے ہی اس کا چہرہ ایک دم دھواں ہو گیا۔

"اس قدر تشویش کی ضرورت نہیں!" میں نے کرسی کی پشتگاہ سے سر ٹکاتے ہوئے کہا۔ "سب گزری ہوئی باتیں ہیں جن کے بارے میں ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ مجھے دکھ اس لئے ہے کہ یہ واقعات آج میرے علم میں آئے ہیں!"

"اپنے گھر والوں میں سے کسی سے ملاقات بھی ہوئی تمہاری؟" اس نے سوال کیا۔

"ماں مر گئی، ایک بھائی بیوی بچوں سمیت دم گھٹنے سے

رخصت ہو گیا۔ بڑا بھائی زندہ ہے لیکن اندیشہ ہے کہ وہ کسی زنداں کی دیواروں میں اپنے شب و روز گزار رہا ہو گا۔"

اس کے استفسار پر میں نے اسے سارے واقعات تفصیل سے سنا دیئے!

"تو تمہارا خیال ہے کہ بھائی جان کو بگاڑنے میں چوہدری بشیر کا ہاتھ ہے؟" پوری کہانی سن کر سیتا نے سوال کیا۔

"اس خیال کی وجہ یہ ہے کہ اس نے بھائی جان کو مقروض کر کے پہلے دوکان پر ہاتھ صاف کیا، پھر مکان بھی ہتھیا لیا۔ اگر دونوں ٹھکانوں کا پہلا خریدار وہ نہ ہوتا تو شاید میں اسے بھول جاتا۔ دراصل گھر برباد ہونے کی اصل وجہ یہی تھی کہ مکان بیچا گیا اور ایک چھت کے نیچے رہنے والے مختلف سمتوں میں بکھر گئے۔"

"مگر ہم اس کا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟"

"فی الحال کچھ بھی نہیں، لیکن تم دیکھنا کہ کسی وقت وہ خود مجھے اپنی بدمعاشی کے افسانے سنانے پر مجبور ہو جائے گا۔"

"غنیمت ہے کہ تمہیں وقت کی نزاکت کا احساس ہے۔" وہ گہرا سانس لے کر بولی۔ "جب تک ہم یہاں اپنی بنیادیں استوار کر کے نئی شناخت پیدا نہ کریں، کسی ہنگامہ آرائی میں ملوث ہونا ہمارے لئے شدید خطرے کا باعث ہو سکتا ہے!"

"اب ہمیں دوبارہ کراچی جانا ہو گا۔" میں نے قدرے سکوت کے بعد کہا۔

"کس لیے؟"

"مجھے بھائی جان کا سراغ لگانا ہے۔ نہ جانے وہ کہاں اور کس حال میں ہیں۔ اس کے بعد ہی میں کچھ کرنے کے قابل ہو سکوں گا۔"

"تم نے جو معلومات جمع کی ہیں ان سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ بھائی جان جیل میں ہوں گے۔ انہیں وہاں سے نکالنا ہمارے بس سے باہر کی بات ہے۔ جرمانے والی بات میں کچھ وزن ہے لیکن وہ ایک مبہم سا قیاس ہے جو درست بھی ہوا تو بھائی جان کی قید کی مدت میں کمی کرانے کے لیے جرمانے کی رقم ادا کرنی ہو گی جو ہزاروں سے کم نہ ہو گی۔"

میں بغور اس کی طرف دیکھنے لگا۔ "تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟"

"جرمانہ ادا کر کے قید کی مدت میں کمی کرائی جاتی۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی۔ "یا جیل سے فرار کی کوشش کی جاتی۔ ہر صورت میں ہمیں بھاری رقم درکار ہو گی جو فی الحال ہمارے پاس نہیں ہے۔ ہماری تھوڑی بہت جمع پونجی بھی کراچی پہنچنے تک برابر ہو جائے گی اور بھائی جان کی مدد تو درکنار ہم خود مالی ضرورتوں میں مبتلا ہوں گے!"

اس کی بات معقول تھی۔ "آخر تمہاری تجویز کیا ہے؟"

"اس وقت ہم لاہور میں بیٹھے ہیں۔ یہاں سے انبالہ قریب اور کراچی دور ہے لہٰذا اس سے قبل کہ ہماری جیبیں خالی ہوں ہمیں انبالہ پہنچ جانا چاہیے۔ اگر توقعات کے مطابق پارس پتھر ہماری تحویل میں آ گیا تو ہمیں مالی بے فکری میسر آ جانے کی اور کراچی پہنچ کر ہم بھائی جان کی تلاش اور مدد کے لیے سارے امکانی وسائل بروئے کار لا سکیں گے!"

"اور اگر وہاں پارس پتھر نہ ملا؟"

"ذہن سے خلش دور ہو جائے گی۔" اس نے بلاتوقف جواب دیا۔ "پھر ہم اتنے ہی تہی دست ہوں گے جتنے اب کراچی پہنچنے پر ہوں گے!"

سیتا ہمیشہ مجھے یہ احساس دلاتی رہتی تھی کہ دنیا میں سمجھدار بیوی سے بڑی کوئی نعمت نہیں ہو سکتی اور اس بار بھی یہی ہوا۔

اس نے جو تجویز پیش کی تھی اس کے بارے میں اس کا ذہن بالکل صاف اور واضح تھا۔ میں کچھ دیر تک اس کے ساتھ مختلف پہلوؤں سے بحث کرتا رہا اور آخری نتیجہ یہی برآمد ہوا کہ ہمیں فوری طور پر انبالہ روانگی کی تیاری کا آغاز کر دینا چاہیے!

اگلے روز میں نے دانستہ سیتا کو ساتھ لے جانے سے گریز کیا اور اس نے میرا راستہ روک لیا۔ "میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی!"

"ضد مت کرو۔ تمہارا جانا مناسب نہیں ہو گا۔" میں نے اسے سمجھایا۔

"کیوں؟ اس میں کون سی نامناسب بات ہے؟"

میں شکست خوردہ انداز میں کرسی پر گر گیا۔ "ضروری تو نہیں کہ تمہیں ساری تفصیلات سے باخبر رکھا جائے!"

"بہت ضروری ہے!" وہ آنکھیں ٹکا کر بولی۔ "میں تمہاری بیوی ہوں، کوئی راہ چلتی لڑکی نہیں جس سے مصلحتوں کے تحت بات کی جاتی ہے!"

"پاکستان میں بھی لوگ صفدر علی کو جانتے ہیں!" میں نے پچھلی رات سے اپنے دل میں چھپائی ہوئی بات اس کے سامنے اگل دی!

"نہیں!" وہ حیرت اور بے یقینی کے ساتھ اچھل پڑی۔

"حاجی اللہ داد بہت نیک اور خدا ترس آدمی ہیں لیکن انہیں صفدر علی کا نام اس کے ماضی کے حوالوں کے ساتھ یاد ہے۔"

"مگر کیسے؟"

"میں پاکستان سے نکلا تو یہاں قتل اور اسمگلنگ کے الزام میں پولیس کو مطلوب تھا پھر طویل سفر کے بعد ہمالیہ سے واپسی میں ہندوستان میں داخل ہوا تو ہندوستان کے سرکاری اداروں کے ساتھ ہی حریص عناصر میری راہ پر لگ گئے۔ اس راستے پر تم میرے ساتھ تھیں لہٰذا جہاں بھی میرا نام آیا ہو گا وہاں تمہارا ذکر ضرور رہا ہو گا!"

"وہ تو سب درست ہے مگر یہ قصے پاکستان میں کیسے پہنچے؟"

"یہ مواصلاتی ترقیوں کا دور ہے۔" میں نے کہا۔ "خبریں ہوا اور روشنی کی لہروں کے ذریعے آناً فاناً دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچتی ہیں۔ ہندوستانی اخبارات کی خبریں یہاں بھی شائع ہوتی ہوں گی۔ پھر شاید تصاویر کے موازنے سے یہاں والوں نے یہ نتیجہ بھی اخذ کر لیا کہ ہندوستان میں سرگرمیاں دکھانے والا اصفدر علی وہی ہے جو پاکستان میں قانون کو مطلوب تھا۔ ہو سکتا ہے کہ دوسرے ممالک جہاں جہاں میرا اصل نام خبروں کا موضوع بنا ہو وہ اطلاعات پاکستانی حکام تک کسی نہ کسی ذریعے سے پہنچتی رہی ہوں!"

"چلو مان لیا کہ یہ درست ہے۔" قدرے توقف کے بعد اس نے کہا۔ "مگر اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ میرا تمہارے ساتھ باہر جانا نامناسب ہوگا!"

"سامنے کی بات ہے... وقت اور حالات نے میرے خدوخال اس حد تک بدل کر رکھ دیئے ہیں کہ حاجی اللہ داد بھی مجھے اپنے روبرو دیکھ کر صفدر علی کی حیثیت میں شناخت نہیں کر سکے مگر میں جانتا ہوں کہ ہمالیہ سے لاہور تک کے طویل سفر نے تمہاری شکل صورت میں کوئی بڑی تبدیلی پیدا نہیں کی ہے تمہارے خدوخال اس علاقے میں لاکھوں کی بھیڑ میں بھی منفرد نظر آئیں گے، ایسا نہ ہو کہ تم پہچان لی جاؤ!"

وہ یک بیک اداس ہو گئی۔ "تم پھر وہی بات کہہ رہے ہو جو تم نے انبالہ میں کہی تھی۔ میری ذات ایک بار پھر تمہارے لیے خطرہ بن رہی ہے!"

"غلط نہ سمجھو!" میں نے جلدی سے کہا۔ "انبالہ میں خطرہ سو فیصد حقیقی تھا۔ تمہارے سیتا کے طور پر نہ پہچانے جانے کا کوئی امکان نہیں تھا یہاں محض ایک خفیف سا اندیشہ ہے اور تمہاری شناخت کا معمولی سا امکان ہے!"

"معمولی ہی سہی مگر امکان تو ہے نا!" اس نے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں کبھی تمہارے ساتھ باہر نہ جا سکوں گی!"

"احمقانہ باتیں نہ کرو، کراچی سے لاہور تک تم برسرِ عام میرے ساتھ بلاخوف و خطر گھومتی رہی ہو!" میں نے کہا۔

"اس وقت تک ہم امکانی خطرات سے بے خبر تھے!" اس کے لب و لہجے میں اداسی کا عنصر غالب تھا۔

"عملاً اس صورتحال میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی ہے۔" میں نے کہا۔ "بات بس اتنی سی ہے کہ کچھ روز احتیاط کر لی جائے تو کوئی ہرج نہیں!"

"جا کہاں رہے ہو؟"

میں ہنس پڑا۔ "اس طرح سوال کر رہی ہو جیسے میری زندگی میں اپنے سوا کسی دوسری لڑکی کے دخل کا اندیشہ ہو!"

"دوسری لڑکی!" وہ مٹھیاں بھینچ کر بولی۔ "میری زندگی میں اس کا کوئی امکان نہیں ہے اور اگر کسی نے تمہیں اپنے قرب کی ترغیب دینے کی جسارت کی تو میں اس کی ٹانگیں چیر کر رکھ دوں گی۔ بس اسی ایک معاملے میں اجڈ رہ گئی ہوں میں!"

اور میری نگاہوں میں بے اختیار وہ بے شمار نسوانی چہرے ناچ اٹھے جن کی قربتوں سے میں نے بارہا اپنی تنہائی کا اندھیرا دور کیا تھا!

میرا سر جھک گیا۔ "میں پاکستانی پاسپورٹ کے حصول کی کوشش کروں گا... ہو سکتا ہے کہ واپسی میں شام ہو جائے!"

اور میں ہوٹل سے چلا آیا!

اس وقت پاسپورٹ کے اجرا میں شناختی کارڈ وغیرہ دکھانے کا رواج نہیں ہوا تھا یا شاید شناختی کارڈوں کا بھی آغاز نہیں ہوا تھا لیکن پاسپورٹ کا حصول خاصا دشوار تھا اور عام لوگوں کو بھی بار بار متعلقہ دفتر کے چکر لگانے پڑتے تھے جب کہ میرا اور سیتا کا معاملہ ہی مختلف تھا۔ ہم دونوں کی شہریت مشکوک تھی۔ میں اپنا پاکستانی ہونا اسی صورت میں ثابت کر سکتا تھا جب اپنا اصل نام ظاہر کروں اس کے بغیر پولیس انکوائری وغیرہ کا مرحلہ طے ہونا ناممکن تھا اور اگر مفروضہ نام استعمال کرتا تو پتہ کہاں کا دیتا!

دفتر میں ایک دو چکر لگا کر میں نے طریقہ کار کا اندازہ لگایا اور پھر احاطے میں لوٹ آیا جہاں متعدد دلال ہر آنے والے کو گاہک سمجھ کر گھیرنے کی کوشش کر رہے تھے!

جو پہلا شخص مجھ سے ٹکرایا وہ صورت ہی سے عیار نظر آ رہا تھا۔ اس کے حریصانہ استفسار کا کوئی جواب دیئے بغیر میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اسے بھیڑ سے نکال کر قریبی ہوٹل کی طرف لے گیا!

"کتنے پیسے خرچ ہوں گے؟" میں نے ہوٹل میں داخل ہوتے ہوئے سوال کیا۔

"پاسپورٹ کب چاہیے؟" اس نے دام مقرر کرنے سے پہلے میری ضرورت کا صحیح اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہوئے سوال کیا!

"چار سو روپے خرچ کرو تو پولیس انکوائری وِنکوائری کے بغیر شاید کل شام تک مل جائے۔" اس نے مجھے خاموش پا کر خود ہی داغ بیل ڈالی۔

"یہ رقم تو بہت زیادہ ہے!" میں نے ایک میز کے گرد پڑی ہوئی کرسی سنبھالتے ہوئے کہا۔

"پولیس انکوائری کا ذمہ اپنے سر لو تو سو روپے خرچ ہوں گے!" اس نے کہنیوں کے بل میری طرف جھک کر کہا۔

"پاسپورٹ کتنے دن میں ملے گا؟" میں نے سوال کیا۔

"رپورٹ آنے کے دوسرے دن!"

"یار تمہیں اندازہ تو ہوگا کہ کم از کم کتنے دن لگ جاتے ہیں؟" میں نے چڑچڑے لہجے میں اسے راہِ راست پر لانے کی کوشش کی!

"تین چار ہفتے تو لگ ہی جائیں گے!"

"پھر کسی اور کو پکڑنا ہوگا۔" میں نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔ "تم تو ضرورت سے زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش کر رہے ہو۔"

گاہک ہاتھ سے نکلتا دیکھ کر وہ سنبھل گیا اور تھوڑی سی ردوقدح کے بعد تین سو روپے میں اگلے روز پاسپورٹ دلوانے پر آمادہ ہوگیا۔

فارم میں میں نے اپنا نام سلطان اور سیتا کا لیلی سلطان لکھوایا۔ ملکوں کے نام لکھواتے ہوئے میں نے ہندوستان کا نام لیا تو وہ چونک پڑا۔

"ہندوستان شامل کرانے کے بیس روپے الگ سے ہوں گے!"

"وہ کس خوشی میں؟"

"ملکوں کی مہر میں ہندوستان کا نام نہیں ہوتا... اس کی تو پاسپورٹ والے بھی الگ فیس لیتے ہیں۔" اس نے مجھے آگاہ کیا اور مجھے یہ شرط بھی تسلیم کرنی پڑی۔

پتے کی باری آئی تو میرے پاس بتانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

"ہم حیدرآباد سے آئے ہیں، وہاں کا پتہ چل جائے گا؟"

"ارے نہیں بھائی۔" وہ جلدی سے بولا۔ "تمہارے فارم جمع ہی نہیں ہوں گے، ہو بھی جائیں تو اگلے دن پاسپورٹ نہیں ملیں گے کیونکہ قانوناً انکوائری تمہارے رہائشی علاقے کے تھانے سے ہونی ضروری ہے۔ کتنی بھی خانہ پری کر لی جائے حیدرآباد آنے جانے کے چار چھ دن تو لازمی گزارنے پڑیں گے!"

"پھر کیا کیا جائے؟" میں نے سوال کیا۔ "تم ہی کوئی راہ بتاؤ!"

"لاہور میں کہاں ٹھہرے ہوئے ہو؟"

"ہوٹل میں!" میں نے کہا۔

"نہیں چلے گا۔" وہ سوچتے ہوئے بڑبڑایا پھر بولا۔ "میں اپنے گھر کا پتہ دے دیتا ہوں لیکن یہ خیال رکھنا کہ آئندہ ویزا فارم میں بھی یہی پتہ لکھنا ہوگا۔"

"چلو ایسا کرو!" میں نے نیم دلی سے کہا۔

حقیقت یہ تھی کہ پاسپورٹ کا حصول پھر اس میں کسی محفوظ حقیقی پتے کا اندراج میرے لیے ایک بہت بڑا مرحلہ تھا جس کو آسان بنانے کے لیے میں نے دلال کا سہارا لینا ضروری سمجھا تھا اور وہ شخص بالکل اسی انداز میں پیش آیا تھا جس کی مجھے توقع تھی!

میرے اور سیتا کے پاسپورٹ سے اس کا چھ سو روپے کا مفاد وابستہ تھا اور اگر محض مقامی پتے کی کمی کی وجہ سے ہمارے فارم نامکمل رہتے تو ہمارے کام کا جو حشر ہوتا لیکن اسے متوقع آمدنی سے ہاتھ دھونے پڑتے!

اس کا اصرار تھا کہ اسے نصف رقم ایڈوانس دی جائے لیکن میں نے محض اوپر کے چالیس روپے دینے پر اکتفا کیا تاکہ وہ کام میں بھرپور دلچسپی برقرار رکھ سکے!

اس موقع پر میں نے صفائی پاسپورٹ کے لیے اتاری گئی تصاویر سے ہی کام لیا اور یوں معاملہ نمٹا کر واپس چلا آیا۔

سیتا کے لیے میری کامیابی کی اطلاع دل خوش کن ثابت ہوئی۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ ہم بیرونِ پاکستان اپنے جملہ مفادات سے جلد از جلد نمٹ لیں تاکہ پوری توجہ اپنے مقامی مسائل پر مرکوز کر کے اپنے نئے گھر کی داغ بیل ڈال سکیں!

اگلے روز میں صبح دس بجے ہی پاسپورٹ آفس پہنچ گیا لیکن اس دلال سے معلوم ہوا کہ متفرق اندراجات کا کام خاصا طویل ہوتا ہے لہٰذا پاسپورٹ دو بجے کے بعد ہی مل سکے گا۔

میں وہاں سے بے مقصد انارکلی کی طرف روانہ ہوگیا!

راستے میں میرا ذہن اپنے مالی وسائل میں الجھا رہا۔ میرے پاس بظاہر تو خاصی رقم موجود تھی لیکن انبالہ کے سفر کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ کم پڑ سکتی تھی کیونکہ پاسپورٹوں کی تیاری کی مد میں چھ سو چالیس روپے کا اضافی خرچ اچانک سامنے آگیا تھا!

بے اختیار مجھے قدرت کی ستم ظریفی پر ہنسی آگئی۔ پاکستان میں صاف ستھری اور ایماندارانہ زندگی بسر کرنے کا ارادہ ابھی تک روبہ عمل آتا نظر نہیں آ رہا تھا حالانکہ پاکستان پہنچنے پر ہماری تحویل میں یمن کے جنرل عماد الحسینی کی دی ہوئی خطیر رقم موجود تھی جو زندگی کی شروعات کے لیے کافی تھی لیکن حادثے کے نتیجے میں میں اس سے محروم ہو چکا تھا اور جو رقم موجود تھی وہ ناکافی نظر آ رہی تھی!

پرانی انارکلی سے گزرتے ہوئے میں نے ایک کمزور سے ارادے کے تحت ایک بڑا سوتی رومال خریدا اور کندھے پر ڈال لیا۔ اس کے بعد میرا رخ نئی انارکلی کی طرف ہوگیا۔

میں نے اپنی زندگی کے مختلف مواقع پر بدترین اخلاقی نوعیت کے جرائم کا ارتکاب کیا تھا جن میں نقب زنی اور چوری سے قتل و غارت گری تک کے واقعات شامل تھے لیکن ایک بار تمام جرائم سے دستبردار ہونے کا رضاکارانہ فیصلہ کرنے کے بعد متروکہ راستوں کی طرف واپسی اختیار کرتے ہوئے مجھے عجیب سا احساس ہو رہا تھا!

نئی انارکلی کا علاقہ پرہجوم نظر آ رہا تھا اور میرے مطلب

کے اعتبار سے خاصا زرخیز تھا۔ چند سو قدم کی مسافت کے بعد ہی میں نے ایک جوڑے کو بھانپ لیا اور ان کے تقریباً پیچھے ہو لیا۔ پھر ایک بار جیسے ہی وہ دونوں بھیڑ میں سے گزرنے لگے۔ مرد اپنی ذات کو بھول کر عورت کو راہگیروں کی کہنیوں اور کندھوں کی زد سے نکال لے جانے کی فکر میں مبتلا ہو گیا!

میرے لیے وہ بہترین موقع تھا، میرے قدم تیزی سے حرکت میں آئے اور میں بالکل اس شخص کے عقب میں پہنچ گیا۔

پھر شانے پر پڑے ہوئے رومال کی آڑ میں میرا ہاتھ آگے بڑھا اور لحظہ بھر میں اس شخص کی جیب سے وزنی بٹوا میرے ہاتھ میں منتقل ہو چکا تھا!

میں نے رفتار سست کر کے سمت تبدیل کرتے ہوئے وہ بٹوا جلدی سے اپنی جیب میں ڈال لیا اور بھیڑ سے نکلنے کی راہ تلاش کرنے لگا تاکہ بٹوے سے رقم علیحدہ کر کے دیگر فضول اشیا سے اپنی جان چھڑا سکوں!

اچانک میں نے اپنے شانے پر کسی کے ہاتھوں کا سخت دباؤ محسوس کیا اور سنسنی کے عالم میں میرے قدم زمین میں گڑ کر رہ گئے! سر گھمایا تو بڑی بڑی آنکھوں اور پھیلی ہوئی مونچھوں والا ایک دیو ہیکل شخص ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ لئے میرے سر پر موجود تھا۔!

”بھاگنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ پسلیوں میں چاقو اتار دوں گا“ اس نے میرے داہنے کان کے قریب منہ لاکر سرگوشی کی۔ ”خیریت چاہتے ہو تو شرافت سے میرے ساتھ ساتھ چلتے رہو۔ بھیڑ میں میرے اور بھی ساتھی ہیں!“

میں نے اپنے حلق میں کوئی چیز اٹکتی سی محسوس کی اور محض اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا کیونکہ مسروقہ بٹوے کی جیب میں موجودگی کی وجہ سے میں اس وقت بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کے حکم کی تعمیل میں ذرا بھی ہچکچاہٹ سے کام لیتا تو وہ مجھے زخمی کر کے بھی قانون کی نگاہوں میں سرخرو رہتا کیوں کہ جیب تراشی کے مال سمیت فرار کی کوشش کرتے ہوئے جیب تراش کو زخمی کر کے بے قابو کرنا ہر لحاظ سے قابل معافی تھا!

کچھ دور آکر وہ ایک روڈ پر مڑ گیا۔

داہنے ہاتھ پر رہائشی عمارتوں اور دکانوں کے درمیان قطب الدین ایبک کے ویران و خستہ مزار کی تعمیر کے کام پر چند مزدور مامور تھے۔ وہ شخص مزار سے گزر کر بائیں ہاتھ پر تنگ و تاریک زینوں میں گھس گیا۔

اس بھاگ دوڑ کا اختتام پہلی منزل کے ایک سیلن زدہ لیکن وسیع کمرے میں ہوا جہاں شاید پورے سال دھوپ کا گزر ہی نہ ہوتا تھا! اس نے کمرے کا مقفل دروازہ کھولا تھا جسے میرے اندر پہنچنے کے بعد اس نے بولٹ کر لیا۔

”مال نکالو“ کمرے میں پہنچ کر چند ثانیوں بعد اس نے درشت لہجے میں کہا۔

”کیسا مال؟“ میں نے پُراعتماد لہجے میں سوال کیا۔

”بکواس مت کرو!“ غصے سے اس کا منہ بگڑ گیا۔ ”وہ بٹوا کہاں ہے جو تم نے انارکلی میں ایک شخص کی جیب سے اڑایا تھا!“

”تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے میرے دوست!“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”کوئی بڑی غلط فہمی — میں ایک شریف آدمی ہوں جس کا جیب تراشی سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے!“

”اڑنے کی ضرورت نہیں!“ وہ غرایا۔ ”میں نے خود تمہیں اس کی جیب سے بٹوا نکال کر اپنی جیب میں رکھتے دیکھا تھا“

”اگر تم اسی قدر بضد ہو تو میری تلاشی لے سکتے ہو۔“ میں نے خائف ہوئے بغیر اسے پیش کش کی۔ ”نہ میں نے کسی کی جیب کاٹی نہ میرے پاس کوئی بٹوا ہے!“

پہلی بار اس کے چہرے پر الجھن کے آثار نظر آئے اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور وہ مجھے بھول کر دروازے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

دروازے پر ایک سے زائد افراد موجود تھے جن سے وہ دھیمی آواز میں باتیں کرتا رہا پھر ایک آدمی کو اندر بلا کر دوبارہ دروازہ بند کر لیا۔ دوسروں کی آہٹیں بتدریج بیرونی راہداری میں دور ہوتی چلی گئیں جن سے لوٹنے والوں کی تعداد کم از کم دو ظاہر ہو رہی تھی!

اپنے ساتھی کے آجانے کے بعد اس نے براہ راست میری تلاشی لے ڈالی لیکن بٹوا میرے پاس ہوتا تو برآمد ہوتا۔ اُسے تو میں راستے میں ہی رقم نکال کر ایک کھلے ہوئے گٹر میں پھینک آیا تھا اور وہ قدم محض یہ سوچ کر اٹھایا تھا کہ کہیں مجھے رنگے ہاتھوں پکڑنے والا خفیہ پولیس کا کوئی بدنیت اہلکار نہ ہو جو مجھے دھمکا کر مال مسروقہ کے علاوہ کچھ اور بھی ہتھیانا چاہتا ہو!

”بٹوا کہاں ہے؟“ ناکام تلاشی کے بعد اس نے جھلائے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

”میں کہہ چکا ہوں کہ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے میں شریف آدمی ہوں!“ میں نے اپنے لہجے کو اعتدال پر رکھتے ہوئے کہا۔

”یہ میرا علاقہ ہے!“ چند ثانیے تک اس نے مجھے پُرخار نظروں سے گھورتے رہنے کے بعد کہا۔ ”اور اسے میں نے کافی دور سے تاڑا ہوا تھا مگر مجھ سے پہلے تم نے اپنا کام دکھا دیا۔ یہ بتاؤ کہ تمہارے پاس اتنی رقم کہاں سے آئی اور بٹوا خالی کر کے تم نے کہاں پھینکا؟“

”رقم میری اپنی ہے جس سے تمہیں کوئی واسطہ نہ ہونا چاہیے!“ میں نے ناگواری سے کہا۔ ”راستے بھر نہ صرف تم میرے ساتھ تھے بلکہ تمہارے تین ساتھی بھی ہمارے پیچھے لگے ہوئے تھے میں نے بٹوا کہیں پھینکا ہوتا تو

ان میں سے کسی کی نگاہ میں ضرور آتا۔"

اس نے استفسار طلب نگاہوں سے اپنے نووارد ساتھی کی طرف دیکھا جس نے حسب توقع میری ہاتھ کی صفائی کی تائید کردی۔ "راستے بھر اس پر نگاہ رہی ہے میں نے تو اسے کچھ بھی پھینکتے ہوئے نہیں دیکھا!"

"مگر میں نے اسے بٹوا نکالتے دیکھا تھا!" وہ جھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اس کے پاس موٹی رقم بھی موجود ہے مگر وہ بٹوا۔۔۔۔!"

"اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو تم اس علاقے کے جیب تراشوں کے سرغنہ ہو بہاسے بے یقینی کا شکار دیکھ میں نے کہا۔" اور مجھے اپنی حدود میں مداخلت کے شبہ میں پکڑ لائے ہو میں شریف آدمی ہوں اور تم جیسوں کی دشمنی کا مطلب خوب سمجھتا ہوں۔ اگر تم مجھے جانے دو تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس واقعہ کو بھول جاؤں گا۔"

وہ دونوں کمرے کے ایک گوشے میں مشورہ کرنے لگے اور میں یہ سوچنے لگا کہ سیتا اس معاملے میں مجھ سے زیادہ ماہر ثابت ہوئی تھی متعدد جیب تراشیاں کرنے کے باوجود وہ کبھی کسی کی گرفت میں نہیں آئی تھی۔ جب کہ میں پہلی ہی واردات کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا!

ان کی مشاورت کئی منٹ تک جاری رہی پھر مجھے نہایت تحقیر آمیز انداز میں دھمکیاں دینے کے بعد وہاں سے جانے کی اجازت مل گئی!

میں نے یوں سستے چھوٹ جانے پر دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور عجلت کے عالم میں اس عمارت سے نکل آیا۔

دوپہر کا کھانا میں نے قیمے کے سموسوں اور لسی کے ایک گلاس کے ذریعے نمٹایا اور کشاں کشاں دوبارہ پاسپورٹ آفس جا پہنچا جہاں میرے دونوں پاسپورٹ ایجنٹ کے پاس تیار تھے جو اس نے رقم لے کر میرے حوالے کر دیئے!

اس روز کے لیے اتنی ہی کامیابی کافی تھی۔ پاسپورٹ لے کر میں سیدھا ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا جہاں سیتا میری منتظر تھی!

پاکستانی پاسپورٹ مل جانے کے بعد میں پاسپورٹ قبضے میں رکھنے سے خطرات پیش آسکتے تھے لہٰذا میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بولٹ کرکے یکے بعد دیگرے ان دونوں پاسپورٹوں کا ایک ایک صفحہ نذر آتش کرکے راکھ غسل خانے کی نالی میں بہادی!

پاسپورٹ ایجنٹ سے باتوں ہی باتوں میں میں یہ معلوم کرچکا تھا کہ ہندوستان کے لیے ویزا پاکستان کے صرف دو شہروں سے جاری کیا جاتا تھا۔ ہمارے لیے کراچی میں ہندوستانی قونصلیٹ کا رخ کرنا تو دشوار تھا لہٰذا ہم نے اسی شام پنڈی روانگی کا فیصلہ کرلیا تاکہ اگلے روز اسلام آباد میں ہندوستانی سفارت خانے سے رجوع کرسکیں!

یہ فیصلہ کرنے کے بعد ہم نے ہوٹل چھوڑ دیا اور اسی شام ریل کار سے راولپنڈی کے لیے روانہ ہوگئے!

راستے میں میں نے سیتا کو اپنی جیب تراشی کا واقعہ تفصیل سے سنایا تو وہ بہت محظوظ ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ میں ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کے باعث گردوپیش کو فراموش کر بیٹھا تھا۔ اگر ذرا دانشمندی سے کام لیتے ہوئے میں احتیاط کے ہر پہلو کو مدنظر رکھتا تو شاید وہ تلخ تجربہ مجھے پیش ہی نہ آتا!

ہم آٹھ بجے پنڈی پہنچے تو اس شہر میں رات کا آغاز ہو چکا تھا۔ عام اس وقت شب بسری کا ہی تھا۔ لہٰذا پنڈی میں بھی ہم نے ایک سستے لیکن صاف ستھرے ہوٹل کا ہی رخ کیا جبکہ پنڈی میں میرے کچھ رشتے دار مقیم تھے لیکن حاجی اللہ داد سے پاکستانی اخبارات میں اپنے بارے میں شائع ہونے والے مواد کے بارے میں سن کر میں ماضی کے ہر رشتے سے دور رہنا چاہتا تھا!

اگلی صبح ہم بس کے ذریعے اسلام آباد پہنچے اور بھارتی سفارت خانے کا پتہ دریافت کرتے ہوئے منزل مقصود پر پہنچ گئے!

وہاں پہنچے تو حیرانی ہماری منتظر تھی۔ اس وقت محض نو بجے تھے لیکن ویزا کی درخواستیں وصول کرنے والی کھڑکی کے سامنے مردوں اور عورتوں کی طویل قطاریں موجود تھیں!

پتہ چلا کہ ان دنوں کراچی سے ویزا کا اجرا خاصی دیر میں ہوتا تھا جبکہ اسلام آباد سے ہندوستان کا ویزا اگلے ہی دن مل جاتا تھا۔ پھر طویل بندش کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے درمیان محدود تعداد میں شہریوں کی آمدورفت کا آغاز ہوئے چند ماہ ہی گزرے تھے لہٰذا سندھ بلکہ حد تو یہ کہ کراچی کے باشندے بھی ویزا کے حصول کے لیے اسلام آباد میں قائم بھارتی سفارت خانے کو ہی ترجیح دیتے تھے!

میں نے کاؤنٹر سے ویزا کے دو فارم حاصل کرکے ان کی خانہ پری کی اور پاسپورٹوں کے ساتھ مردانہ قطار میں کھڑا ہوگیا! اتنا لکھا ہے کہ میں نے

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجئے

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

فرضی درج کیا تھا!

کھڑکی پر درخواستوں کی وصولیابی ٹھیک دس بجے شروع ہو گئی۔ قطار کے آخر میں کھڑے ہوئے لوگ ابتدا ہی سے مایوسی کا شکار تھے۔ کیونکہ ان کے بقول ہر روز درخواستوں کی ایک مقررہ تعداد ہی وصول کی جاتی تھی۔

ان دنوں پاکستان کے باشندوں کی اتنی بڑی تعداد ہندوستان جانے اور اپنے بچھڑے ہوئے اعزہ سے ملنے کے لیے بے چین تھی کہ صبح کے لیے ایک روز قبل سرشام ہی لوگ سفارت خانے کی عمارت سے باہر درخواستیں جمع کرانے کے لیے قطار بند ہو جایا کرتے تھے!

پھر وہی ہوا جو سنا جا رہا تھا!

مقررہ تعداد پوری ہوتے ہی کھڑکی بند کر دی گئی اور ناکام لوگوں کی بھیڑ احاطے میں پھیل گئی میرے لیے وہ ایک انوکھا تجربہ تھا میں سیتا کے ساتھ مل کر کوئی لائحہ عمل طے کرنا چاہ رہا تھا لیکن اس کا دور دور کہیں پتہ نہیں تھا!

چند منٹ بعد وہ عمارت سے نکلتی نظر آئی تو بہت خوش تھی!

"آؤ — شاید کام بن ہی جائے!" اس نے میرے ہاتھ میں دبے ہوئے پاسپورٹ اور ویزہ فارم کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"کوئی سفارش ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"رنجیت سنگھ یہاں بابو ہے۔ وہ ہندوستان میں میری ماں کی بیماری کی کہانی سن کر پسیج گیا۔ اگر فنی وجوہ پر کچھ درخواستیں مسترد ہوئیں تو وہ ہماری درخواستیں شامل کرا دے گا۔ شاید کل کا ویزا ہی مل جائے!"

رنجیت سنگھ ایک ادھیڑ عمر اور رحم دل سکھ تھا۔ اس نے درخواستیں اور پاسپورٹ تو لے لیے مگر ہمیں کوئی رسید نہیں دی۔

میں دل ہی دل میں سیتا کے کمال کی داد دیتا واپس ہو لیا۔

اگلے روز ہم ساڑھے بارہ بجے دوبارہ ہندوستانی سفارت خانے پہنچے تو رنجیت سنگھ نے اپنی میز کی دراز سے پاسپورٹ نکال کر ہماری طرف بڑھا دیے!

اصولی طور پر ہمیں ہندوستان کے چار شہروں کے لیے ویزا مل سکتا تھا مگر اس کے لیے ہر شہر میں اپنے کسی رشتے دار کا پتہ دینا ہوتا جو ہمارے پاس نہیں تھا لہٰذا ہمیں صرف انبالہ کا ویزا ملا تھا اور وہ بھی سیتا کی ماں کے فرضی رہائشی پتہ کی بنا پر!

اس مرحلے سے نمٹ کر ہم اسی روز پنڈی آئے اور شام کو لاہور واپس لوٹ گئے!

اگلے دن کا آغاز کم از کم میرے لیے سنسنی خیز تھا۔

اسٹیشن سے امرتسر کے لیے ٹکٹ حاصل کرنے سے قبل میں نے کچھ پیسے خرچ کر کے سفری دستاویزات کی کارروائیاں مکمل کرا لی تھیں اس کے ساتھ ہی امریکی ڈالرز بھی لے لیے تھے جو بہت قلیل مقدار [illegible] مگر میں نے بقیہ پاکستانی کرنسی بھی ساتھ لے لی تھی!

ٹرین لاہور سے روانہ ہوئی تو ہر ڈبے میں اسپیشل [illegible] موجود تھا۔ چند منٹ کے سفر کے بعد ٹرین واہگہ چیک پوسٹ [illegible] گئی اور ٹرین چلانے والے عملے کے علاوہ سارے سرکاری اہل کار [illegible] اتر گئے!

ہندوستانی اور پاکستانی سرحد کے درمیان مختصر سی آزاد پٹی [illegible] ہندوستان کے دو گھڑ سوار سپاہی موجود تھے۔ ٹرین دوبارہ حرکت [illegible] تو ان میں سے ایک ایک مسلح گھڑ سوار ٹرین کی ایک جانب موجود تھا!

مختصر سی آزاد پٹی سے گزر کر ٹرین اٹاری اسٹیشن پر رک گئی۔ [illegible] سارے مسافر سامان سمیت ٹرین سے اتر گئے۔

کاغذات اور ساز و سامان کی اجتماعی دیکھ بھال میں تو بہت کم وقت صرف ہوا اور مسافر دوبارہ ٹرین پر سوار ہو گئے!

اس بار ٹرین حرکت میں آئی اور ہندوستانی سرزمین پر دوڑنے لگی بمشکل بیس منٹ بعد ٹرین امرتسر کے اسٹیشن پر رک چکی تھی جہاں ہر طرف پگڑیاں ہی پگڑیاں نظر آ رہی تھیں!

جن مسافروں کے پاس امرتسر کا ویزا تھا انہیں اسٹیشن سے نکلنے کی اجازت مل گئی مگر بیشتر تعداد آگے جانے والوں کی تھی!

میں نے زرمبادلہ کے ایک بنک کاؤنٹر سے بیس ڈالر ہندوستانی کرنسی میں تبدیل کرائے اور انبالہ کے ٹکٹ خرید لیے۔

دوسرے پلیٹ فارم پر جانے والی ٹرین تیار تھی۔ میں سیتا کے ہمراہ دھڑکتے دل کے ساتھ اس میں سوار ہو گیا اور تقریباً نصف گھنٹے بعد ٹرین نے امرتسر کا اسٹیشن چھوڑ دیا۔

اس کا اگلا اسٹیشن انبالہ تھا جہاں راجہ ہوٹل ہماری منزل تھا۔

سیتا کی ماں سندری کا دیا ہوا پارس پتھر وہاں موجود تھا یا نہیں — اس کے بارے میں محض امید ہی کی جا سکتی تھی، لیکن اصل صورت حال کے بارے میں ہم دونوں میں سے کوئی بھی پر یقین نہیں تھا۔

میں خیالات کی رو میں ڈوبا کھڑکی سے باہر تیزی کے ساتھ پیچھے بھاگتے ہوئے سرسبز کھیتوں کو دیکھنے میں محو تھا کہ اچانک ایک کرخت آواز نے مجھے چونکا دیا اور میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا!

باقی آئندہ

Jasoosi Digest February 1983

پھندا

بادل کاظمی

Jasoosi Digest February 1983
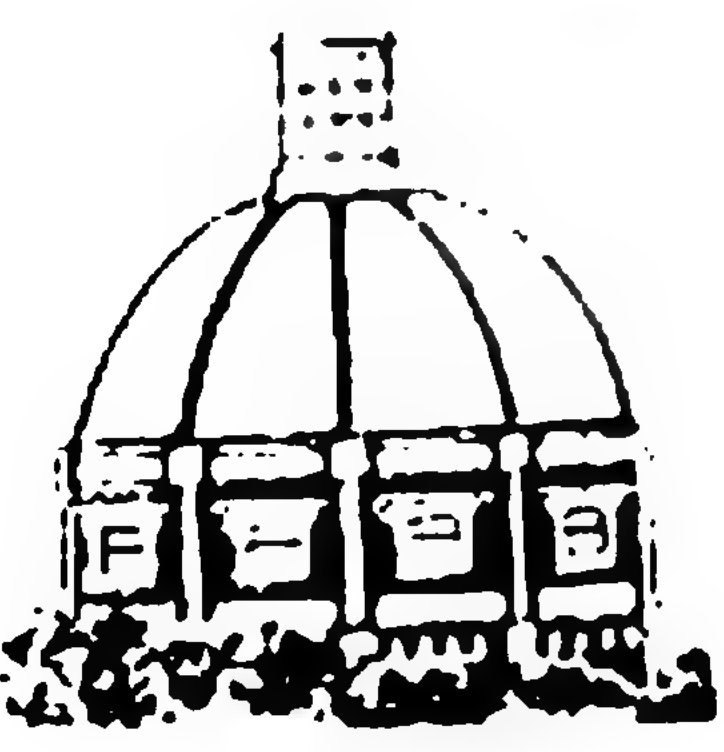
بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ازدواجی بندھن بہت نازک ہوتے ہیں اور انہیں آسانی سے توڑا جاسکتا ہے۔ لیکن بعض اوقات یہ کمزور بندھن ایک ایسا پھندا بن جاتا ہے جسے توڑنا آسان نہیں ہوتا۔ ایک زن گزیدہ شخص کا قصہ جس نے اس بندھن کو غلط طریقے سے توڑنے کی کوشش کی تھی۔

وہ پلنگ کی پٹی پر پیر لٹکائے اس طرح بیٹھا تھا کہ اس کے دونوں ہاتھ بالکل ڈھیلے ڈھالے انداز میں رانوں پر ٹکے ہوئے تھے۔ چہرے پر دنیا جہاں کی اداسی تھی اور آنکھوں میں ویرانی جھلک رہی تھی۔ سر پر چوہے کی رنگت کے بال اپنی جگہ چھوڑنے لگے تھے۔ جس کی وجہ سے کھوپڑی کے عین وسط میں ایک چھوٹا سا چٹیل میدان نمودار ہو رہا تھا۔ بائیں آنکھ کے نیچے کا گوشت کسی پرانی چوٹ کی وجہ سے کھنچا ہوا تھا۔ ایک سیاہ حلقہ آنکھ کے نیچے سے لے کر رخسار تک پھیلا ہوا تھا جس سے اس کے نصف چہرے نے کچھ عجیب سی ہیئت اختیار کر لی تھی۔ چھوٹے قد، دبلے پتلے جسم اور لمبوترے چہرے کی بدولت یوں بھی اس میں کوئی خاص کشش نہیں تھی۔

اس چھوٹے سے کمرے کی بتی اگرچہ بجھی ہوئی تھی لیکن کھڑکی سے آنے والی روشنی اتنی کافی تھی کہ اس کے قدموں میں فرش پر پڑی ہوئی عورت کی لاش کو دیکھا جا سکتا تھا۔ اس کے دماغ میں دھمک سی ہو رہی تھی۔ دماغ کے کسی گوشے سے ابھرنے والی وہی پُراسرار آواز، جو اکثر اس کی رہنمائی کیا کرتی تھی، سرگوشی سی کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ "یہ تم نے کیا کر دیا احمق! تمہیں یہ انتہائی قدم اٹھانے کو کس نے کہا تھا؟"

وہ کسمسا کر رہ گیا۔ اس نے اندر سے ابھرنے والی اس پُراسرار آواز کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اب تک کسی سنگین اقدام سے بچنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ دوسرے مردوں کے برعکس اس نے بیوی

کی ہر بات برداشت کی تھی۔ اس کی شراب نوشی، کئی کئی راتوں تک گھر سے غائب رہنا، دوستوں اور جاننے والوں سے اس کی آوارگی کے طعنے۔ کون سی ایسی بات تھی جسے اس نے برداشت نہیں کیا تھا۔ وہ ہر بات کو زہر کا گھونٹ سمجھ کر حلق سے اتارتا رہا۔ سزا دینے کے طور پر کئی مرتبہ اس نے بیوی کو گھر سے نکال بھی دیا تھا لیکن ہر مرتبہ غصہ ٹھنڈا ہونے کے بعد اسے پھر قبول کر لیا تھا۔ اس کی بیوی ہر مرتبہ راہِ راست پر آنے کا وعدہ کرتی لیکن دو چار روز بعد ہی اس وعدے کو بھول کر پرانی حرکتیں شروع کر دیتی۔ بالآخر اس کی قوتِ برداشت جواب دے گئی اور اسے یہ انتہائی قدم اٹھانا پڑا۔" اس کا کوئی اور حل بھی سوچا جا سکتا تھا بیوقوف!" اندر سے ابھرنے والی آواز نے اسے سرزنش کی۔

"شٹ اپ!" اس نے اپنے اندر کی آواز کو ڈانٹ دیا۔ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ اس نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا تھا اور اس کے ساتھ ہی وہ آئے دن کے ہنگامے بھی ختم ہو چکے تھے جنہوں نے اس کی زندگی کو اجیرن کر رکھا تھا۔ اس کی زندگی میں اب کوئی ہنگامہ نہیں ہوگا۔ اس کے اندر سے ابھرنے والی آواز سینے کی عمیق گہرائیوں میں گم ہو گئی۔ اس کے ذہن پر چھایا ہوا بوجھ اتر گیا اور وہ اپنے آپ کو ہلکا پھلکا سا محسوس کرنے لگا۔ اب اس کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہو رہا تھا۔ اس کے اندر ایک نیا آدمی جنم لے چکا تھا اور وہ ایک نئی زندگی شروع کرنے والا تھا۔

وہ پلنگ سے اٹھ کر میز کے قریب پہنچ گیا جس پر نصف سے قدرے زیادہ بھری ہوئی شراب کی ایک بوتل رکھی ہوئی تھی اس وقت یہی بوتل اس ہنگامے کا باعث بنی تھی جو بالآخر اس کی بیوی کی موت پر منتج ہوا تھا۔ اس نے بوتل اٹھا لی، چند لمحے اس میں بھرے ہوئے ارغوانی سیال کو دیکھتا رہا پھر بوتل منہ سے لگا لی اور اس وقت تک نہیں ہٹائی جب تک کہ شراب کا آخری قطرہ بھی اس کے حلق میں نہ اتر گیا۔ معدے میں شراب پہنچتے ہی اس کے حواس بھی لوٹ آئے اور سوچنے سمجھنے کی قوت بھی عود کرنے لگی۔ حواس بحال ہوتے ہی اس کے ذہن میں ابھرنے والا سب سے پہلا خیال یہی تھا کہ اگر وہ پکڑا گیا تو قانون کے محافظ اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟ جوش کی جگہ ہوش نے لے لی تھی حقیقت کے تصور سے اس کے جسم میں سنسنی سی پھیل گئی۔

یہ سب کچھ ایک حادثہ تھا۔ محض حادثہ جو اتفاقیہ طور پر پیش آیا تھا لیکن اس کے بیان پر یقین کون کرے گا؟ ہر شخص جانتا تھا کہ ان کے تعلقات کشیدہ تھے۔ بیوی آئے دن اپنے غلط رویے سے اسے ذہنی اذیت پہنچاتی رہتی تھی۔ درجنوں افراد ایسے تھے جنہوں نے اکثر انہیں جھگڑتے ہوئے دیکھا تھا یا سنا تھا۔ بہت سے ایسے بھی ہوں گے جنہوں نے اسے اپنی بیوی کو جان سے مار دینے کی دھمکی دیتے ہوئے سنا ہوگا۔ اگر وہ اپنی بیوی کی موت کو ایک حادثہ ثابت کرنے کی کوشش بھی کرے تو اس میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔

چند لمحے قبل اس کے ذہن میں ایک نئی زندگی اور آزادی کا جو احساس پیدا ہوا تھا وہ مرجھائے ہوئے پھول کی خوشبو کی طرح غائب ہو گیا۔ اس کے جسم میں سرد سرد کر سنسنی کی لہریں سی اٹھنے لگیں۔ آنتوں میں گرہیں سی پڑنے لگیں جو اسے بری طرح بے چین کیے دے رہی تھیں۔ وہ بیوی سے آزادی کا تمنی تھا جو اس کے لیے پھانسی کا پھندا بن گئی تھی۔ اس نے کئی مرتبہ سوچا تھا کہ چپکے سے کہیں غائب ہو کر اس پھندے سے نجات حاصل کرلے لیکن وہ اپنے اس ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ آئے دن کے لڑائی جھگڑوں کے باوجود وہ اس کے ساتھ رہنے پر مجبور تھا۔ البتہ کبھی کبھار جب انتہائی غصے کے عالم میں وہ بیوی کو دھکے دے کر گھر سے نکال دیتا تو وہ چند دن کے لیے اسے چھوڑ کر چلی جاتی لیکن کچھ عرصہ بعد ہی اس یقین کے ساتھ کہ وہ اسے دوبارہ اپنا لے گا۔ اس کے آس پاس منڈلانے لگتی تو وہ ماضی کی تلخیاں فراموش کر کے اسے گھر میں بلا لیتا۔

ان کی شادی کو کئی سال بیت چکے تھے۔ محبت یا چاہت نام کی کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو ان دونوں کے اشتراک کا باعث کہلا سکتی ہو۔ بس وہ دونوں ایک دوسرے کی ضرورت تھے اور یہ ضرورت ہی ان کے درمیان بندھن بنی ہوئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ صرف موت ہی اس بندھن کو توڑ سکتی تھی۔ موت نے یہ بندھن توڑ دیا تھا اور وہ ان تمام الجھنوں سے نجات پا لینا چاہتا تھا۔ جنہوں نے مکڑی کی طرح اس کی زندگی کے گرد جالا سا تان رکھا تھا۔ اس کی پیشانی پر سوچ اور فکر و تشویش کی لکیریں تھیں اور وہ آنکھیں بند کیے اپنے آئندہ اقدام کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

سینے کی تاریک گہرائیوں میں دب جانے والی وہ پُراسرار آواز ایک بار پھر ابھری۔ اس مرتبہ یہ آواز کچھ ایسے کڑک کے سے ابھری تھی کہ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور متوحش نگاہوں سے کمرے میں چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ آواز اس کے اندر سے ابھری تھی۔

"اس لاش کو ٹھکانے لگا دو۔" آواز نے اسے مخاطب کیا۔ "اگر تم لاش کو غائب کر دو تو کوئی بھی تم پر کسی قسم کا شبہ نہیں کر سکے گا۔"

"کیسے؟ لاش کیسے غائب کر دوں؟" اس نے سرگوشی کی۔

"اسے اپنے ساتھ کار میں لے جاؤ احمق! وہاں اس سے

"پیچھا چھڑانا تمہارے لیے مشکل نہیں ہوگا۔" آواز نے مشورہ دیا۔

وہ الفاظ کے مفہوم پر غور کرنے لگا۔ کام یہ ہے جا کر لاش سے کس طرح پیچھا چھڑایا جا سکتا ہے جبکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ کسی لاش کو ٹھکانے لگانا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ اسی لمحہ اندر سے ابھرنے والی آواز نے اپنا مفہوم سمجھا دیا۔ لاش کو سمندر کی تہہ میں غرق کر کے اس سے نجات حاصل کی جا سکتی تھی۔

اس کی بیوی دھان پان سی عورت تھی۔ آوارگی، لسیار نوشی اور آئے دن حملہ آور ہونے والی مختلف بیماریوں نے اس کی رہی سہی صحت بھی برباد کر دی تھی۔ اس نے جھک کر لاش کو اٹھایا تو وہ بالکل ہلکی پھلکی ثابت ہوئی۔ اس نے لاش کو اپنے ساتھ کھڑا کر کے ایک ہاتھ سے اس کا ہاتھ تھام لیا اور دوسرا اس کی کمر کے گرد اس طرح حمائل کر دیا کہ دیکھنے والے کو یہی تاثر ملتا جیسے اس کی بیوی نشے میں دُھت ہو اور وہ اسے سہارا دے کر لیے جا رہا ہو۔

اس نے دروازہ کھول کر محتاط نگاہوں سے باہر جھانکا نیم تاریک راہداری سنسان پڑی تھی۔ وہ لاش کو اسی طرح سہارا دیئے کمرے سے باہر آ گیا اور اسے تقریباً گھسیٹتا ہوا زینے کی طرف بڑھنے لگا لیکن ابھی اس نے چند ہی قدم کا فاصلہ طے کیا تھا کہ کسی آہنی زنجیر کے کھٹکے کی آواز سن کر وہ سرتاپا لرز اٹھا۔ اس نے لاش کو سنبھالتے ہوئے تیزی سے گھوم کر دیکھا۔ اس کے فلیٹ کے سامنے والے فلیٹ کا دروازہ کھلا۔ ایک نسوانی چہرہ جھانکتا ہوا نظر آیا۔ پھر ڈریسنگ گون میں لپٹی ہوئی درمیانے قد کی وہ عورت دروازے سے نکل کر سامنے آ گئی۔

"کوئی نیا مسئلہ ہ اب کیا معاملہ ہے فوبس؟" عورت نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔ اس کی نظریں فوبس سے لپٹی ہوئی اس کی بیوی پر جمی ہوئی تھیں۔

فوبس کے اندر ٹوٹ پھوٹ سی ہو رہی تھی۔ بدقت اپنی کیفیت پر قابو پانے کے بعد بیوی کی لاش کو آڑ میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے ہونٹوں پر زخمی سی مسکراہٹ لا کر بولا "وہی پرانا مسئلہ ہے۔ اس کی لسیار نوشی نے تو میری زندگی عذاب کر رکھی ہے۔ پینے لگتی ہے تو اپنا ہوش تک نہیں رہتا۔ فٹ پاتھ سے اٹھا کر لا رہا ہوں۔ بستر پر لٹا دوں گا۔ نشہ اترے گا تو ٹھیک ہو جائے گی۔"

عورت نے تشویش اور ہمدردی کی ملی جلی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور کندھے اچکاتے ہوئے دروازہ بند کر لیا۔

فوبس لاش کو گھسیٹتا ہوا دوبارہ اپنے فلیٹ کے سامنے پہنچ گیا۔ ایک ہاتھ سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوتے ہی دھڑام سے دروازہ بند کر دیا۔ اس لمحہ اس پر عجیب سی جھنجھلاہٹ طاری تھی۔ وہ کچھ دیر تک لاش کو سنبھالے کھڑا رہا پھر تمام تر قوتیں مجتمع کر کے لاش کو سنبھالتا ہوا تیزی سے دوسرے دروازے سے نکل کر عقبی زینے کی طرف بڑھا۔ عمارت کے پیچھے کی طرف گندی گلی تھی۔ زینہ اترنے میں اس نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ لاش کو سنبھالے گندی اور سنسان گلی میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا موڑ گھوم کر اس جگہ پہنچ گیا جہاں اس کی کار کھڑی تھی۔ اس نے ٹٹول کر جیب سے چابی نکالی۔ ڈکی کھول کر لاش کو اندر ٹھونسا اور اسٹیئرنگ وہیل کے سامنے بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کر دیا۔ فلیٹ سے نکلنے کے تین منٹ بعد وہ پرسکون انداز میں گاڑی کو سڑک پر لے جا رہا تھا۔ اس خوفناک مشقت میں اس کی قمیض پسینے سے تر ہو رہی تھی۔ اعصاب میں اگرچہ اب بھی کشیدگی تھی لیکن وہ اپنے آپ میں ایک طمانیت سی محسوس کر رہا تھا۔ کار متوازن رفتار سے سڑک پر دوڑ رہی تھی اور اسے یقین تھا کہ وہ لیٹ ہوئے بغیر وقت پر اپنے کام پر پہنچ جائے گا۔

⊙

میرین ٹرمینل کے گیٹ پر کھڑے ہوئے محافظ کا اشارہ

پاکر فوبس نے کار روک لی۔ محافظ نے جھک کر کھڑکی سے اندر جھانکا اور پھر اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اوہ فوبس! اچھا ہوا تم پہنچ گئے۔ کاسٹر نے حکم دے رکھا ہے کہ اگر تم ایک منٹ کی تاخیر سے بھی پہنچو تو تمہیں گیٹ کے اندر داخل نہ ہونے دیا جائے۔''

فوبس نے محافظ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کار ایک طرف لگادی اور نیچے اتر کر سیکورٹی آفس میں داخل ہوگیا۔ بھاری بھرکم اور ٹھوس جسم کا مالک سیکورٹی آفیسر کاسٹر فائل کیبنٹ پر جھکا ہوا غالباً کوئی مخصوص فائل تلاش کررہا تھا۔ قدموں کی آواز سن کر وہ سیدھا ہوگیا۔ اس کی نظریں فوبس کے چہرے سے ٹکراتی ہوئی دیوار گیر کلاک کی طرف اٹھ گئیں۔ بارہ بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔

''گڈ! آج تو تم وقت پر پہنچ گئے۔'' سیکورٹی آفیسر کاسٹر دوبارہ فوبس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ویئر ہاؤس نمبر تین میں جاکر رولف سے چارج لے لو۔''

فوبس کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی آہنی پنجے نے اس کے پیٹ پر گرفت جمالی ہو۔ اس کے چہرے پر کرب و اذیت کے آثار ابھر آئے۔ ''کیا جیٹی نمبر تین پر؟'' وہ ضبط کرتے ہوئے بولا۔

''اگر میں نے تمہیں جیٹی پر بھیجنا ہوتا تو جیٹی کا نام لیتا۔'' کاسٹر نے اسے گھورا۔ ''ان گودیوں کو خالی کیا جارہا ہے جس جہاز کو آج دوپہر تک یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ اس کی ابھی تک کوئی اطلاع نہیں۔ چیف کو اوور ٹائم دے کر کام کروانا پڑ رہا ہے اور ایسے موقعوں پر چیف کا نزلہ ہمیشہ میرے اوپر ہی گرتا ہے۔'' کاسٹر نے ایک فائل کیبنٹ سے نکال کر میز پر پٹخ دی، اور سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''لعنت ہو ان جہازوں پر کبھی بھی مقررہ وقت پر نہیں پہنچتے۔ ایک پانچ گھنٹے لیٹ ہے دوسرے کو گزشتہ روز یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا جبکہ اس کی آمد کے ابھی کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے۔ تم یہاں کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو فوبس! چلو، اپنی ڈیوٹی سنبھالو اور یاد رکھنا میں تمہیں چیک کرنے کے لیے راؤنڈ پر آؤں گا۔''

فوبس نے بڑی عجلت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ڈریسنگ روم میں جاکر وردی پہنی، ریوالور والا بیلٹ کمر پر باندھا اور ٹارچ جیب میں ڈالتا ہوا باہر آگیا۔ پانچ منٹ بعد اس کی کار نیچی چھت والے اس لمبے ویئر ہاؤس کے گیٹ میں داخل ہوکر رک رہی تھی جہاں جہازوں پر لادا جانے والا سامان رکھا جاتا تھا یہاں سے گودی نمبر تین کا منظر بھی صاف نظر آرہا تھا جہاں ایک مال بردار جہاز لنگر انداز تھا۔ تیز روشنیوں نے جہاز اور گودی کے کچھ حصے کو بھی اپنے حلقے میں لے رکھا تھا۔ مزدور سامان کو جہاز پر لادنے میں مصروف تھے۔ بھاری کرینوں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

گودی نمبر تین کی طرف دیکھتے ہوئے فوبس سوچ رہا تھا کہ اگر وہ جہاز وہاں لنگر انداز نہ ہوتا تو گودی تاریک اور سنسان ہوتی۔ اگر اس کی ڈیوٹی وہاں ہوتی تو اسے آٹھ گھنٹے وہاں گزارنے پڑتے۔ گودی پر ڈیوٹی ہونے کی صورت میں اس کی کار ٹھیک پانی سے صرف چند گز کے فاصلے پر کھڑی ہوتی۔ رات کے پچھلے پہر وہ کار کی ڈکی سے اپنی بیوی کی لاش نکال کر اس کے ساتھ کچھ وزن باندھنے کے بعد اسے اس طرح زیرِ آب پہنچا دیتا کہ کوئی اسے دیکھنے والا بھی نہ ہوتا۔ لیکن اب گودی اس سے کئی سو گز دور تھی۔ مزدوروں کی سرگرمیوں کی وجہ سے وہاں جانا ممکن بھی نہیں تھا۔

فوبس نے مایوسانہ انداز میں سر ہلایا، کار کی ڈکی کا تالا چیک کیا اور گودام میں داخل ہوگیا۔

میز پر بیٹھے ہوئے ایک ادھیڑ آدمی نے سر پر رکھی پی کیپ کو پیچھے ہٹاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ ''آج پھر دیر سے پہنچے۔ کہاں رہ گئے تھے تم؟''

''کاسٹر نے روک لیا تھا۔ جانے سے پہلے کوئی خاص بات بتانا چاہتے ہو؟'' فوبس نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''نہیں، کوئی خاص بات نہیں۔ ریڈیو چل رہا ہے۔ صبح تک تمہارا وقت آسانی سے کٹ جائے گا۔ بہتر ہوگا کہ پہلے اپنا کارڈ پنچ کردو تاکہ کمپیوٹر کو تمہاری آمد کی اطلاع مل جائے۔'' اس شخص نے کہا جو رولف کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

فوبس نے جیب سے پلاسٹک کا ایک کارڈ نکال کر دیوار پر نصب ایک چھوٹے سے بکس کے سلاٹ میں ڈال دیا۔ بکس کی پیشانی پر سرخ روشنی کا ایک نقطہ چمک اٹھا لیکن سرخ روشنی فوراً ہی بجھ گئی۔ اس کی جگہ اب سبز رنگ کا ایک نقطہ روشن ہو گیا تھا۔ فوبس اب باقاعدہ ڈیوٹی پر تھا۔ کمپیوٹر نے اس کی آمد کا وقت نوٹ کرلیا تھا۔ اب اسے شیڈول کے مطابق مقررہ اوقات میں ویئر ہاؤس کی عمارت میں مختلف جگہوں پر ایسے ہی بوکسز میں کارڈ کو پنچ کرنا تھا۔ مختلف بوکسز میں کارڈ پنچ کرنے کا درمیانی وقفہ اتنا زیادہ نہیں تھا کہ وہ لاش کو کسی گودی پر لے جاکر اس سے نجات حاصل کرسکتا۔ اگر ایک بکس میں کارڈ پنچ کرنے کے بعد وہ لاش کو ٹھکانے لگانے چلا جاتا تو واپسی میں یقیناً دیر ہوجاتی جس کی کاسٹر کو اطلاع مل جاتی۔ کاسٹر کسی ایسے ہی موقع کی تاک میں تھا۔ وہ اسے فوراً ملازمت سے برطرف کردیتا۔

''میں جارہا ہوں۔'' رولف کی آواز سن کر وہ چونک گیا۔

اس نے سر کے اشارے سے اسے جانے کی اجازت دے دی۔ روڈلف نے اس کے قریب آتے ہوئے بات جاری رکھی۔" سنو فوبس! یہ ریڈیو کچھ خراب ہے۔ چلتے چلتے اچانک ہی بند ہو جاتا ہے۔ سنا ہے تم اچھے موسیقار بھی ہو۔ امید ہے تم اپنا کلارنٹ بھی ساتھ لائے ہو گے۔ اگر ریڈیو کسی وقت بند ہو جائے تو کلارنٹ سے دل بہلا لینا۔"

" ریڈیو کے شور سے تو اپنی موسیقی ہزار درجہ بہتر ہے۔" فوبس نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا اور ریوالور کا بیلٹ درست کرتا ہوا راؤنڈ پر چل دیا۔

چالیس منٹ بعد وہ اپنا پہلا گشت مکمل کر کے دوبارہ اسی جگہ میز کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس دوران اس کے ذہن میں کار کی ڈکی میں ٹھنسی ہوئی لاش کو ٹھکانے لگانے کے سوا اور کوئی بات نہیں آئی تھی۔ بیوی کو قتل کرتے وقت اسے کسی خیال نے پریشان نہیں کیا تھا۔ پھر جب وہ لاش کو فلیٹ سے نکال رہا تھا تو اس وقت بھی اسے کسی پریشانی کا سامنا نہیں تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ جس طرح آسانی سے ایک زندگی کا خاتمہ کر چکا ہے اسی طرح آسانی سے لاش سے بھی پیچھا چھڑا لے گا لیکن اب پہلی مرتبہ اس کے دل میں چھپا ہوا خوف ابھر کر سامنے آ رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ایک ایسے جال میں پھنسا ہوا محسوس کر رہا تھا جس سے فرار کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ لاش کو کار کی ڈکی میں ڈال کر ویئر ہاؤس میں داخل ہوتے وقت اسے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا لیکن اب لاش کو واپس لے جانا ممکن نہیں تھا۔ ڈیوٹی سے آف ہونے کے بعد باہر جاتے ہوئے کار کی تلاشی لی جا سکتی تھی اور ظاہر ہے وہ ڈکی میں ٹھنسی ہوئی لاش کو کسی کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں رکھ سکتا تھا۔

اگلے چند گھنٹے اس کے لیے بڑے اذیت ناک ثابت ہوئے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ اس امید پر گودی نمبر تین کی طرف دیکھنے لگتا کہ ممکن ہے جہاز پر لوڈنگ کا کام مکمل ہو چکا ہو اور اسے لاش ٹھکانے لگانے کا موقع مل جائے۔ گودام سے ڈیک نمبر تین کا فاصلہ چند سو گز سے زیادہ نہیں تھا۔ وہ اگر حاضر دماغی اور پھرتی سے کام لے تو گشت کے دوران اس بوجھ سے نجات حاصل کر سکتا تھا لیکن جہاز پر بار برداری کا کام جاری تھا اور جہاز کے صبح سے پہلے ڈیک چھوڑنے کی کوئی امید نظر نہیں آتی تھی۔

اسے ڈیوٹی کے آٹھ گھنٹے گزارنے تھے۔ اس دوران لاش سے نجات حاصل کرنے کے ساتھ اس بات کا بھی خیال رکھنا تھا کہ اوقاتِ کار میں کاسٹر کو شکایت کا کوئی معمولی سا موقع بھی نہ ملے بصورتِ دیگر اسے ملازمت سے بھی ہاتھ دھونے پڑتے۔ یہ خیال بھی اس کے ذہن کو الجھائے ہوئے تھا کہ ڈیوٹی ختم کر کے صبح جب گھر پہنچے گا تو وہاں نہ جانے کن حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ ایک طرف کھڑا الجھی ہوئی نگاہوں سے ڈیک نمبر تین کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اس کی نظریں گیٹ کی طرف اٹھ گئیں۔ کاسٹر کی جیپ موڑ گھوم کر ویئر ہاؤس کی طرف آ رہی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے ہٹ کر تیزی سے میز کی طرف آ گیا۔

صبح چار بجے گشت کے دوران اس پر مردنی سی طاری تھی اعصاب بری طرح چٹخ رہے تھے۔ جبڑے اس سختی سے بھینچے ہوئے تھے کہ اس کے دانت دکھنے لگے۔ اندر سے ابھرنے والی وہ آواز جس نے فلیٹ میں اسے لاش اپنے ساتھ لے جانے کا مشورہ دیا تھا اب اسے تنہا چھوڑ کر نجانے کن گہرائیوں میں جا چھپی تھی۔ وہ اپنے اندر کی آواز اور اپنے مقدر کو گالیاں دینے لگا جس نے اسے مصیبت میں پھنسا دیا تھا۔ فلیٹ سے لاش نکالتے ہوئے اس کے ذہن میں شائبہ تک نہیں تھا کہ اس کی ڈیوٹی کسی ڈیک کی بجائے گودام میں لگا دی جائے گی اور قریب ترین ڈیک پر کوئی ایسا جہاز لنگر انداز ہوگا جس پر لوڈنگ ہو رہی ہوگی۔

گشت ختم کرنے کے بعد میز پر بیٹھتے ہوئے اس نے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ گودام کی خاموشی اس کے اعصاب پر مسلط ہو رہی تھی۔ کبھی کبھی کسی ٹگ بوٹ یا جہاز کے سائرن کی آواز فضا میں گونجتی تو وہ اس طرح چونک جاتا جیسے قریب ہی بم پھٹا ہو۔ وہ اس وقت بھی اپنے آپ کو یہ باور کرانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو قتل نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے یہ الفاظ اپنا مفہوم کھو چکے تھے۔ دنیا کا کوئی بھی شخص اس کی بات پر یقین نہیں کرے گا۔ اسے اپنے آپ پر بڑی شدت سے تاؤ آ رہا تھا کہ وہ برسوں سے سب کچھ برداشت کرتا چلا آ رہا تھا۔ صرف ایک لمحے کے لیے اشتعال میں آ کر اس نے اپنے لیے اس سے بڑی مصیبتیں پیدا کر لی تھیں اور وہی ایک لمحہ اس کے لیے عذاب بن کر رہ گیا تھا۔

اس نے اٹھ کر دیوار میں نصب کمپیوٹر میں کارڈ پنچ کیا۔ اس کی یہ کارروائی شیڈول کے مطابق تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ کمپیوٹر کی پیشانی پر جلنے والی سبز روشنی اس سے ہمدردی کا اظہار کر رہی ہو۔ وہ ایک بار پھر صورتِ حال کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے تو صرف ایک قتل کیا تھا اور مصیبت میں پھنس گیا تھا جبکہ لوگ اس سے بڑے بڑے جرم کر کے صاف بچ نکلتے ہیں۔ وہ اپنے مقدر کو کوسنے لگا جو ہمیشہ اس پر نامہربان رہا تھا۔

وہ سر جھٹکتا ہوا اٹھ کر ایک بار پھر گشت پر چل دیا۔ گودام کے آخری سرے پر پہنچ کر وہ اس سامان کا جائزہ لینے لگا جو مختلف

منزلوں کے لیے مختلف جہازوں پر بار کرنے کے لیے یہاں رکھا گیا تھا۔ اس میں چھوٹی بڑی لکڑی کی پیٹیاں، بوریاں اور اسی قسم کی چیزیں شامل تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ یہ سامان اگلے دن کسی جہاز میں لوڈ کیا جائے گا اور اس میں بہت سا سامان ایسا بھی تھا جو اس سے اگلے دن یا مزید تین چار دن بعد آنے والے کسی جہاز پر لوڈ کیا جانا تھا۔ اچانک ہی اس کے ذہن میں خیال آیا کہ جب تک متعلقہ جہاز ڈیک پر لنگر انداز نہیں ہوگا اس وقت تک کوئی اس سامان کی طرف توجہ بھی نہیں دے گا۔ سامان کی طرف دیکھتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ لاش کو اس سامان میں کسی جگہ چھپا دے تو کم از کم آئندہ چوبیس گھنٹوں تک اس الجھن سے نجات مل جائے گی اور صبح ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد گھر جاتے ہوئے گیٹ پر کار کی تلاشی کے دوران بھی اسے کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔

گشت ختم کرتے ہی وہ ایک بار پھر گودام کے آخری سرے پر پہنچ گیا اور ٹارچ کی روشنی میں وہاں بے ترتیب رکھے ہوئے سامان کا جائزہ لینے لگا۔ ٹارچ کی روشنی مختلف چیزوں پر حرکت کر رہی تھی۔ اس کے ذہن میں ابھی تک یہ واضح نہیں ہو سکا تھا کہ وہ چاہتا کیا تھا اور اسے کس چیز کی تلاش تھی۔ چند قدم آگے بڑھنے کے بعد وہ واپس مڑا اور اس جگہ رک گیا جہاں لکڑی کے تین لمبے لمبے بکس پڑے ہوئے تھے۔ ہر بکس تقریباً چھ فٹ لمبا اور چوڑائی اور اونچائی میں دو فٹ کے قریب تھا۔ اٹھانے رکھنے میں ایک بکس غالباً زور سے گرا ہوگا جس سے ایک کونے کی لکڑی ٹوٹ گئی تھی اور وہاں ایک خلا سا نظر آ رہا تھا۔

فوبس متجسس نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ یہ تینوں پیٹیاں گودام کے پچھلے حصے میں پڑی ہوئی تھیں جس کا مطلب تھا کہ انہیں کئی دن تک یہیں پڑے رہنا تھا۔ اگر انہیں ایک دو دن میں کسی جہاز پر لوڈ کیا جانا مقصود ہوتا تو گودام کے آخری حصے کی بجائے آگے رکھا جاتا۔

اگلے راؤنڈ میں وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ان لمبی پیٹیوں کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ چند لمحے ٹارچ کی روشنی میں جائزہ لیتا رہا پھر پیٹی میں جھک کر لوہے کی ایک سلاخ سے ٹوٹی ہوئی پیٹی کا ڈھکنا کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ ٹارچ کی روشنی پیٹی کے اندر رکھے ہوئے اس سلنڈر پر رینگ رہی تھی جو ربڑ کے کور میں لپٹا ہوا تھا۔ اس کا محیط تقریباً پندرہ انچ اور لمبائی پانچ فٹ کے قریب تھی۔ فوبس نہیں سمجھ سکا تھا کہ یہ کس قسم کا سلنڈر تھا۔ وہ سلنڈر کے گرد لپٹے ہوئے چمڑے کے بند کھولنے لگا۔ سلنڈر اٹھاتے ہوئے اسے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ حجم کے برعکس وہ وزن میں بہت ہلکا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس کے دل کی دھڑکن شدت

اختیار کر گئی تھی۔ اس نے سلنڈر اٹھا کر کندھے پر لادا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گودام کے بالکل آخری حصے میں پہنچ گیا جہاں کئی کئی روز تک رکا رہنے والا سامان پڑا ہوا تھا۔ اس نے سلنڈر پیٹیوں کے ڈھیر میں خالی جگہ پر رکھ دیا۔

اس سے اگلے راؤنڈ پر جب وہ ڈیک نمبر تین کے سامنے والے رخ پر آیا تو ایک بار پھر محتاط نگاہوں سے اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ جہاز اب بھی ڈیک پر موجود تھا۔ لیکن ڈیک کی بعض بتیاں بجھ چکی تھیں اور بہت سے مزدور جا چکے تھے۔ اس نے ایک بار پھر اطراف کا جائزہ لیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس طرف بڑھ گیا جہاں اس کی کار کھڑی تھی۔ اس وقت رات کی تاریکی رخصت ہو رہی تھی اور صبح کا ملگجا سا اجالا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ اس نے لاش ڈکی سے نکال کر کندھے پر لادی اور دوبارہ اس جگہ پہنچ گیا۔ بڑی احتیاط سے لاش کو بکس میں ڈالا اور ڈھکنا برابر کر کے پہلے کی طرح کیلیں جڑ دیں۔

"کل رات۔" فوبس نے سیدھا ہوتے ہوئے سوچا۔ "کل رات میں لاش کو سمندر کی تہہ میں پہنچا دوں گا اور پھر ہمیشہ کے لیے نجات۔"

اس کی آنکھ کھلی تو سہ پہر ہو چکی تھی۔ وہ اٹھنے کی بجائے بستر پر بے سدھ سا لیٹا گزشتہ رات کے واقعات پر غور کرنے لگا۔ وہ ایک بھیانک خواب تھا جو بیت گیا تھا۔ جسم میں سنسنی کی لہروں کے بجائے اس وقت پیٹ میں آگ سی بھڑکتی ہوئی محسوس ہوئی تب ہی اسے خیال آیا کہ گزشتہ چھتیس گھنٹوں سے اس نے کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔

وہ اٹھ کر باتھ روم میں گھس گیا۔ چہرے پر ہاتھ پھیرنے سے احساس ہوا کہ ابھی اسے شیو بھی بنانا تھا۔ کاسٹر ایسی باتوں کا بہت خیال رکھتا تھا خصوصاً اس کے معاملے میں تو وہ بہت کینہ پرور واقع ہوا تھا۔ کاسٹر کا خیال تھا کہ ڈیوٹی پر آنے سے پہلے ہر شخص کو مستعد اور اسمارٹ ہونا چاہیے۔ اگر وہ بڑھے ہوئے شیو کے ساتھ ڈیوٹی پر گیا تو کاسٹر اسے دیکھتے ہی ڈسچارج سلپ اس کے ہاتھ میں تھما دے گا جبکہ فی الحال وہ اپنی اس ملازمت سے ہاتھ نہیں دھونا چاہتا تھا۔ ملازمت سے جواب ملنے پر چند روز تک وہ اپنی جمع پونجی پر گزارہ کر سکتا تھا لیکن اس کے بعد وہ کیا کرے گا۔ اسے تو کسی دوسری جگہ ملازمت ملنے کی توقع بھی نہیں تھی۔

فلیٹ کے دروازے سے باہر نکلتے ہی اس عورت سے سامنا ہو گیا جو گزشتہ رات بھی اس کے راستے میں آ گئی تھی۔

"کیسی ہے تمہاری بیوی؟" عورت نے ہاتھ سے روکنے کا

اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"میرا خیال ہے ٹھیک ہی ہوگی۔" فوبس نے رکتے ہوئے جواب دیا۔

"ہوگی کا کیا مطلب ہے؟ کیا تمہیں معلوم نہیں؟" عورت نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"گزشتہ رات میں اسے بستر پر لٹا کر کام پر چلا گیا تھا۔ آج صبح جب واپس آیا تو وہ موجود نہیں تھی۔ کہیں چلی گئی ہوگی۔"

"لیکن اس کی حالت ایسی تو نہیں تھی کہ کہیں جا سکتی۔" عورت اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔

فوبس کندھے اچکا کر رہ گیا۔ وہ نظریں چراتے ہوئے بولا۔ "کیا کہہ سکتا ہوں۔ وہ پہلے بھی کئی مرتبہ ایسی حرکتیں کر چکی ہے۔"

"میں پاس پڑوس میں دیکھتی ہوں۔ شاید وہ کسی جاننے والے کے گھر بیٹھی ہو۔"

"کوئی ضرورت نہیں۔ وہ دو چار دن سے زیادہ کہیں نہیں رہے گی۔ خود ہی لوٹ آئے گی۔"

"شاید میں تمہاری یا اس کی کوئی مدد کر سکوں۔" عورت نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"نہیں، اسے اب کسی کی مدد کی ضرورت نہیں رہی۔" فوبس نے نفی میں سر ہلا دیا اور ہاتھ جھلاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اسے عورت کی نظریں اپنی پشت پر چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اگر وہ عورت کو مزید کرید کا موقع دیتا تو وہ یقیناً شبہات میں مبتلا ہو سکتی تھی۔ جبکہ وہ کسی کو اپنی بیوی کے بارے میں شبہ کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔

آج جب وہ وقت سے تقریباً دس منٹ پہلے میرین ٹرمینل کے گیٹ پر پہنچ گیا تو گیٹ کا سیکیورٹی گارڈ اسے دیکھ کر مسکرا دیا۔

"تمہاری ملازمت کی تاریخ کا یہ دوسرا موقع ہے کہ کسی تاخیر کے بغیر تم ڈیوٹی پر آئے ہو۔ تم نے شاید کاسٹر کو شکایت کا موقع نہ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"ہاں۔" فوبس بھی جواب میں مسکرا دیا۔ "میرا خیال ہے کاسٹر خوش ہو کر مجھے جیب پٹرول کی ڈیوٹی دے دیگا۔"

چند سیکنڈ بعد جب وہ سیکیورٹی آفس میں داخل ہوا تو اسے دیکھ کر کاسٹر نے بھی پسندیدگی کے انداز میں سر کو حرکت دی۔ "میاں! ڈریسنگ روم کی بجائے سیدھے ویئر ہاؤس چلے جاؤ۔" وہ بولا۔

"ٹھیک ہے۔" فوبس دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے بولا۔ "کیا وہاں برتھ پر کوئی لوڈنگ ہو رہی ہے؟"

"نہیں، تمہیں آج بھی رولف کی جگہ کام کرنا ہے۔"

"میرا خیال ہے لیٹ ہونے والا جہاز بھی پہنچ گیا ہوگا۔" فوبس بولا۔

"یہ تمہیں جہازوں کی آمد و رفت سے کب سے دلچسپی ہو گئی ہے؟" کاسٹر نے اسے گھورا۔

"میں تو بس یونہی پوچھ رہا تھا۔" فوبس کہتا ہوا ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ گیا لیکن کاسٹر کی آواز سنتے ہی رک گیا۔ کاسٹر کے لہجے میں کچھ ایسی کاٹ تھی کہ فوبس چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"ایک اہم مسئلہ پر تم سے بات کرنا چاہتا ہوں، خیر بعد میں کسی وقت دیکھا جائے گا۔" کاسٹر نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ایک لمحہ کو فوبس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس کے ذہن میں خیال ابھر آیا کہ کاسٹر اس کے کسی راز سے آگاہ ہو چکا ہے، لیکن پھر اس نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ اگر کاسٹر کو کسی بات کا علم ہوتا تو وہ اسے دفتر سے باہر نکلنے کی اجازت نہ دیتا۔ وہ یونیفارم تبدیل کر کے لاپروائی کا اظہار کرتا ہوا دفتر سے باہر نکل گیا۔

گودام کی طرف جاتے ہوئے اس کے چہرے پر ایک بار پھر سنجیدگی طاری ہو چکی تھی۔ اس نے گودی ملازمین کی طرف دیکھا۔ ڈیک خالی تھا۔ اسے کاسٹر کی اس دھمکی کی بھی اب پرواہ نہیں تھی کہ وہ کسی وقت آکر اس سے بات کرے گا۔ اگر صورت حال نے اس کا ساتھ دیا تو وہ لاش کو پیٹی میں سے نکال کر کار کی ڈگی میں بند کر کے ڈیک پر لے جائے گا اور لاش کو پانی کے سپرد کر کے واپس آجائے گا۔ اسے زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ یہ کام وہ گودام کے راؤنڈ کے دوران بھی کر سکتا تھا۔ اس کے لئے رات کے پچھلے پہر دو اور تین بجے کا درمیانی وقت مناسب تھا۔ اس وقت سوائے کاسٹر کے کسی اور کے اس طرف آنے کا امکان نہیں تھا۔ اس میں اگرچہ خطرہ تو تھا لیکن خطرہ مول لئے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اسے آج رات ہر صورت میں لاش سے نجات حاصل کرنا تھی۔

جب وہ کار سے اتر کر گودام میں پہنچا تو رولف نے شکن آلود پیشانی کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ "تم پھر لیٹ پہنچے ہو۔" وہ ناگوار لہجے میں بولا۔

"سیکورٹی روم میں تو میں وقت سے پہلے پہنچ گیا تھا لیکن کاسٹر نے روک لیا تھا۔" فولبس نے جواب دیا۔

"میرا خیال ہے وہ تم سے سلنڈر کے بارے میں پوچھ رہا ہوگا۔"

"کیسا سلنڈر؟" فولبس کا دل یکبارگی دھڑک اٹھا۔

"وہ جو سامنے پڑا ہے۔" رولف نے ایک طرف اشارہ کیا۔

فولبس کی نظریں اشارے کی سمت اٹھ گئیں۔ نیم تاریک جگہ پر ربر کے کور میں لپٹا ہوا وہ سلنڈر نظر آرہا تھا جسے گذشتہ رات فولبس نے پیٹی سے نکال کر گودام کے پچھلے حصے میں سامان کے ڈھیر میں چھپایا تھا۔ اس نے ہاتھوں کی کپکپاہٹ چھپانے کے لئے دونوں انگوٹھے پتلون کی بیلٹ میں اڑس لئے اور لہجے کو پرسکون بنانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "نہیں! اس نے اس سلسلے میں مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔"

"کاسٹر کا بھی دماغ خراب ہو گیا ہے۔ ہر بات کی ذمہ داری ہم پر لادنے کی کوشش کرتا ہے۔ اب پتہ نہیں یہ سلنڈر کہاں سے آیا ہے اور اس کا تعلق کونسی شپ منٹ سے ہے۔ کوئی ٹوٹی ہوئی پیٹی بھی نظر نہیں آئی۔ بہرحال جب تک کوئی شکایت موصول نہیں ہوتی اس وقت تک یہ سلنڈر ہمارے لئے مسئلہ بنا رہے گا۔" رولف نے سر ہلاتے ہوئے کہا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "یہ سلنڈر گودام کے پچھلے حصے میں اس سامان میں پڑا تھا جسے آج دن میں لوڈ کیا جانا تھا مگر غلطی سے پیچھے ڈال دیا گیا تھا۔ کاسٹر کا خیال ہے کہ کسی نے یہ سلنڈر کسی پیٹی سے نکال کر قصداً وہاں چھپایا تھا تاکہ بعد میں لے جایا جا سکے لیکن کیوں؟ ہم میں سے کسی کو تو یہ بھی علم نہیں کہ یہ ہے کیا اور اس کی کیا قدر و قیمت ہو سکتی ہے۔" رولف دروازے کی طرف بڑھتا ہوا مڑا پھر بولا۔ "کاسٹر نے اگر ابھی تک اس سلسلے میں تم سے کچھ نہیں پوچھا تو اس کا مطلب ہے کہ وہ کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتا ہے۔ بہرحال، پریشان ہونے کی بات نہیں ہے۔"

رولف کے جانے کے بعد فولبس سلنڈر کو گھورنے لگا۔ اسے قسمت کی اس ستم ظریفی پر رونا آرہا تھا۔ اس نے سلنڈر کو ایسی جگہ چھپانے کی کوشش کی تھی جہاں سے کم از کم ایک ہفتہ تک اس کے برآمد ہونے کی توقع نہیں تھی لیکن مقدر کو بھی شاید اس سے کچھ ضد سی ہو گئی تھی۔ گودام کے پچھلے حصے میں پڑے ہوئے اس سامان کو بھی آج ہی جانا تھا۔ اس نئی صورت حال نے اس کے لئے ایک بار پھر بہت سی الجھنیں پیدا کر دی تھیں۔ اس کا حلق خشک ہونے لگا۔ اس نے کمپیوٹر بکس میں اپنا کارڈ پنچ کیا اور پہلے راؤنڈ کے لئے روانہ ہو گیا۔ سب سے پہلے اسے گودام کے سامنے والے حصے کو چیک کرنا تھا۔ وہ دوڑتا ہوا اس طرف پہنچا اور پھر اس طرح رک گیا جیسے کسی ان دیکھی دیوار نے اس کا راستہ روک لیا ہو۔ وہ جگہ جہاں گذشتہ شب لمبی پیٹیاں موجود تھیں اب صاف نظر آرہی تھی۔

چند لمحے وہ سکتے کی کیفیت میں بے حس و حرکت کھڑا رہا پھر ایک دم اس طرح حرکت میں آگیا جیسے روبوٹ کا سوئچ آن کر دیا گیا ہو۔ وہ ادھر ادھر دوڑتا ہوا ٹارچ کی روشنی میں مختلف جگہوں پر پڑے ہوئے سامان کو دیکھنے لگا۔ اس کی نظریں لکڑی کی ان لمبی پیٹیوں کو تلاش کر رہی تھیں جو اس کے خیال میں وہاں سے اٹھا کر کسی دوسری جگہ پر رکھ دی گئی ہوں گی لیکن پورے گودام میں ان پیٹیوں کا نام و نشان تک نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ آج دن میں کوئی جہاز آیا ہوگا اور وہ سامان اس میں لاد دیا گیا تھا جس کی ایک پیٹی میں اس کی بیوی کی لاش بھی تھی جو اب کسی انجانی منزل کی طرف جا رہی ہوگی۔

وہ کچھ دیر تک اسی طرح بیٹھا رہا پھر اٹھ کر اپنا راؤنڈ مکمل کرنے لگا۔ اس کے قدم من من کے بھاری ہو رہے تھے۔ دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ راؤنڈ مکمل کر کے واپس آیا تو چند ہی منٹ بعد کاسٹر بھی پہنچ گیا۔ "کیا بات ہے۔ شاید تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں؟" کاسٹر اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔

"نہیں میں ٹھیک ہوں۔" فولبس نے سر ہلایا۔

"ٹھیک ہی رہو تو بہتر ہے۔ تمہاری جگہ لینے کے لئے میرے

پاس اور کوئی آدمی نہیں ہے۔"

"میں نے کہا نا کہ میں ٹھیک ہوں۔ تم کیوں پریشان ہو رہے ہو؟" فولبس نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

"کیا اس سلنڈر کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟" کاسٹر نے سلنڈر کی طرف اشارہ کیا۔

"رولف نے ذکر کیا تھا۔ میں اس کے بارے میں کیا جان سکتا ہوں لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ پہلے بھی کئی مرتبہ ایسا ہو چکا ہے جہازوں پر لادی جانے والی بعض چیزوں کا ادھر ادھر ہو جانا کوئی غیر معمولی بات تو نہیں۔"

"لیکن میرے لئے یہ کوئی معمولی بات بھی نہیں۔ سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سلنڈر کہاں سے آیا۔ اگر یہ کسی شپمنٹ کا حصہ ہے تو یقیناً کسی پیٹی میں ہوگا۔ پیٹی کہاں گئی؟"

"ممکن ہے پیٹی کو جہاز میں لاد دیا گیا ہو اور سلنڈر یہاں رہ گیا ہو۔" فولبس نے توجیہہ پیش کی۔ "یا کوئی شخص خالی پیٹی چرا کر لے گیا ہو۔"

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں؟" کاسٹر نے اسے گھورا۔ "کوئی خالی پیٹی کیوں چرانے لگا۔ پھر سوال یہ ہے کہ یہاں سے کوئی سامان باہر کیسے لے جایا گیا ہوگا۔"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ مجھے اس سلسلے میں کچھ علم نہیں۔" فولبس نے لاپرواہی سے کندھے اچکائے۔

"کسی نہ کسی کو تو علم ہونا ہی چاہئیے۔" کاسٹر نے اسے گھورا۔ "اگر یہ سلنڈر اس سامان کا حصہ تھا جسے آج دن میں گولڈن ڈولفن پر لادا گیا تھا تو زیادہ سے زیادہ دو ہفتے میں اطلاع مل جائے گی اس سامان کی منزل آئیلینڈز زیادہ دور نہیں۔"

فولبس کی آنکھوں میں الجھن تیر گئی۔ اتنا بہرحال اسے پتہ چل گیا تھا کہ اس کی بیوی کی لاش گولڈن ڈولفن نامی جہاز پر سفر کر رہی تھی۔ منزل پر پہنچنے کے بعد جیسے ہی پیٹیاں کھلیں گی انہیں لاش کا پتہ چل جائے گا اور کاسٹر کو بھی اطلاع مل جائے گی۔ اس نے سختی سے دانت بھینچ لئے۔ وہ چند لمحے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا پھر اپنی بات دہراتے ہوئے بولا۔

"مجھے اس سلسلہ میں کچھ علم نہیں میں کیا بتا سکتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے یہ کوئی ایسی بات نہیں جو چھپی رہ سکے۔ جلد یا بدیر پتہ چل ہی جائے گا۔" کاسٹر کہتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

فولبس بھی دروازے میں کھڑا ہو کر اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس وقت اچانک ہی بارش شروع ہو گئی۔ فولبس وہیں کھڑا سوچنے لگا کہ لاش کتنے عرصہ تک چھپی رہ سکتی تھی۔

✿
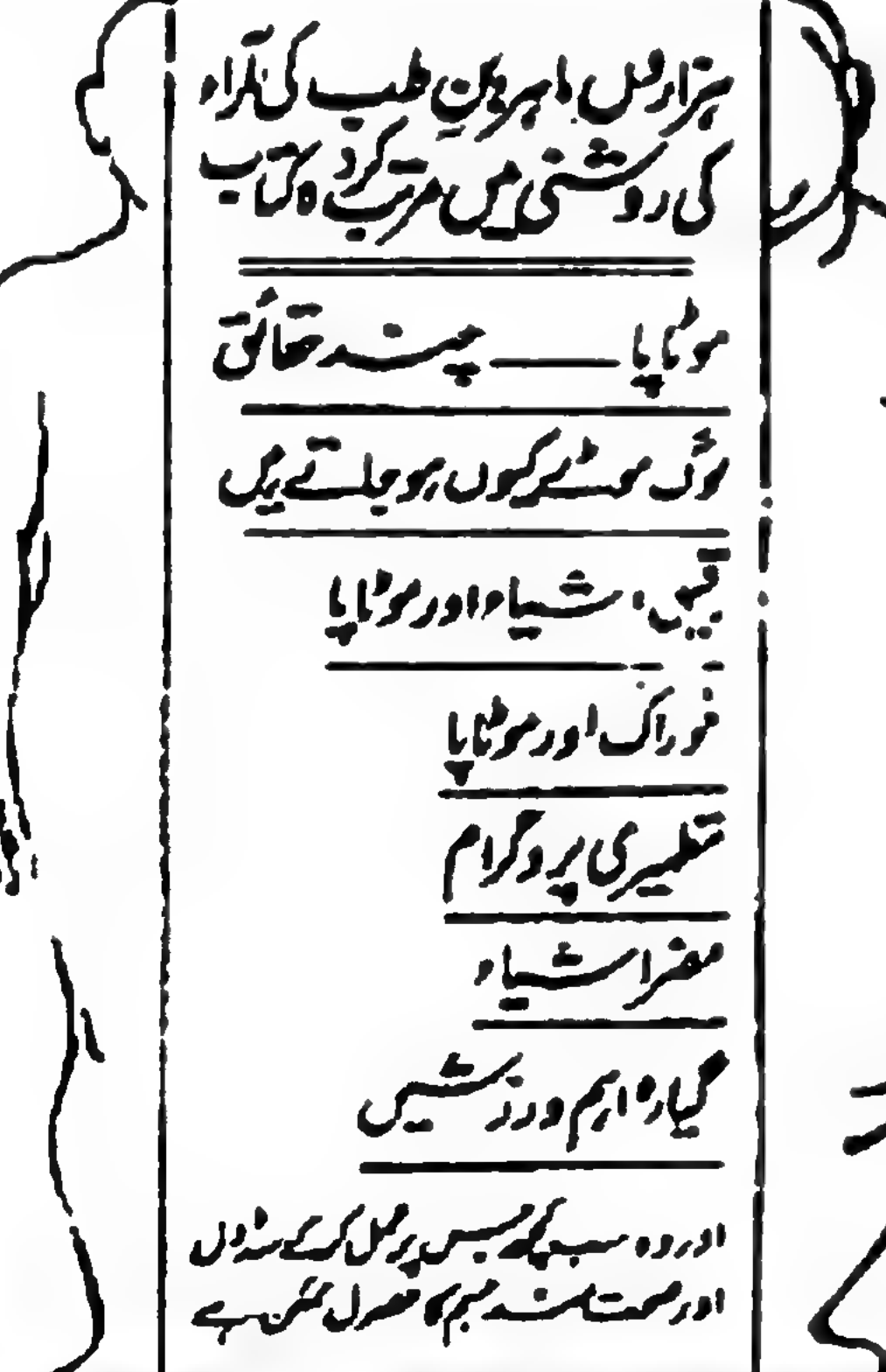
وہ اپنے بستر پر چت لیٹا بے مقصد تکا ہوا سا چھت کو گھور رہا تھا۔ دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے ہوئے تھے۔ وہ اگرچہ رات بھر جاگتا رہا تھا لیکن اس وقت آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہیں تھا۔ باہر اب بھی موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ کھڑکی کے شیشوں پر پانی اس طرح بہہ رہا تھا جیسے بالٹیاں انڈیلی جا رہی ہوں۔ فولبس چھت کو گھورتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ سفر کے دوران تو شاید پیٹی میں لاش کا انکشاف نہ ہو سکے لیکن جہاز کے کسی بندرگاہ پر لنگر انداز ہونے کے بعد یہ بات چھپی نہ رہ سکے گی کہ سامان میں ایک لاش بھی سفر کر رہی تھی۔ لاش کو فوراً واپس بھیج دیا جائے گا۔ یہاں اس کی شناخت زیادہ مشکل ثابت نہ ہوگی اور پھر کاسٹر کے لئے یہ نتیجہ اخذ کرنا بھی دشوار نہ ہوگا کہ اس سلنڈر کی خالی پیٹی کہاں گئی تھی۔ اس انکشاف کے بعد پولیس کا اس تک پہنچنا بھی زیادہ مشکل نہ ہوگا۔

سہ پہر کے وقت فلیٹ کے دروازے پر دستک کی آواز سن کر اس کا دل اچھل پڑا۔ پھر دروازہ کھولتے ہی سامنے کھڑے ہوئے دو آدمیوں کے چہروں پر نظر پڑتے ہی وہ سمجھ گیا کہ اس کی آزادی کے آخری لمحات آن پہنچے ہیں۔ ان کے بیج دیکھے بغیر ہی فولبس سمجھ گیا تھا کہ ان دونوں کا تعلق پولیس سے ہے۔

"میرا نام واسکی ہے۔" ان میں سے لمبے قد والا اپنا شناختی کارڈ نکالتے ہوئے بولا۔ "اور یہ سلیوان ہیں۔ ہم اس زحمت کے لئے معذرت خواہ ہیں لیکن ہمارے فرائض ہی ایسے ہیں جب کوئی کسی بارے میں رپورٹ کرتا ہے تو ہمیں معاملے کی تحقیقات کرنی ہی پڑتی ہے۔"

ولبس خاموشی سے ان کے چہروں کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ کچھ کہنے کی کوشش بھی کرتا تو شاید زبان ساتھ نہ دیتی۔ لمبے قد والا سرگرساں بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "تمہارے سامنے کے فلیٹ میں رہنے والی عورت نے اطلاع دی تھی کہ تمہاری بیوی لاپتہ ہے۔ اس کے بیان کے مطابق وہ اپنے طور پر پورے محلے میں پوچھ گچھ کر چکی ہے لیکن کسی نے گذشتہ دو دن سے تمہاری بیوی کو نہیں دیکھا۔"

"میری بیوی..." ولبس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کچھ کہنا چاہا مگر واسکی نے اس کی بات کاٹ دی۔

"سنو مسٹر ولبس!" وہ نرم لہجے میں بولا۔ "ہم سمجھ چکے ہیں کہ تمہاری بیوی کس قسم کی عورت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ چلی گئی ہوگی اور دو چار دن میں واپس آجائے گی۔ ہم صرف یہ کہنے کے لئے یہاں آئے ہیں کہ جب تمہاری بیوی واپس آجائے تو ہمیں اطلاع کر دینا تاکہ ہم کیس کو ختم کر دیں۔ ٹھیک ہے؟"

ولبس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور سلیوان کی طرف دیکھنے لگا جو کمرے میں داخل ہو کر گہری نظروں سے ہر چیز کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک دیکھ کر ولبس کو یہ اندازہ لگانے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی کہ دراصل ایسے ہی لوگ گڑے مردے اکھاڑ پھینکا کرتے ہیں۔ وہ ایک بار پھر واسکی کی طرف متوجہ ہوگیا۔ وہ اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "ہم تمہیں زیادہ پریشان نہیں کریں گے۔ اپنے کیپٹن کو مطمئن کرنے کے لئے پڑوسیوں سے دو چار باتیں معلوم کر کے واپس چلے جائیں گے۔ میرا ایک کزن بھی بیوی کے معاملے میں کچھ ایسے ہی مسائل سے دوچار ہے۔ میں تمہارے جذبات کو سمجھ سکتا ہوں مسٹر ولبس!"

ان کے جانے کے بعد ولبس پلنگ کی پٹی پر بیٹھ کر سوچنے لگا۔ اس کی بیوی کی لاش بحری جہاز میں سفر کر رہی تھی اور یہاں بھی معاملہ اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اسے اپنی تقدیر پر رونا آرہا تھا۔ افسوس تو اس بات کا تھا کہ حالات کبھی بھی اس کے موافق نہیں رہے تھے۔ لیکن اب تو تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ بیٹھ کر نتائج کا انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ اس کے سامنے بچاؤ کا صرف ایک راستہ تھا، فرار! لیکن وہ بھاگ کر کہاں جائے گا؟ بالفرض وہ کہیں بھاگ بھی جائے تو پیسہ کہاں سے آئے گا؟ اس کی بیوی تو گھر میں اس طرح جھاڑو پھیر چکی تھی کہ ڈھونڈنے سے ایک پائی بھی نہ ملتی۔

رات کو جب وہ ڈیوٹی پر جانے کے لئے گھر سے نکلا تو اس وقت بھی ہلکا ہلکا پانی برس رہا تھا۔ اگر عام حالات ہوتے تو شاید وہ چھٹی کر لیتا لیکن ایسی نازک صورت حال میں اس کے لئے چھٹی کرنا مناسب نہیں تھا۔ وہ مشینی انداز میں کار چلاتا ہوا فیکٹری پہنچ گیا۔ کاسٹر اس وقت موجود نہیں تھا۔ ولبس نے دیوار پر آویزاں اس بورڈ کی طرف دیکھا جس پر ملازمین کے نام اور ان کے ڈیوٹی لکھے ہوئے تھے۔ اس بورڈ کے مطابق ولبس کو آج رات بھی گودام میں رولف کی جگہ سنبھالنی تھی۔ وہ یونیفارم تبدیل کر کے گودام کی طرف روانہ ہوگیا۔ رولف اس کا منتظر بیٹھا تھا۔ "میں نے تیس ڈالر کا ایک نیا ریڈیو خریدا ہے۔ وہ پرانا ریڈیو تو کسی کام کا نہیں رہا۔ اگر تم چاہو تو آدھے پیسوں میں تم ریڈیو کے حصے دار بن سکتے ہو۔ پیسے تنخواہ پر دے دینا۔ کیا خیال ہے؟" رولف نے کہا۔

ولبس نے زبان کو حرکت دینے کی بجائے آمادگی کے انداز میں سر ہلا دیا۔ اس کی نظریں دیوار کے قریب پڑے ہوئے سلنڈر پر جمی ہوئی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے سلنڈر غائب ہوگیا۔ اب وہاں اپنی بیوی کی لاش نظر آرہی تھی۔ اس نے جلدی سے آنکھیں ملیں۔ لاش کا خوفناک تصور اگرچہ غائب ہوگیا لیکن اسے بڑی شدت سے احساس ہونے لگا جیسے اس کی بیوی آس پاس ہی کہیں موجود ہو۔

"شاید تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں؟" رولف نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ولبس نے ایک بار پھر سر ہلا دیا۔ رولف برساتی پہنتے ہوئے بولا۔ "یہ بارش تو مسئلہ بن چکی ہے۔ سوچ رہا ہوں گھر کس طرح پہنچوں گا۔ میری بیوی نے آج کھانے میں ایک خاص ڈش تیار کرنے کو کہا تھا۔ وہ بیچاری میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ وہ میرے بغیر کھانا نہیں کھاتی۔"

ولبس نے اس مرتبہ بھی سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔ رولف چلا گیا۔ دروازہ کھلنے سے سرد ہوا کا ایک تند و تیز جھونکا اندر در آیا۔ ولبس کپکپا کر رہ گیا۔ اس کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ ایک انجانا سا خوف دماغ پر مسلط ہوا جا رہا تھا۔ کئی مرتبہ گشت کے بعد جب وہ میز پر آکر بیٹھا تو اس نے ریوالور نکال کر اپنے سامنے رکھ لیا اور کتنی دیر تک اسے گھورتا رہا لیکن کوئی فیصلہ نہیں کر پایا۔

اگلے راؤنڈ کے بعد جب وہ واپس آیا تو اس نے غیر ارادی طور پر ریڈیو کھول دیا۔ اس وقت ہر ایک گھنٹے بعد نشر ہونے والا نیوز بلیٹن آرہا تھا۔ وہ ریڈیو بند کرنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک ایک جانا پہچانا سا نام سن کر رک گیا اور پوری توجہ سے خبریں سننے لگا۔

"کوسٹ گارڈ کی اطلاع کے مطابق گولڈن ڈولفن نامی مال بردار جہاز گہرے سمندر میں طوفان میں پھنس کر تباہ ہوگیا۔ اس حادثے میں ایک ملاح ہلاک ہوا جب کہ عملے کے دیگر افراد کو بچا لیا گیا۔"

فولبس کو ایک لمحہ کو تو یوں محسوس ہوا جیسے ریڈیو سے نشر ہونے والے ان الفاظ نے اس پر سحر سا کر دیا ہو۔ پھر یکایک اس کے سینے کی گہرائیوں سے وہی آواز ابھری۔ جو اس مرتبہ خاصی پرسکون تھی۔ اس کے ہونٹوں پر بے اختیار خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ بالآخر اسے لاش سے نجات مل گئی تھی۔ خوف کی وہ دھند چھٹ گئی تھی جس نے اسے لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اب اگر گہرے سمندر میں جہاز کے ٹکڑوں کے ساتھ اس کی بیوی کی لاش بھی تیرتی ہوئی مل گئی تو لاش سے اس کا کوئی تعلق ثابت نہیں کیا جا سکے گا۔ اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ بالآخر قسمت اس پر مہربان ہو ہی گئی تھی۔

دن کا اجالا پھیل رہا تھا۔ وہ اٹھ کر گشت پر چل دیا۔ اس وقت وہ اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا سا محسوس کر رہا تھا۔ ہونٹوں پر خود بخود ایک خوش گوار دھن مچلنے لگی۔ راؤنڈ مکمل کرنے کے بعد وہ دروازے میں رک کر تازہ ہوا میں گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ پھر موڑ پر کاسٹر کی جیپ گھومتے دیکھ کر جلدی سے اندر آ گیا۔ جیپ دروازے کے سامنے آکر رک گئی۔ چند لمحوں بعد کاسٹر کے ساتھ ہواسکی اور سلیوان کو بھی اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ چونکے بغیر نہ رہا۔

”میں جانتا تھا“ کاسٹر اندر آتے ہی اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ”مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ گذشتہ تین دن سے تمہاری خاموشی بے معنی نہیں ہو سکتی لیکن یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اپنی بیوی کو قتل کر دو گے۔“

”آرام سے... سکون سے بات کرو دوست۔“ ہواسکی کاسٹر کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

سلیوان، فولبس کے سامنے تن کر کھڑا تھا۔ اس کی نظریں فولبس کو اپنے اندر پیوست ہوتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ ”تمہارے فلیٹ کے کمرے کے فرش پر ہمیں خون کے دھبے ملے ہیں۔“ وہ فولبس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ”تمہارے فلیٹ کے سامنے رہنے والی عورت نے بتایا ہے کہ اس نے تمہیں اپنی بیوی کو گھسیٹ کر فلیٹ سے باہر لے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ ایک اور پڑوسی کے بیان کے مطابق اس نے تمہیں کار کی ڈکی میں کوئی بھاری چیز بند کرتے دیکھا تھا۔ کیا یہ غلط ہے کہ تم اپنی بیوی کو قتل کر چکے ہو مسٹر فولبس؟“

”نہیں یہ بکواس ہے۔“ فولبس اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

”لیکن مجھے یقین ہے کہ تم یہ کارنامہ انجام دے چکے ہو۔“ سلیوان کے لہجے میں بلا کی کاٹ تھی ”لیکن ہم اس امر سے واقعی لاعلم ہیں کہ تم نے لاش کا کیا کیا؟ اگر تم نے لاش کو اپنے فلیٹ اور یہاں تک کے راستے میں کہیں ٹھکانے لگایا ہوتا تو اب تک وہ سامنے آ چکی ہوتی۔ کاسٹر کے کہنے کے مطابق اگر تم لاش کو اپنے ساتھ یہاں لائے ہوتے تو تمہارے لئے اسے واپس لے جانا ممکن نہیں تھا۔ کیونکہ گیٹ پر واپس جانے والوں کی تلاشی لی جاتی ہے۔ لہٰذا میرے خیال میں لاش کو یہیں کہیں ہونا چاہئے۔“

”یہاں؟“ فولبس نے متوحش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”اگر یہ سب کچھ تمہیں کاسٹر نے بتایا ہے تو اس سے پوچھ لو کہ یہاں لاش کہاں چھپائی جا سکتی ہے۔“

”ڈیک یہاں سے زیادہ دور تو نہیں۔“ اس مرتبہ ہواسکی نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

”یقیناً!“ فولبس نے اسے گھورا۔ ”جیسے میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی کام ہی نہیں تھا کہ لاش کو کندھے پر لاد کر وہاں لے جاتا اور شاید مجھے دیکھنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔“ وہ کاسٹر کی طرف گھوم گیا۔ ”تم انہیں بتلاتے کیوں نہیں کہ گودام کے راؤنڈز کے دوران میرے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ ڈیک تک جا کر واپس آ سکتا جب کہ مقررہ اوقات میں مختلف مقامات پر نصب اطلاعی کمپیوٹر بوکسز کو گشت کی اطلاع بھی دی جاتی ہے۔ میرا کارڈ اس کا ثبوت ہے کہ گذشتہ دو راتوں کی ڈیوٹی کے دوران مجھ سے کوئی کوتاہی نہیں ہوئی۔“

”یہ درست ہے۔ لیکن صرف یہ ایک الجھن ضرور پیدا ہوئی ہے۔“ کاسٹر نے سلنڈر کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ کیا ہے؟“ سلیوان پیر سے سلنڈر کو ہلاتے ہوئے بولا۔

”پتہ نہیں۔“ کاسٹر نے کندھے اچکائے۔ ”یہ گذشتہ رات ہمیں گودام کے پچھلے حصے میں رکھے ہوئے سامان میں پڑا ہوا

ملا تھا۔ یہ سلنڈر یقیناً کسی پیٹی میں یہاں آیا ہوگا۔ لیکن ہمیں پورے گودام میں کوئی خالی یا ٹوٹی ہوئی پیٹی نہیں ملی۔"

فولبس لرز اٹھا۔ اسے اپنے اندر ایک بار پھر ٹوٹ پھوٹ سی ہوتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔

"یہ سلنڈر تقریباً پانچ فٹ لمبا اور پندرہ سے اٹھارہ انچ محیط میں ہے۔" سلیوان کہتا ہوا فولبس کی طرف مڑا۔ "اگر میری اطلاعات غلط نہیں تو تمہاری بیوی درمیانے قد اور دبلے پتلے جسم کی مالک تھی۔"

"ایک منٹ،" کاسٹر جلدی سے بولا۔ "تم شاید یہ کہنا چاہتے ہو کہ اس نے سلنڈر نکال کر اپنی بیوی کی لاش کو اس پیٹی میں بند کر دیا ہوگا؟"

"ہاں! میں کچھ ایسا ہی سوچ رہا ہوں۔" سلیوان نے اس کے خیال کی تائید کی۔

"لعنت ہو مجھ پر! مجھے پہلے ہی یہ خیال کیوں نہیں آیا۔" کاسٹر بڑبڑایا۔

"کیا تمہیں کوئی ایسی پیٹی یاد ہے جس میں یہ سلنڈر آ سکتا ہو؟"

"ہاں! مجھے ایسی تین پیٹیاں یاد ہیں جو خوب اچھی طرح پیک تھیں۔"

"کہاں ہیں وہ پیٹیاں؟"

اس موقع پر فولبس کا دل چاہا کہ فلک شگاف قہقہے لگائے۔ لیکن بڑی مشکل سے اپنی اس خواہش پر قابو پا سکا۔

"ڈیک پر! وہ تینوں پیٹیاں ڈیک پر موجود ہیں۔" کاسٹر نے جواب دیا۔

ایک لمحہ کے لئے فولبس کو یوں محسوس ہوا جیسے کاسٹر کے یہ الفاظ کوئی مفہوم نہ رکھتے ہوں لیکن جب ذہن نے ان کا مفہوم واضح کیا تو وہ چیخ اٹھا۔ "لیکن... لیکن تم نے تو کہا تھا کہ..."

"میں نے کیا کہا تھا؟" کاسٹر نے اسے گھورا۔

"کہ وہ سارا سامان گولڈن ڈولفن پر جا چکا ہے۔" فولبس نے جملہ مکمل کیا۔

کاسٹر کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ آگئی۔ وہ چند لمحے معنی خیز نگاہوں سے فولبس کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ "تم دنیا کے احمق ترین آدمی ہو۔ تم کسی طرح لاش سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ تم نے یہ دیکھنے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کی کہ وہ پیٹیاں کہاں جانے والی تھیں۔ تم تو بس یہ چاہتے تھے کہ لاش سے پیچھا چھوٹ جائے۔"

فولبس احتجاج کرنا چاہتا تھا کہ لاش کو کسی جہاز پر بھیجنے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ تو صرف چوبیس گھنٹوں کے لئے لاش کو چھپانا چاہتا تھا۔

"اس نے کیا کیا تھا؟" سلیوان نے کاسٹر سے دریافت کیا۔

"اس نے لاش کو ایک ایسی پیٹی میں ٹھونس دیا تھا جو کوپن ہیگن کے لئے بک کی گئی تھی لیکن قسمت نے اس کے ساتھ بڑا دلچسپ مذاق کیا۔ اس کی رات کی ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد صبح وہ پیٹیاں وہاں سے ہٹالی گئیں اور یہی سمجھا کہ اس نے بیوی کو گولڈن ڈولفن نامی اس جہاز پر روانہ کر دیا گیا تھا جس کے کچھ دیر پہلے طوفان میں پھنس کر غرق ہونے کی اطلاع ملی ہے۔ میرا خیال ہے جہاز کی غرقابی کی اطلاع سن کر یہ خوشی سے پھولا نہ سمایا ہوگا۔ ظاہر ہے اگر لاش بھی جہاز کے ساتھ غرق ہو چکی ہو تو اس کے خلاف کوئی کیس نہیں بن سکتا۔ اگر یہ بیوقوف ذرا بھی حواس سے کام لیتا تو اسے پتہ چل جاتا کہ سامان کے اس ڈھیر میں کچھ چیزیں ایسی بھی تھیں جو کوپن ہیگن کے لئے بک تھیں اور ظاہر ہے کوپن ہیگن جانے والا سامان آئیلینڈز جانے والے کسی جہاز پر نہیں لادا جا سکتا تھا۔"

"لیکن تم نے وہ سامان یہاں سے اٹھوا دیا تھا۔ آخر تم نے ایسا کیوں کیا؟" فولبس کاسٹر کی طرف بڑھا مگر سلیوان اور دوسروں نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔

"کیونکہ جس جہاز پر وہ سامان لادا جانے والا تھا وہ راستے میں انجن کی خرابی کی وجہ سے پہلے ہی تین دن لیٹ ہو چکا تھا۔ اس خیال سے کہ بندرگاہ پر مال کی لوڈنگ میں تاخیر نہ ہو، باس کے حکم پر وہ سامان یہاں سے اٹھوا کر پہلے ہی ڈیک پر بھجوا دیا گیا تھا اور وہ پیٹیاں اس وقت بھی ڈیک کے شیڈ میں موجود ہیں۔" کاسٹر نے جواب دیا۔

فولبس پر ایک سکتہ سا طاری ہو چکا تھا۔ اس کے دماغ میں سوچوں کے بھنور چل رہے تھے۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس کی بیوی اس سے سینکڑوں میل دور جا چکی ہوگی لیکن وہ شروع سے اب تک اس کے آس پاس موجود رہی۔ مرنے سے پہلے بھی وہ ایسا ہی کرتی تھی۔ وہ اسے دھکے دے کر گھر سے نکال دیتا۔ دو چار دن باہر رہ کر پھر واپس آجاتی۔ وہ اس سے زیادہ دور کبھی نہیں گئی تھی۔ ہمیشہ آس پاس منڈلاتی رہی تھی اور اب جب کہ وہ اسے قتل کر چکا تھا، اس نے دور جانے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ اس سے نجات حاصل نہیں کر سکا تھا۔ اس نے مرنے کے بعد بھی پیچھا نہیں چھوڑا تھا اور بالآخر پھانسی کا پھندا ہی ثابت ہوئی تھی۔

حسن ظن

حفیظ اقبال

Jasoosi Digest February 1983

اپنے پسندیدہ کردار عبدل سے ملیے۔ اُس کا خیال ہے کہ اُس نے ایک ایسا نظریہ پیش کیا ہے کہ آنے والی نسلیں اس پر فخر کرسکیں گی۔ ایک ہنستی کھلکھلاتی تحریر جو تھوڑی دیر کے لیے آپ کو غمِ روزگار سے بیگانہ کردے گی۔

اچانک عبدل کو عورتوں سے نفرت ہوگئی۔

اچانک اس لیے کہ بادِ صبا نے اُسے اچانک ہی دھوکا دیا تھا اور ایک گولیماردی رہڑھے فروش سے نکاح کرکے اس کے گھر میں جا بیٹھی تھی۔ اس نے عبدل اور اس کی محبت اور اپنی قسموں اور وعدوں کو فراموش کردیا تھا۔ عبدل کو معلوم ہوا کہ بادِ صبا اسے برباد کرکے اپنا گھر آباد کرچکی ہے تو اس نے بفرزون میں واقع اس زیرِ تعمیر بنگلے کا رخ کیا جس کے چوکیدار نے سو روپے مہینے پر عبدل کو اس وقت تک وہاں قیام کرنے کی اجازت دے رکھی تھی جب تک بنگلے کی تعمیر جاری تھی۔ وہاں پہنچ کر عبدل چوکیدار کی کھاٹ پر 'ہزاروں پیار کرتے ہیں نبھانا کس کو آتا ہے' کہتا ہوا گر گیا اور ریت اور سیمنٹ کے بنے ہوئے ان بلاکوں کو دیکھنے لگا جو بنگلے کی تعمیر کے سلسلے میں وہاں اکٹھا کیے گئے تھے۔

صبح کا وقت تھا، معمول کے مطابق لبالب بھری ہوئی بسیں چل رہی تھیں۔ بادِ صبا بے وفائی نہ کرتی تو اس وقت عبدل لکھ پتی بننے کے شوق میں اپنے بلیڈ کی مدد سے مسافروں کی جیبوں کے کشتوں کے پشتے لگا رہا ہوتا۔ اور شام ہونے سے پہلے پہلے کم از کم اتنی رقم ضرور حاصل کرلیتا کہ رات کے کھانے اور صبح کے ناشتے کا خرچ نکل آتا۔ اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ جیب بھی اسے آج ہی مل جاتی جو عبدل کی قسمت بدل دیتی اور بدنام اور آوارہ عبدل اچانک پاکستان کا تیئیسواں سرمایہ دار بن جاتا۔ بادِ صبا کی بے وفائی نے عبدل کے عزائم اور دلولوں ہی کو خاک میں نہیں ملایا تھا بلکہ اس کے اس روشن مستقبل کو بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تاریک کردیا تھا۔ جس کے خواب عبدل بچپن سے دیکھتا آیا تھا۔

لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے کہ جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا، سو بالکل درست کہا ہے۔ ریت اور سیمنٹ کے بنے ہوئے بلاکوں پر جو بڑی حد تک ظالم بادِ صبا کے دل سے مشابہت رکھتے تھے۔ نظریں جمائے عبدل جی ہی جی میں 'اب تم کو بھول جانے کی کوشش کریں گے ہم۔ تم سے بھی ہو سکے تو نہ آنا خواب میں'، گنگنا رہا تھا اور گزرے ہوئے دنوں کی محبت بھری باتیں یاد کر رہا تھا۔ اس نے جانے کتنی مرتبہ بادِ صبا کے خاک آلود سوکھے بالوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر کہا تھا کہ میری جوانی کے گرم لمحوں پر ڈال دے گیسوؤں کا سایہ اور بار بار اسے یقین دلاتا تھا کہ نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں جس کے شانوں پر تیری زلفیں پریشاں ہوگئیں، اور اُس بے پردہ پردہ نشین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر قسمیں کھاتی تھیں کہ اے بادِ صبا! تیرے علاوہ اس دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔ تو ہی میری سب کچھ ہے محبوبہ بھی، ماں بھی، بہن بھی، بیٹی بھی اور وغیرہ وغیرہ بھی۔

سمجھنے کو تو بادِ صبا سب داستانِ غم سمجھتی تھی۔ جو مطلب کہنے والے کا تھا اسی کو کم سمجھتی تھی۔ بادِ صبا نے عبدل کے دل سے نکلی ہوئی آوازوں پر یقین نہیں کیا۔ ہمیشہ اس لیے جھوٹی محبت کے جھوٹے دعوے
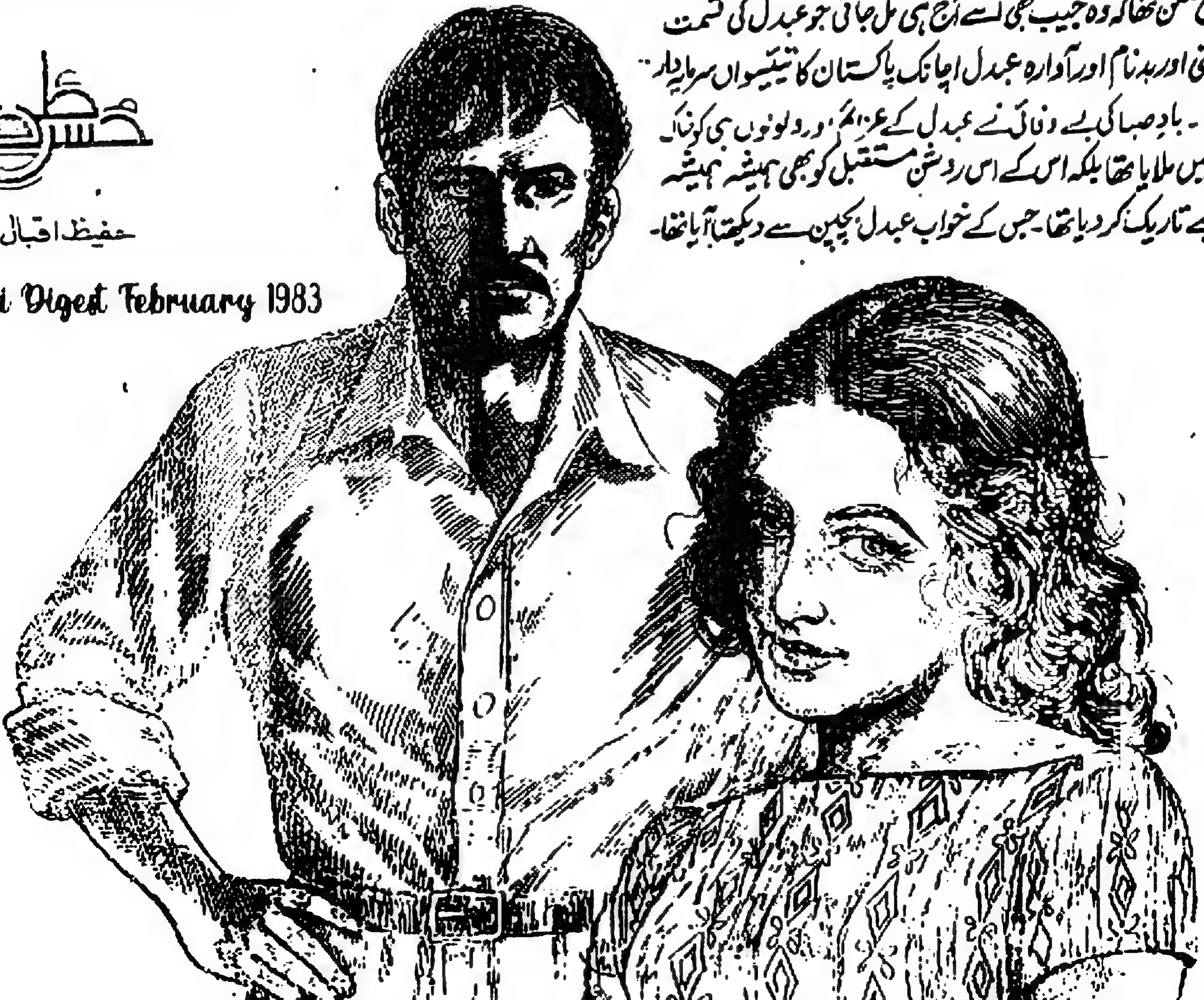
ہی کرتی رہی اور جونہی ریڑھے والا گولیمار وی نظر آیا، وہ سب کچھ بھول بھال کر اس کے گھر بیوی بن کر جا بیٹھی۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ ریڑھے والا کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرے لکھپتی اور کروڑپتی اور ارب پتی ہرگز نہیں بن سکتا۔ جب کہ عبدل کے کسی وقت بھی وارے نیارے ہو سکتے ہیں۔ بس ایک ہی اچھی سی جیب کی تلاش تھی۔

بلاکوں پر نظریں گاڑے ہوئے عبدل نے ٹھان لی کہ اب نہ ملیں گے کسی سے ہم، اُسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا کہ دو ٹکے کی لڑکی سے دل لگا کر خواہ مخواہ اپنے آپ کو خوار کرتا پھر رہا تھا۔ بادِ صبا کے عشق میں گرفتار ہو کر بھول گیا تھا کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ محلے میں دو لڑکیاں اور بھی ہیں مگر نہیں۔ محلے میں دو لڑکیاں ہوں یا دو سو لڑکیاں، عبدل اب کسی سے دل لگانے کی دل لگی ہرگز نہیں کر سکتا تھا۔ اُسے معلوم ہو چکا تھا کہ فطرت کے لحاظ سے ہر لڑکی بادِ صبا ہوتی ہے۔ لڑکیوں سے وفا کی امید کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی بیل سے دودھ کی توقع کی جائے۔ چلو اچھا ہوا برسوں کے بار لنے گئے تو کچھ لوگ بھی پہنچانے گئے۔

بلاکوں پہ اُس کی نظریں بدستور جمی ...ں اور دل ہنوز خون کے آنسو بہا رہا تھا کہ اس نے بلاکوں کی جانب ایک مرغے کو چند مرغیوں کی معیت میں ٹہلتے ہوئے دیکھا۔ اس کے ذہن سے ایک لمحے کے لیے بے وفا یادِ صبا کی بے وفائی نکل گئی اور نظریں بلاکوں سے ہٹ کر مرغے پر جم گئیں اور تب اس پہ وہ الہامی انکشاف ہوا جو نیوٹن کو اس وقت ہوا تھا جب اس کے سر پہ ایک سیب آ گرا تھا۔ عبدل فوراً اچھلا، اُچھل کر بیٹھا اور بیٹھ کر بولا "پتھروں میں بیٹھ کر تقسیم دانائی نہ کر۔"

تین ماہ قبل عبدل کی شیرو سے اس دودھ کی وجہ سے جسے بلی پی گئی تھی سخت لڑائی ہو گئی تھی۔ شیرو کا کہنا تھا کہ کوئی بھی بلی چولھے پہ رکھا ابلتا ہوا دودھ ہرگز نہیں پی سکتی۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ عبدل کے بالائی ہونٹ پہ اب تک بالائی لگی ہوئی ہے۔ حالانکہ وہ بالائی تین روز پہلے حلوائی کے ہاں سے پیئے جانے والے دودھ کی تھی جسے عبدل نے محض اس لیے نہیں دھویا تھا کہ لوگوں پر تھوڑا رعب پڑے گا۔ بالائی ہونٹ کی بالائی دیکھ کر عوام مرعوب ہو جائیں گے کہ جہادِ زندگی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں۔ لیکن شیرو تھا کہ اپنی بات پہ اڑا رہا اور یہی کہے گیا کہ دودھ عبدل نے پیا ہے۔ عبدل نے بھی جھگڑا بڑھانا مناسب نہ سمجھا اور کہا کہ اچھا، اپنے تین پاؤ دودھ کے پیسے لے لینا۔ شیرو پھر بھی نہ مانا سمجھا کہ اس نے عبدل کو دبا لیا ہے۔ بگڑ کر کہنے لگا "پورا ایک کلو دودھ تھا۔ تمھیں ایک کلو کے پیسے دینا ہوں گے۔"

عبدل کہ شریف تھا، عدم تشدد اور اہنسا کا پجاری تھا، تیار ہو گیا کہ چلو ایک ہی کلو کے پیسے لے لینا لیکن شیرو پھر بھی انسانیت کے جامے میں نہیں آیا کہنے لگا "پیسے ابھی اور اسی وقت دینا پڑیں گے تمھارے قرض ادھار کا کوئی بھروسہ نہیں۔"

عبدل سو د در سود دینے پہ بھی رضامند ہو گیا۔ مگر شیرو جہل کا پجوڑ تھا۔ اس کی فکر کھو گئی تھی، کچھ بے عمل اور بہت کچھ بے شعور بھی تھا۔ نقد ادائیگی پہ زور دیتا رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ادھار سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا اور عبدل یہ کہتا ہوا اس کے ہاں سے چلا آیا کہ مومن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم۔

مرغیوں کے جھنڈ میں مرغے کو ٹہلتے ہوئے دیکھ کر عبدل پر جو الہامی انکشاف ہوا تھا، وہ اس بات کا متقاضی تھا کہ بالائی ہونٹ کی بالائی والی بات کو عبدل بالائے طاق رکھے اور شیرو کو بتلائے کہ بادِ صبا کی بے وفائی کے نقصانِ عظیم سے وہ عظیم ترین فائدہ اُسے حاصل ہوا ہے جو نہ پہلے کبھی کسی کو حاصل ہوا تھا نہ آئندہ کبھی حاصل ہو سکے گا۔ نیوٹن کے سر پہ گرنے والے سیب کی طرح کہ سیب تو پہلے بھی گرتے تھے اور آج بھی گرتے ہیں لیکن نیوٹن پہلا اور آخری شخص تھا جس نے کششِ ثقل کا نظریہ دریافت کیا اور دنیائے سائنس و غیر سائنس میں حیاتِ ابدی حاصل کر گیا۔ نیوٹن ہی کی طرح قدرت نے عبدل کو بھی ایک نظریہ دریافت کرنے کا سنہرا موقع جسے نادانی اور جہالت کے باعث شیرو سنہری موقع کہا کرتا تھا، عنایت کیا تھا۔ بادِ صبائیں پہلے بھی ہوتی تھیں، آج بھی ہوتی ہیں اور آئندہ بھی جب تک دنیا قائم ہے ہوتی رہیں گی۔ مگر عبدل جس نظریے کا اظہار کرنے والا تھا وہ اسے رہتی دنیا تک غیر فانی اور زندہ جاوید بنا دینے کے لیے کافی تھا۔

بادِ صبا بے وفائی نہ کرتی، ریڑھے والے گولیمار وی سے بہ سلسلہ خانہ آبادی شادی نہ کرتی اور عبدل کو بے وفائی کا داغ دے کر راتوں رات رقیبِ روسیاہ کی نہ ہو جاتی تو عبدل کاہے کو بھری پری بسیں چھوڑ کر زیرِ تعمیر بنگلے کی کھاٹ پہ گر کر ریت اور سیمنٹ کے بلاکوں کو دیکھتا اور دل ہی دل میں بادِ صبا سے کہتا کہ نہ دن کو چین اور نہ رات کو قرار ہے۔ مگر اس کی بے وفائی اور کج ادائی نے کہ دنیا کی ساری لڑکیاں ہمیشہ اسی طرح اپنے محبوبوں کو دھوکے اور فریب دیتی آئی تھیں، عبدل کی آنکھیں کھول دیں اور مجبوراً اُسے تسلیم کرنا پڑا کہ عورت درحقیقت بے وفائی ہی کا دوسرا نام ہے۔

البتہ بادِ صبا کی بے وفائی کا روشن ترین فائدہ یہ ہوا تھا کہ وہ ایک ایسی حقیقت کا پتہ چلانے میں کامیاب ہو گیا تھا جس کے بارے میں بڑے بڑے علماء فضلا بھی کچھ نہیں کہہ سکے تھے۔ وجہ محض اتنی تھی کہ ان بے چاروں کے اعصاب پہ عورت سوار تھی۔ جونہی عبدل نے اپنے اعصاب پہ سوار عورت کو اتار پھینکا، تونہی اسے پتہ چلا کہ مرد کی پسلی سے پیدا ہونے والی مخلوق کتنی ٹیڑھی اور کتنی بے ہودہ ہے۔ بادِ صبا کی بے وفائی نے اُسے نیوٹن بنا دیا تھا بلکہ نیوٹن سے بھی کچھ زیادہ ہی عاقل اور باریک بین۔ سیب کے نیچے گرنے کا غلط یا صحیح اصول دریافت کرنے والے نادان اور ناسمجھ نیوٹن کو بھی عورت کی حقیقت اد...

ماہیت کا اصل پتہ نہیں چل سکا تھا۔ کیونکہ عورت بہر حال عورت تھی۔ سیب نہیں تھی کہ اسے سمجھنا آسان ہوتا۔

اپنی دریافت کی تصدیق کے لیے شبیرو کے گھر جاتے ہوئے عبدل نے دوسرے جانوروں پر بھی نظر ڈالی جو اگرچہ انسان کی طرح معاشرتی جانور نہیں تھے تاہم ان میں اور انسان میں جو قدرِ مشترک پائی جاتی تھی اس سے عبدل کو اپنے نظریے کو پائے دار بنانے میں زیادہ مدد ملتی تھی۔ اس نے گدھے کو دیکھا، اونٹ کو دیکھا، بکریوں کے ایک چھوٹے سے ریوڑ کو دیکھا، سوچا کہ شبیرو کے پاس جانے کے بجائے کیوں نہ ایک، چکر چڑیا گھر کا لگائے کہ وہاں نظریے کو پختگی بخشنے والے بے شمار انتظامات تھے۔ وہ اسی خیال سے اباؤٹ ٹرن ہو گیا تھا لیکن پھر خود ہی اس نے یہ کہہ کر اپنے خیال کی تردید کر دی کہ جو کچھ دیکھ لیا وہی بہت ہے۔ نیوٹن نے تو محض ایک سیب ہی دیکھا تھا، بعد میں دنیا والے اس کے بنائے اور بتائے اصول کے مطابق تجربات اور مشاہدات کرتے رہے، یہاں تک کہ چلا اٹھے کہ ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔

عبدل اچھی طرح جانتا تھا کہ ہر مرغی کی قیمت میں دارو رسن کہاں؟

پس اس نے چڑیا گھر جانے کے خیال کو پس پشت ڈالا اور شبیرو کا دروازہ جا کھٹکھٹایا۔ شبیرو نے جیسے ہی دروازہ کھولا، عبدل دوڑ کر اس کے گلے سے اس طرح چمٹ گیا جیسے برسوں کے بچھڑے ہوئے دو قریبی عزیز ملے ہوں۔ اس کے گلے سے لگ کر تقریباً بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ کہ اے شبیرو! میرے ہمدم، میرے دوست، محفل میں اس خیال سے پھر آ گیا ہوں میں، شاید مجھے نکال کر پچھتا رہے ہو تم۔

شبیرو کہ لڑکیوں سے بھی زیادہ احمق اور بے وقوف تھا۔ فوراً ہی عبدل کے جھانسے میں آ گیا بولا "مجھے معلوم تھا، میری حلال کی کمائی کا دودھ تم سے ہضم نہیں ہو سکے گا اور جب تک تم اس کی قیمت ادا نہیں کرو گے تمہیں آرام اور چین کی نیند سونا نصیب نہیں ہو گا۔" اس نے ایک بے تکا سا شعر بھی پڑھا جس کا مفہوم کچھ یوں تھا کہ اے ہندوستان والو تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں۔

کوئی دوسرا وقت ہوتا تو عبدل شبیرو کو بتاتا کہ ایسے موقعوں پر کون سا شعر پڑھنا چاہیے اور ساتھ ہی ساتھ اس کی بھس بھری کھوپڑی کو یہ بھی گوش گزار کرا دیتا کہ عبدل کا معدہ دودھ ہی نہیں، چوری اور دھوکے سے اڑائی ہوئی ہر چیز کو ڈکار لیے بغیر ہضم کر سکتا ہے لیکن ہر بات کا ایک موقع اور محل ہوتا ہے۔ وہ وقت سیاسی گفتگو کا نہیں تھا سو عبدل نے شبیرو کے جملے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا "دل توڑنے والی نہیں جوڑنے والی باتیں کرو میاں شبیرو! یہ بتاؤ کہ مرغا زیادہ خوبصورت ہوتا ہے یا مرغی ہے؟"

عبدل کے سوال پر شبیرو کو حیرت تو ہوئی کہ بات ایران کی ہو رہی تھی اور اس نے سوال کر دیا توران کا لیکن موضوع کچھ دلچسپ معلوم ہوا۔ مرغے اور مرغی کا ذکر بے معنی نہیں تھا۔ بہت عرصے سے عبدل نے شبیرو کو اپنے ساتھ نہاری روٹی کھانے کی دعوت نہیں دی تھی۔ بہت ممکن تھا کہ اپنی گزشتہ ساری کوتاہیوں اور لغزشوں کا کفارہ ادا کرتے ہوئے عبدل نے بطور خاص مرغ پلاؤ کی دعوت کا اہتمام کیا ہو اور شبیرو کا عندیہ معلوم کرنے آیا ہو کہ پلاؤ میں مرغی کا گوشت شامل کیا جائے یا مرغے کا۔ یہی دودھ کی قیمت سو مرغ پلاؤ کھانے کے بعد بھی وصول کی جا سکتی تھی۔ کہیں بھاگی تو نہیں جا رہی تھی۔

"میرے دل کی پوچھو تو بھائی عبدل!" شبیرو نے کہا "مرغا ہم مرغا ہوتا ہے جس وقت سینہ تان کر مرغیوں کے غول میں گھومتا ہے تو تمہارے سر کی قسم اچھے اچھوں کے منہ میں پانی آ جاتا ہے۔ اللہ بخشے ابا مرحوم کہا کرتے تھے کہ بیٹا شبیرو ہمیشہ مرغے کا گوشت کھانا اور مرغی کو انڈے دینے کے لیے چھوڑ دینا۔"

عبدل کو اپنے سینے میں ٹھنڈک سی اترتی ہوئی محسوس ہوئی شبیرو کا تبصرہ بے لاگ تھا۔ وہ جو کچھ فرما رہا تھا اپنے اور باپ دادا کے تجربے کے مطابق ارشاد فرما رہا تھا اپنے نظریے کو مزید تقویت پہنچانے کے لیے عبدل نے کہا "دیکھو شبیرو! میرے یار! تم سے جو سوال کیا گیا ہے صرف اس کا جواب دو۔ مرغا زیادہ خوبصورت ہوتا ہے یا مرغی ہے؟"

مرغے اور مرغی کی خوبصورتی کے بارے میں شبیرو دھواں دار تقریر کر سکتا تھا لیکن عبدل کے تیور دیکھ کر اس ڈر سے کہ کہیں مرغ پلاؤ سے ہاتھ دھونا نہ پڑ جائیں، شبیرو نے خلاف عادت مختصر سا جواب دیا۔ "مرغا۔"

"زندہ باد۔" عبدل نے خوش ہو کر فلک شگاف نعرہ بلند کیا۔ "اور اب خدا کو حاضر ناظر جان کر یہ بھی بتاؤ کہ گدھے اور گدھی میں کس کو زیادہ خوبصورت کہا جا سکتا ہے؟"

"گدھے کی نظر سے پوچھو تو۔۔۔۔۔"

"گدھے کی نظر سے نہیں اپنی نظر سے بتاؤ۔" عبدل نے کہا "تمہیں گدھا زیادہ حسین معلوم ہوتا ہے یا گدھی ہے؟"

سوال ایسا نہیں تھا جس کا سوچے سمجھے بغیر آسانی سے جواب دیا جا سکتا چنانچہ شبیرو نے چند لمحوں کے لیے آنکھیں بند کر لیں اور دل ہی دل میں گدھے اور گدھی کی خوبصورتی کا موازنہ کرنے لگا پھر آنکھیں کھول کر زیر لب مسکرا کر بولا "مجھے تو گدھا زیادہ خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ ایمان سے۔"

شبیرو کے جواب نمبر دو سے عبدل کو یقین ہو گیا کہ اب دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی اسے نیوٹن بننے سے نہیں روک سکے گی، وہ ایک عمر کے بعد آج خود کو سمجھا تھا کہ اگر رکے تو کنارہ چلے تو دریا تھا۔

"بس بیٹا! میرے ایک سوال کا سچا سچا جواب اور دے دو تاکہ میرے بے قرار دل کو قرار آ جائے اور اتنی سی بات اور بتا دو کہ شبیر زیادہ

حسین ہوتا ہے یا شیرنی ہے؟"

اس مرتبہ جواب دینے کے لیے شیرو کو کچھ زیادہ سوچ بچار سے کام نہیں لینا پڑا۔ فی البدیہہ بولا۔ "شیر۔"

خوشی کے باعث عبدل کے لیے کھڑا رہنا دوبھر ہو گیا۔ اس کے گھٹنے ٹوٹنے لگے۔ وہ فوراً ہی وہیں زمین پر شیرو کے دروازے کے سامنے بیٹھ گیا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا۔ "شیرو! ہم نہ تمھیں بھلا نہیں گے۔"

شیرو ٹکر ٹکر عبدل کے چہرے کی جانب دیکھنے لگا اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ عبدل پاگل ہو گیا ہے یا پاگل ہونے کی تیاری کر رہا ہے۔ ابھی وہ کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ عبدل نے ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔

"رتبہ جسے دیتا ہے خدا دیتا ہے۔" عبدل نے شیرو کے کندھے تھپکتے ہوئے کہا۔ "کسے خبر تھی کہ تمھارا جگری دوست جو سڑکوں اور گلیوں میں مارا مارا پھرتا ہے اور جس کے چہرے پر لالو کھیت کے لڑکے توے کی سیاہی مل کر جلوس نکالتے ہیں اور جسے بادِ صبا جیسی عیار اور مکار لڑکیاں دغا اور فریب دینا ضروری سمجھتی ہیں۔ ایک دن ایک اہم ترین انکشاف کر کے اپنا، اپنے والدین کا اور اپنے وطنِ عزیز کا ایسا نام روشن کرے گا کہ بڑی سے بڑی آندھی کے سامنے بھی اس کی روشنی مدھم نہ ہو سکے گی۔ مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں۔"

شیرو نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے آج بڑی رقم تمھارے ہاتھ لگی ہے؟ جب کبھی تمھاری جیب میں پیسے اور تمھارے پیٹ میں روٹی ہوتی ہے تو تم ہمیشہ اسی طرح بے تکی باتیں ہانکا کرتے ہو۔"

عبدل کو غصہ تو بہت آیا کہ دوست بنایا بھی تو کیسے ناسمجھ اور نادان انسان کو، اس سے اچھا تو اللہ داد ہیڈ کانسٹبل تھا کہ دانا دشمن تھا۔

"دیکھو میری جان!" عبدل نے نادان دوست کی نادان گفتگو پر دھیان دیے بغیر کہا۔ "یہ بات ثابت ہو چکی ہے اور تم جیسا عقل کا کورا اور آنکھ کا اندھا بھی میرے سوالوں کے جواب میں یہ کہنے پر مجبور ہو گیا ہے کہ مرغا مرغی سے، گدھا گدھی سے اور شیر شیرنی سے زیادہ حسین ہوتا ہے۔ اسی بات کو بہ نظرِ عمیق دیکھا جائے تو بلا خوفِ تردید یقین کامل کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا میں جتنے بھی نر پائے جاتے ہیں، سب کے سب اپنی مادائوں سے افضل، برتر اور خوبصورت ہوتے ہیں۔ مرد بھی قدرت کے اس زریں اصول سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا جا سکتا۔"

شیرو کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ "تمھارا مطلب ہے کہ میں اپنی بیوی سے یعنی تمھاری بھابی سے زیادہ خوبصورت ہوں؟"

"اپنی بیوی اور میری بھابی ہی سے نہیں بلکہ دنیا کی ہر عورت سے زیادہ خوبصورت ہو۔" عبدل نے شیرو کو یقین دلایا۔ "ایک بار جب یہ ثابت ہو گیا کہ نر مادہ سے زیادہ خوبصورت ہوتا ہے تو یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ مرد جیسے اشرف ترین نر ہونے کا شرف حاصل ہے اپنی مادہ سے کم تر قرار پائے۔ جب سے مجھ پر اس حقیقت کا الہام ہوا ہے، مجھے دنیا کی ساری عورتیں بدصورت، کریہہ اور بھیانک نظر آنے لگی ہیں۔ کسی نے سچ کہا ہے، تصور میں کسی کی طلعتوں کا منتظر کیوں ہے؟ خود اپنا آئینہ بن جا، خود اپنے روبرو ہو جا۔"

حیرت و استعجاب کے باعث شیرو کی آنکھیں ہنوز پھٹی پڑ رہی تھیں، چہرے پر بارہ بج رہے تھے، اب تک وہ اپنے آپ کو نجانے کیوں بدصورت اور حقیر سمجھتا آیا تھا۔ عبدل کی باتوں نے اسے ایک نیا زاویۂ فکر عطا کیا تھا، اسے اچانک اپنے بے پناہ حسن کے سامنے اپنی بیوی انتہائی بدصورت اور حقیر نظر آنے لگی تھی۔ منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی، پھر بھی جیسے تیسے لرزتے ہونٹوں سے کپکپاتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اللہ قسم تم نے پہلی بار عقل کی بات کی ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مرغا، مرغی سے، گدھا گدھی سے اور شیر شیرنی سے زیادہ خوبصورت ہو اور شیرو اتنا گیا گزرا ہو کہ اس کی بیوی خواہ مخواہ اس سے حسن میں اور دلکشی میں بازی لے جائے؟ تم نے ہم مردوں کو ہمارے حسن کا درست احساس دلا کر فخر سے ہمارا سینہ بلند کر دیا ہے۔ تم نے وہ مثل تو سنی ہی ہو گی کہ اونٹ رے اونٹ، تیری کون سی کل سیدھی۔ میرا خیال ہے کہ یہ مثل عورت ہی کے لیے کہی گئی تھی کہ میں جتنا بھی سوچتا ہوں اونٹ کو کم اور عورت کو اس کا زیادہ مصداق پاتا ہوں۔"

عبدل نے اپنی زندگی کا سب سے بہترین قہقہہ لگایا۔ "اب میں ایک پریس کانفرنس بلاؤں گا اور اس میں اعلان کروں گا کہ جنھیں حسن کا دعویٰ ہے، حسین وہ نہیں بلکہ ہم ہیں۔ جانتے ہو اس کا نتیجہ کیا ہو گا؟ مجھے نیوٹن جیسی شہرت اور سربلندی حاصل ہو جائے گی۔ رہتی دنیا تک مرد میرا نام عزت و افتخار سے لیتے رہیں گے۔ ہر زبان پر یہی ہو گا کہ پتلے پتلے بھی، مردوں کی شان رکھ لی۔"

شیرو میں دس ہزار برائیاں تھیں تو ایک خوبی بھی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ آئے یا نہ آئے مگر وہ عبدل کی بات کو خوب اچھی طرح سمجھ لیتا تھا۔ وہ فوراً ہی کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور عبدل سے مخاطب ہو کر کہا۔ "یہیں بیٹھے رہنا یار! میں ابھی تمھاری بدصورت بھابی سے چائے کے لیے کہہ کر آتا ہوں۔"

عبدل نے کہا۔ "رات کی پکی ہوئی روٹی رکھی ہو تو وہ بھی لیتے آنا۔"

شیرو اندر چلا گیا اور عبدل تصور ہی تصور میں اپنے گلے میں ہار پڑتے ہوئے دیکھنے لگا۔ اس کی دریافت نے اچانک پورے کرۂ ارض پر دھوم مچا دی۔ نیوٹن کو بھی اتنی شہرت حاصل نہیں ہوئی تھی جتنی شہرت عبدل نے راتوں رات حاصل کر لی تھی۔ ہر طرف اس کی ذہانت اور قابلیت کے ڈنکے بج رہے تھے۔ بھارت کے ایک فلم ساز آئی ایس گوہر نے اس کی

زندگی پر فلم بنانے کا اعلان کیا تھا، جبکہ ساری دنیا کے ٹی وی والے اس کا ایک مفصل انٹرویو لینے کے لیے مضطرب اور بے چین تھے۔ دوسری طرف خود عبدل کو اپنے اعزاز میں دی جانے والی ضیافتوں ہی سے فرصت نہیں مل رہی تھی۔ رات دن کے چوبیس گھنٹوں میں کم از کم اسے پچیس دعوتوں میں شریک ہونا پڑتا تھا۔ عورتوں میں کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ ہر اس گھر سے جس میں کوئی نہ کوئی عورت پائی جاتی تھی رونے پیٹنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ خواتین کی مختلف انجمنوں کی جانب سے عبدل کو بڑی بڑی رقموں کی پیشکش کی جارہی تھی کہ خدا کے لیے اپنا انکشاف واپس لے لو اور ہم پر ترس کھاؤ، لیکن عبدل لالچی نہیں تھا کہ چند لاکھ یا چند کروڑ روپیوں کے لالچ میں آکر مرد کے حسن کے مقابلے میں عورت کی بدصورتی کی بالاتری تسلیم کر لیتا۔ اس نے ساری پیشکشوں کو یہ کہتے ہوئے ٹھکرا دیا تھا کہ میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند۔

عبدل اپنے خیالات میں گم بیٹھا رات کی بچی ہوئی روٹی اور گرم گرم چائے کی آمد کا منتظر تھا کہ اندر سے اسے ایک انتہائی بھیانک آواز سنائی دی۔ "ہاں ہاں، میں بدصورت ہوں، تم پری زاد ہو، جاؤ مجھ سے نہیں بنتی چائے وائے، اپنے باہر بیٹھے ہوئے پری چہرہ لفنگے سے کہو کہ یہ محتاج خانہ نہیں ہے۔ جب اسے موقع ملتا ہے، کھانے پینے اور تمھاری بے وقوفی کا فائدہ اٹھانے ادھر آنکلتا ہے۔ ٹھہرو، میں خود اسے بتاتی ہوں، کہاں ہے میرا چمٹا۔"

چمٹے کا نام سنتے ہی عبدل ایسا بگٹٹ بھاگا کہ نیو خداداد کالونی پہنچنے سے پہلے اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تک نہیں۔ وہ شیرو کی بیوی کے غصے سے اچھی طرح واقف تھا۔ بے وقوف اور تنگ نظر اور جاہل عورت تھی۔ حقیقتِ حال سے واقف ہونے کے بعد احتجاجی جلوس نکالنے کے بجائے براہِ راست ایکشن پر اتر آئی تھی۔ اگر اسے اپنی عزت و عصمت کا پاس نہ تھا تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ باعزت و عصمت عبدل رات کی روٹی اور چائے کی ایک پیالی کی خاطر موسلوں کی چوٹ سے بے نیاز ہو کر اپنا سر اوکھلی میں دے دیتا۔ ویسے ایک بات تھی، شیرو اور شیرو کی بدرو بیوی کے ہاتھوں کی بنی ہوئی چائے ہوتی مزیدار تھی۔

نیو خداداد کالونی کے ایک گھنے پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھ کر عبدل نے ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل میں منعقد کی جانے والی اس پریس کانفرنس کے بارے میں سوچا جس میں وہ غیر معمولی دریافت کا انکشاف کر کے دنیا کو محوِ حیرت کر دینا چاہتا تھا۔ کانفرنس کے منعقد کرنے کے لیے اچھی خاصی رقم درکار تھی۔ گویا عبدل کی عزت اور شہرت کی راہ میں ایک بار پھر دولت آڑے آگئی تھی۔ اس نے جب بھی نیک اور شریف، ایماندار دیانت دار بننا چاہا تھا دولت نے اسی طرح اس کا راستہ روک لیا تھا۔ عبدل کی جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو کب کا جی چھوڑ گیا ہوتا، مگر آفرین تھی اس کی ہمت پر کہ بار بار ٹھوکریں کھاتا تھا اور بار بار نیک اور شریف بننے کی تمنا اسے حیاتِ نو بخشتی تھی اور وہ نئے اور پختہ عزم کے ساتھ دوبارہ مسکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوتا تھا کہ کبھی نہ کبھی کوئی نہ کوئی ایسی جیب ضرور ملے گی جس کے تعاون سے وہ چھوٹا موٹا کاروبار کر کے پاک باز زندگی گزار سکے گا لیکن ہنوز دلی دور است والا معاملہ تھا۔ اپنے تئیں عبدل نے شریف بننے کے کم و بیش سب ہی رائج الوقت حربے آزما لیے تھے۔

اگر خوبصورت فرہاد اپنی بدصورت شیریں کے لیے دودھ کی نہر کاٹ کر لا سکتا تھا تو عبدل بھی پریس کانفرنس کا انتظام کرنے کے لیے اس رقم کا انتظام کر سکتا تھا جو بہرحال دودھ کی نہر لانے سے کہیں زیادہ مشکل کام تھا۔

پیڑ کی گھنی چھاؤں کے نیچے سے نکل کر جب وہ دھوپ میں برآمد ہوا تو پہلے جیسا بے وقوف عبدل نہیں تھا جو کالی لمبوتی جیبوں کی ساری کمائی دنیا کی بدترین مخلوق پر جسے عرفِ عام میں بادِ صبا کہا جاتا تھا لٹاتا تھا۔ اگر عبدل نے اس رقم کو بچا کر رکھا ہوتا تو آج اسے پریس کانفرنس بلانے کے لیے نئی جیبوں کی تلاش میں سرگرداں نہ ہونا پڑتا۔ پھر بھی ابھی وقت گیا نہیں تھا۔ صبح کا بھولا شام ہونے سے پہلے پہلے گھر واپس آگیا تھا۔ عبدل کو اپنی خودی اور دنیا کی ساری بادِ صباؤں کی بےخودی کا پتا چل گیا تھا۔ بس ایک کانفرنس کی کسر باقی تھی پھر پوری کائنات کو بھی معلوم ہو جاتا کہ وہ چیز جسے حسن و رعنائی کہتے ہیں کس کے پاس اور کس مقدار میں پائی جاتی ہے۔

یقیں محکم ہو اور عمل پیہم ہو تو زندگانی میں ہزاروں جیبیں کاٹی جاسکتی ہیں۔ عبدل نے جو جیب بھی سامنے نظر آئی اس کے ساتھ کوئی رو رعایت نہیں کی۔ ننھے ننھے بچوں کی پونجی تک چھین کر لے بھاگا۔ البتہ اس نے یہ خیال ضرور رکھا کہ کسی عورت پر اس کی نظر نہ پڑنے پائے۔ اور کسی عورت کی رقم اس کی محنت کی کمائی میں شامل ہو کر اسے بدصورت اور بے برکت نہ بنانے پائے۔ ایک دو بار بادِ صبا کا خیال آیا تو اس نے نفرت سے اس بدصورت کے بدصورت خیال کو اپنے خوبصورت ذہن سے جھٹک دیا اور گدھے یا اونٹ یا شیر کے حسن کے بارے میں سوچنے لگا۔

دو دن کی لگاتار محنت کے بعد وہ اتنی رقم حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ فوری طور پر آدھی پریس کانفرنس بلائی جاسکتی تھی۔ بس ایک آنچ کی کسر باقی تھی کہ تیسرے روز ایک خوبصورت بڑے میاں کی جیب سے ستائیس روپے کے علاوہ عبدل کو ایک عدد لفافہ ملا۔ جیبوں سے برآمد ہونے والے خطوط اس کی خصوصی دلچسپی کا باعث ہوتے تھے۔ اور عبدل کو کبھی کبھی ایسی اچھی اچھی باتیں پڑھنے کو مل جاتی تھیں جن پر بڑے بڑے رومانی ناول نچھاور کیے جاسکتے تھے۔ پس عبدل نے بڑے میاں کی جیب سے حاصل ہونے والی رقم نیفے میں رکھی کہ وہ

اپنے دوسرے بھائی بندوں کی حرکتوں سے ناواقف نہیں تھا اور خط لے کر ایک فٹ پاتھ پر جا بیٹھا۔

مختصر سا خط تھا۔ بڑے میاں نے کسی دوسرے بڑے میاں کے نام تحریر کیا تھا۔ سلام دعا اور یہاں سب خیریت ہے اور آپ کی خیریت خداوند کریم سے نیک مطلوب لکھنے کے بعد بڑے میاں نے بڑے میاں کو لکھا تھا۔

"میں اپنے علاج کی غرض سے پندرہ مارواں کو امریکہ جا رہا ہوں اور امریکہ جانے سے قبل مناسب سمجھتا ہوں کہ شہزادی کو کسی نیک، شریف اور خاندانی شخص کے حوالے کر جاؤں۔" پھر آگے چل کر یوں رقمطراز ہوتے تھے۔ "تمہیں تو یاد ہی ہوگا کہ نوزائیدہ شہزادی مجھے ایک کوڑا گھر میں پڑی ہوئی ملی تھی۔ میں نے اس کی اس طرح پرورش کی ہے اور اُسے اس طرح تربیت دی ہے جیسے وہ میری اپنی بیٹی ہو۔ اس کی جدائی کے تصور سے میرا کلیجہ کانپتا ہے۔ اگر امریکہ کا سفر درپیش نہ ہوتا تو میں کسی بھی قیمت پر اُسے اپنے سے جدا نہیں کرتا۔ اگر تمہاری نظر میں کوئی اچھا خاندان ہو جو میری شہزادی کی نازبرداری کر سکے تو مجھے جلد از جلد مطلع کرو اور اگر ممکن ہو سکے تو اُس گھرانے کے کسی فرد کو میرے پاس بھیج دو۔ عین نوازش ہوگی۔

فقط تمہارا دوست علاؤالدین"

خط پڑھتے ہی عبدل کی حالت غیر ہوگئی۔ اس کی تازہ ترین دریافت دھری کی دھری رہ گئی۔ اَن دیکھی اور انجانی شہزادی کا چاند سا مکھڑا اس کی نظروں میں چمکنے لگا۔ عقل نے بہت سمجھایا کہ عبدل تمہیں نیوٹن ثانی بن کر دنیا میں اپنا اور اپنے ماں باپ کا نام روشن کرنا ہے۔ خرد نے پاؤں پکڑے کہا: خوبصورت انسان، بدصورتی سے دل کیوں لگا رہا ہے۔ دماغ آڑے آیا کہ اس منافع پرست دنیا میں دل دینا سب سے بڑی حماقت ہے مگر عبدل شہزادی کا نام پڑھ کر اور یہ جان کر کہ بڑے میاں اپنی عزیز از جان شہزادی کو عبدل جیسے کسی نیک، شریف اور خاندانی انسان کے حوالے کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہو جانا چاہتے ہیں۔ ہوش و حواس اور صبر و قرار کھو بیٹھا۔ پریس کانفرنس بعد میں بھی منعقد کی جا سکتی تھی لیکن شہزادی جیسی حسن کی دیوی بار بار ہاتھ نہیں آسکتی تھی۔ رہی یہ بات کہ مرد عورت سے زیادہ حسین، خوبصورت اور خوبرو ہوتا ہے، سو اپنی جگہ پر بالکل درست تھی لیکن وہ لڑکی جس کا نام شہزادی تھا اور جو کوڑا گھر میں پائی گئی تھی، اس اصول سے محفوظ، اس لیے مستثنیٰ تھی کہ وہ درحقیقت آسمانی حور تھی۔ جو کوڑا گھر میں اُتری تھی۔ شہزادی کی تخلیق عبدل ہی کے لیے کی گئی تھی۔ اس کا نام پڑھتے ہی عبدل کو یاد آیا کہ وہ بچپن سے اُسی کو خوابوں میں دیکھتا آیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ اس نے اپنی زندگی میں بے شمار عشق کیے تھے محبت کسی سے نہیں کی تھی۔ محبت تو صرف ایک ہی سے کی جاتی ہے۔ عبدل نے بھی صرف ایک ہی لڑکی سے محبت کی تھی۔ باقی لڑکیاں تو شہزادی کے سایوں کی طرح تھیں۔ اصل سامنے نہ ہو تو نقل سے دل بہلانا پڑتا ہے۔ مجنوں کو لیلیٰ نہیں ملتی تو وہ اس کے کتے کو غنیمت جانتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ لیلیٰ کی ضرورت و اہمیت کو کم تر سمجھا جائے۔ عبدل بھی اگر دوسری لڑکیوں سے جھوٹا سچا عشق کرتا رہا تھا تو اس کے پس پشت وہی مجنوں اور لیلیٰ والا جذبہ کام کر رہا تھا۔ کسی کو کتے میں اپنی محبوبہ کا جلوہ نظر آسکتا تھا تو عبدل کو بھی دوسری لڑکیوں میں اپنی شہزادی نظر آسکتی تھی۔

عبدل نے آنکھیں بند کر لیں اور تصور ہی تصور میں شہزادی کے حسین چہرے کو دیکھنے لگا۔ اتنا حسین چہرہ اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اُسے جتنی بھی تشبیہات یاد تھیں، شہزادی کے تصور کے سامنے سب کی سب ماند پڑ گئیں، جتنے بھی استعارات اس نے پڑھ رکھے تھے، شہزادی کے حُسنِ جہاں سوز کے سامنے پانی بھرتے نظر آرہے تھے۔ شفق، دھنک، ماہتاب، گھٹائیں، بجلی، تارے، نغمہ، حور۔ اس دامن میں کیا کیا ہے، ہاتھ وہ دامن آئے تو۔

وقت کم تھا اور دنیا میں شریف اور اچھے لوگوں کی کمی نہ تھی۔ خط کے مندرجات سے پتہ چلتا تھا کہ جناب علاؤالدین کو سب سے پہلا جو بھی نیک اور شریف انسان نظر آئے گا۔ وہ اس کے ہاتھوں میں اپنی جان سے زیادہ عزیز شہزادی کا ہاتھ دے دیں گے اور خود عازمِ امریکہ ہو جائیں گے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ اس سے پہلے کہ شہر کے معززین کو شہزادی کے بارے میں علم ہو اور وہ جوق در جوق جناب علاؤالدین کے در دولت کی جانب قدم اٹھانا شروع کریں۔ عبدل اُن کی خدمتِ اقدس میں پہنچ جائے اور درخواست کرے کہ میں آپ کی شہزادی کا شہزادہ ہوں۔ سندھ کا سارا بنجر، بے آب و گیاہ ریگستانی علاقہ میرا ہے۔ میں اور شہزادی ایک دوسرے ہی کے لیے بنے ہیں، آپ شوق سے امریکہ جائیے، شہزادی کی کوئی فکر نہ کیجیے، مجھ خاکسار اور ناچیز شہزادے کے حوالے کر جائیے۔ میں خود دھوپ میں سوؤں گا لیکن شہزادی کو سائے میں سلاؤں گا۔ اُسے کبھی کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچنے دوں گا۔ کیونکہ میں یومِ ازل سے اس کا سچا عاشقِ زار ہوں اور یومِ ابد تک اسی سے سچا عشق کرتا رہا ہوں گا۔ میرے بغیر شہزادی کی اور شہزادی کے بغیر میری زندگی ادھوری ہے۔

اس نے سوچا کہ اللہ داد ہیڈ کانسٹیبل کے پاس جائے اور اسے سچ سچ بتا دے کہ کس طرح آسمان کا چاند ٹوٹ کر اس کی گود میں

کرنے والا ہے۔ بشرطیکہ اللہ داد اس کے باپ کے یا بڑے بھائی کے فرائض انجام دینے پر راضی ہو جائے۔ اس نے چند قدم بڑھانے کی جانب اٹھائے ہی تھے کہ اُسے یاد آ گیا کہ اللہ داد ہیڈ کانسٹیبل پہلے ہی دو بیویوں کا بلا شرکتِ غیرے مالک ہے اور تیسری بیوی گھر لانے کی خواہش رکھتا ہے۔ عبدل کا باپ یا بڑا بھائی بننے کے بجائے اگر خط پڑھ کر اس نے خود اپنے آپ ہی کو جناب علاؤالدین کی فرزندی میں پیش کر دیا تو عبدل تاپتا ہی رہ جائے گا۔ کس سے کہتا پھرے گا کہ اصلی شریف زادہ تو میں ہوں۔ اللہ داد تو خواہ مخواہ بیچ میں آ ٹپکا ہے؟

پس اس نے اللہ داد کے پاس جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ بھئے کو اب کچھ نظر آتے تھے بچھ۔ عبدل نے اپنا رُخ شیرو کے گھر کی طرف کر لیا۔ شیرو کے علاوہ اللہ داد سے اچھا اور مناسب باپ یا بڑا بھائی اُسے چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتا تھا۔ بس شیرو میں تھوڑی سی خرابی تھی۔ صورت شکل سے وہ کسی جیل سے بھاگا ہوا قیدی نظر آتا تھا اور وضع قطع سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی پچھلی سات پشتوں میں نہ کوئی شریف انسان پیدا ہوا تھا اور نہ آئندہ سات نسلوں میں شریف انسان کے پیدا ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ مگر عبدل جانتا تھا کہ اچھا میک اپ کیا جائے تو تھوڑی دیر کے لیے گدھے کو بھی انسان بنایا جا سکتا ہے۔

وہ شیرو کو لے کر سیدھا ایک ہوٹل میں گیا اور پیار و محبت کی چائے پلاتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں یاد ہو گا شیرو! ایک بار تمہارے چولھے پر رکھی ہوئی دیگچی کا دودھ ایک بلی پی گئی تھی۔ مگر یار! تمہیں اصل بات نہیں معلوم، میں تمہارے سامنے اپنے گناہ کا اعتراف کرتا ہوں، دودھ بلی نے نہیں، میں نے پیا تھا۔ دراصل اس روز مجھے بہت زیادہ بھوک لگ رہی تھی۔ تمہاری بیوی پڑوس میں گئی ہوئی تھی اور تم میرے لیے سگریٹ تلاش کر رہے تھے۔ میں نے موقع غنیمت سمجھا اور ہونٹ اور زبان جلنے کی پروا کیے بغیر سارا کا سارا دودھ جو تین پاؤ سے کم نہیں تھا، پی گیا۔“

”تین پاؤ نہیں، پورا ایک کلو دودھ تھا۔“

”تھا تو تین پاؤ ہی لیکن وقت ایسا نہیں ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اچھے دل برے کیے جائیں۔ یہ لو، ڈیڑھ کلو دودھ کے پیسے رکھ لو، انکار مت کرنا، میرے دل کا نازک شیشہ تمہارے انکار کی ٹھیس سے چور چور ہو جائے گا۔ پھر ہم جیسا پاؤ گے کہاں ہے۔“

”انکار کون کم بخت کر رہا ہے؟“ شیرو نے دس روپے کا نوٹ عبدل کے ہاتھ سے جھپٹ کر اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”میرے پاس کُھلّا نہیں ہے، باقی پیسے بعد میں لے لینا۔“

”باقی پیسوں کی کوئی چیز خرید کر میری پیاری بھابی کی خدمت میں پیش کر دینا۔“ عبدل بولا۔ ”کبھی کبھی تو یار شیرو! مجھے تمہاری زندگی پر رشک آتا ہے۔ کتنے خوش نصیب ہو کہ ایک عدد چاند سی بیوی کے شوہر ہو۔ گھر تو حقیقت میں وہی ہے جہاں کسی عورت کی چوڑیاں چھنکتی ہوں، ورنہ گھر اور قبرستان میں فرق ہی کیا رہ جاتا ہے؟“

شیرو حیرت سے عبدل کا چہرہ تکنے لگا۔ ”طبیعت تو ٹھیک ہے؟ تین چار روز پہلے تو تم کچھ اور ہی کہتے پھر رہے تھے۔“

”اس وقت مجھے شہزادی سے عشق نہیں ہوا تھا۔“ عبدل نے گہری آہ بھری۔ ”یہ زندگی اُسی کی ہے جو کسی کا ہو گیا، پیار ہی میں کھو گیا۔ اب جب کہ مجھے زندگی میں پہلی بار کوڑے کے ڈھیر سے برآمد ہونے والی ایک خوبصورت مگر سانولی سی، ان دیکھی اور انجانی شہزادی سے سچا عشق ہوا ہے، میں نے کچھ دنوں کے لیے عزت، شہرت اور دولت حاصل کرنے والے نیوٹن جیسے عظیم الشان اور رفیع الشان منصوبے کے اظہار کو موخر کر دیا ہے کہ یہ آنی جانی چیزیں تو چند روز بعد بھی مل سکتی ہیں۔ مگر ایک چاہنے والا بڑی مشکل سے ملتا ہے۔ شہزادی ہاتھ سے نکل گئی تو دوبارہ کبھی نہیں مل سکے گی۔ چنانچہ اب پہلے شادی کر کے گھر بسایا جائے گا، پھر پریس کانفرنس منعقد کر کے دنیا کو عورت کی ازلی و ابدی بدصورتی سے آگاہ کیا جائے گا کہ زمانے کا دستور ہے یہ پرانا تراشیدم، پرستیدم، شکستم۔“

شیرو کی حیرت کم نہیں ہوئی تھی بلکہ کچھ اور بھی بڑھ گئی تھی۔ عبدل نے اُسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر شریف صورت اور نیک سیرت بڑے میاں کی جیب سے نکلنے والے اس خط کا قصہ دل نشین و دل پذیر سنایا جس میں انھوں نے امریکہ جانے سے قبل اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک، دل کی سرور شہزادی کو کسی کھاتے پیتے اچھے خاندانی شخص کے حوالے کر دینے کا بہترین ترین فیصلہ کیا تھا۔ پورے شہر کراچی میں رہنے کے صرف دو ہی حقیقی نیک اور اچھے خاندانی افراد پائے جاتے تھے، شیرو اور عبدل۔ شیرو پہلے ہی ایک عدد موٹی شیرنی کا لقمۂ تر بن چکا تھا اس لیے شہزادی کا شہزادہ بننے کا حق عبدل اور صرف عبدل کو پہنچتا تھا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ فوری اور بھرپور قدم اٹھایا جائے تاکہ کوئی دھوکے باز بدمعاش، معصوم اور بھولے بھالے بڑے میاں کو کہ نام ان کا جناب علاؤالدین تھا، اپنے دامِ فریب میں پھانس کر حسن کی اس شہزادی کو جو ہنستی تھی تو پھول بکھیرتی تھی اور روتی تھی تو موتی برساتی تھی، حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو جائے۔

شیرو کہ دوست آں باشد کہ گیرد دستِ دوست، تھا۔ فوراً باپ یا بھائی کے بجائے عبدل کا چچا بننے پر راضی ہو گیا۔ نہ صرف راضی ہو گیا بلکہ اس نے عبدل کے سر کی قسم کھا کر یہ وعدہ بھی کر لیا کہ عبدل کی شادی خانہ آبادی کے بعد وہ اپنا ڈیڑھ کمرے والا گھر ڈیڑھ ہفتے کے لیے ہنی مون منانے کی خاطر صرف ڈیڑھ ہزار روپے میں عبدل کو دے دے گا اور خود اپنی بیوی کو لے کر اپنی نابکار ساس کے پاس شکارپور

اَچار کھانے چلا جاتے گا۔

عبدل نے بائیں ہاتھ کی انگلیوں کی محنتِ شاقہ کی اس کمائی سے جو اس نے بین الاقوامی پریس کانفرنس کے سلسلے میں اکٹھا کرنا شروع کی تھی۔ بیش کی دو ہزار روپے نکال کر شیرد کے حوالے کیے۔ پانچ سو روپے ان نئے کپڑوں کے لیے تھے جو اس کے پیارے چچا اور پیاری چچی کو اس کی شادی کے روز زیب تن کرنا تھے۔

اسی شام کو شیرد پڑوس میں رہنے والے ایک شاعر کی شیروانی پہن کر اور سوا دو کلو مٹھائی لے کر جناب علاؤالدین کے دولت خانے پر پہنچا اور اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے عبدل کی بات طے کر آیا۔ واپس آیا تو اتنا خوش تھا کہ زمین پر پاؤں ہی نہیں پڑ رہے تھے۔ بات بے بات قہقہے لگا رہا تھا۔ عبدل کو شبہ سا ہوا کہ شیرد نے چچا بن کر بھتیجے کو دھوکا تو نہیں دیا ہے۔ اور کہیں اپنا رشتہ تو پکا نہیں کر لیا ہے مگر جب اس نے شیرد اور اس کی بیوی کو سرگوشیاں کر کے ہنستے دیکھا تو اسے یقین ہو گیا کہ اس دنیا تے آب و گِل میں ایسی کوئی عورت نہیں پائی جاتی جو سوت آنے کی خوشیاں منائے۔

تیسرے روز غروبِ آفتاب کے فوراً بعد عبدل کی بارات روانہ ہونا تھی۔ عبدل وائٹ ہیپ کے زیرِ تعمیر بنگلہ کو چھوڑ کر منہ بولے چچا چچی کے گھر آ گیا تھا۔ وہ رات بھر تصور میں شہزادی کو اختر شیرانی کی نظمیں اور محمد رفیع کے نغمے سناتا اور دن بھر چھوٹی بڑی جیبیں کاٹتا کہ ہنی مون کا ڈیڑھ ہفتہ تو بہرصورت شان و شوکت سے گزارنا تھا۔ اس عرصے میں پانچ یا چھ مرتبہ نیوٹن کی کششِ ثقل سے ملتی جلتی ہوئی وہ دریافت یاد آئی جس سے ناواقف ہونے کے باعث لوگ باگ حسنِ زن کے بارے حسنِ ظن رکھتے تھے تو اس نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو ڈانٹ دیا کہ نہیں نہیں، دلِ زار ابھی نہیں۔ ابھی تو میں جوان ہوں۔

◉

دوست دشمن کس کے نہیں ہوتے۔ ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں۔ فلک ناہنجار کسی کو خوش اور مطمئن نہیں دیکھ سکتا۔ اس سے پہلے کہ عبدل کی خزاں رسیدہ زندگی میں بہار کا موسم ہنستی مسکراتی شہزادی کو اپنے جلو میں لے کر آتا کہ کسی دشمن نے جنابِ علاؤالدین کے ایسے کان بھرے اور ایسی ہوائیاں اڑائیں اور ایسا جھوٹ بولا کہ عبدل کی خاندانی شرافت اور نجابت خطرے میں پڑ گئی۔ بات صرف شرافت اور نجابت کی ہوتی تو عبدل ہرگز فکر نہ کرتا لیکن مصیبت یہ تھی کہ شرافت اور نجابت کے ساتھ وہ پری بھی جا رہی تھی جس کا نام نامی، اسمِ گرامی شہزادی تھا اور سچ مچ کی شہزادیوں سے زیادہ کوڑے کے ڈھیر پر پائی جانے والی شہزادی پر سجتا اور پھبتا تھا۔

عبدل اور شیرد اور بیگم شیرد سر جوڑ کر بیٹھے کہ کرنا کیا چاہیے۔ ایک روز بعد بارات جانے والی تھی۔ سارے انتظامات مکمل ہو چکے تھے،
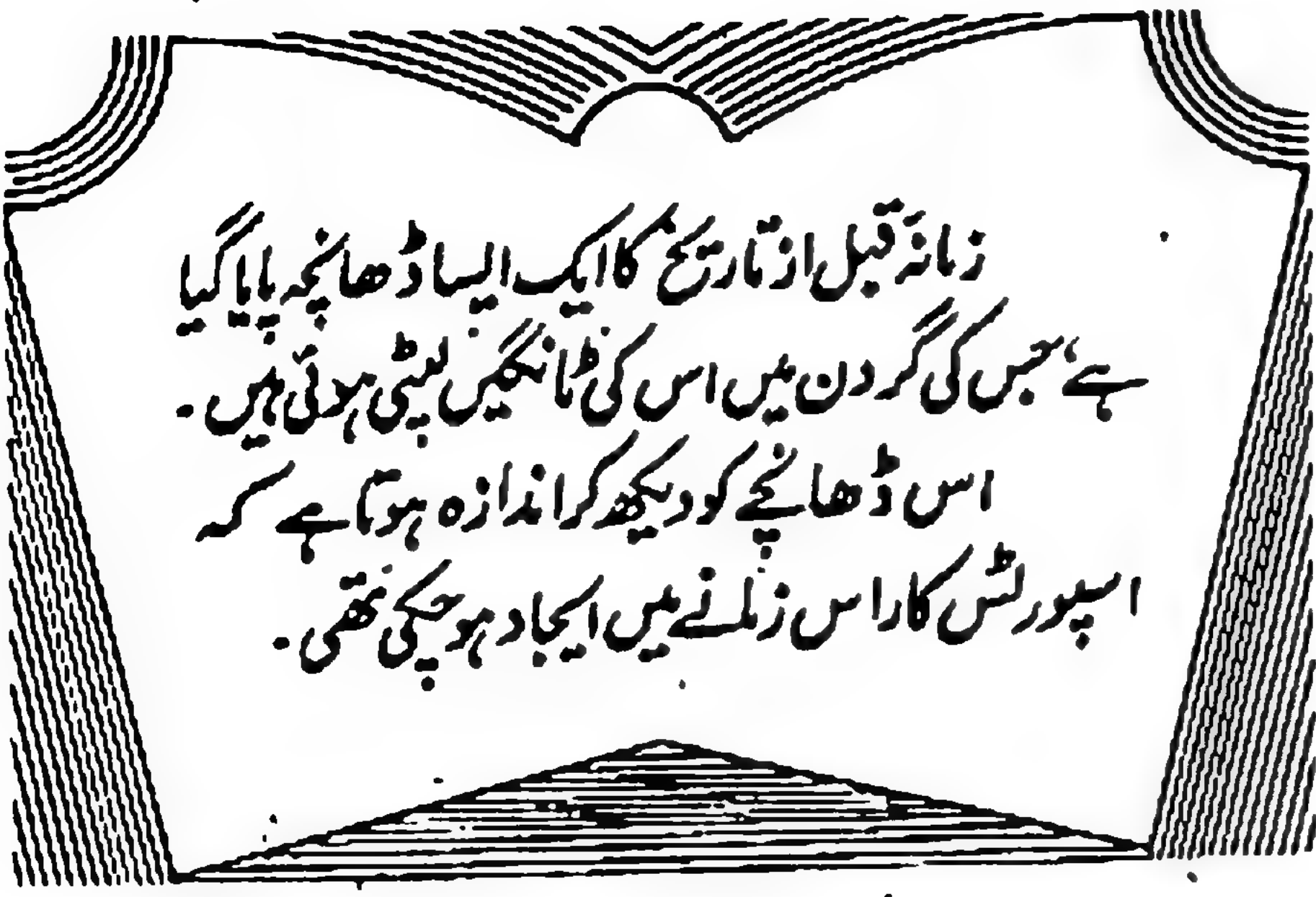
زمانۂ قبل از تاریخ کا ایک ایسا ڈھانچہ پایا گیا ہے، جس کی گردن میں اس کی ٹانگیں لپٹی ہوئی ہیں۔ اس ڈھانچے کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اسپورٹس کار اس زمانے میں ایجاد ہو چکی تھی۔

پاس پڑوس میں نیوتا دیا جا چکا تھا، دو رت جگے دھوم دھام سے منائے جا چکے تھے، تیسرے اور آخری رت جگے کی تیاریاں تھیں کہ آندھیاں غم کی یوں چلیں، باغ اجڑ کے رہ گیا اور سہرے کے پھول کھلے بھی نہیں تھے کہ عبدل یتیم اور بیوہ ہو گیا۔

مگر نہیں، یہ ناممکن تھا عبدل نے پہلی بار شہزادی سے سچا عشق کیا تھا۔ سچا عشق کچا دھاگا نہیں ہوتا کہ جو چاہے، جب چاہے توڑ دے۔ عبدل مجنوں اور فرہاد اور رومیو اور اسی برادری کے دوسرے سچے اور پکے عاشقوں کی طرح جان تو دے سکتا تھا لیکن شہزادی کی محبت سے دستبردار نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے شہزادی کو لوٹ کر چاہا تھا۔ کس طرح ممکن تھا کہ وہ شہزادی کو بھول کر کسی غیر شہزادی سے دل لگاتا۔ اس نے سوچا کہ رات کی تاریکی میں جناب علاؤالدین کے گھر پہ شب خون مارا جائے اور شہزادی کو اغوا کر کے ثابت کر جائے کہ شرافت ایسی ہوتی ہے، نجابت اس کو کہتے ہیں مگر ناقص العقل بیگم شیرد نے مشورہ دیا کہ جلد بازی کی ضرورت نہیں پہلے جناب علاؤالدین سے معلوم کرنا چاہیے کہ ان کا کیا ارادہ ہے اور یہ کہ انھوں نے کیا کیا سنا ہے؟ دنیا کے سبھی شریف زادے جیبیں کاٹتے آئے ہیں بلکہ کچھ شریف زادوں کو تو گردنیں بھی کاٹتے ہوئے دیکھا اور سنا گیا ہے۔ عبدل نے اگر جیبیں کاٹی ہیں تو ایسا کون سا گناہ کیا ہے۔ شیرد نے کہ پکا زن مرید تھا، بیگم کی ہاں میں ہاں ملائی اور اس طرح ان تینوں نے متفقہ طور پہ طے کر لیا کہ برہم ہوں بجلیاں کہ ہوائیں خلاف ہوں، کچھ بھی ہو اہتمامِ گلستاں کریں گے ہم۔

پس وہ تینوں جناب علاؤالدین کے درِ دولت پہ پہنچے شیرد تو خاموش بیٹھا رہا لیکن بیگم شیرد نے جنابِ علاؤالدین کو ایسی بے بھاؤ کی سنائیں کہ انھیں تارے نظر آ گئے۔ عبدل بھی خاموش نہیں بیٹھا اس نے شرم و حجاب کو بالائے طاق رکھا اور صاف صاف بتا دیا کہ یوں زندگی گزار رہا ہوں شہزادی کے بغیر، جیسے کوئی گناہ کیے جا رہا ہوں میں۔ اس نے کہا کہ شہزادی کے بغیر وہ ایک پل بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ وہ ان بوالہوس عاشقوں میں سے نہیں تھا جو تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی کے قائل ہوتے ہیں۔ شہزادی کو اس سے جدا کیا گیا تو کشتوں

کے پشتے لگ جائیں گے، خون کی ندیاں بہہ جائیں گی، ایسی مہابھارت چھڑے گی کہ بڑے میاں تم امریکہ جانا بھول جاؤ گے۔ میں جتنا شریف ہوں اتنا ہی کمین بھی ہوں بلکہ شریف کم ہوں، کمین زیادہ ہوں اور اس بات کا قائل ہوں کہ شہزادی پیار و محبت سے نہ ملے تو اُسے بزورِ شمشیر حاصل کر لینا چاہیے۔ کراچی کے ہر پولیس اسٹیشن پر میرا نام اور حلیہ درج ہے۔ اس نے جنابِ علاؤالدین کو تحت الفظ میں ایک شعر سنایا کہ: بچھڑ کے سارے زمانے سے تم کو پایا ہے، بچھڑ کے رہ گئے تم بھی اگر تو کیا ہوگا۔ پھر دوسرا شعر ترنم سے پڑھا۔ تیری صورت سے نہیں ملتی کسی کی صورت، ہم جہاں میں تری تصویر لیے پھرتے ہیں۔

جنابِ علاؤالدین نے کچھ شیرو کی پُراسرار خاموشی سے، کچھ بیگم شیرو کی ملاحیوں سے اور کچھ عبدل کے دعوئے عشق سے متاثر ہو کر، کچھ لمحوں تک سوچ کر کہا۔ "میں تو صرف اتنا چاہتا ہوں کہ شہزادی کو جسے میں نے بیٹی کی طرح چاہا ہے، کوئی تکلیف نہ پہنچے۔"

"میں بھی اسے بیٹی کی طرح چاہوں گا۔" عبدل نے جلدی سے کہا۔ "میرا مطلب ہے کہ میں اُسے کبھی تکلیف نہیں پہنچنے دوں گا۔ شہزادی کو شہزادیوں کی طرح رکھوں گا اور جب مجھے مرد کی خوبصورتی اور عورت کی بدصورتی والے نظریے کے اظہار کے بعد بین الاقوامی عزت، دولت اور شہرت حاصل ہوگی تب بھی شہزادی کی اہمیت اور حیثیت کو اپنی نظروں میں کم نہیں ہونے دوں گا۔ نوبل پرائز لینے ملک سے باہر جانا پڑا تو یقین کرو بڑے میاں! میری شہزادی میرے ساتھ جائے گی اور میں ببانگِ دہل کہوں گا کہ اگرچہ میرا نظریہ غلط اور جھوٹا نہیں ہے اور اگرچہ مرد زیادہ خوبصورت ہوتا ہے عورت سے لیکن شہزادی کو اس لحاظ سے دنیا کی ساری عورتوں پر برتری حاصل ہے کہ ہر گلستاں میں ہو خزاں یہ ضروری تو نہیں۔"

جناب علاؤالدین بولے۔ "بس، بس اب مجھے یقین آگیا ہے کہ میری شہزادی واقعی تمہارے پاس خوش و خرم رہ سکے گی۔"

عبدل نے مسکرا کر شیرو کی طرف دیکھا اور شیرو نے مسکرا کر بیگم شیرو کی پشت پہ فاتحانہ ٹھوکا رسید کیا۔

"اچھا بڑے میاں!" شیرو نے کہا۔ "اب ہمیں اجازت دیجیے، ہم کل باجے تاشے کے ساتھ آئیں گے اور شہزادی صاحبہ کو......"

"بار بار زحمت کی ضرورت نہیں ہے۔" جناب علاؤالدین بات کاٹ کر بولے۔ "شہزادی تمہارے دوست کی ہوئی تم اُسے ابھی اور اسی وقت اپنے ساتھ لے جاؤ تاکہ میں سکون سے سفر کی تیاری کر سکوں۔"

"ابھی؟" عبدل نے پوچھا۔

"اسی وقت؟" بیگم شیرو کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

شیرو نے باری باری دونوں کو آنکھ ماری کہ اظہارِ حیرت و تعجب نہ کرو قاضی کا انتظام اس گھر میں بھی ہو جائے گا جہاں تمہیں ڈیڑھ ہفتے تک ہنی مون منانا ہے۔ فی الحال تو شہزادی پر قبضہ کرو کہ مفت ہاتھ آئے تو بُری کیا ہے۔ یوں بھی زمانہ نازک ہے، ہو سکتا ہے کل کا سورج نکلتے نکلتے بڑے میاں کا ارادہ بدل جائے یا کوئی سچ مچ کا شہزادہ، شہزادی کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آ جائے۔

"ٹھیک ہے جناب! جیسی آپ کی مرضی۔" عبدل نے سعادت مندی سے کہا۔ "کوئی بھی شریف آدمی کسی بھی شریف آدمی کی بات رد کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ سرِ تسلیم خم ہے، جو مزاجِ یار میں آئے۔"

بڑے میاں نے وہیں بیٹھے بیٹھے ہانک لگائی۔ "زبیدہ!"

اندر سے ایک لڑکی کہ فلمی ہیروئنوں کو اپنے حسن سے شرماتی اور لجاتی تھی، باہر آئی اور بولی۔ "فرمایئے ابا جان؟"

عبدل نے لڑکی کی طرف دیکھا اور نفرت سے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ شہزادی کے سامنے اس کنیز کی حیثیت ہی کیا تھی۔ ویسے بھی وہ ایک لڑکی تھی اور عبدل کے تازہ نظریے کے مطابق خواہ لڑکیاں کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہوں، مردانہ حسن و وجاہت کے مقابلے میں محض بکواس تھیں۔

"دیکھو بیٹی!" بڑے میاں نے کہا۔ "یہ اچھے، شریف اور خاندانی لوگ ہیں اور ہماری شہزادی کو لینے آئے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ شہزادی کا پورا پورا خیال رکھیں گے۔ کیا شہزادی نے رات کا کھانا کھا لیا ہے؟"

"سرِ شام ہی کھا لیا تھا۔"

"پھر ایسا کرو کہ یہاں لا کر ان اچھے، شریف اور خاندانی لوگوں کے حوالے کر دو۔"

لڑکی اثبات میں سر ہلاتی ہوئی واپس چلی گئی۔ عبدل نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنی شہزادی کے لازوال حسن کے تصوّر میں کھو گیا۔ پیدائش سے لے کر آج تک اس نے جتنی لڑکیاں دیکھی تھیں اور آج کے بعد مرتے دم تک جتنی بھی لڑکیوں کو دیکھنے والا تھا، ان سب کا اور اُتنی ہی دوسری لڑکیوں کا ملا جُلا حسن و جمال اس کی شہزادی کی چھنگلی کی پہلی پور کے حسن و جمال کی گرد تک بھی نہیں پہنچتا تھا۔

آہٹ پر اس نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ بڑے میاں کی بیٹی خراماں خراماں چلتی چلی آ رہی تھی، اس کے دائیں ہاتھ میں ریشم کی ڈور کا ایک سرا تھا، دوسرا سرا ایک کتیا کے گلے کے پٹے میں پڑا تھا اور وہ چمکار چمکار کر کتیا سے کہہ رہی تھی۔ "جاؤ شہزادی! اب آج سے تم نئے اچھے، شریف اور خاندانی لوگوں کے ساتھ رہا کرو گی۔"

اس سے قبل کہ لڑکی عبدل کے قریب آتی اور ریشم کی ڈور کا سرا عبدل کو تھماتی، عبدل نے زوردار نعرہ لگایا۔ "خدا کی قسم! میں اچھا، شریف اور خاندانی آدمی ہرگز نہیں ہوں۔" اور بگٹٹ بھاگا باہر کی طرف۔

اس کے پیچھے شیرو اور بیگم شیرو چلاتے ہوئے لپکے۔ "لوٹا لے کر بھاگا ہے۔ لینا پکڑنا جانے نہ پائے۔"

تشریف رکھیے

نسیم جاوید سید

"تشریف رکھیے" ایک بے ضرر سا جملہ جسے ہم صبح سے شام تک نہ جانے کتنی بار سنتے اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ لیکن یہ کہانی پڑھنے کے بعد شاید آپ اتنی آسانی سے اس پر عمل نہ کر سکیں۔ ایک ذہین سائنسدان کا قصہ جس نے مجرم کو پہچاننے کے لیے بڑا خوبصورت طریقہ اختیار کیا تھا

شہرآفاق سائنس دان پروفیسر جیرڈم بیگلی اپنی وسیع و عریض ریاست کے ایک دور افتادہ اور بالکل الگ تھلگ گوشے میں واقع اپنی لیبارٹری بلڈنگ کے آفس روم میں تنہا بیٹھا تھا۔ وہ اٹھتر سال کا، بھورے بالوں اور ذہانت سے پر، چمکیلی آنکھوں والا ایک صحت منداور ظیم شحیم انسان تھا۔ کیمسٹری کے شعبے میں اس کی طویل اور بیش بہا خدمات نے اس پر عزت، شہرت اور دولت کے دروازے کھول دیے تھے۔ وہ ہر سائنس دان کی طرح لباس کے معاملے میں خاصا لاپروا واقع ہوا تھا اور عموماً بھورے رنگ کے ایک ڈھیلے ڈھالے بے ہنگم سے سوٹ میں نظر آتا تھا۔

اس وقت دوپہر کے ایک بج کر پانچ منٹ ہوتے تھے۔ پروفیسر کسی کے انتظار میں اپنی وسیع میز پر کہنیاں ٹکائے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں الجھا کر بے حس و حرکت بیٹھا خالی نظروں سے کسی نادیدہ شے کو گھور رہا تھا۔ کمرے میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی اور ٹائم پیس کی ٹک ٹک سے گویا خاموشی کا دل دھڑک رہا تھا۔ کمرے میں زیادہ سازوسامان نہیں تھا۔ صرف ایک وسیع میز دو کرسیاں، ایک لوہے کی الماری اور میز پر رکھی ہوئی ٹائم پیس اس کمرے کی کل کائنات تھی۔ دفعتاً دروازے پر ہونے والی دستک کی آواز نے کمرے کا سکوت درہم برہم کر دیا۔

"آجائیے۔" پروفیسر کی آواز گونجی اور ایک شخص دروازہ کھول کر اندر آگیا۔ جو تقریباً چالیس سال کا ایک دبلا پتلا، وجیہہ اور خوش وضع انسان تھا۔ اس کی یہ وضع قطع یقیناً صنف نازک کے لیے کشش کا باعث ہوگی۔ لیکن اس سے ایک نوع کا عامیانہ پن ٹپکتا تھا۔ اور

اس کی شخصیت کے پرتے سے چاپلوسی اور عیاری ہویدا ہوتی تھی۔

"بیٹھ جاؤ۔" پروفیسر نے اپنی میز سے چھ فٹ سے بھی زیادہ فاصلے پر رکھی ہوئی واحد کرسی کی جانب اشارہ کیا۔ کرسی پر چمڑا منڈھا ہوا تھا اور یہ دبیز گدے دار، اسپرنگ والی ایک بھاری بھرکم اور بے حد آرام دہ کرسی تھی۔ نووارد اپنے لبوں پر ایک پژمردہ مسکراہٹ سجائے بڑھ کر اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ ایسے میں کرسی پر منڈھا ہوا چمڑہ چرچرایا اور نووارد اس کے گدے میں دھنس گیا۔ "میں حاضر ہوں پروفیسر۔" اس نے لب کشائی کی۔ "این نے بتایا تھا کہ تم مجھ سے خاندانی معاملات پر گفتگو کرنا چاہتے ہو۔ تمہارے بٹلر نے مجھے آگاہ کیا کہ تم اس وقت یہاں ملو گے۔"

"مسٹر اسٹرلنگ!" پروفیسر نے لب کھولے اور اپنا ایک ہاتھ کاہلی سے میز کی سطح پر رکھ کر ٹھہری ہوئی آواز میں رک رک کر گویا ہوا۔ "میں اپنی گفتگو کا آغاز اس تنبیہہ سے کر رہا ہوں کہ اس کرسی سے اٹھنے کی ہرگز کوشش نہ کرنا۔ اگر تم نے کوشش کی تو یہ تمہاری زندگی کی آخری حرکت ثابت ہوگی اور تمہارے جسم کے چیتھڑے اڑ جائیں گے۔"

اسٹرلنگ کے لبوں پر رقص کرتی ہوئی مسکراہٹ چشم زدن میں دم توڑ گئی۔ اور اس کی سیاہ آنکھیں حیرت اور خوف سے ابل پڑیں "کیا مطلب ہے؟"

"اس کرسی کے پائے فرش کے نیچے ایک اسپرنگ پر قائم ہیں۔" پروفیسر گہری سنجیدگی سے وضاحت کرنے لگا۔ "جب تم کرسی پر بیٹھے تو تمہارے وزن نے اسپرنگ کے ایک سرکٹ کو آزاد کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنی میز میں نصب ایک خفیہ سوئچ آن کر دیا ہے۔ جو اندرونی طور پر اس اسپرنگ کے میکنزم سے منسلک ہے۔ اب اگر تم نے کرسی پر سے اپنا وزن ہٹانا چاہا تو اسپرنگ کا وہ سرکٹ بند ہو جائے گا۔ نتیجتہً عمارت کی بنیاد میں شدید ترین دھماکہ ہوگا اور اس پوری عمارت کے پرخچے اڑ جائیں گے۔" پروفیسر خاموش ہو گیا۔ اسٹرلنگ کا چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ اور کرسی کے ہتھے پر رکھے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ کر رہ گئے۔ معاً ایک خیال اس کے ذہن کے پردے پر لہرایا۔ "تم جھوٹ بول رہے ہو۔" وہ تقریباً چیخ پڑا۔ "اور اگر واقعی یہ سچ ہے تو میرے ساتھ تم بھی مارے جاؤ گے۔ تمہارے جسم کے بھی پرخچے اڑ جائیں گے۔"

"میری عمر اٹھتر سال ہے۔" پروفیسر کا لہجہ بے حد سرد تھا۔ "میری ساری زندگی انسانیت کی خدمت کرتے ہوئے گزر گئی ہے۔ اور میں انسانیت کی مزید تھوڑی بہت خدمت کرنے کی خواہش رکھتا تھا لیکن اب ان خدمات کے بجائے اس تھوڑی سی مہلت میں اپنے خاندان کے خوشگوار اور پرسکون مستقبل کی خاطر کچھ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اب انجام جو بھی ہو۔ اگر تم میرے ساتھ اس انجام تک پہنچنا چاہتے ہو تو یہی سہی۔" پروفیسر کے لہجے کی متانت، اس کے چہرے اور آنکھوں سے جھلکتے ہوئے اعتماد اور ارادے کی پختگی نے اسٹرلنگ کو قائل کر دیا کہ اس کے منہ سے نکلنے والا ایک ایک لفظ حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس کی ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے پھوٹ پڑے۔ "لل... لیکن... کیوں؟" اس نے بمشکل تھوک نگلا۔

"اس لیے کہ تم نے میرے خاندان کو بلیک میل کرنے کی انتہائی مذموم کوشش کی ہے۔" پروفیسر نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ "جب اخبارات نے تمہارے ساتھ میری نواسی کی منگنی کی خبر شائع کی تو میرے ذہن میں اس معاملے کی چھان بین کرنے کا خیال آیا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ این ایک پرلے درجے کی احمق اور عاقبت نااندیش لڑکی ہے۔ اسے بھلے برے کی کوئی تمیز نہیں۔ ممکن ہے تمہارے پاس دولت ہو اور یہ بھی بعید از قیاس نہیں کہ شادی کے بعد مزید دولت تمہارے ہاتھ آ جائے گی کیونکہ این اور اس کی والدہ کے ذرائع آمدن محدود نہیں ہیں۔ لیکن میرے خاندان میں شادی کرنے کا خیال تمہاری ایک ایسی بھول ہے جسے میں کسی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتا۔"

"تم... میں...!" اسٹرلنگ نے کچھ کہنا چاہا لیکن اظہار کے لیے الفاظ نہ ملے۔

"میں نے تمہارے سلسلے میں مکمل تفتیش کی ہے۔" پروفیسر نے سلسلۂ تکلم جاری رکھا۔ "تم ایک بلیک میلر ہو۔ تم نے ایک طویل عرصے سے عورتوں کی بلیک میلنگ کو اپنا ذریعۂ معاش بنایا ہوا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ تم نے میرے خاندان کی عورتوں کو کس طرح متاثر کیا یا ان کی کس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر انہیں اپنی گرفت میں لیا۔ اور نہ ہی جاننا چاہتا ہوں۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ سروکار اگر ہے تو صرف اور صرف اپنی نواسی کی شادی سے جو تم نے اس پر مسلط کی ہے۔ میرا مقصد اس کو ہونے سے روکنا ہے۔ خواہ اس کے لیے مجھے تمہارے ساتھ یہاں مرنا ہی کیوں نہ پڑے۔ تمہارے خلاف تفتیش کے دوران یہ بات میرے علم میں آئی کہ تم خاصے ہوشیار اور محتاط واقع ہوئے ہو۔ اور آج تک قانون کی گرفت میں نہیں آئے۔ لیکن آج میری گرفت میں آ گئے ہو۔"

اسٹرلنگ نے اپنی کیفیت پر قابو پانے کی سعی کی لیکن اپنی اس کوشش میں اس کے چہرے پر مزید دہشت چھا گئی۔ اس نے جال میں آئے ہوئے شکار کی مانند خوفزدہ نگاہوں سے پروفیسر کو گھورا اور اپنے خشک لبوں کو تر کیا۔ "تو تم میرے متعلق سب کچھ جان چکے ہو۔" وہ غرایا۔ "لیکن تم میرے ساتھ اتنا برا سلوک نہیں کر سکتے جس کی

دھمکی دے رہے ہو۔ کیونکہ تم نے خود کہا ہے کہ اگر میں کرسی سے اٹھ گیا تو نتیجے میں ہم دونوں کے پرخچے اڑ جائیں گے۔"

"ہاں۔ میں نے یہی کہا ہے اور اگر تم اس کی صداقت کو پرکھنا چاہتے ہو تو... تمہیں کرسی سے اٹھنا پڑے گا۔" پروفیسر کا لہجہ اکسانے والا تھا۔

اسٹرلنگ عالم کشمکش میں پروفیسر کو محض گھورتا رہ گیا۔ پھر دھمکی آمیز لہجے میں مخاطب ہوا۔ "اگر میں اس طرح ہلاک کر دیا گیا۔ تو..." اس نے رک کر پروفیسر کو خشمگیں نظروں سے گھورا۔ "تو وہ سارے کاغذات اور تصویریں جو کہ میرے سیف میں محفوظ ہیں چوبیس گھنٹے کے اندر اندر روزنامہ ہیرنر کو بھیج دی جائیں گی۔ میں یہاں آنے سے قبل سارے انتظامات مکمل کر چکا ہوں۔ کیا تم نے سوچا ہے کہ تصویریں اس روزنامے میں شائع ہوں گی تو تمہارے اعلیٰ خاندان کی عزت اور شرافت کا کیا مول رہ جائے گا؟" بلیک میلر کا لہجہ طنز آمیز تھا۔

"ہاں۔ سوچا ہے۔" پروفیسر نے گہری سنجیدگی سے اپنا سر ہوئے ہوئے اثبات میں ہلایا۔ "شائد تمہیں یہ جان کر مایوسی ہوگی کہ میں نے سارے ممکن پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد ہر قسم کی پیش بندی کر لی ہے۔ اخبار کا نام ظاہر کرنے کا شکریہ۔ لیکن میرا ذاتی خیال بھی یہی تھا کہ تم نے اس سلسلے میں کثیر الاشاعت اور مقبول عام روزنامے کو زحمت دی ہوگی۔ بہرکیف، میں تمہیں یہ بتانا چاہوں گا کہ دو روز قبل میں نے یہ اخبار انتہائی خاموشی سے خرید لیا ہے۔ اب میرا نمائندہ اس اخبار کا انچارج ہے۔ اور اگر میں یہاں تمہارے ساتھ ہی مر گیا تو اس صورت میں میرے اٹارنی سارا معاملہ خود ہی سنبھال لیں گے۔ انہیں اس کی پیشگی ہدایت دی جا چکی ہے۔ کیا تمہارے ترکش میں کوئی اور تیر بھی ہے؟" پروفیسر نے سانسنے عام سے لہجے میں دریافت کیا۔ گویا بلیک میلر کا جواب اس کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہ رکھتا ہو۔

اسٹرلنگ نے دوبارہ اپنے خشک لبوں کو زبان پھیر کر تر کیا۔ اور شدید خوف و نفرت سے اس کا چہرہ مزید بگڑ گیا۔ "تت۔ تم کیا چاہتے ہو؟" اس کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے ناپاک وجود کو میرے خاندان اور اپنے ان دیگر مؤکلوں سے دور کر لو جنہیں تم نے اپنی معاش کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔" پروفیسر نے جواب دیا۔

"اور میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ تم وہ سارے کاغذات اور تصویریں میرے حوالے کر دو جو تم نے اپنی تجوری میں محفوظ کر رکھی ہیں۔ اگر میں انہیں اپنی زندگی میں حاصل نہ کر سکا تو ویسے بھی، وہ ہم دونوں کی ہلاکت کے بعد میرے اٹارنی کے ہاتھوں تلف کر دی جائیں گی۔ اب اس کا انحصار تم پر ہے۔" پروفیسر کے لب و لہجے اور چہرے کے تاثرات نے اسٹرلنگ کی امید کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے پروفیسر کو گھورتا چلا گیا۔ کمرے میں گہری خاموشی مسلط ہو گئی تھی۔ اسٹرلنگ نے پھر سکوت توڑنا چاہا لیکن اس کے کھلے منہ سے کوئی آواز نہ نکل سکی خاموشی میں بتدریج اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور اسٹرلنگ اپنا دل واضح طور پر اپنے کانوں میں دھڑکتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ اس کا چہرہ پسینے سے تر ہو چکا تھا اور رنگت کفن کی مانند سفید پڑ گئی تھی۔ پروفیسر لہر بہ لب لئے سرد اور بے حس آنکھوں سے گھور رہا تھا اور وہ اس سے نگاہیں چرانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ اس کے ذہن میں چنگاریاں سی اڑ رہی تھیں۔ جسم کے روئیں روئیں میں آگ سی لگی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن وہ اس خطرناک کرسی پر کسمسانے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ "خفیہ کاغذات اور تصویریں میرے سیف ڈپازٹ میں محفوظ ہیں۔" اس نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے مرتعش لہجے میں کہا۔ "اور میری زندگی میں میرے سوا کوئی شخص اسے ہاتھ نہیں لگا سکتا۔"

"اگر یہ سچ ہے تو مجھے تمہاری بدقسمتی میں کوئی شک نہیں۔ یا پھر شائد یہ ہم دونوں ہی کی بدقسمتی ہو۔ لیکن میں اسے سچ تسلیم کرنے پر تیار نہیں۔ میں تمہارے دستخط شدہ مختار نامے کے حصول کے سارے انتظامات کر چکا ہوں۔ میں کوئی گمنام شخص نہیں ہوں۔ میں تمہیں

اس مختار نامے کی وصولیابی کی پکی رسید دوں گا۔ اس پر میری مہر اور
دستخط ثبت ہوں گے۔ لہٰذا کوئی کلام نہیں کہ تمہارے اس مختار نامے
اور چابی کی بدولت میرے اٹارنی وہ چیزیں تمہارے سیف سے
نکالنے میں بہ آسانی کامیاب ہو جائیں گے۔" پروفیسر نے کہا اور اسٹرلنگ
گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کمرے میں ایک دفعہ پھر خاموشی چھا
گئی تھی۔

کچھ دیر کے بعد اسٹرلنگ نے مہر سکوت توڑی۔ "اگر میں وہ
خفیہ کاغذات اور تصویریں تمہارے حوالے کردوں تو اس کے بعد
کیا ہوگا؟"

"ان اشیاء کے حصول سے لے کر انہیں تلف کیے جانے
تک تم اس کرسی پر آرام سے بیٹھے رہو گے۔"

"کیا میں اس دوران محفوظ رہوں گا؟"

"جب تک کرسی پر بیٹھے رہو گے۔ اس وقت تک میں تمہاری
زندگی کی ضمانت دے سکتا ہوں۔ شاید تم نے غور کیا ہو کہ اس کمرے
میں ایسی کوئی شے نہیں ہے جسے تم اپنے وزن کے متبادل کرسی پر
رکھ سکو۔ اگر ایسے بھی تو کرسی پر سے اٹھے بغیر مطلوبہ شے تک نہیں
پہنچ سکتے۔ لیکن یہ کوشش بھی لاحاصل ثابت ہوگی کیونکہ ہر شے
اپنی جگہ بالکل مستحکم ہے اور جیسا کہ تم جانتے ہو کہ اس عمارت سے
قریب ترین عمارت کم از کم آدھے میل دور واقع ہے۔ اور یہ کمرہ مکمل
طور پر ساؤنڈ پروف ہے۔ لہٰذا اگر تم میری واپسی تک اس نشست
پر ساکت و سامت بیٹھے رہے تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔ میں
واپس آکر اس کا سوئچ آف کردوں گا۔"

"لیکن اگر میں دستخط کرنے سے انکار کردوں تو؟"

"تو میں تمہیں یہاں تنہا چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ اور گاہے گاہے
اس وقت تک تمہاری مزاج پرسی کے لیے آتا رہوں گا جب تک
تم بھوک، پیاس اور دیگر تکالیف سے گھبرا کر میری شرائط ماننے پر
مجبور نہ ہو جاؤ۔ واضح رہے کہ میری اجازت کے بغیر اس عمارت
میں کوئی پرندہ بھی نہیں مار سکتا۔"

"لیکن اگر تم نے یہاں سے جانے کی کوشش کی تو میں کرسی چھوڑ
کر اٹھ جاؤں گا۔" اسٹرلنگ نے غرا کر دھمکی دی۔

"یہ ایک احسن فعل ہوگا۔ میں اپنی تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش
ہو چکا ہوں اور یہاں مرنے کا ارادہ لے کر ہی آیا تھا۔ لیکن تم...؟"

جواب میں اسٹرلنگ محض تھوک نگل کر رہ گیا۔ پروفیسر کی
باتوں نے اس کے دماغ کی چولیں ہلا دی تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں
آرہا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے؟ اس نے زندگی میں کبھی ایسی بے بسی
کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ وہ عملی طور پر ایک آتش فشاں کے دہانے پر بیٹھا
ہوا تھا۔ اس کی ذرا سی غلط حرکت اس آتش فشاں کا دہانہ کھول دیتی
اور پھر ایک تنکا بھی اپنی جگہ سلامت نہ رہتا۔ وہ دہشت آمیز نظروں
سے پروفیسر کو ایک ٹک گھورے جا رہا تھا۔ لیکن پروفیسر اس کی نیت
سے قطعی بے نیاز نظر آرہا تھا۔ اس کے چہرے پر اپنی موت کے خوف
کا ہلکا سا عکس بھی نہیں تھا۔ اسٹرلنگ۔ اس کی جرأت اور بے خوفی
پر حیرت زدہ رہ گیا تھا اور پھر وہ اندر سے ٹوٹنے لگا۔ احساس
شکست کی ایک تیز لہر ابھری اور اس نے اسٹرلنگ کے وجود کو پوری
طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس کی آنکھوں کی چمک یکایک ماند
پڑ گئی "ٹھیک ہے۔ میں دستخط کردوں گا۔" اس نے شکستہ لہجے میں
کہا۔

ضروری کاغذی کارروائیوں سے فارغ ہونے میں زیادہ دیر
نہیں لگی۔ پروفیسر مختار نامہ اور چابی اپنی جیب میں رکھ کر دروازے
کی سمت بڑھ گیا۔

"خدا کے لیے جلد از جلد واپس آکر مجھے اس کرسی سے نجات
دلاؤ۔" اس کے جاتے جاتے اسٹرلنگ بری طرح گڑگڑایا۔

پروفیسر نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا۔ "میں وقت ضائع
نہیں کیا کرتا۔" اس نے جواب دیا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

❋

اس وقت شام کے چار بج رہے تھے۔ پروفیسر اس عمارت
کے بیرونی پھاٹک پر کسی کا منتظر تھا کہ ایک نامہ بر نے آکر ایک پیکٹ
اس کے حوالے کیا۔ پروفیسر نے پیکٹ شکریے کے ساتھ وصول کرلیا اور اسے
لے کر نچلی منزل میں واقع اپنے خصوصی کمرۂ مطالعہ میں پہنچا۔ اس نے پیکٹ
کھول کر اندر موجود سارے کاغذات اور تصویریں نکال لیں اور بلیک میل
ہونے والی خواتین کی ایک فہرست تیار کی۔ پھر ان سارے کاغذات
اور تصویروں کے پرزے پرزے کر کے جلتے ہوئے آتش دان میں جھونک
دیا اور اپنی نگاہوں کے سامنے انہیں راکھ میں تبدیل ہوتے دیکھتا رہا۔

پانچ بجے جب وہ دوبارہ لیبارٹری کے آفس روم میں داخل ہوا تو
اسٹرلنگ تھکن سے نڈھال سخت بیزاری کے عالم میں کرسی پر پہلو
بدل رہا تھا۔ پروفیسر کے کوٹ کی ایک جیب اس ریوالور کے وزن
سے جھول رہی تھی جو اس نے کمرۂ مطالعہ سے اٹھایا تھا۔ وہ دھیرے
دھیرے قدم اٹھاتا ہوا اپنی وسیع و عریض میز کے عقب میں بچھی ہوئی
مخصوص کرسی پر تھکے تھکے سے انداز میں بیٹھ گیا۔ "اسٹرلنگ۔" وہ بلیک میلر
سے مخاطب ہوا۔ "میں نے ان کاغذات اور تصویروں کا معائنہ کرنے
کے بعد انہیں نذر آتش کردیا ہے۔ لیکن یہ ناکافی ہے۔ کیونکہ میں اچھی
طرح جانتا ہوں کہ یہاں سے آزاد ہونے کے بعد تم بلیک میلنگ
کا دھندہ از سر نو شروع کردو گے۔ اور اپنی زندگی کی آخری سانس تک
اس سے تائب نہیں ہو گے۔ تم جب تک زندہ رہو گے اس وقت تک
تمہاری مؤکل خواتین خود کو غیر محفوظ تصور کریں گی۔ لہٰذا میں تمہارے ساتھ

مرنے کا فیصلہ کر کے لوٹ آیا ہوں۔ جب تم ذہنی طور پر خود کو مرنے کے لیے تیار پاؤ تو کرسی سے کھڑے ہو جانا۔"

اسٹرلنگ کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ "تم پاگل بڈھے" وہ حلق پھاڑ کر چیخا۔ "سوئچ آف کر کے مجھے یہاں سے جانے دو۔ میں یہ شہر چھوڑ دوں گا۔ تم آئندہ کبھی میرے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں سنو گے۔ تم نے میرا سب کچھ تباہ کر دیا ہے۔ اب اور کیا چاہتے ہو؟ میں کہتا ہوں اب مجھے جانے دو۔"

"تم جیسے بے غیرت اور ضمیر فروشوں کا وعدہ میری نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔" پروفیسر نے سرد مہری سے کہا۔ "میں نے جس مشن کا آغاز کیا ہے اسے انجام تک پہنچانے کی واحد صورت یہی ہے کہ جب مرضی ہو کرسی چھوڑ کر کھڑے ہو جاؤ۔ ہم ساتھ مریں گے۔ اس طرح کسی کو اس بات کا شبہ نہیں ہوگا کہ اس عمارت کی تباہی کسی حادثے کا نتیجہ نہیں تھی۔ اٹھو اسٹرلنگ۔ تاخیر سود مند نہیں ہوگی۔"

"میں نہیں اٹھوں گا۔" اسٹرلنگ جھلا کر چیخا۔ اس کا جسم خوف اور وحشت سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ "میں اس کرسی پر اس وقت تک بیٹھا رہوں گا جب تک کوئی تمہاری طویل غیر حاضری سے پریشان اور فکرمند ہو کر تمہیں ڈھونڈتا ہوا یہاں آ نہ جائے۔ اور مجھے پختہ یقین ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔"

جواب میں پروفیسر نے تائید میں گردن ہلائی۔ "اگر تم اس بزدلی کا ثبوت دیتے ہو تو اس امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا چار و نا چار میں خود کو ہلاک کرنے کا فیصلہ واپس لیتا ہوں۔ میں نے اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا تھا۔ لہٰذا اس سلسلے میں مزید پیش بندی کا فوری اضافہ کر دیا ہے۔" یہ کہہ کر پروفیسر نے اپنی میز کی ایک دراز کھولی اور جھک کر کوئی شے ٹٹولنے لگا۔ اسٹرلنگ دم بخود سنسناتے ذہن اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے پروفیسر کو گھورتا رہا۔ پروفیسر کی حرکات و سکنات خاصی مشکوک اور پراسرار تھیں۔ کئی لمحوں تک اپنی پراسرار حرکتوں میں منہمک رہنے کے بعد اس نے سیدھے ہو کر میز پر رکھی ہوئی ٹائم پیس اٹھالی۔ اور اس کی سوئی گھما کر اس کا رخ اسٹرلنگ کی جانب کر دیا۔ اسٹرلنگ کا دل اتنی شدت سے دھڑکنے لگا گویا سینے کی دیوار توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ پروفیسر نے اس کے پسینے سے تر چہرے اور کپکپاتے ہونٹوں کو دیکھا لیکن کوئی تاثر لیے بغیر گہری متانت سے مخاطب ہوا۔ "تم چونکہ مجھے اپنے ساتھ لے کر مرنا نہیں چاہتے لہٰذا میں نے عمارت کی بنیاد میں موجود ڈائنامائٹ کے نظام کو ایک ایسے خودکار آلے سے منسلک کر دیا ہے جو ٹھیک اپنے مقررہ وقت پر اس نظام کو حرکت دے دے گا۔ اس وقت پانچ بج کر سات منٹ ہوئے ہیں۔ اور کرسی نہ چھوڑنے کی صورت میں اب سے دس منٹ کے بعد یعنی ٹھیک پانچ بج کر سترہ منٹ پر یہ عمارت ملبے کے ڈھیر میں تبدیل ہو جائے گی۔" اتنا کہہ کر پروفیسر نے ایک گہری سانس کھینچی اور اپنی نشست سے اٹھ کر دروازے کی سمت بڑھنے لگا۔ اسٹرلنگ کی کیفیت قابلِ دید تھی۔ وہ شدید ہسٹریائی انداز میں چیخ چیخ کر پروفیسر سے رحم کی بھیک مانگنے لگا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی بھی لمحہ بیہوش ہو کر گر پڑے گا۔ لیکن پروفیسر اس کی چیخ و پکار سے متاثر ہوئے بغیر قطعی لاتعلق ہو کر قدم اٹھاتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔

✿

عمارت سے نکل کر پروفیسر پُروقار قدموں سے پختہ روش پر آہستہ آہستہ چلتا ہوا ایک جگہ رک گیا اور اپنی رسٹ واچ پر نگاہیں مرکوز کر کے خاموشی سے انتظار کرنے لگا۔ یہاں تک کہ دس منٹ گزر گئے۔ وہ انہی قدموں سے لوٹ کر دوبارہ اپنے آفس روم میں داخل ہوا اور کئی لمحوں تک اس کرسی پر غیر فطری انداز میں بکھرے ہوئے اسٹرلنگ کو پرسکوت نظروں سے گھورتا رہا۔ پھر قریب پہنچ کر اس کی نبض دیکھی۔ نبض خاموش تھی۔ اس نے اس کی بے جان کلائی چھوڑ دی۔ اور بڑھ کر میز پر رکھے ہوئے فون کا ریسیور اٹھالیا۔ "لیفٹیننٹ ماربل۔" نمبر ڈائل کرنے کے بعد رابطہ قائم ہونے پر وہ ماؤتھ پیس میں بولا۔ "میں پروفیسر جیروم بیگلی بول رہا ہوں۔ ہیرولڈ اسٹرلنگ مجھ سے ملنے میری لیبارٹری میں آیا تھا۔ لیکن دورانِ گفتگو اس کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ بہتر ہے کہ آتے ہوئے اپنے ساتھ میڈیکل ایگزامنر کو لیتے آؤ۔ میں یہاں لاش کے پاس موجود ہوں۔" ریسیور کریڈل پر رکھنے کے بعد وہ مردہ اسٹرلنگ کی جانب مڑا۔ اور خود کلامی کے سے انداز میں اس سے مخاطب ہوا۔ "احمق اور ناپاک بلیک میلر۔ اگر تو بدکردار نہ ہوتا تو اتنا بزدل نہ ہوتا اور بزدل نہ ہوتا تو یقیناً اس کرسی سے اٹھنے کی جرأت کرتا۔ کیونکہ درحقیقت یہ دیگر کرسیوں کی طرح ایک عام سی بے ضرر کرسی ہے اور اس عمارت میں کسی ہلاکت خیز مادے یا آلے کا کوئی وجود نہیں ہے۔"

"مجھے بیکیوں سے نفرت ہے۔"
"کیوں؟"
"پیچھے بیٹھتا ہوں تو گھٹن سے متلی ہونے لگتی ہے۔ آگے بیٹھتا ہوں تو ٹریفک کو دیکھ کر دل بند ہونے لگتا ہے۔"

Jasoosi Digest February 1983

کے قابل قیدیوں کو وہ اپنے کلینک لاکر ان کے گردے بھی نکال لیا کرتا تھا۔ آسیہ کا ایک گردہ ڈاکٹر دھمن نے ہی نکالا تھا۔ ڈاکٹر عذرا نے آسیہ کا گردہ تبدیل کرنے کے لیے کہا تو میں اور آبی پہلے ڈاکٹر دھمن کے ملازم حیدر کو اٹھا لائے مگر وہ بھی ایک گردے سے محروم نکلا۔ پھر ہم ڈاکٹر دھمن کے شریک کار عرفان کو اٹھا لائے۔ ساتھ ہی اس کی سیف کھول کر کئی لاکھ روپیہ بھی لے آئے۔ ڈاکٹر عذرا بھی ایک عرصے تک دھمن کے کاروبار میں شریک رہی تھی۔ عرفان کو پہچان کر اس نے آپریشن کرنے سے انکار کر دیا۔ جس پر آبی نے اس کے گھر پہنچ کر اس کے دونوں بچوں کو یرغمال بنا لیا۔ مجبوراً اس نے عرفان کا گردہ نکال کر آسیہ کے لگا دیا۔ اسی دوران اس کی آیا گھر سے فرار ہو کر پولیس کے پاس پہنچ گئی۔ انسپکٹر غضنفر نے فون کیا تو میری دھمکی سن کر ڈاکٹر عذرا نے اُسے مطمئن کر دیا۔ میں نے اس کا پرس کھول کر اس کی ڈائری نکالنا چاہی تو وہ میرے ہاتھ سے ڈائری چھیننے کی کوشش کی۔ وہ مجھے ڈائری پڑھنے سے روک رہی تھی تبھی انسپکٹر غضنفر نے دروازے پر دستک دی۔

میں منان کو لے کر ماجدہ کے ساتھ اسی کی رہائش گاہ پر چلا گیا جہاں وہ نصیر نامی کسی شخص کے ساتھ رہ رہی تھی۔ منان نے میرے تشدد کے باوجود آسیہ کا پتہ نہیں بتایا تو میں اُسے ماجدہ کی تحویل میں دے کر آبی کے پاس ہسپتال چلا گیا۔ ہسپتال آنے پر مجھے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر عرفان کی لاش پہچان لی گئی ہے اور پولیس نے ڈاکٹر عذرا کو گرفتار کر لیا ہے۔ میں نے آمو سے رابطہ قائم کر کے اُسے ماجدہ کا پتہ بتانا چاہا تاکہ وہ اپنے ہیرے وصول کر لے مگر آمو لاہور سے جا چکا تھا، گیا ہوا تھا۔ اسی دوران ماجدہ نے ڈی ایس پی منان کو رہا کر دیا اور خود وہاں سے فرار ہو گئی۔ میں ایک بار پھر ڈھلوں صاحب کے گاؤں جا پہنچا۔ وہاں ایک انتخابی جلسہ ہو رہا تھا جس میں کسی نے ڈھلوں صاحب کو ہلاک کرنا چاہا مگر میری اسٹین گن نے کام دکھایا اور حملہ آور مارے گئے۔ ڈھلوں صاحب مجھے کوٹھی کے اندر لے گئے جہاں ایک پولیس انسپکٹر نے مجھے پہچان کر گرفتار کرنا چاہا لیکن ڈھلوں صاحب آڑے آگئے۔ یہاں میری ملاقات چھانگا مانگا کے رئیس چوہدری سردار خان سے ہوئی جو میری منہ بولی بہن مجیدن کی عزت سے کھیلا تھا۔ میں نے سردار خان کی خوب اچھی طرح بے عزتی کی اور قریب تھا کہ ہم آپس میں بھڑ جاتے کہ ڈھلوں صاحب اُسے باہر لے گئے۔ میرا خون کھول رہا تھا۔

ذرا دیر بعد وہ اپنے آدمیوں کو لے کر لوٹ آیا۔ تھوڑی سی جھڑپ کے بعد میں نے ایک آدمی کا ہاتھ توڑ دیا اور باقیوں کو بے بس کر کے وارننگ دے دی کہ سات دن کے اندر میری منہ بولی بہن مجیدن کو پیش کر دیں۔ پھر میں اور ڈھلوں لاہور آگئے۔ ڈی آئی جی لودھی سے مل کر آسیہ کا پتہ کرنے کی کوشش کی مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ یہیں انہوں نے مجھے پہچان لیا۔ قریب تھا کہ میں پکڑا جاتا کہ ڈھلوں صاحب نے ان پر کار چڑھا دی اور انہیں زخمی کر کے مجھے ہمراہ لے گئے۔ اسی دوران پولیس نے ریٹا پر تشدد کر کے اسے ہلاک کر کے سڑک پر پھینک دیا۔ میں اور ڈھلوں صاحب اس کی لاش کو پولیس سرجن کے پاس لے گئے۔ جہاں ایک بار پھر مجھے پہچان لیا گیا۔ میں فرار ہو کر ایک دولت مند بیوہ کی کوٹھی میں جا چھپا۔ پھر میں آبی سمیت عرشی اور سلوتی نامی نرسوں کے گھر شفٹ ہو گیا۔ جہاں ماجدہ بھی ٹھہری ہوئی تھی۔ یہاں مجھے چھوڑ کر آبی مقامی گرجا گھر چلا گیا۔ تاکہ ان لوگوں کو ریٹا کی لاش پولیس سے واپس لینے پر آمادہ کر سکے۔ آسیہ کا ہنوز کوئی پتہ نہیں چل رہا تھا۔

آبی لوٹ کر آ گیا تو میں ماجدہ کے ہمراہ اس اداکارہ کے گھر پہنچا جس کی ڈی ایس پی منان سے دوستی تھی۔ وہاں شراب کی ترنگ میں منان نے ریٹا کے قاتل ان غنڈوں کی نشاندہی بھی کر دی جنھیں پولیس نے ریٹا کو مالِ غنیمت کے طور پر دے دیا تھا اور یہ بھی بتا دیا کہ آسیہ کو کس ہاسپٹل میں زیرِ علاج رکھا گیا ہے۔ میں ہاسپٹل پہنچا اور وہاں معلوم ہوا کہ آسیہ کو یہاں سے بھی کہیں منتقل کر دیا گیا ہے۔ بالآخر کھوج لگاتے لگاتے یہ پتہ چلا کہ آسیہ کو کبیر شاہ نامی پولیس انسپکٹر علاج کی غرض سے کسی نامعلوم جگہ لے گیا ہے۔ میرے سینے میں ریٹا کے قاتلوں سے انتقام کی آگ جل رہی تھی چنانچہ میں نے آبی کے ہمراہ بدمعاشوں کے ڈیرے پہنچ کر ریٹا کے تمام قاتلوں کو ٹھکانے لگا دیا مگر انھوں نے ہماری رہائش گاہ دیکھ لی اور رات کے کسی وقت ہمیں گھیر کر مکان کو آگ لگا دی۔ میں اور آبی بمشکل جان بچا کر بھاگے اور آبی کے گاؤں کے ایک طالب علم نور کے پاس ہوسٹل میں جا چھپے۔ انور ہمارے کہنے پر وہاں کی صورت حال معلوم کرنے گیا تو واپسی میں پولیس کو پیچھے لگا لایا۔ ہم نے مستری پیچھے کے پاس سے دوسری کار حاصل کی اور کبیر شاہ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ راستے میں اچانک ہی پولیس کی گاڑیاں ہمارے پیچھے لگ گئیں۔ آبی نے کار پوری رفتار سے ملتو موڑ کی طرف ڈال دی۔

سرحد کے نزدیک بالآخر ہماری جھڑپ ہو گئی۔ ہم نے ایک پولیس جیپ پر قبضہ کر کے اس میں موجود انسپکٹر کو بے ہوش کر دیا اور جیپ کو اندھا دھند لے آئے۔ ہوش اس وقت آیا جب ہمیں بھارتی سرحدی پولیس نے روک لیا اور گرفتار کر لیا۔ ہمیں امرتسر جیل پہنچا دیا گیا جہاں میں نے آغا بلال نامی پاکستانی پولیس آفیسر کو دیکھا جو ایک سکھ کے روپ میں بھارتی پولیس کا افسر بنا ہوا تھا۔ ہمارے متعلق پاکستان سے معلومات حاصل کی گئیں اور پھر ہمیں کچھ وقت حوالات میں رکھنے کے ملہوترا نامی کسی آفیسر کے حوالے کر دیا گیا جو ہمیں اپنی کوٹھی میں لے آیا۔ یہاں ملہوترا کا ایک خطرناک ملازم پانڈے ہماری نگرانی اور خوراک کے لیے مامور تھا۔ یہاں دو ہندو دوشیزاؤں کو اس کام پر لگایا گیا کہ وہ ہم دونوں کو ان کا آلۂ کار بن کر پاکستان جانے اور وہاں ان کی فراہم کردہ فہرست کے مطابق مقتدر ہستیوں کو قتل کرنے پر آمادہ کریں۔ ملہوترا صاحب خود بھی یہ کہہ چکے تھے اور اس کے عوض آسیہ کی رہائی اور پُرآسائش زندگی کی ضمانت دینے پر تیار تھے۔ اسی دن ایک رات وہاں سے آبی کو غائب کر دیا گیا۔ میں پریشان ہو کر اٹھ کھڑا ہوا جبھی خوابگاہ کا دروازہ دھڑ سے کھلا۔

ملہوترا صاحب اندر آگئے تھے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ آبی شکنتلا کو لے کر فرار ہو گیا ہے۔ ثبوت کے طور پر انھوں نے مجھے شکنتلا کا لکھا ہوا الوداعی خط بھی دکھایا لیکن بعد میں پتہ چلا کہ آبی کو انھوں نے خود غائب کیا تھا۔ میں ابھی تک ان کی پیشکش پر صاد نہ کر سکا تھا چنانچہ انھوں نے مجھے بھی جیل میں ڈال دیا۔ پھر کئی روز بعد ایک بار پھر مجھے نکال کر آر ایس ایس کے ایک سرکردہ لیڈر بھنڈاری صاحب کے گھر پہنچا دیا گیا۔ موقع ملتے ہی میں نے بھنڈاری اور اس کی بیوی اور بیٹی پر قابو پا کر یرغمال بنا لیا اور انھیں آلۂ کار بنا کر نہ صرف آبی کو بلوا لیا بلکہ ایک ہیلی کاپٹر بھی حاصل کر لیا۔ تینوں یرغمالیوں کو لے کر ہم ہیلی کاپٹر میں بیٹھ کر ایئرپورٹ پر آ گئے لیکن ایئرپورٹ پر جب ہم نے خود کو پولیس کے نرغے میں دیکھا تو ہیلی کاپٹر دوبارہ اڑا کر ہارون آباد کی طرف نکل گئے۔ پولیس ہمارے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ ایک جگہ ہم اتر گئے اور یرغمالیوں کو ہیلی کاپٹر سمیت آزاد کر دیا۔ وہاں پولیس آ پہنچی تو ہم ریت میں چھپ گئے۔ اچانک بھیڑیوں کے ایک غول نے پولیس پارٹی پر حملہ کر دیا۔ ایک کانسٹبل مارا گیا باقی ہیلی کاپٹر میں بیٹھ کر فرار ہو گئے۔ پھر ہمیں وہیں اونٹوں پر دو لٹیرے ٹکرا گئے۔ فائرنگ کا تبادلہ ہوا اور وہ زخمی ہو گئے۔ ہم نے ان کے اونٹوں پر قبضہ کیا اور صحرا کی طرف چل پڑے۔ راستے میں ایک زخمی اونٹ گر کر مر گیا۔ ہم حیران پریشان کھڑے رہ گئے۔

اونٹ کو خدا کے حوالے کر کے ہم ریگستان میں آگے بڑھے تو راستے میں ایک فلم یونٹ سے ملاقات ہو گئی۔ میں اور آبی رات بسر کرنے کے لیے وہیں ٹھہر گئے۔ آدھی رات کو کچھ نامعلوم حملہ آوروں نے یونٹ کے افراد کو زخمی کر دیا اور فلم کی ہیروئن الماس کو جیپ میں ڈال کر فرار ہو گئے۔ ہم دونوں نے ان کا تعاقب کیا اور الماس کو آزاد کرا لیا۔ وہیں ہم پر انکشاف ہوا کہ یہ حملہ بہاولپور کے رئیس خان غریب نواز کے اشارے پر ہوا تھا۔ بہاولپور میں ہماری ملاقات خان غریب نواز سے ہو گئی۔ ہم نے اسے الماس کے زخمی ہونے کی فرضی کہانی سنائی۔ وہ ہمیں اپنے آدمیوں کی تحویل میں دے کر چلا گیا لیکن ہم وہاں سے نکل آئے اور اسٹیشن پہنچ گئے۔ خان غریب نواز پولیس لے کر اسٹیشن پہنچ گیا اور ہم چلتی ٹرین میں سوار ہو گئے۔ راستے میں ہم ٹرین سے اتر گئے اور رحیم یار خاں ہوتے ہوتے ساہیوال پہنچے۔ ہماری کبیر شاہ سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے مجھے پہچان لیا اور آسیہ کے حالات سے آگاہ کیا۔ پھر بذریعہ کار لاہور آگئے۔ پھر ہم دونوں الماس کے گھر سے چلے آئے۔ آبی کے سر پر الماس کے عشق کا بھوت سوار تھا، اس نے مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کیا کہ وہ الماس سے شادی کے لیے اماں جی سے بات کرے گا۔

ہم دونوں ہربنکا پہنچے۔ آبی نے اپنی ماں سے الماس کا تذکرہ کیا۔ وہ شادی پر رضامند ہو گئی تو ہم ماں جی کو لے کر لاہور آگئے۔ میں نے ان کو الماس کی کوٹھی پر چھوڑا اور دانی کی تلاش میں لاری اڈہ پر جا نکلا۔ ملاقات ہونے پر دانی نے مجھے یقین دلایا کہ اس نے آسیہ کو اغوا نہیں کیا تھا۔ میں نے امرتسر جانے کا ارادہ کیا تاکہ بلبیر سنگھ سے انتقام لے سکوں۔ ڈھلوں صاحب کی حویلی پہنچا تو انہوں نے

ساوتری مر گئی تھی۔ آبی تین ہفتے بعد امرتسر میں ملنے کا وعدہ کر کے چلا گیا اور میں گزشتہ واقعات کا جائزہ لینے لگا۔ پھر ڈھلوں صاحب کے توسط سے میں حلیہ بدل کر مہیش مہتہ کے نام سے آسیہ کی تلاش میں امرتسر چلا گیا جہاں بالک رام سے بھنڈاری کے بارے میں صورتحال معلوم کی جو خاصی تشویشناک تھی۔ بالک رام بڑے کام کا آدمی ثابت ہوا۔ اس سے مجھے ایک عدد سائیلنسر لگا پستول بھی مل گیا۔ میں نے انسپکٹر بلبیر سنگھ کو ساوتری کے معاملے میں بلف کرنے کی کوشش کی مگر خود میں اس کے شکنجے میں پھنس گیا لیکن کچھ دیر بعد میں نے بلبیر سنگھ کو برقی کرسی کے اسی شکنجے میں جکڑ دیا جس میں اس نے مجھے پھنسانے کی کوشش کی تھی۔ اب میں اس سے وہ باتیں معلوم کرنا چاہتا تھا جن کا جاننا میرے لیے بہت ضروری تھا۔ میں ایک بار پھر اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

بلبیر سنگھ نے جو سنسنی خیز انکشافات کیے تھے ان کے پیشِ نظر اسے چھوڑ دینا مناسب نہ سمجھتے ہوئے میں نے اسے سیتا سمیت ایک آہنی پیٹی میں بند کر کے بالک رام کے توسط سے پاکستان روانہ کر دیا اور خود پولیس سے آنکھ مچولی کھیلتا ہوا جکرا روانہ ہو گیا۔ کلونتی کے ہاں رات کو میرا یہ راز فاش ہو گیا کہ میں سکھ نہیں مسلمان ہوں۔ اسی رات میں نے اس کے بھائی کے دشمنوں کو خاک و خون میں ملا دیا۔ کلونتی میری گرویدہ ہو گئی۔ اس کے بھائی نے مجھے سرحد پر پہنچا دیا لیکن میں آبی سے ملنے امرتسر واپس آ گیا۔ چند روز زندگی کے نشیب و فراز عبور کرتے ہوئے ہم فیروز پور کے ایک گاؤں پہنچ گئے۔ یہاں تیج رام نامی ایک ہندو بنیے سے سرحد پار ہونے کا معاملہ طے ہوا۔ ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔

وہ گردھاری لال تھا جو تیج رام سے اپنی بیوی واپس لینے آیا تھا۔ تیج رام نے ہمیں گوتیاں کی نگرانی میں سرحد پر واقع ایک مندر میں پہنچا دیا جہاں رات کے پچھلے پہر ہمیں بے ہوش کر کے ایک سرنگ کے ذریعے پاکستانی علاقے میں پہنچا دیا گیا۔ اوکاڑہ سے پیشتر، چند کی آمد پر سے کریم سکھر روانہ ہو گئے۔ ٹرین میں وردہ سے ملاقات ہوئی۔ ڈائننگ کار کے بیروں نے ہمیں بے ہوش کر کے ٹرین سے پھینک دیا۔ بعد میں انکشاف ہوا کہ وردہ کی خالہ کو قتل کر دیا گیا تھا۔

ہم سمہ سٹہ سے ایک کار تیار کر کسی نہ کسی طرح اس ٹرین تک پہنچ گئے جس سے ہمیں نیچے پھینکا گیا تھا۔ اتفاق سے راستے میں تکریم احمد بھی ہم سے مل گیا۔ ہم نے ڈائننگ کار کے بیروں کو گرفت میں لے لیا اور ان کی نشان دہی پر ایک آہنی ٹرنک کھولا تو اس میں وردہ گویا دولت شہر بانہ سے لپٹی تھی۔

ڈائننگ کار کے بیروں کو تکریم احمد کے حوالے کر کے ہم تینوں عاقل اسٹیشن پر گاڑی سے اتر گئے۔ وہاں سے ایک ٹیکسی کے ذریعے سکھر پہنچے جہاں نہال چند سے لاکھو کا پتا دریافت کیا اور شکار پور روانہ ہو گئے۔ لاکھو تک پہنچنے کے لیے ہمیں خاصی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ لاکھو سے معلوم ہوا کہ آسیہ اُس کے دو آدمیوں کو قتل کر کے وہاں سے غائب ہو چکی تھی۔ میں لاکھو سے انتقام نہ لے سکا اور ہم کراچی آ گئے۔ ہم نے تکریم احمد سے کراچی میں ملنے کا وعدہ کیا تھا ہم ٹیکسی میں بیٹھے اس کا پتا تلاش کر رہے تھے کہ گفتگو کے دوران الماس کا نام سن کر آبی یکایک اداس ہو گیا۔ حالانکہ وہ اسے میرے سامنے گالیاں دیتا رہا تھا۔

اُس کے تعلقِ خاطر کی گہرائی کا میں اندازہ ہی نہ کر سکا تھا۔ وہ الماس کو اپنے قلبی محسوسات میں کچھ اس طرح گوندھ چکا تھا کہ وہ خود کو اس سے کسی بھی صورت الگ نہیں دیکھ سکتا تھا۔

گاڑی طارق روڈ کے وسطی چوک سے دائیں طرف مُڑی تو ڈرائیور بولا۔ "میرا خیال ہے میں نے آپ کو ٹھیک جگہ پہنچا دیا ہے۔ آپ نے بلڈنگ کا جو نمبر دیا تھا وہ سامنے لکھا ہے۔"

اُس نے کمال کر دیا تھا، وہ کراچی کے چپے چپے سے واقف تھا اور اُس نے آنکھیں بند کر کے ہمیں بڑی آسانی سے ہماری منزل پر پہنچا دیا تھا۔ ہمارے سامنے ایک بڑی سی تین منزلہ عمارت تھی جس میں یہاں سے وہاں تک بہت سے فلیٹ بنے ہوئے تھے۔ گاڑی سے نکل کر ہم اس کی پہلی منزل میں جا گھسے۔ ہمارا مطلوبہ نمبر سامنے ہی تھا۔ دروازے کی گھنٹی پر میں نے ہاتھ رکھا تو چند ساعتوں کے بعد ہی کسی نے دروازہ کھول دیا ہمارے سامنے ایک بہت ہی سجی سنوری دراز قد عورت کھڑی تھی۔ اس نے ہمیں دیکھا تو ساڑھی کا پلّو اپنے سر پر ڈالتی ہوئی بڑے ہی نرم لہجے میں بولی۔ "آپ کو کس سے ملنا ہے؟"

"ہم تکریم احمد صاحب سے ملنا چاہتے ہیں بی بی۔ اگر وہ گھر پر ہیں تو انھیں بتا دیں کہ ہاشم خان آیا ہے۔" میں نے دروازے سے ایک طرف ہٹتے ہوئے کہا۔ آبی بھی اس عورت کو دیکھ کر سٹپٹا سا گیا تھا اور ساتھ ساتھ بنے دوسرے فلیٹوں کے دروازے پر لگی تختی پڑھنے لگا تھا۔ یوں جیسے وہ اپنے چہرے کے تاثرات کو چھپا لینا چاہتا ہو۔

"آپ کا نام ہاشم خان ہے؟"

"جی! یہ میرے دوست ہیں ایس جی ایم ایم پیرزادہ صاحب۔"

"آپ اندر آ جائیں۔ تکریم صاحب باہر گئے ہیں مگر وہ جلدی واپس آ جائیں گے۔ مجھے وہ کہہ گئے تھے کہ آپ آئیں تو آپ کو میں اندر بٹھالوں۔"

"آپ کی بڑی مہربانی ہے بی بی! آئیں پیرزادہ صاحب اُن کا ہم انتظار کر لیتے ہیں۔" یہ کہہ کر میں آبی کو کھینچ کر اندر لے گیا۔ اس سکھ حسین خاتون نے بڑے ہی مہذب انداز سے ہمیں اپنے اُس مختصر سے ...... فلیٹ کی آرام دہ نشست گاہ میں بٹھایا اور بولی۔ "آپ چائے پئیں گے کہ ٹھنڈا؟" اس کے لہجے کی شائستگی مجھے حیران کرتی تھی۔ دراصل کچھ عورتیں اپنے گرد نور کا ایسا ہالہ لیے پھرتی ہیں کہ انھیں دیکھ کر مرد بھونچکا رہ جاتے ہیں۔ ایسی ہی صفات کچھ اس عورت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھیں۔ اُس کی آواز کی نغمگی سماعت کو سکون پہنچاتی تھی اور میرا تاثر یہ تھا کہ اسے دیکھ کر آدمی کے دل میں نیکی اور پاکیزگی، عجز اور انکساری کا جذبہ پیدا ہونے لگتا تھا۔ وہ ایسی ہی تھی اور تکریم احمد نے خدا جانے اسے کہاں سے ڈھونڈ لیا تھا۔ وہ مردان شاہ کو بھی یاد رہ گئی تھی۔ اور میں تو اسے آج تک نہیں بھولا ہوں۔

"تکلف کی کوئی ضرورت نہیں بی بی! آپ اطمینان سے کمرے میں بیٹھیں۔ فریج سامنے ہی ہے اور اس کی خوبی یہ ہے کہ اس میں تالا کوئی نہیں ہوتا۔ ضرورت ہوئی تو ہم خود پی لیں گے، اس میں کچھ نہ کچھ تو ضرور ہوگا۔" میں نے اپنائیت سے لبریز لہجے میں کہا۔

"ہاں اس میں ٹھنڈی بوتلیں رکھی ہیں پانی کی بھی اور کوکا کولا کی بھی۔ میں آپ کے لیے کھانا پکا لیتی ہوں۔ دوپہر کا کھانا تو آپ کو ادھر ہی کھانا ہوگا۔" یہ کہہ کر اس نے جھٹ کا پنکھا کھول دیا۔

"ہاں یہ اچھی تجویز ہے آپ شوق سے پکائیں۔" آبی نے اپنے حصے کی گفتگو شروع کر دی۔ میرا خیال ہے کہ اسے میری اتنی طولانی گفتگو اس خاتون سے پسند نہیں آئی تھی۔ وہ اپنی طرف سے بھی یہ کچھ اضافہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کی بات کا جواب دیے بغیر دروازہ اپنے پیچھے بند کر کے دوسری طرف نکل گئی۔

آبی بولا۔ "یہ تم ہر عورت سے بیچارگی کیوں لڑانے لگتے ہو ہو سکتا ہے یہ تکریم احمد کی ماں ہو بہن ہو یا ہو سکتا ہے یہ تکریم احمد کی بیوی ہی ہو۔"

"یہ اس کی کوئی بھی ہو سکتی ہے مگر میں نے اس سے ذرا سی بات ہی تو کی ہے تم کیوں جل گئے ہو ہائیں! تمہاری بدنیتی کی کوئی حد نہیں ہے آبی، تو بہت بدمعاش ہو چکا ہے۔"

وہ ہنس دیا، بولا۔ "یار، کچھ عورتوں کو خدا نے اپنی شخصیت میں ایسا جادو پیدا کرنے کا کتنا زبردست سلیقہ عطا کر رکھا ہے یہی عورت اگر باہر ریلوے لائن پر کوئلے چنتی نظر آتی تو کوئی پروا بھی نہ کرتا۔"

"تو یہ باتیں نہیں سمجھ سکتا ہے آبی! تو ٹھہرا موٹی عقل کا آدمی" میں نے بوشرٹ کے بٹن کھول کر پنکھے کی ہوا میں اپنا بدن ڈال دیا۔ سورج اس روز بھی تاک تاک کر آدمی بھون رہا تھا اور کراچی کی مرطوب آب و ہوا بھی اس کو اس حرکت سے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔

تکریم احمد کوئی آدھ ہی گھنٹے بعد واپس آ گیا وہ سفید بوشرٹ سفید پتلون اور سفید چرمی بوٹ پہنے ہوئے تھا اور یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی کرکٹ ٹیم کی کپتانی کر کے آ رہا ہے۔ ہمیں اپنے فلیٹ میں دیکھ کر وہ خوش ہو گیا بڑی محبت سے پیش آیا، بولا۔ "یار، تم نہ آتے تو میں بہت پریشان ہوتا۔ تمہاری وجہ سے ہی میں نے یہ گھونسلا ڈھونڈا ہے۔"

"کیا مطلب؟ پہلے یہ فلیٹ نہیں تھا تمہارے پاس۔"

"اب بھی کہاں ہے۔ یہ تو اس مہربان کا گھر ہے اس غمزدہ خانم کا۔"

"یہ نام ہے اس کا؟"

"نہیں یار! اس کا نام تو فردوسی بیگم ہے مگر میں اسے غمزدہ خانم کہتا ہوں۔ بس ایسے ہی میری قسمت اچھی تھی جو یہ مجھے ایک سینما ہال میں مل گئی اور مجھے یہاں اٹھا لائی۔ یہ ایک سال پہلے کی بات ہے۔ میں اسی کے لیے ہر دو مہینے بعد ادھر آ جاتا ہوں۔"

"کیا؟ یہ... یہ کوئی پیشہ ور ہے؟"

"نہیں یار! ایسا نہ کہو۔ یہ کسی دفتر میں ملازم ہے بے شمار ... ایسا لکھتی ہے کہ دل پر نقش ہوتا جاتا ہے۔ آدمی چاہتا ہے کہ ... اسکی پنسل کے پیچھے آ جائے۔ طبیعت کی بھی بہت سخی ہے۔ میں ذرا سیدھا ... ہو جاؤں تو کل ہی میں اس سے شادی کر سکتا ہوں۔"

"در ایں چہ شک! اب تو ہم بھی آ گئے ہیں، اس نیک کام میں ... دیر نہ کرو۔ آج ہی ہم کسی نکاح خواں کو بلوا لیں گے۔"

"یہی تو نہیں ہو سکتا۔ میری بیوی تو میرے وارنٹ نکلوا دے گی۔ آدمی کی یہی بدقسمتی ہے کہ اسے ہمیشہ صحیح عورت غلط وقت پر ملتی ہے اور وہ بس کف افسوس بلکہ ہائے ندامت ملتا ہی رہ جاتا ہے۔"

"چلو دفع کرو۔ انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھو اور ہمیں ذرا اطمینان سے بتاؤ کہ اس وردہ کا کیا بنا اور وہ مقتولہ کیا ہوئی؟"

"ہاں یار! اسی چکر میں تو میں پھر رہا ہوں۔ ان سب بدمعاشوں کو تو میں نے گاڑی ہی میں پولیس کے حوالے کر دیا تھا۔ طرم خان نے میرے خلاف بہت زہر اگلا کہ جناب اس کے پاس ایک پستول بھی ہے اور یہ جعلی تھانیدار بنا ہوا ہے لوگوں کو لوٹتا پھرتا ہے اور یہ کہ اس قتل کا الزام میں ان پر بلاوجہ لگا رہا ہوں مگر ان کے خلاف تو سب سے بڑی گواہی وردہ کی تھی۔ اس کے بیان پر وہ سب ایسے پھنسے ہیں کہ کوئی ان کی ضمانت بھی لینے والا نہیں ہے۔"

"مگر یہ بتاؤ کہ اسے اسٹیشن پر کوئی لینے بھی آیا تھا کہ نہیں؟"

"وہاں تو کوئی نہیں آیا۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ وردہ کو پولیس کی حفاظت میں چلتے دیکھ کر وہ لوگ سامنے نہیں آتے۔ میں نے تو کراچی اسٹیشن پر پہنچتے ہی ان لوگوں سے جان چھڑانا چاہی تھی مگر وہ میرے بیان کو بہت اہمیت دے رہے تھے۔ مجبوراً مجھے تھانے جانا پڑا۔ وہاں میں نے جو کچھ ضروری تھا انہیں حلفاً بتا دیا۔"

"مگر ہمارے بارے میں ان سے تم نے کیا کچھ بتایا؟"

"کچھ بھی نہیں۔ میں نے کہہ دیا کہ ڈبے میں سوار دو آدمیوں کو ان لوگوں نے ان سے روپے چھین لینے کے بعد گاڑی سے باہر پھینک دیا تھا۔ ان کا نوٹوں سے بھرا بریف کیس دو اور آدمی لے گئے وہ کہہ رہے تھے انھیں ہی ان لوگوں نے گاڑی سے پھینکا تھا مگر وہ ٹیکسی میں گاڑی کا تعاقب کر کے پھر سوار ہو گئے تھے اور یہ ہے بھی سچ۔"

"انھوں نے پوچھا نہیں کہ وہ تھے کون؟"

"بہت پوچھا۔ بہت چکر باز ہوتے ہیں یہ پولیس والے۔ مگر میں نے کہہ دیا کہ جناب ان کے بارے میں تو مجھے کچھ نہیں معلوم کہ وہ کون تھے۔ طرم خان اور اس کے ساتھی بھی ثابت کرتے رہے کہ وہ میرے ساتھی تھے۔ میں نے بھی یوں کیا کہ اپنا نام ولدیت پتہ نشتہ سب کچھ غلط لکھوایا۔ اب میں ان کے سامنے کبھی جاؤں گا ہی نہیں۔"

"ہوں! تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وردہ ابھی تک ان کی تحویل میں ہے۔"
"نہیں بھئی! مجھے ابھی ابھی معلوم ہوا کہ آج صبح دو معتبر آدمی اسے تھانے سے لے گئے ہیں۔"
"کون لوگ تھے وہ؟" میں نے پوچھا۔
"یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ تھانے کے ایک سپاہی نے مجھے یہ بات بتائی تھی۔ میرا خیال ہے کہ تھانے میں وہ اپنا پتہ لکھوا گئے ہوں گے۔"
"ہاں اس کے بغیر تو پولیس وردہ کو ان کے ساتھ نہ جانے دیتی" میں نے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔
"مگر بھائی جی! وہ بھی تو تھانے میں پتہ غلط لکھوا سکتے ہیں بھائی ہاشم سنگھ جی، ان کا شجرۂ نسب تو تم جانتے ہی ہو۔" آبی نے یہ کہہ کر سگریٹ کا گہرا کش لیا۔
"بھئی! تھانے والوں نے ان سے کوئی ضمانت بھی تو لی ہو گی۔ کسی تنہا لاوارث عورت کو وہ یونہی تو کسی کے حوالے نہیں کر دیتے۔"
"جب وردہ نے خود کہہ دیا ہو گا کہ وہ ان کے ساتھ جانا چاہتی ہے اور وہ انہیں جانتی ہے تو پھر اسے کون روک سکتا تھا۔ ایسے میں وہ کوئی بھی پتہ لکھوا سکتے ہیں۔" آبی نے میری دلیل کو کاٹ کر رکھ دیا۔ مگر وہ بات درست ہی کہہ رہا تھا۔
"یار! مجھے بتاؤ یہ قصہ کیا ہے۔ کیا کرنا چاہتے ہو تم اور کس کے ساتھ۔ تم کس کی تلاش میں ہو آخر؟" تکریم احمد نے الجھتے ہوئے کہا۔
"تمہیں کیا بتاؤں تکریم احمد! یہ دیکھو یہ میرے پیٹ پر یہ زخم کا نشان دیکھ رہے ہو نا! ذرا سوچو کہ یہ کس قسم کا زخم ہے؟" میں نے اپنے پیٹ پر سے کپڑا اٹھا دیا۔
"یہ... یہ تو کسی آپریشن کا نشان ہے" تکریم احمد نے کہا۔ اس کی یہ بات سن کر میں نے مختصراً اسے اس زخم کی وجہ بتائی۔
وہ پریشان ہو کر بولا "یار! یہ... یہ تو بڑے ظلم کی بات ہے وہ ڈاکٹر اگر آج کل کراچی میں آیا ہوا ہے تو یہاں بھی وہ یہی دھندا کر رہا ہو گا۔ اسے تو پکڑنا چاہیے۔"
"ہم اسی لیے ادھر آئے ہیں اور وہ وردہ بھی کے گھر گئی ہے۔"
"ٹھہرو! میں تھانے والوں سے فون پر بات کرتا ہوں میرا خیال ہے میں اس کا پتہ معلوم کر سکتا ہوں۔"
"یہاں فون بھی ہے؟"
"ہاں فردوسی بیگم کی فرم نے اسے ٹیلیفون بھی دے رکھا ہے۔ فرم کے جنرل مینیجر کی پرسنل سیکرٹری ہے یہ" تکریم احمد نے بڑے فخر سے کہا
"ٹھیک ہے پیارے عیش کرو، قسمت کے دھنی نظر آتے ہو" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔
وہ مسکراتا ہوا دوسری طرف نکل گیا کوئی دس منٹ بعد واپس آیا تو بولا "تمہارا خیال درست معلوم ہوتا ہے یار۔ وہ لوگ اسے دارالامان میں لے گئے تھے کہ ایک عورت جو اپنا نام ڈاکٹر عالیہ بتاتی تھی اسے ساتھ لے گئی۔ وہ سپاہی بتا رہا تھا کہ وہ لمبی سی سیاہ رنگ کی کار میں آئی تھی جسے اس کا شوفر چلا رہا تھا۔"
"پتہ کیا بتا گئی ہے وہ؟"
"ناظم آباد میں کوئی بنگلہ ہے 'الشفق' نام ہے اس کا۔ نمبر نو سو پانچ لکھوا گئی ہے وہ۔"
"کوئی فون نمبر؟"
"نہیں فون نمبر اس نے اپنا نہیں بتایا انہیں مگر ہم وہ جگہ تلاش کر سکتے ہیں۔"
"وہ تو ٹھیک ہے مگر اب کی بار ہم کوئی حماقت نہیں کریں گے۔ بہت سوچ سمجھ کر اس پر ہاتھ ڈالنا ہو گا" آبی نے مجھے خبردار کرتے ہوئے کہا۔
اچانک دروازہ کھول کر فردوسی بیگم اندر آ گئی۔ تکریم احمد اسے دیکھ کر کرسی سے اٹھ گیا، بولا "یہ میرے دوست ہیں، آپ نے اچھا کیا کہ انہیں بٹھا لیا۔"
"یہ تو میرا فرض تھا تکریم صاحب مگر اس وہاب اور عارف کا کچھ پتہ چلا؟ ان کے گھر سے کئی بار فون آ چکا ہے۔"
"کیا کہوں فردوسی بیگم! میں نے وہ ہسپتال چھان مارا ہے مگر وہ کہیں ملے ہی نہیں۔ اتنا مجھے کسی نے بتایا ہے کہ ان دونوں کو بیہوشی کی حالت میں دو آدمی ٹیکسی میں ڈال کر لے گئے تھے۔ وہاں تو افراتفری مچی تھی۔ میں خود حیران ہوں کہ میں کیسے بچ گیا؟"
"یہ کیا قصہ ہے تکریم صاحب! کن کا پوچھ رہی ہیں یہ؟"
"کل یہاں ان کے دفتر کے پانچ چھ آدمی آئے تھے۔ ان کی سالگرہ تھی کل۔ جس پر ایک چھوٹی سی چائے پارٹی کا انتظام کیا تھا۔ شام کو چھ بجے میں ان کے دفتر کے دو آدمیوں عارف اور وہاب کے ساتھ ایک منی بس میں بیٹھ کر صدر کی طرف گیا مگر اس بدقسمت بس کی راستے میں ایک اور منی بس سے ٹکر ہو گئی۔ منی بس کے کئی آدمی شدید زخمی ہو گئے۔ آج اخبار میں خبر بھی چھپی ہے مجھے بھی نیم بے ہوشی کی حالت میں کسی نے بس سے نکالا۔
مگر مجھے اسی وقت ہوش آ گیا تھا۔ زخمیوں کو کئی لوگ کاروں اور ٹیکسیوں میں لاد کر ہسپتال لے گئے۔ ان میں عارف اور وہاب بھی شامل تھے۔ میں نے خود ان کو ٹیکسی میں لادتے دیکھا تھا۔ دو آدمی انہیں باری باری اٹھا کر ٹیکسی میں ڈال کر آگے چل دیے۔ میں اس وقت تک مفلوج سا ہو کر دوسرے لوگوں میں دبا کھڑا تھا۔ ایک آدمی نے مجھے سہارا دے رکھا تھا۔ میں نے چاہا کہ میں بھی ٹیکسی میں بیٹھ کر ہسپتال چلا جاؤں مگر ابھی میں اس طرف بڑھا ہی تھا کہ وہ لوگ ان دونوں کو لے کر تیزی سے نکل گئے۔ ٹیکسی کا نمبر بھی مجھے یاد نہیں رہا۔ میں نے اس پر غور ہی نہیں کیا لیکن بعد میں پتہ

چلا کہ وہ دونوں کسی ہسپتال میں موجود نہیں ہیں۔ میں صبح سے اُن کی تلاش میں پھر رہا تھا۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے! وہ ٹیکسی والے انھیں کدھر لے گئے! کوئی بڑی رقم تھی اُن کے پاس؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"نہیں یار! وہ بابو قسم کے لوگ ہیں اُن کے پاس رقم کہاں سے آتی۔"

"یہ بات تو واقعی ایک معمے سے کم نہیں ہے۔" آبی نے کہا۔ پھر ایک سگریٹ سلگا کر بولا۔ "میرا خیال ہے وہ انھیں کسی بیگار پر لگا چکے ہوں گے، یہ دھندا ابھی تو چلتا ہے اپنے ہاں۔"

"وہ بہت زیادہ زخمی تھے اور ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے۔ انھیں کوئی کس بیگار پر لگا سکتا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ کسی نہ کسی ہسپتال میں پڑے ہوں گے مجھے اچھی طرح یاد ہے اُن لوگوں نے دو اور زخمیوں کو بھی ٹیکسی میں ڈال لیا تھا۔ منی بس کا تو کچومر ہی نکل گیا تھا۔ تین آدمی موقعے پر ہی مر گئے تھے۔"

تکریم احمد نے کہا پھر فردوسی بیگم سے مخاطب ہوا۔ "وہ اخبار تو لاؤ میں آج کا، مرنے والوں کی اس میں تصویریں بھی چھپی ہیں۔"

وہ آرام جان اُٹھی اور دوسرے کمرے سے اخبار لے آئی۔ حادثے کی تفصیلات اُس میں درج تھیں اور بڑی ہی دل دوز تفصیلات تھیں تین آدمی جو مر گئے تھے بال بچے دار تھے اور اخبار نے اُن کے لواحقین کے نالہ و شیون کی بھی تصویریں چھاپی تھیں مگر یہ کہیں نہیں لکھا تھا کہ کوئی آدمی غائب بھی ہوچکے ہیں۔ یہ تو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ منی بس کے کچھ زخمی لاپتہ بھی ہوسکتے ہیں۔

ہم اخبار دیکھ چکے تو آبی بولا۔ "تکریم صاحب! آپ میرا خیال ہے ابھی تک کچھ نہیں سمجھ سکے ہیں ان کا کوئی دشمن ہی ہوسکتا ہے جو ایسی بے بسی کی حالت میں انھیں اغوا کر کے لے گیا۔"

اس پر فردوسی بیگم بولی۔ "نہیں جناب! وہ بے چارے تو بہت ہی سادہ لوح آدمی ہیں، ایک کے تین بچے ہیں اور دوسرے کی ابھی چھ ماہ پہلے شادی ہوئی تھی۔ ان کا کسی سے لڑائی جھگڑا ہونے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"شادی شدہ یا بال بچے دار ہونے سے آدمی دوسروں کی دشمنی سے تو بچ نہیں جاتا۔ وہ کوئی تختی تو سینے پر لٹکائے نہیں پھرتے ہوں گے۔ ہم بال بچے دار ہیں ہمیں کوئی کچھ نہ کہے کیا خیال ہے تمھارا ہاشم خان؟" آبی نے یہ کہہ کر ہاتھ کا سگریٹ ایش ٹرے میں مسلا اور ایک نیا سلگا لیا۔

فردوسی بیگم زیرِ لب مسکرائی اور تکریم احمد کی طرف دیکھ کر بولی۔ "آپ نے اُن کے گھر والوں کو بتا دیا تھا نا کہ وہ آپ کے ساتھ منی بس میں بیٹھے تھے صدر کے لیے۔"

"میں کیا بتاتا، وہ یوسف صاحب ہی بہت کانی تھے۔ وہ باریش آدمی جو رس گلوں پر ہاتھ کھول کر صاف کر رہا تھا۔ وہ مر جاتا تو مجھے دلی خوشی ہوتی وہ سات سموسے اور تیرہ رس گلے کھا گیا تھا میرے سامنے۔ ہاں۔ اس نے دونوں گھروں میں جا کر بتا دیا۔ مگر آج صبح رات بھر وہ ہسپتال میں رہا۔ سوچا ہوگا کہ پورا معائنہ ہو جائے تو وہاں سے اُٹھے۔ پھر نرسوں کے نرم نرم ہاتھ بھی ایسے روکے رہے ہوں گے آدمی ذرا رنگین طبیعت کا ہے وہ۔"

تکریم احمد نے کسی محمد یوسف کے بارے میں سب کچھ فردوسی بیگم کو تفصیل سے بتا دیا۔ "آپ بھی بہت دور کی کوڑی لاتے ہیں۔ اُن کو ڈھونڈیں جناب یہی ہیں آپ کی تکریم ہے۔"

"میں کہاں ڈھونڈوں انھیں، وہ کوئی بچے تھوڑی ہیں بہرحال آئیں ہاشم صاحب ہم ذرا ناظم آباد تک ہو آئیں دیکھیں تو سہی کہ وہ لوگ ہیں کون۔"

"ہاں! میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ آئیں پیرزادہ صاحب۔" یہ کہہ کر میں نشست گاہ سے اُٹھ گیا۔

فردوسی بیگم کی چھٹی حس کچھ زیادہ ہی بیدار تھی وہ کچھ پریشان سی ہوگئی بولی۔ "تکریم صاحب! مجھے نہیں بتائیں گے کہ آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"ہم ذرا ناظم آباد تک جائیں گے ڈیئر۔ ان کے کوئی جاننے والے وہاں رہتے ہیں اُن سے مل کر ہم جلدی لوٹ آئیں گے۔"

"ٹھیک ہے مگر کھانے کے وقت تک ضرور واپس آجائیں۔ میں بس دیکھتی ہی نہ رہ جاؤں۔"

"اللہ کرے آپ ابد آباد تک ان خوبصورت آنکھوں سے بغیر عینک کے دیکھتی رہیں، اتنی فکرمند کیوں ہیں آپ! ہم بقائمی ہوش و حواس باہر جا رہے ہیں۔"

وہ اس کی یہ بات سن کر کچھ خوش نہیں ہوئی اسے بازو سے پکڑ کر اپنے اکلوتے بیڈ روم میں لے گئی۔ تھوڑی دیر بعد تکریم احمد ہمارے ساتھ فلیٹ سے باہر نکلا تو بولا۔ "یار تم ادھر بڑی بے احتیاطی سے باتیں کرتے رہے ہو وہ دروازے کے پیچھے کھڑی سنتی رہی ہے۔"

"اوئے بیڑہ غرق! یہ تو بہت ہی برا ہوا ہے سائیں تکریم احمد! ایسی خراب عورت ہے یہ؟"

"میں دراصل اس کو تمھارے بارے میں بار بار کہتا رہا تھا کہ جیسے ہی تم لوگ آؤ وہ تمھیں فوراً اندر بٹھائے اب وہ پریشان ہوگئی ہے اس کا خیال ہے کہ آپ کوئی اچھے آدمی نہیں ہیں۔"

"نہیں اس سے کوئی اپنے چال چلن کا سرٹیفکیٹ نہیں لینا ہے بھئی! تم چاہو تو ہمارے ساتھ ہوٹل میں ٹھہر سکتے ہو۔"

"نہیں یار! ایسی خنک رات جو مجھے ادھر ملتی ہے اور کہاں مل سکتی ہے میں بہرحال اس کے شکوک رفع کر دوں گا۔" یہ کہہ کر اس نے ایک ٹیکسی روکی اور ہم اس میں بیٹھ کر سیدھے ناظم آباد جا پہنچے۔

انسان نے زمین کی صورت کچھ یوں بدلی ہے اور جا بجا اپنی صناعی سے اس میں ایسا حسن اور ایسی جذباتیت پیدا کر لی ہے کہ آدمی کا یہ دنیا چھوڑ دینے کو دل ہی نہیں چاہتا۔ یہی حال اس ناظم آباد کا ہے۔ میں نے گلبرگ میں بھی پودوں کو آدمی کے ہاتھوں میں اُگ کر اونچے برچھے بنتے دیکھا ہے وہاں سے بھی آوارہ ہوائیں جب گزرتی ہیں تو معطر ہونے لگتی ہیں۔ اور ان میں سے جنگل کی بُو باس کی جگہ کئی قسم کی بھید وں بھری جادوئی خوشبوئیں رچنے لگتی ہیں۔ یہاں تک کہ جب وہ معطر ہوائیں پھر کسی کچی آبادی میں داخل ہوتی ہیں تو اُن میں پھر عفونت جذب ہونے لگتی ہے۔

جب میں نے ناظم آباد کا وہ سرسبز اور خوبصورت علاقہ دیکھا تو انسان کی صناعی کو میں بے ساختہ داد دینے لگا۔ لوگوں نے زمین پر جنت بنالی تھی۔ اور ایسی زمین پر جو ناظم آباد بننے سے پہلے ایک ہولناک ویرانہ ہوگی۔ ہر کونہ انسان کی عظمت کی گواہی دے رہا تھا۔

الشفق کے بارے میں ہم نے ادھر ادھر سے معلوم کیا مگر کسی نے بھی ہمیں کچھ نہ بتایا۔ اتفاق سے اُس گھڑی ایک ڈاکیہ ہمارے پاس سے گزر رہا تھا۔ آبی اس کی سائیکل سے ٹکرا ہی گیا، بولا "بھائی خطوط خان! خدا رُک کر ہماری فریاد سُن لے تیرا بڑا احسان ہوگا۔"

وہ ادھیڑ عمر کا آدمی اپنے اس نئے خطاب پر مسکراتا ہوا بڑی مشکلوں سے سائیکل کی گدی پر سے نیچے اُترا، بولا۔ "جی بھائی شکوک خان جی! منی آرڈر تو میں سب بانٹ آیا ہوں۔ اگر رقم کی ضرورت ہے تو وہ میں اب دینے سے معذور ہوں۔" اس نے آبی کو ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ وہ سمجھا کہ ہم شاید اسے لوٹ لینا چاہتے ہیں۔ اُس بستی کا بھی کمال یہ تھا کہ بھری دوپہر میں سڑکیں ویران نظر آتی تھیں چاروں طرف ویسا ہی سناٹا طاری تھا جیسا جنت میں ہوگا۔ کئی کئی سو مربع گز پر بنی ہوئی کوٹھیاں اپنے معدودے چند مکینوں کو یوں بانہوں میں لیے بیٹھی تھیں جیسے وہ انہیں لوری دے کر گہری نیند سُلا چکی ہوں اور ان اداس اور تنہا سڑکوں پر اُس ہرکارے کا مل جانا ہمیں غنیمت نظر آتا تھا۔ بڑے آدمیوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ عوام الناس کی بھیڑ بھاڑ سے بہت گھبراتے ہیں۔ انگریز تھے تو وہ بھی شہروں سے باہر کنٹونمنٹس بناتے تھے۔ مغل بھی یہی کرتے تھے، انھیں دلی کی بھیڑ بھلی نہ لگی تو آگرہ میں جا بسے۔ انھیں اپنی آخری آرام گاہ میں بھی عام لوگوں کی بھیڑ بھاڑ پسند نہیں آتی تھی یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اپنے مقبرے ایسی جگہوں پر بنوائے جہاں تک شہر کی مسجدوں کی اذانیں بھی سُنائی نہ دے سکتی تھیں۔ شاہدرہ، لاہور میں جہانگیر کا مقبرہ اور نور جہاں کی آخری آرام گاہ اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔ ورنہ وہ لوگ بھی میانی صاحب میں ہی لیٹ رہتے کہ آدمی کو آنکھیں موند لینے کے بعد کرنا ہی کیا ہوتا ہے مگر اس کا تموّل اُسے چین نہیں لینے دیتا۔

"بات یہ ہے بھائی کہ ادھر ایک بنگلہ ہے الشفق۔ اگر اس کا تو ہمیں پتہ بتا دے تو ہم تیری بلا تفتیش مغفرت کی دعا کریں گے تاکہ تو قبر کے عذاب سے بھی بچ جائے اور فرشتے تیرے ریکارڈ کی چھان بین بھی نہ کریں۔"

آبی اچھے موڈ میں ہوتا تھا تو ایسے ہی کسی نہ کسی سے پیچ لڑا لیتا تھا۔ وہ ہرکارہ ہنس دیا، بولا۔ "مجھے تو مہربانی کر کے ابھی اِدھر ہی رہنے دیں جناب ابھی بڑی ڈاک تقسیم کرنی ہے مجھے، البتہ الشفق کا پتہ یہ ہے کہ اس سیدھی سڑک پر جا کر بائیں ہاتھ مڑ جائیں دوسری کوٹھی کا نام الشفق ہے۔ اگر وہ نہ ملے تو کسی آئی اسپیشلسٹ سے مشورہ کریں یا پھر میرے پاس ڈاک خانے آ جائیں۔" یہ کہہ کر اس نے پیڈل پر پاؤں رکھا اور وعلیکم السلام کہہ کر آگے چل دیا۔

"بہت تیز آدمی ہے بھئی یہ ڈاکیا! قینچی کی طرح زبان چلتی ہے اس کی۔" آبی اس کے جواب پر خوش ہو گیا۔

"تیرے ساتھ یہی سلوک ہونا چاہیے کیا ضرورت تھی اُسے قبر کے عذاب کی دھمکی دینے کی مسٹر غلام محمد مرشد پیرزادہ!" میں نے آبی کو ٹوکتے ہوئے کہا۔

وہ ہنس دیا، بولا۔ "یار تو نے میرا نام کچھ زیادہ ہی لمبا کر دیا ہے کیوں تکریم صاحب اب آپ کا نام دیکھیں نا کتنا اچھا ہے چھوٹی سی باریک سوئی کی نوک پر بھی لکھا جا سکتا ہے۔"

ابھی وہ یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ ہمارے قریب سے ایک ٹیکسی تیزی سے گزر گئی۔ وہ ہمارے عقب سے آئی تھی اور اُسی طرف مڑ گئی۔ جدھر ہم جا رہے تھے مگر میں تو اسے دیکھتا ہی رہ گیا، اس میں مردان شاہ سوار تھا اور اس کے ساتھ تین آدمی اور بھی تھے۔ آبی نے بھی اسے پہچان لیا، بولا۔ "یار! یہ۔۔۔ یہ مردان شاہ اِدھر کیا کر رہا ہے؟"

"پتہ نہیں! کسی کام سے آیا ہوگا اِدھر۔ اُس نے ہمیں دیکھا نہیں، ورنہ ضرور رُکتا۔" ہم تینوں نے اپنی رفتار لاشعوری طور پر تیز کر دی۔ وہ ڈاکیا ٹھیک کہتا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم الشفق کے سامنے کھڑے تھے۔ مگر۔ وہاں تو سماں ہی کچھ اور تھا۔ کم و بیش ساٹھ ستر آدمی اُس

کار کی ایجاد نے شہرِ خموشاں کی آبادی میں اضافہ کیا ہے، ٹریفک کے لاینحل مسائل تخلیق کیے ہیں، ٹرکوں کو بے راہ کیا ہے، نصف سے زیادہ دنیا کو آمدنی سے زیادہ خرچ کرنے کا گُر سکھایا ہے اور ہمیں گھوڑوں سے نجات دلائی ہے۔

بنگلے کے کھلے صحن میں کھڑے ہوئے تھے۔ کچھ دیوار کے سائے میں تھے اور کچھ سامنے کے برآمدے میں۔ جن کو وہاں جگہ نہیں ملی تھی وہ دھوپ میں کھڑے اپنا پسینہ پونچھ رہے تھے۔ مردان شاہ اور اس کے تین ساتھی برآمدے میں جا پہنچے تھے۔ ہم اس سے بات کرنے کے لیے سیدھے برآمدے میں جا پہنچے۔

مردان شاہ کے تینوں ساتھی پنجابی نظر آتے تھے اور بہت صحتمند تھے۔ برآمدے تک ہم ابھی پہنچے ہی تھے کہ مردان شاہ کی نظر ہم پر پڑ گئی۔ وہ تیزی سے ہماری طرف لپکا، بولا۔ "یار جی! یہ آپ کدھر "کھجل کھوار" ہو رہے ہیں، فارن کے چکر میں تو نہیں ہو؟"

"نہیں شاہ جی! ہم تو ایک آدمی کا پتہ معلوم کرنے آئے ہیں ادھر مگر یہاں یہ اتنے سارے لوگ کیوں کھڑے ہیں؟"

"بھئی! ادھر سعودیہ اور عراق کے لیے بھرتی ہو رہی ہے ہر قسم کا آدمی اٹھا لیتے ہیں یہ۔"

"اچھا، مگر ہم نے تو کچھ اور ہی سنا ہے، ریکروٹنگ ایجنٹ کون ہے؟"

"کوئی قربان علوی صاحب ہیں۔ اخبار میں پچھلے منگل کو ایک اشتہار بھی چھپا تھا ان کا۔ اپنے یہ تینوں بندے تو انھوں نے پاس کر لیے ہیں۔ دس دس ہزار روپے لیے ان سے۔"

"کوئی رشتے دار ہیں یہ تمھارے؟"

"ان میں میرا ایک بھتیجا ہے جمیل۔ یہ جو دائیں ہاتھ کھڑا ہے نا۔ ادھر بیکار پھر رہا تھا۔ بہت اچھا موٹر مکینک ہے، اب اس کے دن بھی پھر جائیں گے۔"

"اب کیا کہتے ہیں یہ؟"

"بس ہم یہی پوچھنے آئے ہیں، آپ کو کس سے ملنا ہے؟"

ابھی وہ یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ عمارت کے بڑے دروازے میں سے دو آدمی باہر آئے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں بڑا سا رجسٹر تھا۔ اسے دیکھتے ہی مردان شاہ برآمدے کی طرف لپکا۔ وہ دونوں آدمی صحن میں بکھرے لوگوں سے مخاطب ہو کر بولے۔

"جناب! جن لوگوں کو منتخب کر لیا گیا ہے ہم ان کے نام پڑھ کر سناتے ہیں جس جس کا نام لیا جائے وہ یہاں ٹھہر جائے اور باقی سب لوگ واپس چلے جائیں۔ اور سمجھیں کہ انھیں منتخب نہیں کیا جا سکا ہے۔"

سب لوگ ایک دم خاموش ہو گئے۔ ان کا دھیان اب اس آدمی کی آواز پر لگا تھا۔ اس نے اپنی عینک کا زاویہ درست کیا اور باری باری مختلف لوگوں کے نام پڑھنے لگا۔ معلوم یہ ہوا کہ انھوں نے بائیس آدمی منتخب کر لیے تھے۔ وہ جب خاموش ہوا تو صحن میں عجیب سا بے ہنگم شور مچ گیا۔

اس نے سب کو ڈانٹ کر خاموش کر دیا۔ بولا۔ "جن لوگوں کے نام میں نے پڑھ کر سنائے ہیں وہ یہاں رک جائیں اور باقی فوراً یہاں سے چلے جائیں اور اپنا قیمتی وقت برباد نہ کریں۔"

مردان شاہ ہم سے چند قدم دور کھڑا تھا۔ اور بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ بہت سے لوگ مایوس ہو کر بنگلے سے نکلنے لگے تو وہ ہمارے پاس آ گیا۔ بولا۔ "میرے تینوں آدمی پاس ہو گئے ہیں یار جی! اللہ نے ان کی دعائیں سن لیں۔"

"چلو اچھا ہوا۔ خدا کرے یہ صحیح سلامت واپس آ جائیں۔" میں نے یونہی بے خیالی میں یہ بات کہہ دی۔

مردان شاہ چونک سا گیا۔ میرے چہرے کو بڑے غور سے دیکھ کر بولا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو یار جی! وہاں کوئی توپ تو نہیں چلانی ہے انھیں۔ محنت مزدوری سے آدمی مر تو نہیں جاتا۔"

"میں بھی یہی کہہ رہا تھا شاہ جی! دور دیس کی بات ہے نا۔ میں نے تو ان کی خیریت کی دعا مانگی ہے۔" یہ کہہ کر میں تیزی سے ان دونوں آدمیوں کی طرف بڑھا جو اب رجسٹر بند کر کے اپنے منتخب لوگوں کو برآمدے میں ترتیب سے کھڑا کر رہے تھے۔ مردان شاہ کے تینوں آدمی بھی اس قطار میں جا ٹھہرے تھے۔

"جناب! آپ کو زحمت نہ ہو تو میری ایک گزارش سن لیں۔" میں نے اس معنک آدمی کے کندھے پر بڑی رسان سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

وہ کچھ بھڑک سا گیا۔ "کیا بات ہے میاں؟ ٹھیک سے کھڑے ہو، کیا چاہتے ہو؟"

"تمھارا لہجہ انتہائی گنواروں ایسا ہے۔ سوچ سمجھ کر بولو۔ میں بھرتی ہونے نہیں آیا۔" میں نے اپنی آواز میں ذرا سی گھن گرج پیدا کرتے ہوئے کہا۔

وہ ٹھٹک سا گیا مگر میری آنکھوں میں ابلتے ہوئے غصے کو دیکھ کر قدرے نرم آواز میں بولا۔ "فرمائیے آنجناب کی بندۂ حقیر پرتقصیر کیا خدمت کر سکتا ہے۔ کرسی نکلواؤں، بستر بچھواؤں۔ حکم ہو تو پیچوان بھی حاضر کر دوں۔"

اس کے لفظوں کے اس طنز نے میرا مغز الٹ دیا۔

"تم ابھی تک اپنی کھال میں نہیں آئے ہو مجھے ڈاکٹر عالیہ سے ملنا ہے اور ابھی۔ مجھے امید ہے کہ ڈاکٹر دھمن بھی اندر ہوں گے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ اس نام کے لوگ یہاں نہیں رہتے ہیں۔"

آبی اور تکریم احمد اس عرصے میں ہمارے قریب آ چکے تھے۔ تکریم احمد نے اسے اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھو میاں یہ ناٹک بند کرو۔ ہم اس عورت وردہ سے بھی ملنا چاہتے ہیں، جسے ڈاکٹر عالیہ تھانے سے اپنی ذمے داری پر لے کر یہاں آئی ہیں۔ ہم ان سے کچھ ضروری باتیں معلوم کرنا چاہتے ہیں۔"

اب کی بار وہ آدمی کچھ اور زیادہ سنجیدہ ہو گیا۔ بولا۔ "آپ کو کسی نے غلط بتلایا ہے صاحب! یہاں اس نام کے لوگ نہیں رہتے۔ یہ قربان علوی صاحب کی رہائش گاہ ہے اور وہ ریکروٹنگ ایجنٹ ہیں۔"

"ہمیں قربان صاحب سے بلوا دو۔ ہم ان سے معلوم کر لیں گے کہ یہ کیا چکر ہے؟" تکریم احمد نے بڑے جمے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ان کو علوی صاحب سے بلوا دیں حفیظ صاحب اس میں ہرج ہی کیا ہے؟"

"مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے کمال میاں آپ علوی صاحب کو اطلاع کر دیں۔ کیا نام ہے جناب آپ کا؟"

"میرا نام تکریم احمد ہے۔"

"جائیں کمال میاں علوی صاحب کو بتا دیں۔" یہ کہہ کر وہ آدمی پھر ان لوگوں کی طرف متوجہ ہو گیا جن کو وہ فہرست کے مطابق قطار میں کھڑا کر رہا تھا۔ کمال اندر گیا تو ہم برآمدے کے ایک کونے میں جا کھڑے ہوئے۔ آبی بولا۔ "میرا خیال ہے کہ اندر صرف تکریم صاحب ہی کو جانے دیا جائے۔"

"ہاں! عین ممکن ہے وہاں صورت حال کچھ مختلف ہو۔ صرف آپ ہی اندر جائیں تکریم صاحب! ہم یہیں ٹھہرتے ہیں۔" میں نے آبی کی ہاں میں ہاں ملائی۔

تکریم احمد نہیں مانا، بولا۔ "آپ بھی میرے ساتھ چلیں ایک سے دو بہتر ہوتے ہیں۔"

اتنے میں کمال تیزی سے ہماری طرف لپکتا چلا آیا، بولا۔ "آئیں جناب! علوی صاحب آپ سے مل لیں گے۔"

ہم اس کے پیچھے چلتے ہوئے برآمدے کے وسط میں پہنچے تو اس نے دروازہ کھول دیا۔ سامنے راہداری تھی جس کے فرش پر دبیز مصنوعی ریشے کا قالین سا بچھا تھا۔ اس پر ہم بے آواز چلتے ہوئے چند ہی قدم آگے بڑھے تو کمال نے دائیں ہاتھ کا دروازہ کھول دیا۔ سامنے ایک بڑی سی خوبصورت دفتری میز کے پیچھے ایک ادھیڑ عمر کا بہت ہی صحت مند آدمی بیٹھا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ کرسی سے اٹھا اور دو قدم آگے آ کر اس نے ہم سے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا پھر ہمیں کرسیوں پر بٹھا کر بولا۔

"آپ مجھ سے ملنا چاہتے تھے کس نے میرا پتہ دیا ہے آپ کو؟"

"تھانے سے ہمیں آپ کا پتہ ملا ہے جناب! وہاں سے ایک مظلوم عورت ورده کو ڈاکٹر عالیہ نام کی کوئی خاتون یہاں لائی ہیں اور ہم ان سے ملنے کے لیے ادھر آئے ہیں۔" تکریم احمد نے بڑے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

"معلوم ہوتا ہے کچھ غلط فہمی ہوئی ہے آپ کو، کیا نام ہے آپ صاحبان کا؟"

"میرا نام تکریم احمد ہے، یہ ہاشم خان ہیں اور یہ ایس جی ایم ایم پیرزادہ ہے۔"

"ہوں! ٹھہریں میں تھانے سے فون پر معلوم کرتا ہوں کہ یہ کیا گھپلا ہے۔ اس نام کے لوگ تو ادھر نہیں رہتے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور پہلو کے کمرے میں جا گھسا۔ فون اس کی میز پر بھی تھا مگر جب میں نے اس کا ریسیور اٹھایا تو معلوم ہوا کہ وہ انٹرکام تھا اور اصل ٹیلیفون کسی خاص مصلحت کی بنا پر دوسری جگہ رکھا ہوا تھا۔ یہ بڑی عجیب سی بات تھی مگر ہمارے پاس اس کا کوئی علاج نہیں تھا۔ کوئی دس منٹ بعد قربان علوی واپس آیا۔ اس کے چہرے پر تشویش کے آثار نمایاں تھے۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ اپنی کرسی پر بڑے ہی متذبذب انداز میں بیٹھ کر ہمیں گہری نظر سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "جناب میں نے تھانے سے معلوم کیا ہے، وہ تو یہ کہہ رہے ہیں کہ جس خاتون نے ان سے رابطہ قائم کیا۔ اس نے اپنا پتہ الشمس لکھوایا تھا آپ الشفق سمجھ بیٹھے۔ اور الشمس نام کی کوٹھی ادھر کہیں لیاقت آباد میں ہے مگر آپ ناظم آباد چلے آئے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے علوی صاحب! اجازت دیں تو میں خود فون پر بات کر لوں؟ ابھی معلوم ہو جائے گا۔" تکریم احمد نے پریشان ہو کر کہا۔

"آئی ایم ساری جنٹلمین! میں آپ کی کوئی خدمت نہیں کر سکتا۔ یہ بلاوجہ کی الجھن میں مول نہیں لیتا۔ میرا وقت بہت قیمتی ہے۔" اس آدمی نے ایک دم ہمیں پاؤں سے اکھاڑ دینے کی کوشش کی اور اس کے ساتھ ہی اس نے میز کے ساتھ لگی گھنٹی دوبارہ بجائی۔ ہمیں اپنے عقب میں دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے پیچھے نظر ڈالی۔ دو آدمی کمرے میں داخل ہو چکے تھے۔ اور دونوں مسلح تھے۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ ہتھیار انہوں نے ہاتھ میں تھام رکھے تھے۔ یہ بات نہیں تھی مگر جس انداز سے وہ چل کر آگے بڑھے اس سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ بلاوجہ ہیبت خان بننے کی کوشش نہیں کر رہے تھے۔ ان کے لمبے کرتوں کے نیچے سفید چوڑی دار پاجاموں کے نیفوں میں ہلکے پستول اڑسے ہوئے تھے۔ آبی نے بھی ان کا پہلی ہی نظر میں ایکسرے لے لیا تھا۔

"سیفی میاں! تم ذرا اس الماری میں سے ان نئے رنگروٹوں کی فائل نکال دو اور تم انہیں گیٹ تک پہنچا دو اکبر میاں! کسی نے انہیں خواہ مخواہ غلط پتہ دے دیا ہے۔"

"آیئے جناب! میں آپ کو گیٹ تک لے چلتا ہوں۔ ٹیکسی بھی پکڑ دوں علوی صاحب؟"

"ہاں! یہ بے چارے پردیسی ہیں انہیں لیاقت آباد کے لیے ٹیکسی لے دو۔" اس کا وہ روکھا خشک اور لیا دیا لہجہ ہمیں ذلیل کرنے کے لیے بہت کافی تھا۔ آبی کی آنکھوں میں خون اترنے لگا تھا مگر میں نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ باہر اتنے سارے لوگ جمع تھے اور ہمیں صحیح صورت حال کا ابھی تک کوئی علم

نہ ہو سکا تھا۔ تکریم احمد کی جرأت دیدنی تھی، وہ بھی بہت بُری طرح الجھ چکا تھا مگر ہمارے پاس اس نئی مشکل کا فوری حل کوئی بھی نہیں تھا۔ علوی کے دونوں آدمی میز کے دائیں بائیں یوں آ ٹھہرے تھے جیسے وہ ہماری ذرا سی غلط حرکت پر ہمیں چھاپ لیں گے مگر ان کی غلط فہمی ہم فوراً ہی دُور کر سکتے تھے۔ آبی اس کے لیے بالکل تیار تھا۔ ایک بھرا ہوا پستول اس کی جیب میں تھا اور ایک میری جیب میں۔ مگر میں اپنی جگہ سے فوراً ہی اٹھ گیا۔

”ٹھیک ہے علوی صاحب آپ کا بہت بہت شکریہ! ہم سے کوئی گستاخی ہو گئی ہو تو ہم اس کی معافی چاہتے ہیں۔“

آبی نے بندھے چیتے ایسی بے بسی سے میری طرف خون آلود نگاہوں سے دیکھا اور پھر سر جھٹک کر وہ تکریم احمد کے ساتھ کمرے کے دروازے کی طرف لپکا اور دروازے کی دستی کو گھماتے ہوئے بڑے ہی غضبناک لہجے میں بولا۔ ”تم سے پھر ملاقات ہو گی قربان میاں! پھر ہمیں تم اتنی آسانی سے دھوکا نہیں دے سکو گے۔“

قربان علوی کے دونوں آدمی مستعد کھڑے تھے مگر ان میں سے کسی کو بھی ہمیں للکارنے کی جرأت نہ ہوئی۔ قربان بھی منجمد سا ہو کر کرسی پر بیٹھا رہ گیا۔ میں ان کا ردِعمل دیکھنے کے لیے دروازے میں رُک گیا تھا میرے بپھرے ہوئے تیور دیکھ کر وہ فوری طور پر کوئی فیصلہ نہ کر سکے کہ آبی کی بات کا انھیں کیا جواب دینا چاہیے۔

ہم جب برآمدے میں نکلے تو ہمارا حال پٹے ہوئے جانوروں ایسا تھا۔ قربان علوی کے دونوں کارندے نئے رنگروٹوں کے بارے میں تفصیلات رجسٹر میں درج کر رہے تھے۔

مردان شاہ اس گھڑی کچھ فاصلے پر دیوار کے سائے میں کھڑا تھا۔ ہمیں باہر آتے دیکھ کر وہ ہماری طرف لپکا اور ہنستے ہوئے بولا۔ ”کیا بنا یار جی! وہ بندہ مِل گیا کہ نہیں جس کے لیے آپ اِدھر آئے تھے“

”نہیں شاہ جی! وہ اِدھر نہیں ہے۔“

”کیا نام ہے اس آدمی کا جس سے آپ ملنا چاہتے ہیں؟“

”ڈاکٹر دھمن نام ہے اس کا۔“ آبی نے بے ساختہ کہہ دیا۔

”اوئے بیڑہ غرق! میرا بھتیجا بھی اس کا ہی نام لے رہا تھا۔ اس نے ہی تو اُن کی ڈاکٹری کی تھی یار جی!“ وہ دبے لہجے میں بولا۔

”مگر کس جگہ؟“

”اِدھر ہی! پرسوں کی تو بات ہے، اس نے بتایا تھا کہ اِدھر دو ڈاکٹر موجود تھے۔ ایک عربی بولتا تھا مگر لباس اس نے انگریزی پہن رکھا تھا۔ دوسرا پنجابی میں بھی بات کرتا تھا۔“

”تمھارے بھتیجے کو کیسے پتہ چلا کہ دوسرے ڈاکٹر کا نام دھمن ہے؟“

”اُس کے ساتھ ایک اور امیدوار کھڑا تھا۔ اس نے جمیل سے کہا تھا کہ یہ ڈاکٹر دھمن ہے اور لاہور کا رہنے والا ہے۔ مگر یار جی عجیب بات یہ ہے کہ جب اس نے ڈاکٹر دھمن سے کہا کہ ڈاکٹر جی! میں آپ کو جانتا ہوں آپ لاہور کے رہنے والے ہیں، میں بھی لاہوری ہوں۔ میرا کام کروا دیں۔ آپ دھمن ہیں اور میں لقمن ہوں۔ تو وہ ڈاکٹر تپ گیا تھا۔ کہنے لگا کیا بکتے ہو میرا نام انور سیال ہے۔ تمھیں کس نے کہا کہ میں دھمن ہوں؟ اس کی یہ بات سن کر وہ بے چارا چپ ہو گیا یہ ساری باتیں میرے بھتیجے نے مجھے بتائی تھیں۔ وہ جو عربی ڈاکٹر تھا، اُسے وہ لوگ ڈاکٹر ادریس کے نام سے پکارتے تھے۔ وہ دونوں ہی موجود نہیں یہاں۔“ مردان شاہ نے ہمیں حیران کر دیا اپنے بھتیجے کی کہی ہوئی تمام باتیں اس نے ہمیں بتا دی تھیں۔

”مگر وہ قربان علوی تو کہتا ہے کہ اس نام کا کوئی ڈاکٹر اِدھر نہیں ہے۔“

”بکتا ہے وہ۔“ پھر قدرے توقف کے بعد وہ بولا۔ ”مگر ہو سکتا ہے کہ جمیل کے ساتھی کو مغالطہ لگا ہو مگر یار جی! یہ کوئی نوسر بازوں کا ٹولہ تو نہیں ہے، ان کے بارے میں اگر آپ کو کچھ معلوم ہے تو بتا دو۔ جب سے آپ نے کہا ہے کہ خدا انھیں صحیح سلامت واپس لائے، تب سے میں بھی سوچ میں پڑا ہوں کیا مطلب تھا آپ کا؟“

”یہ کچھ نہیں مردان شاہ! ہم کسی خاص نتیجے پر پہنچ لیں پھر تمھیں سب کچھ بتا دیں گے مگر اپنے بھتیجے سے کہو کہ وہ ہوشیار رہے۔“

”میں اسے سمجھا دوں گا، کوئی اور رقم ان لوگوں نے مانگی تو میں جوتا دکھاؤں گا انھیں۔ باندھ کر مار دوں گا ان سالوں کو۔“

قربان علوی کے وہ دونوں مسلح آدمی برآمدے میں کھڑے ہمیں گھور رہے تھے۔ مردان شاہ اُن کی تیز تیز نظروں سے گھبرا کر ہم سے الگ ہو گیا اور ہم اسی وقت بنگلے سے نکل کر باہر سڑک پر جا پہنچے۔

”تو بالکل غلط آدمی ہے ہاشم خان! اس علوی کو خواہ مخواہ چھوڑ دیا تو نے۔ وہ ہمیں ٹرخا گیا ہے۔“

”نہیں بھائی جی! یہ بات نہیں ہے۔ ہم اِدھر ہی کسی جگہ رُک کر ڈاکٹر دھمن کا انتظار کریں گے وہ اس بنگلے پر ضرور آئے گا۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے مگر ہاشم خان جی! ابھی تک آپ نے مجھے اُن کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا ہے۔“

”آپ کو بتایا تو تھا ہم نے گاڑی میں۔ مگر خیر، ہم اب آپ کو سب کچھ تفصیل سے بتا دیتے ہیں۔“ یہ کہہ کر میں ان دونوں کو وہاں سے ہٹا کر الشفق سے ذرا دُور ایک سبزہ زار میں لے گیا۔ آبی کا غصہ کسی طرح ڈھل نہیں رہا تھا اور اس کی رائے میرے بارے میں زیادہ ہی خراب ہو گئی تھی۔ مجھ سے وہ بات بات پر اُلجھنے لگا تھا۔ اور میری کوشش یہ تھی کہ تکریم احمد کے سامنے میرے اور اس کے درمیان کوئی تلخی پیدا نہ ہو جائے۔ وہ میرے کلبے کا شریک ہی نہیں تھا بلکہ وہ میرے لہو میں رچ بس گیا تھا۔ جس کا وکا وہیں میں مبتلا تھا اس کا اسے پوری

طرح احساس تو تھا مگر میرے اس کلیے کو وہ کسی بھی طرح دُور نہیں کرسکا تھا اور اب وہ میری مسلسل ناکامیوں کو میری بے تدبیری پر محمول کرنے پر بضد تھا۔ اور یہی تو میں برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے تو اپنی زندگی لہولہان کرلی تھی۔ کوئی لمحہ ایسا نہیں تھا جو میں نے اپنے مقصد کے حصول میں صرف نہ کیا ہو۔ پھر بھی وہ اس روز مجھ سے بہت ناراض تھا۔ محض اس لیے کہ میں نے قربان علوی کو وہیں کیوں نہ پکڑ لیا۔ اس کے جھوٹ کو نگل کر کیوں اتنے اطمینان سے میں اشفق سے باہر آگیا۔ وہ اسے میری بزدلی پر محمول کر رہا تھا۔ تکریم احمد نے بیچ بچاؤ کراتے ہوئے اسے سمجھایا کہ وہ تحمل سے کام لے اور اپنی طبیعت کے اس جوش پر قابو پائے۔ تکریم احمد کی یہ بات سن کر بھی وہ چپ نہیں ہوا، بولا۔ ”چھوڑیں جی یہ کوئی طریقہ ہے، اتنے زخم کھانے کے بعد بھی اپنے یار کو سمجھ نہیں آئی۔ آگئے وہاں سے منہ لٹکا کر۔“

”یار میری بات سمجھنے کی کوشش کر، میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر دھمن سے اس منڑوے نے بات ضرور کی ہے مگر اُن کو یہ احساس نہیں ہوسکا کہ اُن کے لیے کون پوچھتا پھر رہا ہے اگر وہ ہمیں پہچان کر ہماری اس حماقت سے فائدہ اٹھا کر ہمیں وہیں بٹھا رکھتا اور ڈاکٹر دھمن ہمیں پہچان کر اپنے آدمیوں سے ہمارا گلا کٹوا دیتا تو ہم بے موت مارے گئے تھے۔ اوّل تو یوں منہ اٹھا کر ہمیں وہاں جانا ہی نہیں چاہیے تھا کیونکہ اسی طرح میں پہلے بھی مار کھا چکا ہوں۔ اس حماقت کو میں نے دہرا تو دیا مگر اس علوی سے ملنے کے فوراً ہی بعد مجھے یہ احساس ہوا کہ ہم سے غلطی ہو گئی ہے ہم پھر مصیبت میں پھنس سکتے تھے۔“

”یہ بات تمھیں پہلے سوچنا چاہیے تھی۔ تمھیں معلوم تھا کہ تم ڈاکٹر عالیہ سے ملنے جا رہے ہو اور وہ کس قماش کی عورت ہے اس کا بھی تمھیں علم تھا۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو یار جی! مگر اب شکر کرو کہ ہم کسی چکر میں نہیں پھنس گئے ہیں ہمیں کوئی اور تدبیر سوچنا ہوگی اب مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر عالیہ کی رہائش گاہ کہیں اور ہے۔“

”تمھیں یاد ہے وہ وردہ کیا کہہ رہی تھی، یہی نا کہ ڈاکٹر دھمن اُدھر کہیں اسٹار گیٹ کے پاس رہتا ہے۔“ آبی نے مجھے یاد دلایا۔

”ارے پاگل تو نے پہلے کیوں یہ بات مجھے نہیں بتائی۔ میں تو بھول ہی گیا تھا، وہ تو واقعی یہی کہہ رہی تھی۔“

مجھے اپنی حماقت پر اور زیادہ غصہ آنے لگا۔ آبی کی برہمی برحق تھی وہ گرڈ پنکھ یونہی شور نہیں مچا رہا تھا۔

تکریم احمد نے اس مرحلے پر مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ مجھے ذرا اس قصے کی تفصیلات بتائیں میرا خیال ہے میں آپ کو کوئی بہتر تجویز پیش کرسکتا ہوں۔“

”ہاں آپ کو اسی لیے میں ادھر لایا تھا بھائی جی!“ یہ کہہ کر میں نے

اُسے پھر سے اپنی ساری کہانی مختصر الفاظ میں سنا دی، حالانکہ بہت سی باتیں میں اسے پہلے بھی بتا چکا تھا مگر وہ جان بوجھ کر تفصیل پوچھ رہا تھا۔

وہ کچھ دیر تک خالی خالی نظروں سے مجھے گھورتا رہا پھر اس کے ذہن میں کوئی بتی سی جل اٹھی، پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا "اگر آپ مجھ سے اتفاق کریں تو میں فردوسی بیگم کے ذریعے یہ سارا معاملہ کراچی کے ایک بڑے پولیس افسر کے گوش گزار کر سکتا ہوں۔"

"وہ کس طرح؟"

"وہ یوں کہ فردوسی بیگم کی فرم کا جنرل مینجر کلب عباس لطیف الدین خان کا جگری یار ہے وہ کبھی کبھار فردوسی بیگم کے فلیٹ کے ساتھ والے فلیٹ میں بھی آ ٹھہرتے ہیں۔ وہ جگہ کلب عباس نے کرائے پر لے رکھی ہے۔"

"بات تو آپ کی ٹھیک ہے مگر ثبوت ہم کہاں سے لائیں گے؟"

آپی نے متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

"ثبوت میں پیش کر دوں گا۔ میں جیسے بھی ہو سکا ڈاکٹر دھمن کو پکڑ کر اس فلیٹ پر لے آؤں گا۔" میں نے بڑے ہی پُراعتماد لہجے میں کہا۔ آپی کی آنکھوں میں چمک پیدا ہونے لگی، وہ مسکرا دیا، یوں کہ میری جان میں جان آ گئی۔ اس کی بے بسی اور بے مردگی نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ اس نے بڑی دیر بعد ایک دم دو سگریٹ نکال کر سلگائے جو اس نے مجھے بھجوایا وہ اسے جان بوجھ کر گیا کر چکا تھا۔

"پھر میرے منہ پر تھوک رہا ہے تو؟"

"تو ہے ہی اسی قابل۔ کسی دن تجھے کوئی یونہی ناکارہ کر کے سڑک پر پھینک جائے گا جس طرح تو اپنے گردے سے محروم ہوا اسی طرح تیرے باقی پرزے بھی بیچ کھائے گا۔"

"میری تجویز کے بارے میں کیا رائے ہے تمہاری؟"

"اچھی رائے ہے، اس پر جتنی جلدی عمل ہو سکے کر گزرو۔ مگر اپنی شناخت کرائے بغیر تم یہ مرحلہ کیسے طے کر سکو گے؟"

"اس کا بھی میں کوئی نہ کوئی حل ضرور نکال لوں گا۔ اب کی بار میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ معاملہ پولیس اور قانون کی نظر میں آ جائے اور ان لوگوں کو عدالت کی طرف سے سزا ملے۔ میں نے یوں ہی سر راہے ان کو گولی مار دی تو کیا ہو گا، وہ مر جائیں گے اور بس۔ یہ تو کوئی سزا نہ ہوئی وہ تو ہر مصیبت سے محفوظ ہو جائیں گے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے خان جی آپ ڈاکٹر دھمن کو پکڑ کر لائیں۔ باقی کام میں کر دوں گا میرے پیچھے تو پولیس نہیں لگی ہے نا۔" تکریم احمد نے کہا۔

"ہاں یہ بہتر رہے گا، آپ اب گھر جائیں۔"

"جی نہیں! وہ کھانے پر ہم سب کا انتظار کر رہی ہو گی وہ غنچہ دہن۔" تکریم احمد نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تو پھر چلیں پہلے ان کی روٹیاں تو سونگھ لیں۔" آپی نے ہری جھری آمادگی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر بعد ہم فردوسی بیگم کے فلیٹ پر جا پہنچے۔ [illegible] کوکا کولا اور سیون اپ ایسی ٹھنڈی بوتلوں سے [illegible] پہلے تو ہم نے اپنی پیاس بجھائی اور پھر کھانے کا انتظار کرنے لگے [illegible] تک ہم شکم سیر ہو چکے تھے۔ کھانا فردوسی بیگم نے واقعی بہت عمدہ پکایا تھا اور اس میں بازار کی تیار کردہ کوئی شے نہیں تھی۔

مگر اس کھانے میں خدا جانے ایسی کیا بات تھی کہ مجھے چار سے اپنی طبیعت میں عجیب سی گرانی محسوس ہونے لگی اور پھر مجھے [illegible] مجھے پیچش نے آ دبایا۔ میرا وہ پیٹ جو ہر قسم کی الا بلا بہ آسانی ہضم کرتا چلا جاتا تھا اس روز میرا ساتھ چھوڑ گیا۔ تکریم احمد نے مجھے [illegible] کی گولیاں بھی لے دیں، جو کچھ بھی اُن سے ممکن ہو سکتا تھا اس نے کیا مگر آٹھ بجے تک میری حالت کچھ اتنی خراب ہو گئی کہ میں سمجھا کہ بدن میں ستیا ہی نہیں رہ گئی تھی۔ بار بار کے مروڑ نے مجھے [illegible] کر رکھ دیا تھا۔ اور پھر مجھ پر نقاہت کے دورے پڑنے لگے۔ آدمی یوں پانی کا بلبلا بھی ثابت ہو سکتا ہے اس کا تو مجھے وہم بھی نہیں تھا۔ میں کو سولہ سترہ دفعہ باتھ روم میں جا چکا تو میری ہمت جواب دے گئی۔ نو بج گئے مگر مجھے آرام نہیں آیا۔ آپی اور تکریم احمد بھی گھبرا گئے۔ اٹھارویں بار تو مجھے بستر ہی پر بے بس ہونا پڑا۔ وہ اور زیادہ پریشان ہوئے تو مجھے رات کے ساڑھے نو بجے وہ اٹھا کر ہسپتال لے گئے۔ مجھے اپنی اس مصیبت کا وہ دن کبھی نہ بھول سکے گا۔ میرے بدن سے پانی بالکل ہی خارج ہو چکا تھا۔

میری اس ابتر حالت پر ڈاکٹر بھی پریشان ہو گئے۔ جو کچھ ان سے ممکن ہو سکتا تھا وہ رات بھر کرتے رہے مگر مرض کے اصل سبب پر قابو نہ پا سکے۔ میں کیا کہوں یارو! میں اس مرض میں ایسا مبتلا ہوا کہ میرے پندرہ دن اس ہسپتال میں یوں گزر گئے جیسے میں قبر کا عذاب جھیل رہا ہوں۔ آپی دن رات میرے بستر کے ساتھ لگا میری تیمارداری میں مصروف رہا۔ وہ بھول ہی گیا تھا کہ اُسے دنیا میں کوئی اور بھی کام ہے یہی حال تکریم احمد کا تھا۔ وہ بھی صبح سے شام تک میرے سرہانے کھڑا رہتا تھا۔ بیچ میں وہ اپنی ضرورتوں کے لیے ادھر اُدھر نکلتے تھے ورنہ اُن کے وہ پندرہ دن میرے ہی گرد گھومتے گزرے۔ آپی نے میرے علاج پر بے دریغ روپیہ خرچ کیا۔ میرے لیے اس نے ایک بہت عمدہ قسم کا الگ کمرہ لے لیا تھا۔ دن رات وہ ڈاکٹروں کو میرے گرد نچاتا رہا۔ اس نے ایک پل بھی چین سے نہ گزارا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ وہ کسی زندہ آدمی کا پیٹ کا پورا کارخانہ نکال کر میرے لیے سب کچھ کر گزرنے پر آمادہ تھا۔

اس دوران وہ میرے علاج کے سوا کسی بھی اور بات پر توجہ نہ دے سکے نہ انہیں ڈاکٹر دھمن یاد رہا نہ ڈاکٹر عالیہ۔ وہ بھول ہی گئے کہ

وہ کس لیے کراچی آئے تھے انھیں کچھ یاد تھا تو صرف یہ کہ اُن کا یار بستر مرگ پر پڑا ہے اور اس کو وہ ہر قیمت پر موت کے منہ سے چھین لینا چاہتے ہیں سولھویں دن جاکر کہیں میری طبیعت سنبھلی۔ دو ہفتوں کے بعد وہ پہلا دن تھا کہ میرے معدے نے تھوڑا سا دودھ قبول کیا تھا۔ آبی نے اُس روز سارے سپتال میں مٹھائی تقسیم کی۔ مجھے بتائے بغیر وہ اس دوران سپتال میں آنے والے نادار مریضوں کو ہزاروں روپوں کی دوائیں خرید کر دے چکا تھا۔ وہ ہر ایک سے کہتا تھا میرے بھائی کے لیے دعا کرو، خدا سے اس کی زندگی مانگو۔ اور وہ سب مفلس و نادار مریض اس کی آہ و بکا سے متاثر ہو کر، اس کے خلوص کی فراوانی سے متاثر ہو کر اس کے اور میرے حق میں بے تحاشا دعائیں کرتے تھے۔ شاید یہ اُنھی میں سے کسی کی دعا کا اثر تھا کہ میں بچ گیا، اور سولھویں دن.... میں زندگی کی طرف آہستہ آہستہ لوٹنے لگا تھا۔ کون زندگی پر بھروسا کرسکتا ہے۔ آدمی کا کاربوریٹر تو کہیں بھی خراب ہو سکتا ہے۔ کہیں بھی اس کے رنگ پسٹن بیٹھ سکتے ہیں، آبی یہی کہتا تھا مرض اور اس سے آگے مرگ کے سامنے تو آدمی بالکل ہی بے بس ہے یہ کوئی پستول کی گولی تو نہیں ہے کہ آپ طرح دے کر اس سے بچ سکتے ہیں مرض تو آدمی کو چیتے کی طرح بے آواز آگے بڑھ کر گردن سے دبوچ لیتا ہے — اٹھارہویں دن میں نے چاہا کہ میں اس بستر سے اُٹھ کر بھاگ نکلوں مگر میری حالت دیدنی تھی۔ بدن یوں گھل گیا تھا جیسے میں بس ایک استخوانی ڈھانچہ ہوں ساری رونقیں ختم ہو گئی تھیں حالت یہ تھی کہ انتیسویں دن آبی نے مجھے آئینہ دکھایا تو میں خود کو پہچان نہیں پا رہا تھا میرے چہرے کی ساری بتیاں گل نظر آتی تھیں نہ آنکھوں میں چمک تھی نہ رخساروں پر وہ خون کی لالی ہی باقی رہ گئی تھی۔ اور رگیں ہاتھوں اور گردن پر یوں اُبھر آئی تھیں جیسے میں کوئی ستر سالہ بوڑھا آدمی ہوں اور بے غیرت بن کر جینے کے لالچ میں جی رہا ہوں۔

ڈاکٹروں نے بھی میری حالت کو سمجھتے ہوئے مجھے ہسپتال سے نکلنے کی اجازت نہیں دی۔ یوں بھی میری ہمت جواب دے گئی تھی۔ میں اپنے پاؤں پر چل کر باہر نکلنا چاہتا تھا۔ دس دن اور گزر گئے جب میں ہسپتال سے صحتیاب ہو کر نکلا تو معلوم ہوا کہ میں زندگی کے انتیس دن موت کی نذر کر آیا ہوں۔ میری صحت تو مجھے واپس مل گئی تھی مگر بیچ میں سے جو ایک مہینہ مجھ سے چھن گیا تھا وہ مجھے اور آبی کو ہماری منزل سے کئی کروڑ کوس دور پھینک گیا تھا۔ اس دوران وہ دونوں کچھ بھی نہ کر سکے۔ یہاں تک کہ تکریم احمد کو بھی میرے سوا کوئی اور بات نہ سوجھ سکی فردوسی بیگم بے چاری الگ پریشان رہی۔ اُس کا یہ خیال تھا کہ اس نے جو کھانا پکایا اُس میں کوئی غلط چیز داخل ہو گئی تھی بڑی مشکلوں سے میں نے اس کے فلیٹ پر واپس پہنچ کر اُسے یقین دلایا کہ میرے دل میں ایسا کوئی وہم نہیں ہے وہی کھانا آبی اور تکریم احمد نے کھایا تھا اور کلہان ہو گئے تھے۔ یہ تو میری اپنی کلہیا ہی پکی تھی، کہ پھوٹ گئی۔ میں نے اس سے کہہ دیا کہ وہ پشیمان نہ ہو یہ میری خم پارہ تقدیر ہے مجھے یونہی رگیدتی رہتی ہے اس میں کسی دوسرے کا کوئی قصور نہیں ہے۔

وہ میری باتیں بڑے غور سے سنتی تھی مگر جواب بہت کم دیتی تھی۔ یہ بات اس کی صالحیت اور شرافت کا محکم ثبوت تھی کہ اُس نے ہم سے ایک بار بھی بے تکلف ہونے کی کوشش نہیں کی۔ تکریم احمد کی باتوں میں تعلّی زیادہ تھی ورنہ میں اور آبی اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ان دونوں میں ایک پاک صاف سا انتہائی خلوص پر مبنی بے لوث دوستانہ تعلق تھا جس میں اُن کے درمیان کسی دوسرے تعلق کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تکریم احمد ہمیں خواہ مخواہ ہی بے وقوف بناتا رہتا تھا کہ اس فلیٹ میں اُسے بڑی خنک اور معطر راتیں میسّر آتی ہیں۔ فردوسی بیگم بہت ہی سلجھی ہوئی عورت تھی ایسی عورت جو قلعہ بند ہو کر یوں بیٹھی ہے کہ اُس کے وجود تک کسی کا تیر نہیں پہنچ سکتا۔ بلاشبہ وہ بہت ہی مدھو ماتی عورت تھی۔ اس کی آواز میں ایسی حلاوت اور ایسا لوچ موجود تھا کہ آدمی کی غنائیت کو ترستی روح سرشار ہو جاتی تھی اور اُس کی شائستگی کی تو قسم کھائی جا سکتی تھی۔ اُس نے ایک بار بھی ہمیں بھائی کہہ کر مخاطب نہیں کیا مگر ہمارا احترام اُس نے بھائیوں سے بھی زیادہ کیا۔ اس ایسی کردار کی بالا حصار عورت میں نے زندگی میں بہت کم دیکھی ہے۔ تکریم احمد بھی کوئی اوچھا آدمی نہیں تھا اگر وہ کسی قسم کے شہدے پن کا مظاہرہ کرتا تو میرا خیال ہے وہ اُسے دوسرے ہی لمحے فلیٹ سے باہر نکال دیتی۔ اُن دونوں میں کوئی ایسی ہی قدر مشترک تھی اور وہ اپنی اپنی حدود کا کچھ ایسا ہی احترام کرتے تھے کہ ان کو ایک دوسرے سے اتنی محبت ہونے کے باوجود اُن کے درمیان موجود جنگلا جُوں کا تُوں قائم تھا۔ اور آبی کا یہ کہنا تھا کہ وہ انجیل کی آیت پر صحیح معنوں پر عمل کر رہے ہیں۔

میں فلیٹ پر پہنچ کر بھی چار پانچ دن تک کسی طرف توجّہ نہ دے سکا میرے کل پرزے شاید پوری طرح پھر سے کام کرنے لگے تھے۔ یا پھر وہ لوگ مجھے غذائیں ہی اچھی دے رہے تھے اور فردوسی بیگم کچھ ایسے جی جان سے میری خدمت کر رہی تھی کہ پانچ چھ دن میں میری تندرستی عود کر آئی تھی اور مجھے محسوس ہوا کہ میرے اندر پہلا سا جیالا پھر سے بیدار ہو گیا ہے۔ مجھے پریشانیوں سے بچانے کے لیے اس سارے اندوہناک عرصے کے دوران میرے اُن دوستوں نے ایک بار بھی مجھ سے میرے اصل مسئلے پر کوئی بات نہیں کی۔ اُن کی اس چپ سے تنگ آکر میں نے خود ہی ایک دن بات چھیڑی تو آبی بولا ”یار! تو اب کوئی بندے کا پتر بن اب چھوڑ بھی دے یہ بستر۔ بہت ذلیل کر

لیا ہے تُو نے ہمیں! بہت خدمت لے لی ہے ہم سے تو نے۔ کیوں بھائی تکریم احمد!"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں یار جی! اب تو اعلیٰ حضرت کے چہرے پر سُرخی لوٹ آئی ہے۔"

"ایک دم فیٹے منہ اس کا۔ اگر یہ مر جاتا تو میں ساری عمر اس پر لعنت بھیجتا رہتا کہ سالا ہیجیش سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا۔ یہ ہے مردانگی اس کی۔"

"بک نہیں اوئے! کسی دن تیری بڑی آنت ڈھیلی ہو گئی تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔ چل آج ان لوگوں کا پتہ کرتے ہیں لا میرا وہ چپ شاہ مجھے دے۔ حد ہو گئی تو نے سمجھا کیا ہے مجھے؟" میں یہ کہہ کر بستر سے اُٹھ گیا۔ اس وقت فردوسی بیگم دفتر گئی ہوئی تھی۔ تکریم احمد نے میرا وہ دبنگ لہجہ دیکھا تو وہ دوڑ کر میرے لیے رنگلر کی جینز اور ایک خوبصورت قسم کی قمیض لے آیا۔ آبی ٹخنوں سے اونچے بوٹ اور جرابیں اٹھائے ہوئے تھا۔ خود بھی ان لوگوں نے اسی قسم کا لباس چڑھا رکھا تھا۔

"یہ کہاں سے مل گیا ہے تمھیں؟ یہ تو بالکل نیا جوڑا ہے بھئی!"

"ہم نے بڑی شاپنگ کی ہے تیرے لیے۔ رومال بنیائیں پتلونیں قمیصیں اور ڈھیر ساری ٹافیاں خرید لی تھیں کہ بچہ اُٹھے گا تو خوش ہو جائے گا۔" آبی نے جرابوں پر لگی مہریں توڑتے ہوئے کہا۔

"لا بھئی! اچھا اور خوبصورت لباس تو میری خاندانی کمزوری ہے۔" یہ کہہ کر میں نے جلد جلد فیشن کے کپڑے پہن لیے۔

"ہاں کیوں نہیں! بہادر شاہ ظفر کے خاندان کا اصلی اور وڈا وارث تو تو ہی ہے ویسے یار! یہ لباس تجھے سج گیا ہے۔ اپنے صحیح بندے کا پتّر نظر آ رہا ہے۔" آبی نے میرے چاروں طرف گھوم پھر کر مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

تکریم احمد ہنس دیا، بولا۔ "اب کدھر کے ارادے ہیں؟"

"اس قربان علوی کا پتہ کرتے ہیں میرا خیال ہے اس عرصے میں آپ لوگوں نے ڈاکٹر دھمن کو بھی ڈھونڈ نکالا ہوگا۔"

"ہاں کیوں نہیں! بچے تو نے تو ہمارے ہوش کے طوطے ہی اُڑا دیے تھے۔ ہمیں کسی طرف دیکھنے کی مہلت ہی تو نے کہاں دی۔" آبی نے کہا۔ وہ بھی نشست گاہ میں لگے قدآدم آئینے کے سامنے کھڑا اپنا حلیہ دُرست کر رہا تھا۔

"چلو دفع کرو۔ جو ہونا تھا ہو گیا، اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ وہ لوگ زمین کے اندر بھی ہوں گے تو ہم انھیں نکال لیں گے۔"

کچھ ہی دیر بعد ہم نے فردوسی بیگم کے فلیٹ کو تالا لگایا اور ٹیکسی میں بیٹھ کر قربان علوی کی رہائش گاہ کی طرف چل دیے مگر وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ اشفق کے گیٹ پر صرف تالا ہی نہیں لگا ہے بلکہ اس پر کرائے کے لیے خالی ہے کا بھی یہ بڑا سا بورڈ آویزاں تھا۔

"ایں چہ معنی دارد آبی سائیں؟" میں نے ہونقوں کی طرح گردو پیش پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"...... وہ جو بیچتے تھے دوائے دردِ دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے۔" آبی نے پریشان ہو کر کہا۔

"یہ تو بہت بُرا ہوا ہے یار جی! چلو ذرا اُدھر مردان شاہ کے ہاں چلتے ہیں اسے معلوم ہوگا کہ یہ لوگ کہاں چلے گئے ہیں۔"

یہ کہہ کر میں پھر ٹیکسی میں جا بیٹھا۔ اسے ہم نے ابھی فارغ نہیں کیا تھا۔ تکریم کے چہرے سے یوں ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ بہت زیادہ نادم اور پشیمان ہے، بولا۔ "جیلانی صاحب! مجھے افسوس ہے کہ آپ کی بیماری کے دوران میں ان لوگوں پر نگاہ نہ رکھ سکا۔"

"ہاں سائیں! ہم سے واقعی بہت بڑی غلطی ہو گئی ہے مجھے ڈر ہے کہ یہ لوگ پھر اپنا بستر گول کر گئے ہیں۔" آبی نے کہا۔ وہ بھی بہت زیادہ پریشان نظر آ رہا تھا جب وہ کسی کو جناب کے بجائے سائیں کہہ کر مخاطب کرتا تھا تو مجھے بے ساختہ ہنسی آ جاتی تھی یوں لگتا تھا جیسے وہ کہہ رہا ہو "سیٹس"۔

گاڑی ہم نے مردان شاہ کے ہوٹل کے سامنے جا کر کھڑی کر دی۔ وہ اس وقت کاؤنٹر پر موجود تھا اور خود چائے بنا رہا تھا۔ ہوٹل کے اندر باہر کرسیوں پر قلی کباڑی قسم کے بے شمار لوگ بیٹھے وقت کو دھکا دے رہے تھے۔

ہمیں ٹیکسی سے اُترتے دیکھ کر مردان شاہ نے کیتلی اپنے ملازم کے حوالے کی اور تیزی سے باہر نکل آیا۔

"آؤ سائیں آؤ۔ آج ہمیں کیسے یاد آ گیا آپ کو؟ اور اوئے لڑکے تو ذرا گاہکوں کا دھیان رکھ، میں اندر جا رہا ہوں۔" وہ ہمیں ساتھ لے کر گاہکوں کی بھیڑ میں سے گزرتا ہوا اپنے کیبن میں جا پہنچا۔ جاتے ہی اس نے بتیاں بھی جلا دیں اور پنکھا بھی چلا دیا۔

"یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے بھائی جی! کچھ بیمار شمار رہے ہو؟" اپنے چھوٹے سے فریج میں سے اس نے سوڈے کی تین بوتلیں نکال کر ہمارے سامنے رکھ دیں۔ وہ میرے چہرے کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

"یہی تو مصیبت رہی ہے شاہ جی! میں ہسپتال میں رہا۔ پورا مہینہ اُدھر ہی گزرا۔"

"اچھا! مجھے تو کسی نے بتایا ہی نہیں، آپ ہی ادھر آ جاتے بھائی جی! آدمی آدمی کا دارو ہوتا ہے۔"

"اسی لیے تو آئے ہیں یار جی! کچھ پتہ بھی ہے کہ وہ قربان علوی کہاں چلا گیا ہے؟ اس کا بنگلہ تو خالی پڑا ہے۔" میں نے بوتل اٹھاتے ہوئے کہا۔ وہ بھڑکتی ہوئی پیاس کے لیے اکسیر ثابت ہو سکتی تھی۔ فریج نے اُسے یخ کر رکھا تھا۔

"وہ بنگلہ تو چوتھے روز ہی خالی ہو گیا تھا۔ میرے بھتیجے کو دوسرے سات آدمیوں سمیت وہ اسی رات ہوائی جہاز میں بٹھا کر جدہ لے گئے تھے۔ چوتھے روز قربان علوی صاحب بھی وہاں جا پہنچے اور اب تک وہاں ہی ہیں۔"

"اچھا! اب کہاں ہے آپ کا بھتیجا؟"

"اس کا نصیب ہی خراب تھا یار جی! جدہ پہنچنے کے بعد دوسرے ہی دن وہ بیمار پڑ گیا۔ اس کے پیٹ میں ایسا درد اٹھا کہ اسے ایجنٹ کا آدمی ایک ہسپتال میں لے گیا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ اس کو پتے کا درد ہے۔ علاج کے لیے ان لوگوں نے اسی روز اس کا اپریشن کر دیا۔ اور وہ بیچارا پندرہ دن بستر پر پڑا رہا۔ جب تک اس کا زخم ٹھیک ہو چکا تھا مگر جب اس نے نوکری پر حاضری کی کوشش کی تو ڈاکٹر نے اسے 'ان فٹ' کر دیا، کہ وہ کوئی سخت محنت مزدوری کا کام نہیں کر سکتا تھا۔ زخم کھل جانے کا خطرہ تھا۔ ڈاکٹر نے جمیل کو یہی بتایا۔ قربان علوی کا خدا بھلا کرے اس نے جمیل کو پچاس ہزار روپیہ دے کر چار ہفتے بعد کراچی بھیج دیا۔ مگر اس کی صحت ٹھیک نہیں رہی۔ میں نے اسے بندر روڈ پر ایک ورکشاپ کھول دی ہے کام تو اس کا چل نکلا ہے مگر وہ خود بیمار رہنے لگا ہے۔"

مردان شاہ نے اپنے بھتیجے کے بارے میں مجھے جو کچھ بتایا وہ میرے خدشات کی تصدیق کے لیے بہت کافی تھا۔

"اس کے ساتھ جو دوسرے آدمی گئے وہ کہاں ہیں؟"

"وہ تو ادھر ہی ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی واپس نہیں آیا۔ ایک لڑکا اس کے ساتھ گیا تھا بشیر، اس کے بارے میں مجھے کل کسی نے بتایا ہے کہ وہ بھی بیمار ہے اور ہسپتال میں داخل ہے۔ در اصل وہاں کی آب و ہوا کسی کو ہی راس آتی ہے یار جی!"

جمیل نے اچھا کیا جو واپس آ گیا اور علوی صاحب کی مہربانی دیکھو کہ انھوں نے اس کو پچاس ہزار روپیہ بھی دے دیا۔

"کوئی کسی کو مفت پیسہ نہیں دیتا ہے مردان شاہ جی تمھارے بھتیجے سے انھوں نے کوئی لمبا ہی فائدہ اٹھایا ہوگا۔" میں نے آپی کے پیش کردہ دو میں سے ایک سگریٹ لے کر منہ میں دبا لیا۔

مردان شاہ کے چہرے پر تشویش کی لکیریں ابھر آئی تھیں، بولا "مجھے بتاؤ یار جی! کچھ گڑبڑ تو مجھے بھی لگتی ہے سالوں نے لڑکے کو 'داغی' کر کے بھیج دیا۔ روپیہ بھی ساتھ کر دیا پر اصل وجہ مجھے معلوم ہونی چاہیے۔"

"تمھیں وجہ معلوم ہو گئی تو تم بہت دکھی ہو جاؤ گے مردان شاہ! مجھے یہ بتاؤ کہ اس ڈاکٹر دھمن کے بارے میں تمھیں کچھ معلوم ہوا ہے؟"

"نہیں! ان کا تو پھر میں نے کسی سے ذکر ہی نہیں سنا۔"

"ہمارے ساتھ چلو مردان شاہ! ہم تمھارے بھتیجے کو ابھی دیکھنا چاہتے ہیں ان لوگوں نے اس کی زندگی برباد کر دی ہے۔" میں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

مجھے اپنی بے پناہ اذیتوں کا زمانہ یاد آنے لگا تھا۔ وہ لمحے میرے ذہن میں پھر سے گزرنے لگا تھا جب ان بھیڑیوں کے دانت میرے بدن میں پہلی بار دھنسے تھے۔ ان کے نشتر کی کاٹ مجھے یاد آ گئی تھی اور میرا خون پھر سے کھولنے لگا تھا۔ وہ لوگ ابھی تک اپنی مکروہ تجارت جاری رکھے ہوئے تھے اور میں ایسا بے غیرت تھا کہ ابھی تک جی رہا تھا حالانکہ میں نے اپنے لہو کی قسم کھا رکھی تھی کہ جیسا انھیں مہلت ملتے ہی صفحہ ہستی سے نیست و نابود کر دوں گا۔ میں نرغے میں آئے ہوئے زخمی وحشی کی طرح سر جھٹک کر کرسی سے اٹھ گیا۔

میرے ذہن میں پھر ایک سرخ آندھی چلنے لگی تھی، احتیاط، صبر اور تحمل کا دامن ایک بار پھر میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ آپی کہتا تھا مجھے اسی روز قربان علوی سے بات کر لینی چاہیے تھی۔ خدا جانے میں کیوں اس کی دہلیز سے چپ چاپ اتر آیا تھا۔ میرے وہ تیر و تیزی کے دن ابھی تک ختم نہیں ہوتے تھے۔ آپی میرے چہرے کی اس کیفیت کے رموز سمجھتا تھا وہ بھی میرے ساتھ ہی اٹھ گیا یوں کہ کرسی اس نے اپنے پیچھے بڑے غضبناک انداز سے گرا دی۔

مردان شاہ ہمارے اس رویے سے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولا۔

"یہ کیا قصہ ہے یار جی! تم تو بھڑک ہی اٹھے ہو۔"

"بات ہی کچھ ایسی ہے مردان شاہ! وہ تیرا بھتیجا نہیں، ہمارا بھی بھتیجا ہے۔ وہ اسے لوٹ کر برباد کر چکے ہیں اور تجھے ابھی تک خبر نہیں ہوئی۔"

"مجھے کچھ بتلاتے تو ہو نہیں خواہ مخواہ تم میری جان نکال رہے ہو۔"

"ڈاکٹر نے جمیل کو دیکھ لیا تو پھر تجھے معلوم ہو جائے گا مردان شاہ کہ ہوا کیا ہے۔"

میں اسے اپنے ساتھ کھینچتا ہوا باہر سڑک پر نکلا۔ آپی نے ٹیکسی روکی اور ہم ——— بندر روڈ پر جا پہنچے۔ جمیل ورکشاپ میں موجود تھا۔ مردان شاہ کو دیکھ کر وہ کام چھوڑ کر سڑک پر آ گیا۔

"یہ میرے دوست ہیں بیٹے! تمھیں ہم کسی ڈاکٹر کے پاس لے جا رہے ہیں۔ تیری صحت کے بارے میں یہ بھی بہت فکرمند ہیں۔"

مردان شاہ نے علیک سلیک کے بعد اسے اپنی آمد کا مقصد بتایا۔ وہ کچھ حیران سا ہو کر ہمیں یوں دیکھنے لگا جیسے وہ ہمیں پہچان لینے کی کوشش کر رہا ہو۔ "کیا ہوا ہے میری صحت کو چاچا! میں تو بھلا چنگا ہوں۔"

"یار تو اپنے یہ کپڑے بدل کر ہمارے ساتھ چل۔ تیرا ڈاکٹر کے

پاس جانا بہت ضروری ہے جا یہ وردی بدل آ۔"

وہ انہی قدموں دکان کے اندر گیا اور اپنے دونوں شاگردوں کو ضروری ہدایتیں دیتا ہوا کپڑے بدل کر ہمارے ساتھ آ بیٹھا۔ اسی سڑک پر کچھ ہی دور آگے مجھے ایک ڈاکٹر کا کلینک نظر آیا۔ میں نے ٹیکسی وہیں روک لی۔

ڈاکٹر کا نام ظفر احمد تھا اور وہ دکان کے اندر موجود تھا۔ اور مریضوں کے معائنے میں مصروف تھا۔ خود وہ الگ کیبن میں بیٹھا تھا۔ شیشے کے پردے میں سے اُسے دیکھ کر میں جمیل کو ساتھ لیکر سیدھا اس کیبن میں جا گھسا۔ مردان شاہ آپی اور تکریم احمد بھی میرے پیچھے آ گئے۔ ایک مریض اسی وقت باہر نکلا تھا۔

ڈاکٹر نے استفہامی نظروں سے ہمیں یوں گروہ کی صورت میں اندر آتے دیکھا تو وہ کچھ پریشان ہوگیا، بولا "خیر تو ہے ینگ مین! اپنی باری کا بھی انتظار نہیں کریں گے آپ!"

آپی نے جیب سے سو کا نوٹ نکال کر اسکے سامنے رکھ دیا۔ "ہمیں بہت جلدی ہے ڈاکٹر صاحب اس لڑکے کا ہم ابھی معائنہ کروانا چاہتے ہیں ہمیں بتائیں کہ اس کے پیٹ کے اس آپریشن کا کیا مطلب ہے؟" جمیل کا دامن بنیان سمیت اٹھا کر آپی نے ڈاکٹر کو اُس کا پیٹ دکھا دیا۔

"کیا مطلب! یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ میں باقاعدہ معائنے کے بغیر کچھ نہیں کہہ سکوں گا۔"

"تو پھر اسے آپ ابھی دیکھیں، یہ بہت ضروری ہے۔ کیا یہ اپینڈے سائیٹس کا آپریشن ہے یا کچھ اور بات ہے؟"

"مریض کو تو معلوم ہوگا۔"

"جی نہیں! یہ بے ہوش تھا اسے کیا پتہ اس کے جسم کے کس پرزے پر نشتر چلا ہے آپ کی فیس حاضر ہے ہم دگنی فیس دیں گے۔"

آپی کی یہ بات سن کر ڈاکٹر اٹھا اور جمیل کو پہلو کے کمرے میں لے گیا۔ کوئی پندرہ منٹ ہم بالکل خاموش بیٹھے سگریٹ پھونکتے رہے۔ مردان شاہ ہمارے چہرے پر پھیلی وحشت دیکھ رہا تھا۔ وہ اب ہم سے بات کرتے بھی ڈرتا تھا۔ ہزاروں وسوسے اس کے دل میں اُٹھتے ہوں گے۔ اس کے وجود کے سارے ہی بٹن گیہوں پس گئے تھے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ ہم اس کے بھتیجے کی صحت کے بارے میں اتنے فکرمند کیوں ہو رہے ہیں۔ مجھے اور آپی کو یقین تھا کہ اس بدنصیب کے ساتھ بھی وہی کچھ ہو چکا ہے جو میرے ساتھ اور میری تیرہ بخت بہن آسیہ پر گزر چکا تھا۔ مردان شاہ کے ماتھے پر ایک بھونری سی تھی، وہ بھی اس کی لکیروں کی زد میں آگئی تھی۔ اُن بیس منٹوں میں اس نے اپنی ذہنی اذیت سے جان چھڑانے کے لیے دس سگریٹ یوں پھونک ڈالے تھے کہ اُن کو آدھے آدھے مسل کر اس نے راکھدان میں ڈال دیا۔

تکریم احمد بالکل خاموش رہا۔ خالی خالی آنکھوں سے وہ کیبن میں لٹکے انسانی بدن کے رموز واضح کرتے ہوئے اشتہاروں کو دیکھتا رہا۔ اُسے ہماری بھیتر چوٹ کا ابھی تک صحیح اندازہ نہ ہو سکا تھا۔ اگرچہ ہم اُسے سب کچھ بتا چکے تھے مگر میرا یہ خیال ہے کہ اُس فریب کی سنگینی کا احساس وہ نہیں کر سکا تھا۔

ڈاکٹر جب باہر آیا تو وہ کسی قطعی نتیجے پر پہنچ چکا تھا۔ بولا۔ "آپ کا کیا خیال ہے یہ آپریشن کس لیے کیا گیا تھا؟ یہ لڑکا تو کچھ نہیں جانتا۔" یہ کہہ کر وہ بڑے اطمینان سے کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ سلگانے لگا۔

"اسی لیے تو ہم آپ کے پاس آئے ہیں ڈاکٹر! ہمیں کسی قطعی نتیجے پر پہنچنا ہے ہمیں یقین ہے کہ یہ پیٹ کا آپریشن نہیں تھا۔" میں نے میز پر کہنیاں ٹکاتے ہوئے کہا۔

"ہاں آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اس جوان کا دایاں گردہ نکال لیا گیا ہے۔"

یہ بات سنتے ہی مردان شاہ کی عقل دنگ ہو گئی میز پر ہاتھ مار کر بولا "یہ کیسے ہو سکتا ہے ڈاکٹر جی! اس کا گردہ خراب ہوتا تو وہ اسے بتا نہ دیتے۔"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں جناب! یہ تو آپ جانیں اور آپکا ڈاکٹر۔"

"تھینک یو ڈاکٹر! ہم یہی معلوم کرنا چاہتے تھے۔ کیا اس کا زخم مندمل ہو چکا ہے؟"

"نہیں۔ کوئی خرابی رہ گئی ہے۔ اس کے ناڑے سے کچھ مواد خارج ہوتا ہے وہ غالباً اس زخم کی سوزش ہے، ابھی تک اس کا درد بھی پوری طرح دور نہیں ہوا۔"

"کیا یہ صحیح ہے بیٹے؟"

"ہاں چاچا! کبھی کبھی یہاں ٹیس اٹھتی ہے مگر میں اسے دبا ہی جاتا ہوں۔"

"آپ اس کا علاج کریں ڈاکٹر! جتنے بھی پیسوں کی ضرورت ہوگی ہم دیں گے یہ پانچ سو تو ابھی رکھ لیں تم ابھی ادھر ہی بیٹھو مردان شاہ! اپنے اس بھتیجے کے ساتھ اور ان سے دوا لے کر واپس آؤ۔ ہم شام کو تمہیں ہوٹل پر ملیں گے۔"

مردان شاہ میری یہ بات سن کر اور میرے ہاتھ سے نکل کر ڈاکٹر کے ہاتھ میں جاتے پانچ سو روپے کے نوٹ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا بولا۔ "یارو تم۔۔۔ تم کیوں اتنی تکلیف کرتے ہو میں اس کے علاج کے پیسے خود دوں گا۔"

"کوئی بات نہیں مردان شاہ! یہ ہمارا بھی کچھ لگتا ہے، اچھا خدا حافظ۔" یہ کہہ کر میں نے آپی اور تکریم احمد کو اپنے ساتھ لیا اور اسی وقت سڑک پر پہنچ کر ہم ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔

"تکریم احمد! وہ دو آدمی جو آپ کے جاننے والے تھے، غائب ہو گئے تھے، حادثے میں زخمی ہونے کے بعد اُن کا کچھ پتہ چلا آپ کو؟"

"ہاں! وہ تو میں آپ کو بتانا ہی بھول گیا۔ وہ ادھر جناح ہسپتال میں ہیں۔ دونوں کی ٹانگوں پر پلستر چڑھا ہوا ہے اور ان دونوں کے پیٹ پر بھی پٹیاں بندھی ہیں۔ میں تو بتانا ہی بھول گیا۔ کوئی دس دن بعد اُن کے بارے میں ہسپتال والوں نے فردوسی بیگم کو اطلاع دی تھی۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟ کیا وہ دس دن بعد ہسپتال پہنچے تھے؟"

"ہاں! انھوں نے بتایا تھا کہ وہ کسی اور ہسپتال میں زیرِ علاج رہے ہیں مگر وہ اس کا نام نہیں بتا سکتے۔ انھیں کچھ خبر ہی نہیں ہے۔ کوئی ڈاکٹر تھا وہاں۔ اس کا بھی نام وہ نہیں بتا سکے۔ اسی نے اُن کا علاج کیا تھا۔ اس ڈاکٹر نے انھیں بتایا تھا کہ اُن کے پیٹ پھٹے ہوئے تھے۔ حادثے کی وجہ سے وہ سب کچھ ہو گیا تھا۔"

"اُن سے ہمیں ملوا سکتے ہیں آپ؟"

"ہاں، کیوں نہیں! اب تو وہ بیساکھیوں پر چل پھر بھی لیتے ہیں۔ اُن کے پیٹ کے زخم تو بالکل ٹھیک ہو چکے ہیں البتہ ٹانگوں کے پلستر ابھی شاید ایک ماہ تک نہ اُتر سکیں۔"

"تو پھر چلیں ہمیں اُن کے پاس لے چلیں۔"

"ہاں، کیوں نہیں! مگر اُن سے مل کر کیا کریں گے آپ؟"

"چلیں تو سہی۔" یہ کہہ کر میں نے ڈرائیور کو جناح ہسپتال کی طرف چلنے کے لیے کہا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم اُن بدنصیبوں کے سامنے بیٹھے تھے جن میں سے ایک کا نام وہاب تھا اور دوسرے کا عارف۔

کریم احمد نے اُن سے ہمارا تعارف کروایا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ وہ سمجھے ہم ازراہِ ہمدردی اُن سے ملنے چلے آئے ہیں۔

عارف بولا۔ "ہم آپ کے شکرگزار ہیں جناب کہ آپ کو ہمارا اتنا خیال ہے۔"

"کریم احمد آپ کے دوست ہیں عارف صاحب ہمیں بھی آپ اپنا ہمدرد سمجھیں، آپ کی ٹانگ کا کیا حال ہے اب؟" وہ وہاب کے مقابلے میں زیادہ ہشاش بشاش اور صحت مند نظر آتا تھا۔ جبکہ اس کا مبر ایسا ہی تھا۔ خاصا اونچا لمبا جوان تھا وہ اور بے فکر بھی۔ سگریٹ وہ دبا کے پیتا تھا اور ہر وقت مسکراتے کا عادی تھا۔

"ڈاکٹر کا خیال ہے کہ بس ہم پندرہ دن میں یہاں سے فارغ ہو جائیں گے دراصل ہمارے پیٹ میں لوہے کی سیخوں کا ٹوٹا ہوا اینگل آئرن لگ گیا تھا جس کی وجہ سے میرا دایاں گردہ کچلا گیا تھا اور وہاب کا بایاں۔"

"یہ کیا۔۔۔ کیا کہہ رہے ہیں آپ! کیسے معلوم ہوا آپ کو کہ آپ کے گردے کچلے گئے ہیں؟"

"وہ دراصل جس کلینک میں ہمیں پہلی بار حادثے کے بعد لایا گیا تھا وہاں کے ڈاکٹر نے ہمیں یہی بتایا تھا۔ اس کی تشخیص یہ تھی کہ دونوں گردے بیکار ہو چکے ہیں ان کا نکال دینا ہی بہتر ہے۔"

"اچھا پھر! پھر کیا ہوا؟" میں نے بے صبری سے پوچھا۔

"پھر کیا، اب ہم دونوں ایک ایک گردے پر جی رہے ہیں۔ پر صاحب بڑے کمال کا ڈاکٹر تھا وہ۔ اُس نے ہمارا ایسا علاج کیا کہ ہمارے آپریشن کے زخم بس دس دن میں مندمل ہو گئے۔"

"اس ڈاکٹر کا نام معلوم ہے آپ کو؟"

"جی نہیں۔ سب اُسے ڈاکٹر ڈاکٹر ہی کہتے تھے۔ ادھیڑ عمر کا آدمی ہے وہ۔" یہ کہہ کر اُس نے جو حلیہ مجھے اس کے بارے میں بتایا وہ صاف طور پر ڈاکٹر رحمن ہی کی عکاسی کرتا تھا۔

"آپ کو یاد ہے کہ وہ کلینک کہاں ہے؟"

"نہیں۔ ہمیں تو اس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہے جناب! البتہ جب وہ ہمیں وہاں سے نکال کر یہاں لا رہے تھے تو راستہ دیکھ کر مجھے احساس ہوا تھا کہ وہ کلینک ایک ایسی جگہ پر واقع ہے جس کے قریب سے ریلوے لائن گزرتی ہے۔ گاڑیوں کی چھک چھک کی آوازیں بھی مجھے یاد ہیں۔ وہ کوئی دکان تو تھی نہیں ایک خاصی بڑی کوٹھی تھی۔ ہمیں وہ جب ایمبولینس میں ڈال رہے تھے تو ان کا خیال شاید یہ تھا کہ ہم ہوش میں نہیں ہیں مگر مجھے کافی ہوش تھا۔ اس کوٹھی کے گیٹ پر سات سو چھیاسی لکھا تھا۔ سفید سنگِ مرمر کی سل پر یہ حرف لکھے تھے۔ جب ہم باہر نکلے تو کچھ دیر تک ہم سڑک کے ساتھ ساتھ کچھ فاصلے پر کسی ریل گاڑی کے چلنے کی آواز سنتے رہے۔ پھر کچھ دُور جا کر مجھے ہوائی اڈے کی عمارت نظر آئی۔ میرا خیال ہے کہ ہم ادھر ہوائی اڈے کی طرف کسی جگہ زیرِ علاج رہے تھے۔"

"ہوں! آپ کو رات کے وقت وہاں سے نکالا گیا تھا؟"

"ہاں، شام کا جھٹپٹا پھیل رہا تھا، دو آدمی ہمارے ساتھ آئے تھے۔ وہ ہمیں ایمرجنسی وارڈ میں چھوڑ کر اسی وقت واپس چلے گئے۔ ہماری ٹانگوں پر پہلا پلستر انھوں نے اپنے کلینک میں ہی لگایا تھا مگر یہ بعد میں بدلنا پڑا۔ کیونکہ ہمارا درد ختم نہیں ہوتا تھا۔ ہڈیاں صحیح نہ جڑی تھیں۔" عارف نے اپنی یادداشت پر بوجھ ڈالتے ہوئے کہا۔

"آپ کو کسی نرس، کسی ڈاکٹر، کسی لیڈی ڈاکٹر کا نام تو یاد رہ گیا ہو گا۔"

"ہمیں اُن دنوں کی تو کوئی بھی بات یاد نہیں ہے صاحب! ہم پر تو بس ہر وقت نیم بے ہوشی سی طاری رہتی تھی پھر بھی ہم ان کے احسان مند ہیں کہ انھوں نے فی سبیل اللہ ہمارا علاج ایسے وقت میں کیا کہ اگر دیر ہو جاتی تو ہم زندہ نہ بچ سکتے تھے۔"

اس کو کچھ کو احساس تک نہ ہو سکا تھا کہ انھیں بے ہوشی کی حالت میں سڑک پر سے اٹھا کر اُن بدمعاشوں نے کتنے سنگین مراحل سے انھیں گزار دیا تھا اور وہ الٹا اپنے ذہن میں اُن کی نوازشوں کا نقشہ قائم کیے بیٹھا تھا۔ وہاب دوسرے پلنگ پر بالکل خاموش لیٹا ہماری باتیں سن رہا تھا۔

اور مجھے یقین ہو چلا تھا کہ صورتِ حال کا اُسے بھی کوئی علم نہیں تھا۔ دونوں گھامڑ تھے مگر جن لوگوں نے اُن کے جسموں پر نشتر چلائے وہ تو مُستاصل تھے کہ بڑے بڑوں کے پیٹ وہ چاک کر گئے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔

"آپ سن رہے ہیں نا تکریم صاحب! یہ بھی انہی لوگوں کی چھری سے کٹے ہیں جن کا شکار وہ جمیل ہو چکا ہے۔" آپی نے بڑی ہی بجھی بجھی آواز میں کہا۔

"میں سمجھ رہا ہوں بھائی جی! سب کچھ سمجھ رہا ہوں۔ مگر... ان لوگوں کا ٹھکانہ بھی تو معلوم ہونا چاہیے۔"

"وہ ہم ڈھونڈ لیں گے آپ تو اپنے فلیٹ پر جائیں اور ہمارا انتظار کریں۔" میں نے تکریم احمد کو اس جھمیلے سے الگ رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ اس ریشے کا نہیں بنا ہوا تھا جو اتنی ساری سختیاں سہہ سکتا۔

"مجھے فکر لگی رہے گی بھائی جی! میرا آپ کے ساتھ جانا ضروری ہے۔"

آپی اپنی جگہ سے اٹھ کر تکریم احمد سے مخاطب ہو کر بولا۔ "نہیں یار کوئی "چوچے" تھوڑی ہیں ہم۔ اور تم عارف میاں! اتنے بدھو نہ بنے رہو تم دونوں کے گردے ان لوگوں نے صحیح سالم حالت میں نکال کر کئی لاکھ میں بیچ دیے ہوں گے وہ جھوٹ بکتے تھے کہ تمہارے گردے پچھلے گئے تھے۔ مگر تمھیں احساس ہی نہیں ہو سکا۔ وہ تم جیسے خدا جانے کتنے لوگوں کو برباد کر چکے ہیں۔" آپی نے عارف کے اوپر سے اطمینان کی چادر جھٹکتے ہوئے کہا۔

عارف مسکرانے لگا، ایسی سادگی سے مسکرانے لگا کہ میں بھی حیران رہ گیا، بولا "آپ کا خیال صحیح نہیں ہے جناب! وہ تو بڑے ہمدرد اور خدا ترس لوگ ہیں۔ انھوں نے ایسے وقت ہمارا علاج کیا جب ہمارے بچ جانے کی کوئی امید نہیں تھی۔"

"بس آپ کی سادگی اُن کے کام آگئی۔ بہرحال آپ سے جلدی ملاقات ہوگی اور ہو سکتا ہے آپ کو ہم دو چار لاکھ روپیہ اُن سے دلوا ہی دیں۔ ادر خان جی اب ہم چلتے ہیں۔"

عارف کے وجود کی یاسیت شاید کٹنے لگی تھی، اسے ہماری باتوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اندر سے بکھرنے لگا ہے۔ بولا "خدا کے لیے ہمیں بتائیں کہ یہ بات آپ کس بنا پر کہہ رہے ہیں اگر یہ سچ ہے تو پھر ہم سے زیادہ بدنصیب اور کوئی نہ ہوگا۔"

"پریشان نہ ہوں ایک گردے پر بھی آرام سے جی لیں گے، البتہ اُن کے وارے نیارے ہو رہے ہیں۔ ایک گردہ آج کل وہ کم سے کم چھ لاکھ میں تو بیچتے ہوں گے، بہرحال بے فکر رہیں آپ کا حق ہم آپ کو دلا کر رہیں گے۔" یہ کہہ کر میں اُن دونوں کو حیران پریشان چھوڑ کر پیچھے ہٹا تو آپی نے عارف کے قریب ہو کر کہا۔ "ہماری ان باتوں کا کسی سے ذکر نہ کریں۔ یہ بہت ضروری ہے ورنہ ہم اُن لوگوں تک کبھی نہ پہنچ سکیں گے۔"

یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ہمارے ساتھ ہسپتال سے باہر آگیا۔ تکریم احمد کو اس کے اصرار کے باوجود ہم نے اسی وقت فلیٹ پر بھیجنا چاہا۔ یہ کہہ کر وہ اسی علاقے میں ہمارے لیے کوئی عمدہ سی کوٹھی کرائے پر لے رکھے خواہ اس کا کرایہ دو ہزار روپے مہینہ کیوں نہ دینا پڑے۔ اس نے حیرانی تو بہت ظاہر کی مگر ہم نے اس کی وجہ نہیں بتائی۔

وہ ہمارے ساتھ آگے جانے پر بضد تھا، بولا "یہ کوٹھی آپ کو کس مقصد کے لیے چاہیے؟"

"ابھی تو ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ وہ پرندے ہمارے ہاتھ آگئے تو پھر ہم کچھ بتا سکیں گے بہر حال وہ کوٹھی آپ اپنے نام پر لے لیں۔ یہ بہت ضروری ہے۔"

آبی نے اس عرصے میں ایک ٹیکسی روک لی تھی "آپ اس میں بیٹھ جائیں تکریم صاحب اور ہمارے لیے دعا کریں۔"

تکریم احمد بادل ناخواستہ اس میں بیٹھا اور طارق روڈ کی طرف چل دیا۔ اس کی ٹیکسی نظروں سے اوجھل ہوئی تو ہم کچھ دیر تک یونہی بے خیالی میں سڑک کے کنارے پیدل ہی چلتے رہے۔ آبی کسی گہری سوچ میں گم تھا، بولا "ایک بات پوچھوں جیلانی! تو نے اس لاکھو لاشاری کی باتیں سن لینے کے بعد سے آسیہ کے بارے میں کوئی بات نہیں کی، آخر وجہ کیا ہے تو اس کے معاملے میں خاموش کیوں ہو گیا ہے؟"

"یہ بات تو تجھے بہت پہلے پوچھنی چاہیے تھی آبی! بہر حال میرا یہ خیال ہے کہ آسیہ کو اب زندہ رہنا آگیا ہے جب سے میں نے یہ سنا ہے کہ اس نے لاکھو کے دو آدمی مار کر آزادی حاصل کر لی تھی جب سے میرا دل مطمئن سا ہو گیا ہے اور مجھے یقین ہو گیا ہے کہ اب وہ اپنی حفاظت کر سکتی ہے۔ وہ اب کسی بہت ہی محفوظ جگہ پر ہو گی۔"

"یہ تو کس طرح کہہ سکتا ہے؟ وہ ہے تو بہر حال عورت ذات۔"

"تو ٹھیک کہتا ہے آبی! مگر میرے یار اتنے سارے زخم سہنے کے باوجود اگر اسے عقل نہیں آئی تو پھر کب آئے گی۔ اس نے لاکھو لاشاری کے ہاں پہلی بار اپنے ہاتھوں کی قوت کا تماشہ دیکھا ہو گا۔ لاکھو پہلا آدمی ہے جو اس کی محبت میں گرفتار ہوا، وہ اسے دل سے چاہتا ہے۔ اس کے آنسو مگر مچھ کے آنسو نہیں تھے، اسی لیے میں نے اس پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ وہ۔۔۔ وہ مجھے اچھا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اور۔۔۔ اور آسیہ کسی دن لوٹ کر اس کے گھر ضرور جائے گی اور میں اسے وہیں ملوں گا۔"

"ہاں میرا اندازہ بھی یہی ہے مگر ہم اس کو یوں غیر یقینی حالات کے سپرد تو نہیں کر سکتے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے آبی! مگر یوں اندھیروں میں بھٹکنے کا فائدہ؟ میں ان لوگوں سے نپٹ لوں، پھر میں اپنے ماموں کے پاس جاؤں گا آسیہ کو اس گاؤں کا راستہ معلوم ہے وہ تین چار دفعہ وہاں جا چکی ہے میرا اندازہ ہے کہ اپنے اجڑے گھر میں جھانکنے کے بعد سیدھی وہاں گئی ہو گی اور اسی امید پر میں خاموش ہو گیا ہوں۔"

"خدا کرے وہ ماں جی کے پاس جا پہنچی ہو" پہنچنے کے بارے میں کوئی بھی بات بنا سکتی ہے۔"

"ہاں! اتنی عقل تو اسے آگئی ہو گی۔ وہ تو خدا جانے کتنے خوفناک سبق پڑھ چکی ہو گی آبی۔ وہ جیل میں رہ چکی ہے۔ اتنا عرصہ اس نے بدترین قسم کے لوگوں میں گزارا ہے وہ تو خدا معلوم کیا چیز بن گئی ہو گی۔" میں نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آسیہ کے شب و روز کیوں کر گزرتے ہوں گے۔ وہ ایک موہوم سی آس تھی۔ ایک غالب آرزو کہ وہ اپنی حفاظت کا گر سیکھ چکی ہو گی۔ اسے وار کرنا اور وار سے بچنے کا طریقہ آگیا ہو گا۔ میں اسے ایسی منہ زور عورت کے روپ میں دیکھنے لگا تھا جو ہوا کی لہروں میں آبتری پھیلا سکتی تھی۔ میں نے جب سے سنا تھا کہ اس نے کھلی آنکھوں اپنے پستول کی گولیوں سے لاکھو کے دو آدمی مار دیے تھے اور وہ اس کے ہاں سے تیس ہزار روپے لے کر حویلی سے باہر نکلی تھی اور اسی کے گھوڑے کو اس نے اپنا مرکب بنا لیا تھا تو اس وقت سے میں دل ہی دل میں خود کو بے حد خوش اور مطمئن محسوس کر رہا تھا کیونکہ میں اسے کسی ایسے ہی روپ میں دیکھنا چاہتا تھا۔ کوئی تو لمحہ ایسا آنا چاہیے کہ مظلوم پورے قد سے اٹھ کر ظالم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے للکار سکے۔ مار کھا لینا اور مسلسل مار کھاتے رہنا تو کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ آدمی بھی زمین بن جائے تو سارا جہان اس کی پشت پر من مانی کرتا چلا جائے گا۔ اس کو ہر قدم روندتا ہوا آگے بڑھے گا۔ زمین میں یہ قدرت ہی نہیں ہے کہ پاؤں سے نکل کر آدمی کے سر پر جا چڑھے مگر انسان کی یہ تقدیر نہیں ہے اور یہی میری آرزو تھی کہ آسیہ کسی نہ کسی دن تو اٹھ کر اپنے دشمن کے گریبان پر ہاتھ ڈال دے کوئی لمحہ تو ایسا آئے کہ وہ اپنے تیز نوکیلے ناخن اس کی آنکھوں میں گاڑ دے اور اب مجھے یقین تھا کہ وہ یہی کچھ کر رہی ہو گی۔"

اس وقت تک ہم لب سڑک کھڑے ایک ہاکر کے پاس جا پہنچے تھے۔ آبی نے یونہی بے ارادہ ایک اخبار خرید لیا۔ قریب ہی ایک ریڑھی والا گنے کا تازہ رس بیچ رہا تھا۔ ٹھنڈا یخ تازہ گنے کا رس دیکھ کر میں نے دو گلاس بھروا لیے۔ ایک میں نے آبی کو دیا مگر وہ اخبار کے مطالعے میں مصروف تھا میری بات کا اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے کہا "ٹھیک ہے بچے! عیش کر۔" دونوں گلاس میں ہی چڑھا گیا۔ آبی اس وقت کسی خبر کے مطالعے میں کچھ یوں ڈوبا ہوا تھا کہ اسے کسی بات کا ہوش ہی نہیں تھا۔ میں نے تیسرا گلاس بھروا لیا اور کہا "آبی! یہ رس تو پی لے یار! کوئی تیرے بارے میں خبر چھپی ہے اس میں؟"

گلاس میں لے کر اس کے پاس جا پہنچا تھا۔ وہ کسی گہرے خیال

میں گم تھا میری طرف دیکھے بغیر بولا۔ "یار! وہ کیا نام تھا اس جہانزیب ڈاکٹر کا، وہ جو راولپنڈی جیل میں کام کرتا تھا۔" یہ کہہ کر اس نے اخبار میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ لاکھو بھی اس کے بارے میں کچھ کہہ رہا تھا۔ یہ خبر تو پڑھ، ذرا یہ والی۔" یہ کہہ کر اس نے کچھ ایسی بے خیالی میں گنے کے رس سے بھرا گلاس میرے ہاتھ سے لیا کہ اس پر سے ہم دونوں کی گرفت بیک وقت ڈھیلی پڑی اور وہ فرش پر گر کر چکنا چور ہو گیا۔

"کیا بکواس ہے یار! یہ گلاس ہی ٹوٹ گیا سالا۔"

"یہ کیا کر دیا بھائی جی! چھ روپے کا گلاس بھی برباد کر دیا آپ نے" ریڑھی والا پریشان ہو کر ہماری طرف بڑھا۔

"ابے تیرا رنگ کیوں پیلا ہو رہا ہے میرے یار! گلاس ہی ٹوٹا ہے کوئی تیرا سر تو نہیں ٹوٹ گیا۔" میں نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں بھئی! اور لے آئیں گے بازار سے گر ٹوٹ گیا۔"

"یہ کوئی معمولی گلاس نہیں تھا جناب! فرانس کا بنا ہوا گلاس تھا۔ آپ کو تو اس کے دام دینے ہوں گے۔" وہ ریڑھی والا بڑے ہی تیکھے اور ترش لہجے میں بولا۔

"اور اگر ہم نہ دیں تو؟" آبی نے اس کو مخصوص نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ ریڑھی والا شخص کوئی ستم رسیدہ شخص تھا۔ آبی کی بلی ہوئی خوفناک نظر اسے اندر سے دہلا گئی۔ وہ وہیں رکا اور پھر بیلن میں گنا پھنسا کر ہتھی چلانے لگا۔ آبی کو اس کی وہ شکست خوردہ مراجعت بھا گئی، بولا "بھیا یہ تو ناراض نہ ہو، یہ لو ہم تجھے تیس روپے دیتے ہیں۔ یہ لو چھ گلاس خرید لینا۔"

یہ کہہ کر اس نے دس دس کے تین نوٹ اس آدمی کے سامنے ڈال دیئے۔ وہ گنگ ہو کر رہ گیا۔ کبھی وہ آبی کو دیکھتا تھا اور کبھی ان نوٹوں کو۔ اس وقت تک اس نے دو اور گلاس رس سے بھر دیے تھے۔ آبی نے باری باری وہ دونوں حلق سے نیچے اتارے اور مونچھوں کو پونچھتا ہوا بولا۔ "آؤ خان جی! اب آگے بھی بڑھو۔"

میں اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا اخبار کو دیکھنے لگا تھا مگر وہ خبر مجھے ابھی تک نظر نہیں آئی تھی جس کی طرف اس نے اشارہ کیا تھا۔ بڑے غصے میں بولا "یار! تیرے خاندان میں کبھی کسی نے اخبار پڑھا ہو تو تجھے پڑھنا آئے، یہ دیکھ یہ تین کالمی سرخی ہے، یہ۔۔۔ اور تصویر بھی چھپی ہے مقتول کی۔"

اب جو اس خبر پر میری نظر پڑی تو میں حیران رہ گیا۔ معلوم یہ ہوا کہ راولپنڈی جیل کے ڈاکٹر مقبول احمد کو کسی عورت نے شام اس کے بنگلے پر چار گولیاں مار کر ہلاک کر دیا ہے۔ عورت جو سیاہ برقعے میں ملبوس تھی بنگلے کے ایک ملازم کو بھی زخمی کر گئی۔ اس ملازم نے بیان دیا ہے کہ وہ عورت حاملہ تھی، اس کے حلیے اور چال سے یہی معلوم ہوتا تھا۔ وہ ڈاکٹر سے مشورے کے بہانے بنگلے میں آئی اور جب ڈاکٹر کے کمرے میں گھسی اس نے جاتے ہی مقبول احمد کے سینے میں پستول کی چار گولیاں اتار دیں۔ اور پھر وہ پستول لہراتی ہوئی اطمینان سے واپس چل دی۔ مقبول احمد کے ملازم رسول بخش نے اس کو للکارا تو ملزمہ نے اس کی ٹانگ پر گولی چلا دی۔ اس عورت نے ڈاکٹر کے بنگلے سے کچھ ہی دور ٹیکسی روک رکھی تھی۔ رسول بخش کو زخمی کر کے وہ بھاگتی ہوئی بنگلے سے نکلی اور فاصلے پر کھڑی ٹیکسی میں جا بیٹھی۔ پیشتر اس کے کہ ڈاکٹر مقبول احمد کے بیوی بچے اس بارے میں کچھ جان سکتے وہ فرار ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر مقبول احمد بہرحال مرنے سے پہلے سامنے پڑے کاغذ پر ایک لفظ لکھ گیا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قاتلہ کا نام آسیہ ہے۔ ڈاکٹر نے نزع کے عالم میں بھی حیرت انگیز قوت ارادی سے کام لے کر حملہ آور کا نام بتا دیا تھا۔ پولیس ملزمہ کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہے معلوم یہ ہوا ہے کہ ملزمہ وہی آسیہ ہے جو کچھ عرصہ پہلے چند بدمعاشوں کی مدد سے راولپنڈی جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ جیل کے حکام ابھی تک اس قتل کی وجہ کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ایک افواہ یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر مقبول نے اس عورت سے اس کی قید کے دوران قریبی تعلق پیدا کر لیا تھا اور اب وہ اپنی ذمہ داریوں کو نباہنے سے کترا رہا تھا کیونکہ وہ پہلے ہی شادی شدہ تھا اور تین بچوں کا باپ بھی۔

اخبار نے وہ خبر بڑی تفصیل سے شائع کی تھی اور اس کا ایک ایک لفظ اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ وہ عورت میری بہن آسیہ ہی تھی اور اس نے اپنی ذلت کے پہلے محرک سے موقع ملتے ہی خوفناک انتقام لے لیا تھا۔ لاکھو لاشاری کی جھولی میں آسیہ کو اس ڈاکٹر مقبول احمد نے ہی ڈالا تھا۔ اسی کی مدد سے لاکھو لاشاری جیل سے فرار بھی ہو سکا تھا۔

میں اس خبر کو پڑھ کر سڑک کے کنارے اُگے ایک خوبصورت بانس پام کے ساتھ ٹیک کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ایک عجیب طرح کا سکھ مجھے اپنے سینے میں اترتا محسوس ہو رہا تھا یوں جیسے میری ایک بہت بڑی آرزو پوری ہو گئی ہو۔ آبی ایک دن پہلے مجھ پر طعنہ زن تھا اور اس بات پر آسیہ کو بھی ہدف تنقید بنا رہا تھا کہ وہ اپنے تحفظ کے لیے اب تک کسی کے خلاف انگلی تک نہیں اٹھاتی۔ وہ موم کی ناک بنی ہوئی ہے، تو ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ چیونٹی بھی پاؤں تلے دبے تو کاٹ لیتی ہے وہ تو پھر تمہاری بہن ہے جیلانی بدمعاش کی بہن، اس جیلانی کی جس نے بڑے بڑوں کو نتھ ڈال دی ہے، پھر۔۔۔ پھر وہ کیوں اتنی ساری ذلتیں چپ چاپ سہہ جاتی ہے؟

"یہ بہت اچھا ہوا ہے آبی! پہلی بار آسیہ نے ثابت کیا ہے کہ وہ میری بہن ہے اور ہماری رگوں میں ایک ہی خون جاری ہے۔"

میں نے اب کی بار خود دو سگریٹ سلگا کر ایک آبی کے حوالے کر دیا۔ اس کا فلٹر والا حصہ میں نے اچھی طرح گیلا کر دیا تھا۔ کچھ تو بدلہ مجھے بھی چکانا ہی چاہیے تھا۔ مگر وہ بہت کائیاں آدمی تھا۔ سگریٹ کو ہاتھ میں لیتے ہی میری کارروائی کو سمجھ گیا۔ اس نے یوں کیا کہ اُس کا فلٹر سگریٹ سے علیحدہ کر کے پھینک دیا۔ بولا "استادوں سے یوں نہ جیت سکو گے۔ برخوردار! بہر حال یہ خبر پڑھ کر مجھے بھی دلی خوشی ہوئی ہے آسیہ نے بہت ہی اچھا کیا ہے اس کو یہی کرنا چاہیے تھا۔"

"آہستہ بول یار! کوئی سن ہی نہ لے۔ چل میں اسی خوشی میں تجھے کسی اونتر مکھتر انٹرنیشنل ہوٹل میں کھانا کھلاتا ہوں۔"

"یہ کون سا ہوٹل ہے؟ تیرے چاچے نے کھولا ہے کہیں؟"

اُس نے سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے نتھنوں سے ڈھیر سارا دو دھار دھواں نکال کر کہا۔

"آج میں بہت خوش ہوں آبی! اتنا خوش کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ وہ جو انتقام لے لیتا ہے وہ بھی فطرت کے مقاصد کی تکمیل ہی کرتا ہے۔ اللہ کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ منتقم ہے بہت بڑا اور زبردست منتقم۔ وہ چاہے تو چیونٹی سے ہاتھی کو مروا سکتا ہے۔"

یہ کہہ کر میں نے اخبار پیٹا اور ایک ٹیکسی رکوا کر آبی کو اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ "ہمیں تو ادھر ہوٹل لے چل میرے یار! آج ہم ۔ ۔ ۔ ۔ ذرا اپنی دعوت کرنا چاہتے ہیں کیوں بیر زادہ صاحب! ابھی اخبار میں اشتہار ہے اُس کا، یہ دیکھیں۔" میں نے ایک بڑے ہوٹل کا نام بتاتے ہوئے کہا۔

ٹیکسی ڈرائیور کچھ نہیں بولا۔ اُس کے مُنہ پر سنجیدگی کی پھٹکار برستی نظر آتی تھی۔ یا تو وہ بیوی سے پٹ کر آیا تھا یا تقدیر کا ستایا ہوا تھا۔ وہ قطعاً خوش دکھائی نہیں دیتا تھا۔ آبی نے اخبار میرے ہاتھ سے جھپٹ لیا اور مقبول احمد کی تصویر دیکھنے لگا۔ــــــــــ

وہ اس کی میت کی نہیں بلکہ اُس کی زندگی کے دوران کھینچی ہوئی تصویر تھی جس میں وہ خاصا طرحدار اور صحت مند جوان نظر آتا تھا اور آسیہ نے اس کا سینہ اپنے انتقام کی گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا۔ وہ سالا پتہ نہیں جیل میں اپنے بے پناہ اختیارات کے بل بوتے پر کس کس کو۔ کس حد تک ذلیل کر چکا تھا۔ کتنی بے بس اور معصوم عورتیں اس نے درندوں کے حوالے کر دی ہوں گی۔ کتنے بے گناہ اور نچلے قیدیوں کی مجبوریوں سے اُس نے کتنے زبردست فائدے اٹھائے ہوں گے۔ ۔ وہ انہی لوگوں میں سے ایک تھا جو جیل کی معمولی نوکریاں کرتے کرتے جب ریٹائر ہوتے ہیں تو لکھ پتی بن چکے ہوتے ہیں۔ مجھے اُس کی موت سے دلی خوشی ہو رہی تھی۔ وہ اس سے بھی زیادہ خوفناک سزا کا مستحق تھا۔

جس ہوٹل میں ہم جا بیٹھے تھے وہ خالصتاً سرمایہ داروں کی ذہنی اور جسمانی تسکین کے لیے گوشۂ عافیت مہیا کرتے ہیں۔ وہ لوگ جو لمبے پیسے کما کر اپنے گھروں سے باہر نکلتے ہیں تو وہ گھروں کو نہیں لوٹتے سیدھے ایسے آرام خانوں میں جا بیٹھتے ہیں جہاں چوروں سے کپڑے لاکھیوں کے گندوں سے ناپ کر اونے پونے داموں خریدے جاتے ہیں۔ جس حساب سے وہ لوگ سرمایہ داروں سے بل وصول کرتے ہیں اس سے تو میں نے اور آبی نے یہی اندازہ لگایا کہ وہاں پلیٹ میں رکھی ایک مربع انچ بوٹی کئی ربوؤں میں پڑتی ہے۔ الحمدللہ کہ ہم بھی بے دریغ پیسہ خرچ کرنے والوں میں شامل تھے کیونکہ اس کو کمانے میں تو ہم نے ایک تنکا کبھی دُہرا نہیں کیا تھا۔ ہم شاید وہاں بیٹھنے والے تمام لوگوں میں سب سے زیادہ بے فکرے تھے۔ آبی بڑھ بڑھ کر آرڈر دیتا رہا۔ اپنی میز اس نے اُلا بلا چیزوں سے یوں بھر لی جیسے بھوکا کے بعد ہمیں بس مر جانا ہے اور وہ ہمارے حصے کے رزق کا آخری جُرعہ تھا جو ہم نے اپنے سامنے رکھ لیا تھا۔

ہوٹل کے اندر اس حصے میں جہاں ہم بیٹھے تھے کرشن پکشن ایسا نیم اندھیرا پھیلا تھا چاروں طرف بھینی بھینی صبح کی شبنمی فضا کا احساس دلاتی ہوئی عجیب سی خوشگوار اور سکون پرور خوشبو رچی ہوئی تھی۔ روشنی بڑے بڑے خوبصورت رنگیزی شمعدانوں سے مستعار لی گئی تھی مگر وہ روشنی اپنے ارد گرد بیٹھے خوبصورت جوڑوں کے دلوں میں اندھیر مچاتی چلی جاتی تھی۔ نغمہ سازوں نے ماحول کو یوں ٹھنڈا کر رکھا تھا جیسے کسی پری وش نے کسی درد رسیدہ کے دل پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ ہلکی ہلکی موسیقی کی دھُن یہ احساس دلاتی تھی کہ ہم برزخ سے نکل کر ابد آباد تک معطر رہنے والی لہلہاتی بہشت میں داخل ہو چکے ہیں۔

گاہکوں کے اس ذی شان کو کبے کو وہاں کے گو کر دوڑ دوڑ کر سلام کرتے تھے۔ ان کے سامنے بچھے جاتے تھے اور وہ نظر نہ آنے والا موسیقار ٹھہر ٹھہر کر ایسی دلدوز دھن چھیڑ دیتا تھا کہ بڑی بڑی سجی سنوری میزوں کے گرد نیم تاریک روشنی میں بیٹھے جوڑے جدائی کے خیال سے سہم کر ایک دوسرے میں اور زیادہ مدغم ہونے میں مصروف ہو جاتے تھے۔

وہ شہر ایک بہت بڑے سمندر کے کنارے پر آباد ہے۔ وہ کراچی وہ عروس البلاد سا ہے جس کی شریانوں کا لہو جس کی جانب رواں رہتا ہے اور جہاں سے سارے ملک کو زندگی بخش خون مہیا ہوتا ہے۔ اس شہر کے ایک خاموش اور پُرسکون کونے میں آباد اس ہوٹل میں داخل ہونے کے بعد ہم بھول ہی گئے کہ ہمارا حسب نسب کیا ہے۔ ہماری حرکت میں ایک عجیب سا تصنع اور ایک عجیب سی خود فریبی گھر کر گئی۔ ہم گلاس بھی پکڑتے تھے تو یوں جیسے وہ کام ہم زندگی میں پہلی بار کر رہے ہوں۔ ہم بھنے چاولوں کو پانچوں انگلیوں سے کھانے والے اور ادھر جب مجھے اور آبی کو پلاؤ میں بڑی سخت جان بوٹیوں سے چھُری کانٹے کے ساتھ جنگ کرنی پڑی تو آبی نے جھنجھلا کر سمجھایا۔

الگ پھینکے اور ہوٹل والوں کو یہ موٹی سی لاہوری قسم کی گالی دے کر اس نے سامنے پڑی پلاؤ کی بھری پلیٹ پر مرغ کا سالن انڈیلا اور پھر اللہ دے اور بندہ لے۔ جب وہ اطمینان سے تین چار لقمے اپنی طبیعت کے مطابق حلق سے نیچے اتار گیا تو بولا "ان انگریزوں کی ایسی تیسی خود چلے گئے مگر اپنی اولادیں یہاں چھوڑ گئے۔"

ابھی وہ یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ ایک شمعدان کی روشنی میں بیٹھا اچانک ایک چہرہ میری نظروں میں آیا تو میں سن ہو کر رہ گیا۔ وہ ... چہرہ ڈاکٹر عالیہ کا تھا۔ اور ... اس کے پاس جو آدمی بیٹھا تھا، اس کے چہرے پر اگر وہ داڑھی نہ ہوتی۔۔ وہ فرانسیسی وضع کی داڑھی تو بھی میں یہ بات بلا خوفِ تردید کہہ سکتا تھا کہ وہ ڈاکٹر دھمن ہے، اس کی آنکھیں اس کی ناک کا بانسہ اس کا ماتھا، اس کے سر کے بال، اس کا دہن سب کچھ اس بات کے گواہ تھے کہ وہ ڈاکٹر دھمن ہے مگر وہ دو نہیں تھے، ان کے ساتھ ایک اور بھی آدمی بیٹھا تھا۔ لمبے لمبے ہاتھ پاؤں والا گورا چٹا آدمی۔ وہ وضع قطع کے اعتبار سے سینڈھرسٹ کے سانچے میں ڈھلا ہوا کوئی بہت بڑا سرکاری افسر معلوم ہوتا تھا۔ اس کی ہر حرکت سے اس کے اختیار کی نخوت پھوٹ رہی تھی وہ ڈاکٹر عالیہ پر بہت زیادہ توجہ دے رہا تھا اور وہ سارے جہان کی جھوٹی پھوہڑ کی عورت ابھی تک ویسی ہی تر و تازہ اور جوان نظر آ رہی تھی جیسی میں نے پہلی بار دیکھی تھی بلکہ وہ پرانی شراب کی طرح پہلے سے کہیں زیادہ خوبصورت اور شہد آگیں ہو گئی تھی صحت ڈاکٹر دھمن کی بھی بہت اچھی تھی مگر ہاں، وقت نے اس کے وجود پر اپنی نوبت بجا دی تھی۔ اس کی نظر کنکر سی ٹھنڈی ہوتی جاتی تھی۔ وہ دیکھتا نہیں تھا بس آنکھیں عادتاً کھلی رکھتا تھا اس کے ہاتھ میں ایک لمبا سا ہوانا قسم کا سگار تھا جس کو وہ شاید عمداً پوری طرح نہیں جلا رہا تھا۔ اور وہ بجھ بجھ جاتا تھا۔

وہ اسی وقت یا اس سے چند لمحے پہلے وہاں آئے تھے ہمارے اور ان کے درمیان تین میزیں حائل تھیں۔ ان دونوں کو لوں اپنے سامنے دیکھ کر میرے وجود میں دھماکے سے ہونے لگے میری آنکھوں کا رنگ بھی بدلنے لگا تھا اور چہرے کا بھی۔

آبی کی نظر میرے چہرے پر پڑی تو میری اس خونخوار کیفیت کو سمجھ کر میری نگاہ کا تعاقب کرنے لگا مگر اس نے نہ تو عالیہ کو کبھی دیکھا تھا نہ دھمن کو۔ وہ میری آنکھوں میں کھولتی نفرت کا سبب سمجھ سکا تو بولا "یار ایسی نناوے فیصد عورت تو میں نے آج ہی دیکھی ہے قسم اللہ کی مگر یہ کن بگلوں کے ساتھ بیٹھی ہے۔"

اس کی یہ بات سن کر میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ آبی اپنی قسم کا بہت بڑا چھچھلیان بدمعاش تھا، وہ بھی مسکرا دیا۔ اس نے نظریں عالیہ کے چہرے پر جما دیں چند لمحوں کے توقف کے بعد سوڈے کی بوتل گلاس میں انڈیل کر بولا "تیری آنکھوں میں یہ سرخی کی لہر کیوں ابھر

آئی ہے؟ اُس کے ساتھیوں پر غصہ آرہا ہوگا، مگر ہو سکتا ہے وہ اس کے مشترکہ دوست ہوں۔"

"مشترکہ کھاتے دار بھی تو ہو سکتے ہیں؟" میں نے نازک سے گلاس پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔ ماضی کی یادیں میرے دماغ پر تیچھے لگا رہی تھیں۔

"ادئے پُوربیے! یہ ٹوٹ جائے گا۔ اس کی کمر بہت نازک ہے اس گلاس کی۔" دو بیروں نے اُن کی میز کو نرغے میں لے لیا تھا، اب وہ مجھے نظر نہیں آرہے تھے۔ میں نے گلاس میز پر رکھ کر آبی کا ہاتھ پکڑ لیا اور شمعدان میں جلتی دو میں سے ایک شمع کو بجھا دیا۔

"آبی جانتا ہے تو یہ عورت کون ہے؟ یہ ڈاکٹر عالیہ ہے اور اُس کے دائیں ہاتھ جو آدمی بیٹھا ہے وہ ڈاکٹر دھمن ہے۔"

"نہیں یار! اتنی حسین عورت سے مجھے متنفر نہ کر۔ یہ عالیہ نہیں ہو سکتی۔"

"یہ وہی ہے۔ تم اِدھر بیٹھو، میں ابھی واپس آرہا ہوں۔ اِن پر نظر رکھو۔"

"کسی سیاپے میں نہ پھنس جانا۔ آدمی تو ہے خر مغز۔ ٹھہر میں تیرے ساتھ چلتا ہوں۔"

"نہیں! تم اِدھر ہی بیٹھو۔ اِن پر نگاہ رکھو، یہ نکلنے نہ پائیں۔"

"تو جال لینے جا رہا ہے! کیسی سر پھری باتیں کرتا ہے تو۔"

"یہی بہتر ہے۔ میرے کہنے پر عمل کر اور پستول کی لگام ڈھیلی کر لے۔" یہ کہہ کر میں اپنی کرسی پر سے اٹھا اور عقبی میز پر بیٹھے لوگوں کی اوٹ میں چلتا ہوا میں تیزی سے باہر گیا۔ مجھے یقین تھا کہ میں اُن لوگوں کی کار کا سراغ لگا لوں گا۔ اس گلبدن عالیہ کی عادت میں اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اُسے خوبصورت اور لانبی لانبی کاریں رکھنے کا جنون تھا اور ڈرائیور بھی وہ چُن کر رکھتی تھی۔

باہر کاروں کا ہجوم تھا مگر وہ سب کی سب نئی نویلی چہرہ بند نظر آتی تھیں جیسے وہ ابھی شو روم سے نکلی ہوں مگر اُن میں سے ڈاکٹر دھمن کی کار کو پہچان لینا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اُن لوگوں کو ہوٹل میں داخل ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی اس لیے میں سمجھتا تھا کہ اُن کی کار اُن دو قطاروں میں سب سے آخر میں کھڑی ہوگی۔ اسی خیال کے زیرِ اثر میں آخری تین کاروں کا جائزہ لینے لگا۔ اُن میں سے ایک سیاہ رنگ کی کیڈلک تھی جس کے شیشے بھی سیاہ تھے۔ اور رنگ اُن کا ایسا تھا کہ اندر کی کوئی شے اُن میں سے باہر نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے اس کے شیشوں کے ساتھ لگ کر اندر جھانکنے کی کوشش کی اور ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر دروازہ کھولنا چاہا مگر کار مقفل تھی۔ ابھی میں پیچھے نہیں ہٹا تھا کہ کوئی میرے عقب میں بڑے معنی خیز انداز سے کھنکارا۔ میں نے کسی قسم کی حیرانی ظاہر کیے بغیر کار کے ساتھ ٹیک لگا دی۔ میرے سامنے سفید وردی میں ملبوس ایک کرنجی آنکھوں والا جوان کھڑا مسکرا رہا تھا۔ وہ بڑے ہی عاشقانہ انداز میں مجھے آنکھ مار کر بولا۔ "کار اڑ پھڑو کرنے ہوا استاد! چابی دے دوں؟"

اس کے لہجے میں بلا کا طنز تھا۔ وہ پان کی جگالی کر رہا تھا، اور اسے یقین تھا کہ میں کار چُرانے کی نیت سے وہاں پہنچا ہوں۔

"یہ ڈاکٹر دھمن کی کار ہے؟" میں نے بڑے بھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں ہاں! کیوں، تئیں کیوں پوچھتا ہے؟"

"تمہیں ڈاکٹر صاحب نے اندر بلایا ہے۔"

"تو چل بھیا۔ کاہے کو وخت ضایاں کرتا ہے۔ اپن تو نوکر ہئی اُن کا ہے۔" وہ ایک دم مستعد ہو گیا اور ہوٹل کی عمارت کی طرف چلنے لگا مگر یوں کہ وہ میری رہنمائی چاہتا تھا۔ بڑے دروازے کے قریب پہنچ کر بولا۔ "اپن کو رستہ نئیں معلوم۔"

"میرے پیچھے آجاؤ۔ وہ اُدھر اگلے ہال میں بیٹھے ہیں۔ کیا نام ہے تمھارا؟"

"اپن کا نام پھُلروا ہے۔ واجد پھُلروا۔ ڈاکٹر صاب اپن کو نہار کہوے ہیں۔"

"میرا نام جھُومر ہے۔ تم تو اپنے ہی قافیے کے آدمی نکلے۔"

"اپن کا نام اماں نے لاڈ سے رکھ دیا تھا۔ اپن کو بھی یہی پسند ہے۔ پر استاد یہ ہوٹل ہے کہ پری خانہ، اپن کو تو جھینپ آوے ہے۔"

"ٹھہر ذرا میں اِدھر نمٹ لوں۔ تو بھی آجا، دیکھ کیسے عالیشان غسل خانے بنے ہیں یہاں۔" میں نے اسے ہوٹل کی راہداری میں چلتے چلتے روک کر ٹائلٹ کی طرف دھکیل دیا مگر اتنی نرمی اور اپنائیت سے کہ اُسے میری نیت پر شبہ نہ ہو سکے۔ میں دراصل اس کا حلیہ اپنا لینا چاہتا تھا۔ ٹوپی سے لے کر پتلون تک میں اس سے چھین لینا چاہتا تھا۔ چکنے چکنے اور سفید ٹائلوں سے مزین اُن خوبصورت غسل خانوں کو دیکھ کر وہ بھی تیزی سے ایک غسل خانے میں جا گھسا۔ وہ یُوں سیٹی بجانے لگا تھا جیسے وہ سب کچھ اس کے لیے خواب تھا۔ ایسا خواب جو اُسے حیران کیے دیتا تھا۔ اس وقت اُن غسل خانوں میں اتفاق سے کوئی اور آدمی موجود نہیں تھا۔ جیسے ہی وہ غسل خانے میں گھسا میں اپنی ذہنی جھونجل کو جھٹک کر تیزی سے اس کے عقب میں جا پہنچا۔ میں نے بڑی آہستگی سے اس کی گردن پر ہاتھ رکھا اور پھر اتنی تیزی سے اپنی انگلیوں کی گرفت مضبوط کر کے اس کی رگِ احساس مسل دی کہ وہ سلسلہ درمیان ہی میں رک گیا۔ اور وہ بے ہوش ہو کر میرے بازوؤں میں جھول گیا۔ میں نے فوراً ہی اندر سے چٹخنی چڑھائی اور پھر تیزی سے اُس کے کپڑے اتار کر پہننے لگا۔ یہ خاصا پریشان کُن کام تھا مگر پھر بھی میں نے طوعاً و کرہاً اسے برداشت کر ہی لیا۔ زیادہ مشکل مجھے اس وقت پیش آئی جب میں اپنے کپڑے اُسے پہنانے لگا۔ وہ کسی طرح سیدھا ہی نہیں ہو رہا تھا۔ پھر بھی جوں توں

کرکے میں نے اُسے اپنے لباس میں گھسیٹ ہی دیا۔ سالا گناہگار کی میت سے بھی زیادہ وزنی تھا اور بھر بلے ہوش مردوں سے شرط باندھ کر لیے سُدھ ہوا تھا۔ اس کام سے فارغ ہوتے ہی میں نے اُسے بڑی مشکلوں سے کموڈ کے اوپر بٹھایا تو وہ دیوار کے ساتھ یوں جا لگا جیسے کوئی تھکا ہوا آدمی کسی بہتی دوپہر میں درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ جائے۔ آنکھیں اس کی یوں نیم وا تھیں جیسے وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ اس کے منہ سے عجیب سی پھین نکلنے لگی تھی جسے دیکھ کر میں سمجھا کہ وہ شاید موت کی طرف لڑھک رہا ہے مگر اس کی نبض دیکھنے کی مجھے کہاں فرصت تھی۔ میں نے اس کی ٹوپی سر پر جمائی اور دروازہ بڑی آہستگی سے اپنے پیچھے بھیڑ کر میں باہر نکل آیا۔ آئینوں کی چکاچوند میں جب میں نے اپنا حلیہ دیکھا تو میں سمجھا کہ میں ہی پھلروا ہوں۔ کار کی چابی میری جیب میں تھی اور اپنے لباس کی ہر شے میں نکال لایا تھا۔

غسل خانے سے نکل کر میں اس نیم تاریک ہال کی طرف بڑھا جہاں میں آبی کو تنہا چھوڑ آیا تھا۔ ایک بیرا اس وقت میرے قریب سے گزر رہا تھا۔ اُسے روک کر میں نے اپنے لہجے میں بلا کی شائستگی پیدا کرتے ہوئے کہا کہ وہ سات نمبر میز پر بیٹھے پیرزادہ صاحب کو ذرا دیر کے لیے باہر بھیج دے۔

"ابھی بھیجو شوہر صاب! انگریزی میں آپ کو شوہر ہی کہتے ہیں۔" وہ میری وردی دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

"شوہر نہیں بڑے بھائی! میں شوفر ہوں شوفر۔ کوئی مجھے شوہر بنالے تو پھر اور کیا چاہیے مجھے؟" میں نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ وہ ہنستا ہوا ہال کے اندر چلا گیا۔ ابھی دو منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ آبی دروازے کو جھپٹ کر کھولتے ہوئے باہر آگیا۔ میں اس کے سامنے ہی کھڑا تھا مگر وہ مجھے نظر انداز کر کے تیزی سے آگے بڑھا اور بدکے ہوئے وحشی کی طرح بڑے غور سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔

"ابے ساون کے اندھے تیری نظر کام نہیں کرتی ہے کیا؟" میں نے اس کے عقب میں پہنچ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دبی زبان میں کہا۔

وہ اچھل سا گیا۔ اپنے سیدھے ہاتھ میں اس نے رومال میں لپیٹ کر پستول یوں پکڑ رکھا تھا جیسے وہ سامنے کی ہر شے کو بھون کر رکھ دے گا۔ اب وہ گھوم کر میرے حلیے کو یوں دیکھ رہا تھا کہ میں سمجھا اس کے ہوش اُسے الوداع کہہ گئے ہیں۔ نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دبا کر بولا۔ "تو نے تو مجھے پاگل کر دیا ہے یار، یہ کیا چکر ہے؟"

"دیکھ میں باہر ان کا انتظار کر رہا ہوں۔ یہ ہال سے نکلیں تو تو ان کے ساتھ ساتھ باہر آجائے گا۔ میں آج ہی ان کا جھٹکا کر دوں گا۔ یہ وردی ان کے شوفر کی ہے۔"

"بس ٹھیک ہے۔ تو چل میں ان کے ساتھ ہی باہر آؤں گا۔"

"ہاں میں تجھے یہی بتانے آیا تھا، اب تو اندر جا کر ان کو نظر میں رکھ شاباش!" یہ کہہ کر میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔

وہ لوگ کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد مجھے کار کی طرف آتے دکھائی دیے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اندر سے پی پلا کے باہر نکلے ہیں۔ عالیہ کے قدم بھی اپنے نہیں تھے اور ڈاکٹر دمن بھی لڑکھڑا رہا تھا، ان کے ساتھ جو آدمی تھا وہ کچھ زیادہ ہی بہک رہا تھا۔ وہ اسی حالت میں کیڈلک تک آئے، وہ مجھے نہیں دیکھ رہے تھے۔ بس میرا ہیولا انہیں پھیلا پھیلا سا ہی نظر آتا تھا، اور یہی ان کے لیے کافی تھا۔ میں نے کار کے بائیں ہاتھ کے دونوں دروازے کھولے تو وہ تینوں پچھلی نشست پر ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو کر بیٹھ گئے۔ عالیہ ان کے درمیان بھنچ کر رہ گئی تھی۔ ڈاکٹر دمن اس کا بندھا بندھا ہوا جوڑا بھی یونہی نہیں ہو گیا تھا۔ اس کی وہ کالی برہم زلفیں اس کے چہرے کی صباحت کو اور زیادہ دلکشی بخش رہی تھیں اور مجھے حیرت یہ تھی کہ ڈاکٹر دمن اس آدمی کا وجود کیسے برداشت کر رہا تھا مگر نہیں، وہ تینوں اپنے حواسوں میں نہیں تھے اور ڈاکٹر دمن کچھ زیادہ ہی لڑھک چکا تھا۔ ان کو اس حالت میں دیکھ لینے کے باوجود میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ میں پچھلی نشست پر ان کے ساتھ پھر مڑ کر جا بیٹھا۔ اور ان دونوں کی گردنیں ہاتھوں میں لے کر میں نے ان کی رگیں مسل دیں وہ بے سدھ تو پہلے ہی تھے، فوراً ہی جھول گئے۔ عین اسی وقت آپی بائیں ہاتھ کے اگلے کھلے دروازے سے تیزی سے کار میں داخل ہوا، پستول اس پر تان لیا مگر میں نے فوراً ہی اس کا ہاتھ نیچے جھکا دیا اور اس کے ساتھ ہی میں نے تیسرے آدمی کی بتی بھی گل کر دی۔

"تیری کارروائی کی ضرورت نہیں ہے، یہ پہلے ہی غٹ ہو رہے تھے۔ بیٹھو۔" وہ میرا اشارہ سمجھ کر نشست کی اونچی پشت کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھ گیا، یوں جیسے اس نے خود کو تہہ کر لیا ہو۔ میں اگلی دو نشستوں کے درمیان سے گزر کر ڈرائیور کی سیٹ پر جا بیٹھا اور کار اسٹارٹ کر کے ہوٹل کے درِ مراجعت سے نکلتا ہوا بڑی سڑک پر جا چڑھا۔

محسوس مجھے یوں ہو رہا تھا کہ وہ بے قابو لوگ نہیں تھے۔ شراب نے انہیں دو گھڑی کے لیے خود سے بے گانہ تو ضرور کر دیا تھا مگر وہ جو ان کے وجود میں ایک اپنی تہہ در تہہ جمی ضبط کی برف موجود تھی وہ ہنگامہ بن کر ٹوٹ نہیں رہی تھی۔ میں نے شرابیوں کو بدترین قسم کی ذلتوں میں مبتلا دیکھا ہے، وہ نشے میں دھت ہو کر اپنی شر اور آفت سے لبریز شخصیت کو فوراً ہی آشکارا کر دیتے ہیں۔ مگر وہ تینوں خاموش تھے۔ اپنے اپنے حال میں مست۔ شراب نے انہیں ایسی متانت دے دی تھی کہ غل غپاڑے کی منزلوں سے بہت دور تھے۔

وہ یہی سمجھ کر گاڑی میں بیٹھے تھے کہ گاڑی ان کا شوفر چلا رہا ہے۔ آپی نے مجھے دبی زبان میں کہا۔ "ان کو ابھی تم ادھر جنگل کی طرف لے چلو۔ شہر سے باہر، ہم فلیٹ پر گئے تو وہاں فساد برپا ہو جائے گا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو یار۔" یہ کہہ کر میں نے کار کی رفتار ایک دم تیز کر دی۔ کراچی میں ٹریفک ایسی ہے کہ آدمی ایک دوسرے کے اوپر سے گزر جانے کی آرزو کرتا ہے۔ سائیکل سوار کو پیدل زہر لگتا ہے۔ سکوٹر سوار سائیکل والے سے متنفر ہے اور وہ جو کار میں بیٹھتا ہے اس کا بس نہیں چلتا ورنہ وہ ہر روز دس آدمی مار کر گھر کو لوٹے۔ رہ گئے ٹرک والے اور بس والے۔ تو وہ اپنے ارد گرد کی ہر شے کو حقیر سمجھتے ہیں۔ اور جسے چاہتے ہیں اسے روند ڈالتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کو سات خون معاف ہیں یہی وجہ تھی کہ مجھے اس بھیڑ میں سے کار کو افراتفری کے عالم میں نکال لے جانے میں خاص دقت پیش آ رہی تھی۔ میری رفتار کم ہوئی تو آپی کو طیش آنے لگا، بولا۔ "ابے تو جولاہا بنتا جا رہا ہے کوئی کھڈا تو نہیں ہے سامنے جلدی نکل چل بڑی نازک سواریاں بیٹھی ہیں پیچھے۔"

"میں نے ان کا جھٹکا کر دیا ہے اب یہ عالم برزخ میں کھڑے ہیں، تو کوئی سگریٹ ہی سلگا دے۔"

"ہاں یہ لے! ابھی لے۔ تو بھی مجھے ڈاکٹر دمن کی پھوپھی کی بھانجی کا بھتیجا لگتا ہے۔ سالے! تجھے یہ گر کس بدبخت نے سکھا دیا تھا آدمی کو بیٹھے بٹھائے تو ٹھنڈا کر دیتا ہے سینٹ پرسینٹ۔" یہ کہہ کر اس نے مجھے بھی ایک سگریٹ سلگا دیا۔ شکر ہے کہ اس کے سرے پر اس نے تھوک نہیں لگایا تھا۔

اس کے سینٹ پرسینٹ پر مجھے عالیہ کے بارے میں اس کی رائے یاد آ گئی میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

"یار! یہ عالیہ تجھے نائنٹی ناٹن پرسینٹ نظر آئی، ہنڈرڈ پرسنٹ کیوں نہیں؟"

"اس کو تو میں نے بہت اونچے درجے میں رکھا ہے پیارے! ورنہ اکثر عورتیں تو بس ساٹھ فیصد ہی عورت ہوتی ہیں ان کا باقی چالیس فیصد حصہ مردانہ ہوتا ہے۔"

"تیرے تجربے کی داد دیتا ہوں۔ اکثر عورتوں کو دیکھ کر مجھے بھی یہی احساس ہوتا ہے کہ یہ ساری کی ساری عورت نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم ان سواریوں کو تکریم احمد کے ساتھ والے فلیٹ پر لے جاتے ہیں۔"

"دن کے وقت ادھر مت جاؤ یار! انہیں کسی جگہ فریج میں لگا دے ابھی۔ ہم ہوٹل میں بھی نہیں جا سکتے۔"

"تو پھر کیا کریں؟ کوئی جگہ تو ہونی چاہیے ان کے آرام کے لیے۔"

"بس لے چل سیدھا ان کو حیدرآباد کی طرف۔ شام کو واپس

آجائیں گے ۔" آبی نے اپنے ذہنی اضطراب سے جان چھڑانے کے لیے ایک اور سگریٹ سلگا لیا۔ گاڑی سبک رفتار بھی اور بے آواز چلتی بھی۔ کوئی بیس منٹ بعد ہم ہائی وے پر جا چڑھے اب مجھے کوئی فکر نہیں بھی۔ مگر نہیں، عقب نما پر میں جب بھی نظر ڈالتا تھا، ایک سرخ رنگ کی فاکس ویگن مجھے ایک خاص فاصلے سے اپنے پیچھے چلتی نظر آرہی تھی۔ شہر کی مختلف سڑکوں پر سے گزرتے وقت بھی وہ مجھے اپنے تعاقب میں آتی محسوس ہوئی مگر میں نے خیال کیا ہی نہیں۔ میں سمجھا کہ یہ بھی کوئی راہگیر ہیں لیکن میرا یہ اندازہ غلط نکلا۔ آبی بھی بائیں ہاتھ کار کے باہر لگے عقب نما کو بڑی دل چسپی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ فاکس ویگن اب زیادہ تیز رفتاری سے ہمارے پیچھے آرہی تھی۔

"یار! یہ کون لوگ ہیں؟ اس گدھا گاڑی میں میں انہیں بڑی دیر سے دیکھ رہا ہوں ۔"

"میرا خیال ہے کہ یہ ہمارے تعاقب میں آرہے ہیں۔ میں گاڑی روک رہا ہوں ۔" یہ کہہ کر میں نے گاڑی سڑک سے اتار کر درخت کے سائے میں روک دی۔ وہ سرخ رنگ کی گاڑی کوئی چار منٹ بعد ہمارے قریب آپہنچی اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کا اسٹیرنگ سوات خان کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے گاڑی لاکر ہمارے عقب میں کھڑی کردی اور پھر دروازہ کھول کر بلند آواز سے بولا۔ "کیا بات ہے پھلرا! ادھر کہاں نکل آئے ہو خیر تو ہے۔ ہم نے تمہیں اسٹار گیٹ کی طرف جانے کے بجائے ادھر مڑتے دیکھا تو تمہارے پیچھے چلے آئے تو بولتا کیوں نہیں ہے بھائی!"

یہ کہہ کر وہ گاڑی سے اتر گیا۔ اس کے پیچھے ہی ایک اور آدمی بھی باہر آگیا۔ میں انہیں عقب نما میں برابر دیکھ رہا تھا۔ اس سوات خان کی مکروہ صورت پر نظر پڑتے ہی میرا مغز الٹنے لگا۔ آسیہ پر پہلا غلط ہاتھ اسی نے اٹھایا تھا۔ اس کو میرے گھر سے اغوا اسی نے کیا تھا۔ میں نے جراب میں اڑسے پستول کو کھینچ کر نکالا اور جیسے ہی وہ دونوں ہمارے قریب آئے میں نے تیزی سے دروازہ کھول کر پستول اس پر تان لیا۔ وہ تو دنگ رہ گیا۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ گاڑی میں پھلروا نہیں کوئی اور آدمی سوار ہے مجھے بھی وہ نہ پہچان سکا درمیان میں سے وقت بھی تو بہت نکل چکا تھا۔

"یہ۔۔۔یہ۔۔۔کیا ڈرامہ ہے اوئے! کون ہے تو؟ اور پھلروا کہاں ہے؟" سوات خان نے حیرت کے پہلے ریلے کو برداشت کرتے ہوئے بڑی پاٹ دار آواز میں کہا۔

مجھے یقین تھا کہ وہ دونوں مسلح ہوں گے مگر مجھے یوں اچانک سامنے دیکھ کر وہ کچھ بھی نہ کرسکے۔ اس اثنا میں دوسرا دروازہ کھول کر آبی ان کے عقب میں آ ٹھہرا اس نے اپنا وہ ننھا سا پستول رومال میں لپیٹ کر دوسرے آدمی کی کمر سے لگا دیا تھا۔

" چلو اُدھر اپنی گاڑی میں بیٹھو چلو ۔" آبی نے ان کو پیچھے مڑنے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں تیزی سے گھوم کر گاڑی کی طرف چلے مگر ابھی ہم ان کے بارے میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کرپائے تھے کہ سوات خان کے اندر کا وحشی ایک دم بے قابو ہوگیا۔ اس نے پلٹ کر آبی کی دائیں کلائی پر بھر اتنی تیزی سے کھڑی ضرب لگائی اور اس کا اندازہ اتنا صحیح نکلا کہ آبی کے ہاتھ سے پستول الگ جا گرا۔ اتنا دور کہ وہاں تک ان دونوں میں سے کوئی بھی فوراً نہیں پہنچ سکتا تھا۔ دوسرا آدمی اس پستول کی طرف لپکا تو میں نے پوری قوت سے اس کی پسلی میں ٹھوکر ماری وہ تیوراکر گرا۔ اس ذرا سی مہلت سے فائدہ اٹھا کر سوات خان نے تیزی سے آبی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنی ڈھال بنا لیا۔ اس کی برق رفتاری نے مجھے حیران کردیا تھا۔ اور آبی کو تو وہم تک نہیں تھا کہ پانسہ یوں بھی پلٹ سکتا ہے۔ میرا دل چاہا کہ میں ان دونوں کا قصہ وہیں پاک کردوں مگر میں اتنی آسانی سے سوات خان کو ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ اسے میں وہیں مار دیتا تو میرے پلے کیا رہ جاتا۔ میں انتقام کس سے لیتا۔ آسیہ کی آہوں اور سسکیوں کی بازگشت ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ میں نے پستول عمداً جیب میں ڈال لیا۔ میں اس کا اس ویرانے میں فیصلہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پستول کو نظروں سے غائب ہوتے دیکھ کر سوات خان نے آبی کو زمین پر پٹخنے کے لیے اوپر اٹھانا چاہا تو عین اس وقت آبی آگے کو جھکا اور پورے قد سے اس نے سوات خان کو اپنے اوپر سے اچھال کر اپنے سامنے گرایا اور پھر اس کے دونوں پنجے اپنے پنجوں میں پھنسا کر اسے زمین پر سے یوں دہرا ہوکر اٹھنے پر مجبور کیا کہ میں سمجھا اس نے سوات خان کے دونوں ہاتھ توڑ دیے ہیں مگر نہیں اب سوات خان کے دونوں ہاتھ اس کے کندھوں کے اوپر سے کھینچ کر آبی نے پکڑ رکھے تھے۔ اس کو زبردست جھٹکا دے کر اس نے سوات خان کو گاڑی کی طرف دھکیلا اور اسے ایک نہایت گندی گالی دے کر بولا۔ "اندر بیٹھ بیٹے! تجھ سے تو ابھی ہمیں بڑی باتیں کرنی ہیں تو آج ہی مرگیا تو پھر ہمارا جینا کس کام آئے گا۔"

یہ کہہ کر اس نے فاکس ویگن کے کھلے دروازے کے اندر کی کرسی پیچھے ہٹانی چاہی یوں کہ سوات خان کا دایاں پنجہ ابھی تک اس کے پنجے میں پھنسا تھا۔ ایک ہاتھ واپس ملتے ہی سوات خان نے پلٹ کر آبی کو بالوں سے پکڑ لیا۔ اس کی یہ حرکت دیکھتے ہی میں نے سوات خان کی گردن پر ہاتھ ڈال دیا۔ اس سے بلا وجہ لب سڑک زور آزمائی کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میری انگلیاں اس کی رگ احساس کو فوراً ہی مفلوج کرگئیں۔ میں نے اسے ہاتھوں میں بھر کر فاکس کی پچھلی نشست پر پھینک دیا مگر وہ آدمی جسے میں بے ہوش سمجھ بیٹھا تھا، ہم سے

ہاتھ کر گیا۔ میری نظر اُدھر اٹھی تو میں نے دیکھا کہ وہ کیڈلک کا اسٹیرنگ سنبھال کر اسے اسٹارٹ کر چکا تھا۔

"ارے پکڑو اسے اس کو۔ تو بالکل ڈھگا آدمی ہے یار۔" آبی تیزی سے کار کی طرف لپکا۔ مگر اس آدمی نے چھوٹتے ہی کیڈلک کو ایکسپریس لگا دی تھی۔ وہ اتنی تیزی سے آگے نکلا کہ میں سمجھا ہم بازی ہار گئے۔ کیڈلک کی چابی میں اگنیشن ہی میں چھوڑ آیا تھا، اور اس کا انجن چل ہی رہا تھا کہ وہ آدمی ہماری ایک لحظہ کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر گاڑی پر قبضہ کر کے اسے لے اڑا۔ میں نے فوراً ہی فاکس ویگن میں بیٹھنے کی کوشش کی مگر معلوم ہوا کہ اس کی چابی اگنیشن میں نہیں ہے۔ آبی نے تیزی سے سوات خان کی جیبیں ٹٹولیں تو اس کے نیفے کے ساتھ سلی جیب میں سے چابی مل گئی۔

"اس گدھی کو آگے ہانک یار! مروا دیا تیری بے تدبیری نے، بڑا بہرام ڈاکو بنا پھرتا ہے تو۔" یہ کہہ کر وہ خود ہی اسٹیرنگ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ گاڑی فوراً ہی اسٹارٹ تو ہوگئی مگر ان تین منٹوں میں کیڈلک ہماری نظروں سے معدوم ہوتی جاتی تھی۔ آبی بڑے مضبوط اعصاب کا مالک تھا اس نے چھوٹتے ہی گاڑی کی رفتار ساٹھ میل اٹھا دی۔ کچھ ہی منٹ بعد ہمیں کیڈلک نظر آنے لگی۔ اس کی رفتار میں وہ پہلے ایسی تیزی نہیں رہی تھی کیونکہ سامنے سے مال بردار ٹرکوں کا قافلہ چلا آرہا تھا۔ اور بسیں الگ ایک مصیبت بنی ہوئی تھیں پھر بھی آبی نے ہمت نہیں ہاری۔ اور اس گاڑی کو جسے وہ گدھی کہتا تھا، سڑک کے کچے حصے پر اتنی برق رفتاری سے بھگاتا چلا گیا کہ کوئی دس منٹ بعد کیڈلک ہم سے صرف ایک فرلانگ دور رہ گئی تھی۔ وہ آدمی ہمیں کار کے عقب نما میں برابر دیکھ رہا تھا۔ وہ کوئی بہت مشاق ڈرائیور نہیں تھا، اسے بسوں اور ٹرکوں نے بھی عاجز کر دیا تھا۔ وہ اسے آگے پیچھے سے دباتے چلے آرہے تھے۔ اور وہ اس کوشش میں تھا کہ کسی حادثے کے بغیر ہی اپنی گاڑی کو نکال کر کسی محفوظ مقام پر جا پہنچے۔ مگر آبی اس کے ارادوں کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ اس نے ایک لحظے کے لیے بھی گاڑی کی رفتار کم نہیں کی اور وہ فاکس ویگن بھی ایسی شریف نکلی کہ اس کا حکم بے چون و چرا مانتی چلی گئی۔ آبی دانت پیس کر بولا۔ "تجھے تو کچھ دیر عدت میں بیٹھ جانا چاہیے جیلانی! تاکہ تو یہ معلوم کر سکے کہ تیرے ساتھ کوئی اونچ نیچ تو نہیں ہوگئی۔"

"کیا بک رہے ہو یار تم! میرا کیا قصور ہے، وہ بندر کی اولاد میری سمجھ میں ہی نہیں آیا۔" میں نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ کیڈلک کی رفتار ایک بار پھر تیز ہوگئی تھی کیونکہ ٹرکوں کا قافلہ اس آدمی نے بڑی احتیاط سے گزار لیا تھا۔

"تیری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آتا۔ ہاتھ بھر کا وہ لونڈا تجھے جل دے گیا تو سمجھا کہ وہ بے ہوش ہو گیا ہے نا؟" آبی نے ایکسیلیریٹر پر دباؤ اور بڑھا دیا۔ فاکسی کا انجن اب بری طرح چیخنے لگا تھا مگر ہم اس کے واویلے پر دھیان نہیں دے سکتے تھے۔

"بات کچھ ایسی ہی تھی مگر، بچ کر نہیں جا سکتا ہے آبی۔"

"اس کے پاس کیڈلک ہے جیلانی! اور تو ٹھہرا فرید ٹوٹی پہننے والا آدمی۔ دعا مانگ کہ اس کا ٹائر پھٹ جائے یا اس کا اپنا دماغ ٹوٹ جائے۔"

آبی کا غصہ کسی بھی طرح کم ہونے میں نہیں آرہا تھا۔ اچانک ٹرکوں کا ایک اور قافلہ سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ کیڈلک کو اس جوان نے اب کچے پر اتار لیا تھا مگر اپنی پہلی سی رفتار وہ قائم نہیں رکھ رہا تھا کیونکہ گاڑی کو گزرنے کے لیے پوری جگہ نہیں مل رہی تھی۔ اس موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آبی نے اپنی گاڑی اور زیادہ تیز کر دی۔ سامنے سے ایک بس تیز رفتاری سے ٹرکوں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی ہماری طرف بڑھی چلی آرہی تھی۔ آبی اگر اور زیادہ کچے میں نہ اتر جاتا، تو وہ بس ہم سے ٹکرا ہی گئی تھی۔ ہمیں بچانے کے لیے ڈرائیور نے بس کا اسٹیرنگ کچھ زیادہ ہی بائیں ہاتھ موڑ دیا اور وہ سیدھا ایک ٹرک کے عقب سے جا ٹکرایا۔ زبردست دھماکے کی آواز فضا میں گونجی میں نے دیکھا کہ بس کے انجن میں ٹکر لگتے ہی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ آبی نے بھی عقب نما میں یہ منظر دیکھا مگر وہ رکا نہیں۔ ایک بھیدار قسم کی گالی بس ڈرائیور کو دیتے ہوئے وہ بلاخیز رفتار سے کیڈلک تک جا پہنچا جسے گزرنے کے لیے راستہ نہیں مل رہا تھا کیونکہ ٹریفک رکنے لگی تھی۔ آبی نے پاگلوں کی طرح فاکسی کو سڑک کے آخری حصے سے اتار کر کچے میں ڈال دیا اور ایک دائرے کی صورت میں فاصلے کو کاٹتا ہوا وہ کیڈلک کے قریب جا ٹھہرا۔ وہ آدمی فاکسی کو دیکھتے ہی گاڑی سے نکلا اور دہائی دینے لگا۔

"بچاؤ، بچاؤ یہ مجھے مار دینا چاہتے ہیں۔"

مگر آبی نے... بلاخیز رفتار سے آگے بڑھ کر پوری قوت سے ایک تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا اور چیخ کر بولا۔ "بدمعاش! ایک تو ہماری گاڑی لے کر بھاگ رہا ہے اور الٹا شور مچا رہا ہے کتے! تجھے تو ہم ابھی پولیس کے حوالے کریں گے۔"

لوگ اپنی اپنی بسوں کاروں میں بیٹھے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ کسی میں اتنی جرأت نہیں ہوئی کہ وہ اتر کر پوچھتا کہ میاں جی بات کیا ہے۔ آبی نے ایک اور تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا اور اس کے دونوں بازوؤں کو مروڑ کر اسے دھکیلتا ہوا فاکسی تک لے گیا۔

"اس کو اپنے ساتھ باندھ لے آبی! میں کیڈلک سنبھالتا ہوں۔" اتنے میں ایک بس میں سے تین آدمی باہر نکل آئے۔ وہ اس مار کٹائی کی وجہ معلوم کرنا چاہتے تھے، ان میں سے ایک بولا "کیا بات ہے بھائی جی! کیوں مارتے ہو اس بے زبان کو؟"

"یہ بے زبان نہیں ہے میاں جی! ہماری کیڈلک لے کر شہر سے بھاگ نکلا تھا۔ ہمارے مالکوں کو راستے ہی میں اس نے کوئی چیز سنگھا کر بے ہوش کر دیا۔ بڑی مشکلوں سے ہم نے اسے پکڑا ہے۔" میں نے اُن کو ساری بات تفصیل سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اچھا! ایسا کاریگر آدمی ہے یہ! اور ماریں اس بدمعاش کو۔" اُس آدمی نے میری باتوں سے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔

اس عرصے میں آبی جو اسے بے بس کر کے فاکسی کے اندر سواخان کے پاس بٹھا چکا تھا بلند آواز سے بولا۔" اس کا بندوبست کر دیں خان جی! یہ کہیں بھاگ نہ جائے ہم اسے تھانے ضرور لے جائیں گے۔"

آبی کی یہ بات سنتے ہی میں فاکسی کے اندر جا گھسا۔ اس آدمی کے منہ سے خون رسنے لگا تھا۔ آبی نے ہاتھ اس پر کچھ زیادہ ہی سخت مار دیا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ دبک کر پیچھے ہٹنے لگا تو میں نے اسے پیار سے پچکارتے ہوئے کہا۔" بے فکر رہ بچے! اب ہم تجھے اور نہیں ماریں گے۔" یہ کہہ کر میں نے اس کی گردن پر بڑی محبت سے ہاتھ رکھ کر اُس کی رگ مسل دی۔ اُس وقت بس سے اُترنے والے تینوں آدمی کیڈلک کے قریب کھڑے اُس کی خوبصورتی سے محظوظ ہو رہے تھے۔ اگر اس کے شیشے چڑھے ہوئے نہ ہوتے تو انھیں بھی معلوم ہو جاتا کہ اندر بیٹھی سواریاں کس حال میں ہیں۔ جیسے ہی وہ آدمی بے سُدھ ہوا۔ میں فاکسی سے نکل کر کیڈلک میں جا بیٹھا اور پھر ہم نے دونوں گاڑیاں بڑی مشکلوں سے ٹریفک کی بھیڑ میں سے نکال کر اُن کا رُخ بدلا اور اُن کو کچے پر ڈال کر کراچی کی طرف چل دیے۔ جس بس میں آگ لگی تھی وہ اب تک جل رہی تھی مگر سواریاں اُس میں سے لوگوں نے احتیاط سے باہر نکال لی تھیں۔

کچھ ہی دیر بعد ہم پھر پختہ سڑک پر جا چڑھے۔ میں کیڈلک لیے جا رہا تھا اور آبی فاکس ویگن۔ اور حیرت مجھے یہ تھی کہ اتنے سارے لوگوں کی موجودگی میں ہم ان لوگوں کو باندھ کر واپس لے جانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اب کی بار آبی مجھ سے آگے تھے، اسے میری کارکردگی پر اطمینان نہیں تھا۔ اسے ڈر تھا کہ مجھ سے کوئی حماقت سرزد ہو جائے گی اور پھر ہم کسی نئی مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ کبھی کبھی اس کی رائے میرے بارے میں بہت ہی خراب ہو جاتی تھی۔

کوئی پانچ میل آگے بڑھنے کے بعد آبی نے اپنی گاڑی بائیں ہاتھ مڑتی ایک پتلی سی سڑک پر ڈال دی۔ ہم ذرا آگے بڑھے تو ہمیں محسوس ہوا کہ ہم ایک گھنے جنگل کی طرف جا رہے ہیں۔ سڑک اس کے بیچ میں سے ہو کر نہیں گزرتی تھی بلکہ اس کے کنارے کنارے چلتی تھی۔ آبی نے جنگل کے وسط میں جا کر گاڑی سڑک پر سے اتار کر بائیں ہاتھ کھجوروں کے ایک گھنے جھنڈ تلے کھڑی کر دی۔ اس کے عقب میں میں نے کیڈلک لگا دی۔ اب ہماری پانچوں سواریاں بے ہوش

تھیں۔ اور ہم آبادی سے بہت دُور ایک ایسی جگہ پر کھڑے تھے جہاں ہم اطمینان سے اپنے چیختے ہوئے اعصاب کو سکون پہنچا سکتے تھے۔

گاڑی سے اتر کر آبی میرے پاس آیا اور بولا "اب اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو میں تجھے نہیں بخشوں گا دیکھ ادھر کوئی پینے پلانے کی چیز بھی ہے کہ نہیں ان گاڑیوں میں؟"

"تو خود نہیں دیکھ سکتا۔ اتنی مشکلات سے یہ شکار مارے ہیں میں نے تو انھیں بھون بھی نہیں سکتا؟"

"ہاں بڑا تیر چلایا ہے تُو نے۔ یہ کھچن مارلی۔ ذرا دیکھ اس کیڈلک میں کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔"

"ادھر تو کچھ بھی نہیں ہے یار! یہ کوئی جنگل کے سفر پر تو نہیں نکلے تھے۔"

"دراصل مجھے پیاس بہت لگ رہی ہے۔" یہ کہہ کر وہ فاکسی کے اندر جھانکنے لگا۔ جیسے ہی اُس نے ڈیش بورڈ کھولا، ایک کلکاری سی اس کے منہ سے نکل گئی۔ وہاں کوکاکولا کی چار بوتلیں رکھی تھیں اور اُن کے ساتھ دو بوتلیں بیئر کی بھی تھیں۔

"دیکھا میں نہ کہتا تھا، ادھر ان لوگوں نے کچھ نہ کچھ ضرور ڈال رکھا ہوگا۔" یہ کہہ کر اس نے دانتوں میں دبا کر دو بوتلیں کھول دیں۔ وہ ٹھنڈی تو نہیں تھیں پھر بھی اس وقت ہمیں غنیمت نظر آتی تھیں۔ چاروں بوتلیں ہم خالی کر چکے تو آبی ان گاڑیوں کے کاغذات کی جانچ پڑتال کرنے لگا۔ کیڈلک کسی مسیح الدین کے نام رجسٹرڈ تھی اور وہ جو فاکسی تھی اُس کے کاغذات سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی چوہدری مطلوب احمد کی ملکیت ہے۔

اچانک میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا، یوں جیسے کسی نے میرے اعتماد پر سے چادر جھپٹ لی ہو۔

"یار! ہمارا زیادہ دیر یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں ہے آبی! میں ہوٹل میں پھلروا کو چھوڑ آیا ہوں۔ وہ ہوش میں آگیا تو سب جگہ شور مچ جائے گا۔"

آبی نے میری بات سن کر فوراً ہی کاغذات گاڑیوں میں رکھے اور سگریٹ پاؤں تلے مسل کر بولا "ویسے بھی یہ کراچی شہر ہے پولیس حرکت میں آگئی تو تماشے کے لوگ سڑکوں پر آجائیں گے، اور یہ تیسرا آدمی پتہ نہیں کون ہے؟" یہ کہہ کر اس نے کیڈلک کی پچھلی نشست پر پڑے تیسرے آدمی کی جیبیں ٹٹولیں، اور پھر پریشان سا ہو کر کہنے لگا "یار! یہ ..... یہ تو محکمہ صحت کا کوئی بڑا افسر ہے جیلانی! یہ مصیبت تُو نے خواہ مخواہ مول لے لی۔"

"بڑا افسر! دکھا تو سہی کیا ثبوت ہے تیری اس بات کا؟"

"یہ دیکھ۔ یہ اس کے کاغذات تو دیکھ! ڈاکٹر ترمذی نام ہے اس کا۔" یہ کہہ کر اس نے چند کاغذات مجھے دکھائے ان میں اس کا شناختی کارڈ بھی شامل تھا جس پر ڈاکٹر ایس ایم ترمذی اور اس کی لمبی چوڑی ڈگریوں کا حساب لکھا تھا۔

"بھاگ ان گردہ فروشوں سے کہاں کے حاذق
نہیچ کھائیں جو یہ ہم ایسا کوئی بکرا دیکھیں"

آبی نے اپنی پتلون کی بیلٹ کستے ہوئے کہا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ اور شاید اس بات پر خوش تھا کہ ہم نے ایک بڑی مچھلی پکڑ رکھی ہے، بولا "اب ان گاڑیوں میں ہم سفر نہیں کر سکتے عین ممکن ہے اس پھلروا نے پولیس کو سب کچھ بتا دیا ہو۔"

"نہیں! میرا خیال ہے کہ وہ اتنی جلدی ہوش میں نہیں آسکتا ہے۔ کم از کم چھ گھنٹے تو آدمی کو میرے عمل سے غٹ رہنا چاہیے تم سب کو لے کر واپس چلو۔ ہمیں ادھر آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔"

"اب تو مجھے بھی اپنی غلطی کا احساس ہو رہا ہے مگر پھر بھی ہمیں یہ خطرہ تو مول لینا ہی ہوگا۔ چل تو کیڈلک میں بیٹھ۔" یہ کہہ کر اس نے فاکسی ویگن اسٹارٹ کر دی۔ وہ پیچھے ہٹا تو میں نے کیڈلک اس کے آگے لگا دی اور ہم پھر آہستہ آہستہ ہائی وے پر جا چڑھے۔ ہمیں یہ احساس تھا کہ ہم ایک بہت بڑا خطرہ مول لے رہے ہیں۔ اگر پھلروا نے پولیس کو اپنی بپتا سنا دی اور انھیں یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ہم ترمذی کو لے اُڑے ہیں تو وہ سارے راستوں پر ناکہ بندی کر کے بیٹھے ہوں گے، ایک نئی شے ہے گشتی پولیس۔ اور اُس کے طور اطوار ایسے ہوتے ہیں کہ اُسے یاروں نے ہر قسم کی سہولت فراہم کر رکھی ہے جیپیں، وائرلیس سیٹ، موٹر سائیکل یہاں تک کہ بعض اوقات انھیں ہیلی کاپٹر بھی مہیا کر دیے جاتے ہیں۔ جتنی زیادہ خوفناک مہم ہوتی ہے اتنی ہی زیادہ سہولتیں اُن لوگوں کو مل جاتی ہیں۔ اور مجھے یہ ڈر تھا کہ ترمذی جیسے آدمی کے اغوا پر تو سارا ایوانِ حکومت ہل کر رہ جائے گا۔ وہ ہم ایسے دو غریب مسکین افراد کے خلاف ائیر فورس کو بھی حرکت میں لا سکتے ہیں، چوہا مارنے کے لیے لاہور سے بھنگیوں کی توپ منگوالیں گے۔ وہ کیا نہیں کر سکتے تھے۔ مجھے آبی کے مشورے پر سخت طیش آرہا تھا۔ ہم شہر سے باہر نہ نکلتے اور ہائی وے پر نہ چڑھتے تو سوات خان ہمارا تعاقب نہ کرتا۔ اگر وہ شہر میں ہمیں کہیں للکارتا تو ہم اُس سے وہیں نمٹ لیتے۔ وہ دراصل کہیں بہت دُور پہنچ کر ہمارے پیچھے لگا تھا۔ اگر ہم ہوٹل سے سیدھے فردوسی بیگم کی بارگاہ میں جا ٹھہرتے تو ہمارے لیے خطرے کے سارے دروازے آپ ہی آپ بند ہو جاتے مگر اب ہم جس بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا تھے اس کا کوئی حل ہماری سمجھ میں نہیں آرہا تھا اور یہی وجہ تھی کہ ہم بہت محتاط ہو کر آگے بڑھ رہے تھے۔

(باقی آئندہ)

دیوارِ خوف

محمود احمد مودی

انسان اپنے گناہ گار ماضی سے جدا ہو کر نئی
زندگی اختیار کرنا چاہے تو یہ سب سے زیادہ مشکل
کام ضرور ہے۔ لیکن لوگ اکثر کوشش کے باوجود اپنے
داغدار ماضی سے پیچھا چھڑانے میں کامیاب نہیں
ہوتے۔ ایک عادی مجرم کی روداد جسے ایک
عادی مجرم کھلونا بنانا چاہتا ہے۔
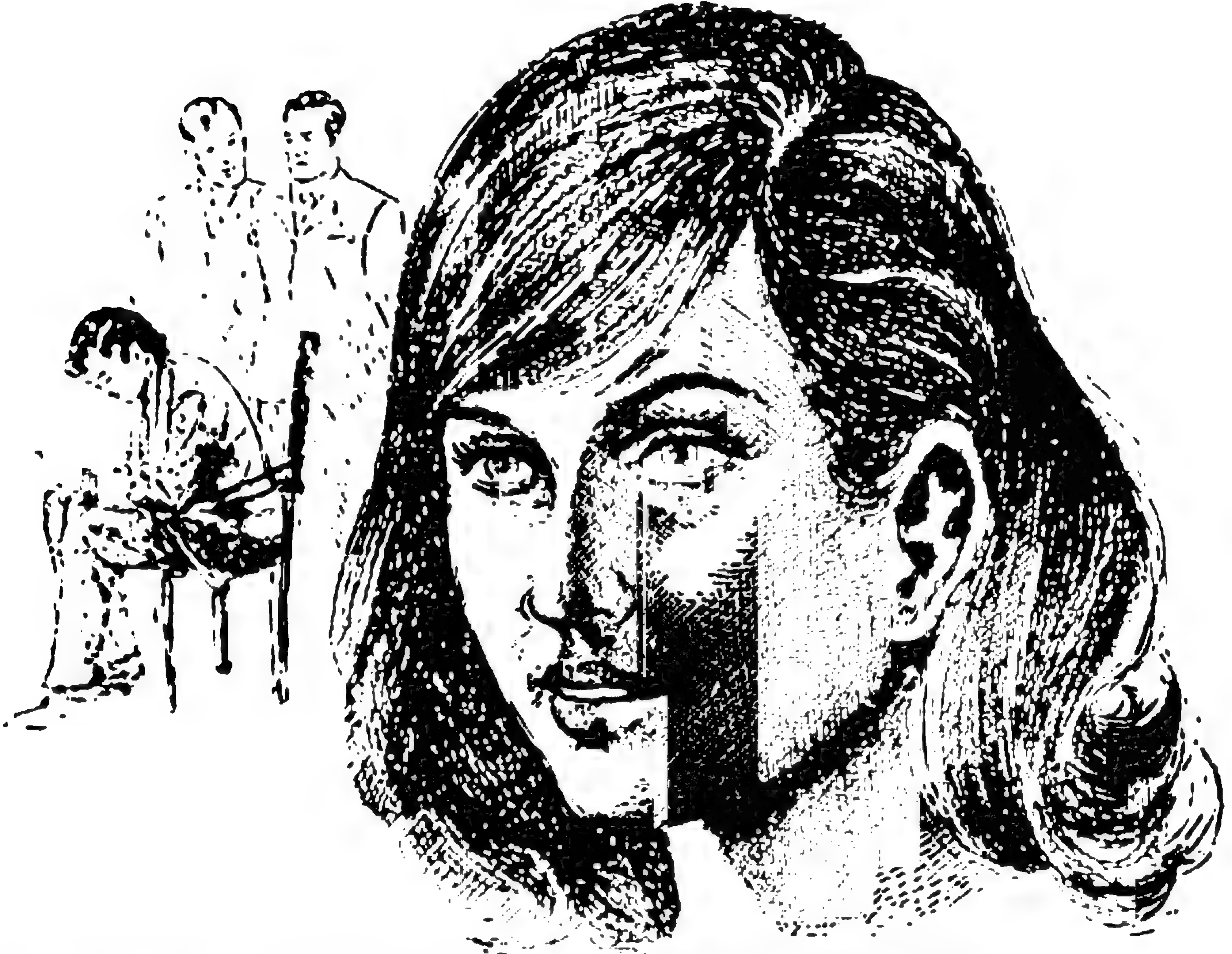
کینٹ نے ایک شخص کو وادی میں داخل ہوتے دیکھا اور وہ اپنے ٹماٹروں کے کھیت میں کام کرتے کرتے اٹھ کھڑا ہوا تاکہ آنے والے کو زیادہ اچھی طرح دیکھ سکے۔ وہ ہمیشہ اسی طرح کرتا تھا جب بھی کوئی وادی میں داخل ہوتا تھا۔ کینٹ دور ہی سے اسے دیکھنا شروع کر دیتا تھا اور اس کے معدے میں گرہیں سی پڑنے لگتی تھیں۔ اس کے عضلات اس وقت تک معمول پر نہیں آتے تھے جب تک وہ آنے والے کو پہچان نہیں لیتا تھا۔ کبھی کبھی وہ حیرت سے سوچتا تھا کہ شاید اس نے رہنے کے لیے اس کھلی جگہ کا انتخاب اسی لیے کیا تھا کہ یہاں آنے والے کو وہ دور ہی سے دیکھ سکتا تھا۔ کوئی اس کی نظروں سے چھپ کر وادی میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ یا پھر شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ یہاں اسے دور دور تک آسمان پھیلا ہوا نظر آتا تھا جسے دیکھ کر اسے بے پناہ وسعت کا احساس ہوتا تھا، اور یہ وسعت اسے تحفظ دیتی تھی۔ تنگ تاریک اور چھت والی جگہوں کو اس نے ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ دیا تھا۔ بشرطیکہ خدا مہربان رہتا۔

وادی میں اترنے والا شخص گھوڑے پر تھا جو اس طرح سست چال کے ساتھ چلا آرہا تھا جیسے یہ علاقہ اس کے لیے مانوس ہی ہو۔ کینٹ اس شخص کو ابھی تک صاف طور پر نہیں دیکھ پا رہا تھا اور اس کے معدے میں اینٹھن سی بڑھتی جا رہی تھی۔

دفعتاً اس کی آنکھوں کی دھندلاہٹ دور ہو گئی اور اس

لے آنے والے کو پہچان لیا۔ وہ شیرف تھا۔ کینٹ کا پرانا پڑوسی اور اچھا دوست جسے کبھی شبہ تک نہیں ہوا تھا کہ کینٹ کبھی ایسی بلند و بالا دیواروں کے درمیان بھی رہا ہے جو انسانوں کو مقید رکھنے کے لیے تعمیر کی جاتی ہیں۔

اس کے معدے کی اینٹھن بھی کم ہوتی چلی گئی لیکن اس کے بعد ہمیشہ کی طرح ٹانگوں میں کمزوری محسوس ہونے لگی۔ وہ دوبارہ ٹماٹر کے کھیت میں بیٹھ گیا۔ اب پتھریلی زمین پر گھوڑے کی نعلوں کی کھنک سنائی دینے لگی تھی۔ قریب آ کر شیرف نے ہاتھ ہلایا۔ "ہیلو کینٹ!"

"صبح بخیر باب!" کینٹ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "آؤ۔ اتر آؤ۔ کچھ دیر بیٹھو۔"

"آج تو نہیں بیٹھ سکتا۔" شیرف نے کہا۔ اس کی پیشانی پر بل تھے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی معاملے میں فکرمند ہے۔ "سنو کینٹ! میں یہاں خاص طور پر یہ پوچھنے آیا ہوں کہ تم سیوائر نامی کسی شخص سے واقف ہو؟"

کینٹ کے معدے میں ایک بار پھر اینٹھن سی ہونے لگی۔ وہ سیوائر نامی کسی شخص کو نہیں جانتا تھا لیکن اس کے لیے تشویش کی یہی وجہ کافی تھی کہ کسی کے بارے میں اس سے پوچھا جا رہا تھا۔

"نہیں باب!" اس نے اپنے لہجے کو پرسکون رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے یاد نہیں پڑتا کہ یہ نام میں نے کبھی سنا ہو، کیوں؟"

شیرف اپنے پائپ میں تمباکو بھرنے لگا۔ وہ حقیقتاً فکرمند نظر آ رہا تھا۔ "گاؤں میں دو آدمی تمہارے بارے میں پوچھتے پھر رہے تھے۔" اس نے بتایا۔ "ان میں سے ایک اپنا نام سیوائر بتا رہا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ تمہیں خاصی اچھی طرح جانتا ہے۔ وہ قدرے چھوٹے قد کا تھا۔ چہرے پر چھائیاں تھیں، بال سرخ تھے اور آنکھیں بہت تیزی سے حرکت کرنے کی عادی تھیں۔"

"نہیں، میں تو ایسے کسی شخص کو نہیں جانتا۔" کینٹ نے محتاط لہجے میں کہا۔ "بیٹھ جاؤ۔ پائپ تو سلگا لو۔"

شیرف نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں، میرا جانا ضروری ہے۔" اس نے کہا۔ "میں صرف یہی سوچ کر آیا تھا کہ تم سے ان کے بارے میں پوچھ لوں۔ اب میں دیکھتا ہوں کہ شاید وہ دوبارہ نظر آ جائیں تو انہیں روک لوں۔"

"معاملہ کیا ہے؟" کینٹ نے پوچھا۔

"دراصل سرخ بالوں والے کا چہرہ مجھے کچھ شناسا لگا تھا۔" شیرف نے قدرے ہچکچاہٹ سے کہا۔ "اس لیے میں نے دفتر جا کر ریکارڈ کھنگالا تو مجھے اس کی تصویر مل گئی۔" اس نے اپنے پائپ میں تمباکو کو انگوٹھے سے دبایا۔ "اس کا اصل نام سیوائر نہیں ہے۔ وہ کئی جیلوں میں رہا ہے اور ایک بار پھر پولیس کو مطلوب ہے۔ تمہیں قطعی کوئی اندازہ نہیں کہ وہ کیوں تمہارے بارے میں پوچھ رہا تھا؟ تم اسے ہرگز نہیں جانتے؟"

"نہیں باب!" کینٹ نے جواب دیا لیکن اس کے معدے میں اینٹھن شدید ہو گئی تھی۔

"حیرت ہے۔" شیرف نے قدرے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔ "وہ تو یقینی طور پر تم سے اچھی طرح شناسا معلوم ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ اسے یہ تک معلوم تھا کہ اسکول کے زمانے میں تم نے اپنی اچھی لکھائی پر انعام حاصل کیا تھا۔ بہرحال... اب میں چلتا ہوں۔"

شیرف نے گھوڑے کو موڑا اور واپس چل دیا۔ کینٹ نے کھیت میں اپنا کام جاری رکھنے کی کوشش کی لیکن اس کے ہاتھ پیروں میں جیسے جان ہی نہیں رہی تھی۔ وہ ساکت بیٹھا ہوا میں دور کہیں کسی غیر مرئی چیز کو گھورتا رہا۔

یہ وادی چھوٹی بڑی اونچی نیچی چٹانوں کے درمیان دو میل دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ چٹانوں کی یہ دیواریں آگے چل کر ایک اور وادی کی حدود میں مدغم ہو گئی تھیں جو نسبتاً زیادہ طویل و عریض تھی۔ اس وادی سے آگے بلند و بالا پہاڑوں کا لامتناہی سلسلہ تھا۔

لیکن یہاں کوئی ایسی دیوار نہیں تھی جس پر چڑھنے کی کینٹ کو ممانعت ہوتی اور کسی دیوار پر کہیں کوئی مسلح محافظ بھی نہیں تھا۔ رقبے کی بھی کوئی حد بندی نہیں تھی۔ کینٹ جب چاہتا ہیٹ سر پر رکھ کر اور چھڑی اٹھا کر جہاں تک پاؤں ساتھ دیتے، جا سکتا تھا۔

... اور اب ایک شخص اس کے بارے میں پوچھتا ہوا یہاں تک آ پہنچا تھا: سرخ بال، چہرے پر چھائیاں اور حد سے زیادہ متحرک آنکھیں۔ یہ شخص وال ڈونی کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ جیل کی کوٹھری میں کینٹ کا ساتھی ہوا کرتا تھا اور کینٹ ہمیشہ اس کے منہ سے بلند بانگ دعوے ہی سنا کرتا تھا جو خاصے خوفناک ہوا کرتے تھے۔ وہ پیرول پر رہائی کا منتظر تھا لیکن کینٹ کو اپنے بارے میں معلوم تھا کہ اگر وہ زیادہ عرصے جیل میں رہا تو پاگل ہو جائے گا۔ اس نے فرار کا ایک ایسا طریقہ سوچا تھا جس کا تصور بھی اب اسے پاگل پن محسوس ہوتا تھا۔

لیکن وال ڈونی اسے تلاش کرتا ہوا یہاں تک آ پہنچا تھا اور اپنی رہائی کے بعد بھی نہ جانے کتنے جرائم کا ارتکاب کر چکا تھا جن کی وجہ سے پولیس کو مطلوب تھا۔

رفتہ رفتہ شیرف اور اس کا گھوڑا کینٹ کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس کے بہت دیر بعد کہیں جا کر کینٹ دوبارہ اپنے کام کی طرف متوجہ ہو سکا اور شام تک مشقت میں مصروف رہا۔ لیکن اس دوران وہ بار بار سر اٹھا کر میلوں دور تک دیکھتا رہا۔

کئی مرتبہ اسے کسی سمت سے کوئی آتا دکھائی دیا لیکن کافی دیر بعد اسے احساس ہوا کہ وہ تو اس کا واہمہ تھا، فریب نظر تھا۔

سورج غروب ہونے پر کینٹ اپنے گھر آ گیا۔ بتی جلائے بغیر اس نے کھانا کھایا اور ان چوڑی چوڑی کھڑکیوں سے باہر دیکھتا رہا جو اس نے اپنے مکان کی ہر دیوار میں رکھی تھیں اور جن میں سے وہ اسی طرح میلوں دور تک دیکھ سکتا تھا، جس طرح کھلے میدان میں بیٹھ کر۔ اس کے لیے اب ایسی کسی جگہ میں رہنا ممکن ہی نہیں رہا تھا جہاں سے وہ دور تک نہ دیکھ پاتا۔ ایک مدت تک وہ دیواروں دروازوں، سلاخوں اور تالوں کے پیچھے محدود جگہ میں رہا تھا۔ اب بند مکان یا محدود جگہ میں رہنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ ملگجا اندھیرا پھیل چکا تھا اور دور تک پہاڑ افق کے دامن پر پھیلے ہوئے ہیولوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔

دفعتاً ایک آواز نے اسے سُن کر کے رکھ دیا۔ "یہیں بیٹھے رہنا پیارے! تمہارے ملاقاتی آن پہنچے ہیں۔" اس کے ساتھ ہی کوئی ٹھوس اور سرد سی چیز اس کی گدی سے آ لگی اور دو ہاتھ اس کا جسم ٹٹولنے لگے۔ ان ہاتھوں نے اس کی جیب سے ریوالور نکال لیا۔

"ہیلو وال!" کینٹ نے مدھم لہجے میں کہا۔ "میں نے سُن لیا تھا کہ تم اس طرف آ رہے ہو۔"

وال نے غراہٹ آمیز سا ہنکارا بھرا اور کینٹ کے سامنے آ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ بلاشبہ کوتاہ قامت تھا اور اندھیرے میں گو کہ اس کے بالوں کا رنگ اور آنکھیں دکھائی نہیں دے رہی تھیں لیکن کینٹ کو معلوم تھا کہ اس کے بال اور آنکھیں کیسی ہیں۔ کینٹ کے ہاتھ میز پر ٹکے ہوئے تھے اور ان میں تناؤ تھا۔

"کس سے سنا تھا تم نے؟" وال نے زہریلے لہجے میں پوچھا۔

"شیرف سے۔" کینٹ نے جواب دیا۔ "وہ مجھے بتلانے آیا تھا کہ گاؤں میں کوئی میرے متعلق پوچھتا پھر رہا تھا۔ تمہاری شکل اسے کچھ شناسا سی لگی۔ اس نے ریکارڈ کھنگالا اور اسے تمہاری تصویر مل گئی۔ اب وہ تمہیں تلاش کر رہا ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں محتاط رہوں گا۔" وال نے اس بار خوشدلی سے کہا اور ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "اس سے ملو۔ یہ میرا پرانا دوست ہے ہیرڈ شیک۔ ہم محض تم سے ملنے آئے ہیں۔ ویسے تھوڑا سا کام بھی ہے۔"

"تمہیں مجھ سے جو کام ہوگا وہ میں ترک کر چکا ہوں۔" کینٹ نے کہا۔

وال ڈوفی نے قہقہہ لگایا۔ "میں بھی اکثر یہی کہا کرتا ہوں۔" وہ بولا، پھر اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا۔ "ہیرڈ! یہ شخص لکھائی کا بادشاہ ہے۔ قلم کو استعمال کرنے میں پورے ملک میں اس کا کوئی ثانی نہیں لیکن اپنی اس صلاحیت کو صحیح طور پر استعمال کرنے کا ڈھنگ اسے نہیں آتا۔ یہ جیل سے بھاگا ہوا ہے۔"

وال کے ساتھی نے ہنکارا بھرا۔

وال ایک بار پھر کینٹ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "ہیرڈ کو اور مجھے لکھائی کے ایک کام میں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ ایک خط اور ایک تصدیق شدہ چیک تیار کرنا ہے۔ سادہ چیک اور لیٹر ہیڈ وغیرہ ہم لے آئے ہیں۔ ساتھ تحریر کا نمونہ بھی ہے جس کی تمہیں نقل کرنی ہے۔"

"میں قلم کو نہ چھونے کا عہد کر چکا ہوں۔"

وال ایک بار پھر ستائشی لہجے میں اپنے ساتھی کو بتانے لگا۔ "اس شخص نے دنیائے جرم میں وہ کارنامہ انجام دیا ہے جس کی کبھی مثال نہیں مل سکے گی۔ جیل میں قید کے دوران اسے کلرکی کا کام سونپا گیا تھا۔ ایک بار اس نے کسی قیدی کی سزا معاف کیے جانے کے بارے میں گورنر کا خط دیکھ لیا۔ معلوم ہے اس نے کیا کیا؟ اس نے روشنائی اور چند قلم لیے اور گورنر کی طرف سے اپنے لیے لیا

ہی رہائی کا ایک حکم نامہ لکھ ڈالا۔ اس کے پاس لیٹر ہیڈ تک نہیں تھا لیکن اس نے وہ بھی ہاتھ سے ہی تیار کر لیا۔ اسے معافی نامے کا سادہ فارم میسر نہیں تھا، اس نے وہ بھی اتنی صفائی سے تیار کر ڈالا گویا ابھی ابھی اسٹیشنری پریس سے چھپ کر آیا ہو۔ لفافے پر اس نے ایک استعمال شدہ ٹکٹ چپکائی اور اُسے جیل میں موصول ہونے والی ڈاک میں شامل کر دیا۔

معافی نامہ دیکھتے ہی جیل کے حکام نے اسے رہا کر دیا۔ انہیں ایک ہفتے بعد علم ہو سکا کہ وہ خط، معافی نامے کا فارم اور لفافہ وغیرہ سب کچھ جعلی تھا۔"

"بہرحال اب میں توبہ کر چکا ہوں۔" کینٹ نے کہا۔ "میں نے محض ایک لڑکی کی خاطر جعلسازی کی تھی جس کے نتیجے میں میں جیل پہنچا تھا۔ اب میں ایسا کوئی کام کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ مجھے کسی منصوبے سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

وال کا ساتھی جو کینٹ کے عقب میں کھڑا تھا، سپاٹ لہجے میں بولا۔ "میں اسے سبق سکھاؤں وال؟" اس نے ریوالور کی نال کا دباؤ کینٹ کی گردن پر کچھ اور بڑھایا۔ کینٹ ساکت بیٹھا رہا۔

وال ڈوبی نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ "کیا واقعی تم اپنا ارادہ نہیں بدلو گے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں، میں اپنا ارادہ ہرگز نہیں بدلوں گا۔"

"دیکھو....!" وال نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "جیل میں تم میرے ساتھ تھے تو نیند میں تم جہاں اس انعام کی باتیں کیا کرتے تھے جو تمہیں اسکول کے زمانے میں اچھی لکھائی پر ملا تھا وہیں تم اس جگہ کے بارے میں بھی نہ جانے کیا کچھ بڑبڑایا کرتے تھے۔ قریبی گاؤں کا نام بار بار لیا کرتے تھے۔ پھر تم جیل سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے اور مجھے وہیں چھوڑ آئے، حالانکہ جہاں تم نے ایک معافی نامہ تیار کیا تھا وہاں دوسرا بھی کر سکتے تھے اور مجھے بھی ساتھ لے کر نکل سکتے تھے لیکن میں نے بُرا نہیں منایا اور جیل والوں کو یہ نہیں بتایا کہ تم کس جگہ کے خواب دیکھا کرتے تھے ورنہ میرا ایک اشارہ انہیں یہاں پہنچا سکتا تھا۔ اب میں تمہیں اس معمولی سے تعاون کے لیے کہہ رہا ہوں جبکہ تم انکار کر رہے ہو حالانکہ تمہیں اس کا معاوضہ بھی ملے گا۔"

"میں نے کہا تو ہے کہ میں یہ دھندا چھوڑ چکا ہوں۔" کینٹ نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"مجھے صرف یہ کرنا ہو گا...." وال نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ "کہ جیل کے حکام کو ایک خط لکھ کر اطلاع دے دوں کہ تم کہاں موجود ہو، اور تم واپس جیل میں پہنچ جاؤ گے۔ میں چاہتا تو پچھلے دنوں کسی وقت بھی یہ کام کر سکتا تھا۔ اب بھی کر سکتا ہوں۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں ایسا کروں؟ بہتر یہی ہے کہ ہمارا ساتھ دو پیارے!"

کینٹ کے معدے کی اینٹھن بڑھنے لگی اور جیل کی پتھریلی دیواروں اور فرش، آہنی دروازہ، کنڈیوں اور تالوں کے تصور سے اس کا سر چکرانے لگا۔

"ایک سنہری موقع ہمارا انتظار کر رہا ہے۔" وال کہہ رہا تھا۔ "میں شہر جاؤں گا اور بڑے بینک میں پہنچ کر تمہارا لکھا ہوا ایک تعارفی خط پیش کروں گا جس میں ایک انشورنس کمپنی کی طرف سے اطلاع دی گئی ہو گی کہ حامل رقعہ ایک پرائیویٹ سراغ رساں ہے، چند نہایت بیش قیمت مسروقہ جواہرات اور زیورات چوروں سے سودے بازی کے ذریعے واپس لینے کی غرض سے اس کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔

میں دو دن شہر میں رہوں گا۔ اس کے بعد پیٹر نمودار ہو گا۔ اس کی حیثیت چوروں کے نمائندے کی ہو گی۔ اس کو واکرنے کے لیے میں اپنا تصدیقی چیک بینک میں پیش کر کے رقم حاصل کروں گا، اور اس سے ایک پیکٹ لے کر بینک کے حوالے کر دوں گا کہ وہ اسے بذریعہ ڈاک انشورنس کمپنی کو ارسال کر دے۔ اس کے بعد ہم دونوں غائب ہو جائیں گے۔ یہ ایک تر نوالہ ہے میرے دوست! تم صرف تعارفی خط لکھ دو اور تصدیقی چیک تیار کر دو۔"

"میں.... میں نہیں کر سکتا...." آواز کینٹ کے گلے میں پھنس رہی تھی۔

وال کے ساتھی پیٹر نے ریوالور کینٹ کی گُدّی سے ہٹا لیا اور اس کے سر پر دستہ رسید کیا۔ "یہ فیصلہ تمہیں نہیں، ہمیں کرنا ہے کہ تم کیا کرو گے اور کیا نہیں کرو گے۔" وہ غرایا۔

لہو کی ایک لکیر کینٹ کی گردن سے پھسل آئی تھی۔ وال ڈوبی نے اپنے ساتھی کو ڈانٹا۔ "مار دھاڑ مت کرو پیٹر! اسے صرف کچھ دیر سکون سے سوچنے کی ضرورت ہے۔ اسے معلوم ہے کہ اگر اس نے ہمارا ساتھ نہ دیا تو ہمیں صرف ایک خط حوالۂ ڈاک کرنا ہو گا۔ یہ یقیناً وہی کرے گا جو ہم چاہتے ہیں۔ اس کے سوا یہ کر بھی کیا سکتا ہے؟"

پیٹر ناگواری سے بڑبڑاتے ہوئے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

کینٹ نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ مزید ریوالور کے دستے کی ضرب نے جہاں اسے تکلیف پہنچائی تھی وہیں اس کے سینے میں غصے کی آگ بھی بھڑکا دی تھی لیکن یہ بے بسی کا غصہ تھا۔

جعلسازی اور فراڈ دراصل اس کے مزاج میں شامل نہیں تھا۔ اگر اس کے باعث وہ جیل پہنچا تھا تو یہ محض ایک لڑکی کے عشق میں پاگل ہونے کا نتیجہ تھا۔ وہ اسے بے وقوف بنا گئی تھی اور کینٹ میں اتنی جرأت ہی نہیں تھی کہ وہ اس کی کسی فرمائش سے انکار کر سکتا خواہ وہ دوستانہ ہوتی یا مجرمانہ۔ اس کے بعد اسے جیل سے نکلنے کے لیے جعلسازی کرنا پڑی تھی لیکن یہ اس کی مجبوری تھی۔ اسے

یقین ہو چلا تھا کہ اگر وہ مزید چند دن ان بلند و بالا دیواروں میں گھری ہوئی اس قبر نما کوٹھری میں مقید رہا تو پاگل ہو جائے گا یا دماغ کی کوئی شریان پھٹنے سے مر جائے گا۔

عشق کا بھوت تو جیل پہنچتے ہی اس کے سر سے اتر گیا تھا۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ لڑکی نے جی بھر کے اسے بیوقوف بنایا ہے اور اس سے جو کام لیا ہے اس کی بدولت اس کے وہ تمام جرائم پیشہ ساتھی خوب خوشحال ہو چکے ہیں جنہیں وہ اپنے عزیز اور رشتے دار کہا کرتی تھی... اور کینٹ جس نے اس کے لیے یہ سب کچھ کیا تھا جیل کی کوٹھری میں پہنچ گیا تھا۔

اس جہنم سے تو وہ نکل آیا تھا لیکن وال ڈوفی اسے دوبارہ اس طرف گھسیٹنے کی دھمکی دے رہا تھا۔ اگر وہ اس کی جعلسازی میں شریک نہیں ہوتا تو وہی تنگ و تاریک کوٹھری پتھریلا فرش اور آہنی دروازے اس کا مقدر بن جائیں گے۔ وہ سوچ رہا تھا۔

دفعتاً ایک مدھم سی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس آواز کو وہ پہچانتا تھا۔ یہ پتھریلی زمین پر گھوڑے کی نعل کی آواز تھی جو بہت دور سے آئی تھی۔ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں لیکن وال اور پیٹر بھی یہ آواز سن چکے تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"کوئی آ رہا ہے۔" پیٹر نے کہا۔ "ہم چھپ جاتے ہیں اور اسے بھی ساتھ لے چلتے ہیں۔" اس نے یوں کالر سے پکڑ کر کینٹ کو اٹھایا کہ اس کا دم گھٹنے لگا اور وہ احتجاجاً گھٹی گھٹی سی آواز میں چیخ اٹھا۔ وال تیزی سے دروازے تک گیا اور ایک جھری سے آنکھ لگا کر دیکھنے لگا۔

"صرف ایک ہی آدمی ہے۔" اس نے اعلان کیا۔ "گھوڑے پر آ رہا ہے۔ چلو... باہر چلو پیٹر! بس کینٹ کو چیخنے سے باز رکھنا۔ باقی سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

وہ تینوں باہر کھلی ہوا میں آ گئے اور ایک طرف گہری تاریکی میں چلے گئے۔ گھڑ سوار قریب آتا جا رہا تھا۔ تاروں کی دھندلی روشنی اس کے اردگرد پھیلی ہوئی تھی مگر وہ اتنی نہیں تھی کہ اس کے خدوخال صاف طور پر دیکھے جا سکتے۔

وال ڈوفی کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور اس وقت وہ کوئی مکار شکاری نظر آ رہا تھا۔ کینٹ کو اندازہ تھا کہ اس کے ارادے کیا ہیں لیکن وہ گھڑ سوار کو خبردار کرنے کے لیے چیختا تو وال یا پیٹر کے ہاتھوں اس کی اپنی جان کی خیر نہیں تھی مگر اسے اپنی جان کی اتنی پرواہ نہیں تھی۔ دوبارہ جیل جانے کا تصور اس کے لیے موت سے زیادہ اذیتناک تھا۔

اندر ہی اندر غصے سے کانپتے ہوئے اس نے ایک طویل سانس لے کر پھیپھڑوں میں خوب ہوا بھر لی۔ چیخ مارتے وقت پیٹر پر جھپٹنا بھی ضروری تھا تاکہ کالر پر اس کی گرفت کچھ ڈھیلی ہو سکے اور کینٹ کی چیخ اس کے حلق ہی میں گھٹ کر نہ رہ جائے۔ اس کے عضلات تن گئے۔

وہ آگے کو جھپٹا اور ساتھ ہی اس نے چیخنے کے لیے منہ کھولا۔ اسے احساس ہوا کہ اس کے حلق سے ایک نہایت ہی مختصر سی گھٹی گھٹی چیخ برآمد ہوئی تھی۔ پھر جیسے کوئی تپتی ہوئی سلاخ اس کے حلق میں اتر گئی تھی۔ اس کے جسم پر کہیں کوئی خوفناک ضرب پڑی تھی اور وہ تکلیف سے دوہرا ہو گیا تھا۔ اس کے بعد اسے کچھ احساس نہ رہا۔

اس کی حسیات نے دوبارہ کام شروع کیا تو سب سے پہلا احساس اسے سر میں مسلسل دھمک اور جسم میں درد کا ہوا۔ وہ ننگے فرش پر پڑا تھا۔ پھر اسے وال ڈوفی کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ اس کے لہجے میں طنز آمیز آسودگی کی جھلک تھی۔ کینٹ نے نیم غنودگی کے سے عالم میں جھرجھری لی تو وال باتیں کرتے کرتے ایک لمحے کے لیے رک گیا پھر بولا۔ "ہوش میں آ رہا ہے۔ کچھ اور پانی ڈالو۔"

اسے احساس ہوا کہ اس کے سر اور چہرے پر ٹھنڈا پانی ڈالا جا رہا تھا جبکہ اس کا اوپری دھڑ پہلے ہی بھیگا ہوا تھا۔ اس کے سر کی دھمک ناقابل برداشت تھی اور ٹھنڈے پانی کے درمیان اس کے رخسار پر کوئی گرم سیال بھی پھیل رہا تھا اور اسے معلوم تھا کہ وہ کیا ہے۔

کینٹ نے سر اٹھایا۔ وال ڈوفی اس کی طرف دیکھ کر بشاشت سے مسکرایا۔ کینٹ نے دیکھا کہ شیرف بھی وہیں موجود تھا لیکن وہ ایک کرسی سے بندھا ہوا تھا۔ اس کی حالت بتاتی تھی کہ وال اور پیٹر سے اس کی ہاتھا پائی بھی ہوئی تھی۔ شیرف نے سرد مہری سے کینٹ کی طرف دیکھا۔

"اچھا ہوا تم ہوش میں آ گئے۔" وال نے کہا۔ "ہم تمہارے دوست شیرف کو بتا رہے تھے کہ تم سے ہماری شناسائی کس حد تک ہے۔ اسے گمان تک نہیں تھا کہ تم کبھی جعلسازی کے جرم میں جیل میں رہے ہو گے اور اپنا جعلی معافی نامہ خود ہی تیار کر کے باہر آئے ہو گے۔ بہرحال اب اسے سب کچھ معلوم ہے۔"

کینٹ کچھ نہ بولا۔

"تم نے خواہ مخواہ اتنی بدمزگی پیدا کی۔" وال نے کہا۔ "اب ہمیں اسی وقت ہاں یا نہیں میں جواب چاہیے۔ شیرف کو ہم یہیں بندھا ہوا چھوڑ جائیں گے۔"

"نہیں۔" یہ کینٹ کے حلق سے پھٹی پھٹی سی آواز نکلی جو اسے خود بھی اجنبی محسوس ہوئی۔ "یہاں تو مہینے میں دو تین آدمیوں کا بھی گزر نہیں ہوتا۔ یہ یہیں مر جائے گا اور کسی کو اس کی موجودگی کا علم نہیں

ہو سکے گا۔"

"اچھا۔" وال نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ اگر ہمیں تم کو بھی یہیں چھوڑ کر جانا پڑا تو ہم تمہیں بھی اس کے ساتھ ہی باندھ کر جائیں۔ اب بتاؤ تم ہمارے ساتھ چلو گے یا یہیں بندھے رہنا پسند کرو گے؟"

کینٹ کا منہ اس بُری طرح خشک تھا کہ بولنا اس کے لیے محال تھا۔ اس نے بولنے کی پوری کوشش کی لیکن حلق سے محض ناقابلِ فہم سی آوازیں برآمد ہوئیں۔ وال نے نہ جانے ان سے کیا مطلب اخذ کیا۔

"مجھے تم پر ذرا بھی اعتبار نہیں کینٹ!" وہ غصیلے لہجے میں بولا۔ "تم جیل سے تنہا بھاگ گئے تھے اور اس ملاقات پر بھی ہمیں اُلو بنانے کی کوشش کرتے رہے ہو۔ بہرحال اب تمہیں وہی کچھ کرنا پڑے گا جو ہم کہیں گے۔ اب بتاؤ تم ہمارا اکھائی کا وہ کام کر رہے ہو؟"

کینٹ نے بمشکل تمام تھوک نگلا۔ "اگر تم وعدہ کرو..."

"ہم تمہیں ساتھ لے جانے کا وعدہ کرتے ہیں۔" وال نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "لیکن اگر تم نے ہمارا کام نہ کیا تو ہم تمہیں شیرف کے ساتھ ہی باندھ جائیں گے۔ اس صورت میں تم دونوں بھوک پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر جاؤ گے اور اگر اتفاق سے کوئی یہاں آ بھی پہنچا اور اس نے تمہیں بندشوں سے نجات دلا دی تب بھی تمہیں دوبارہ جیل بھیج دیا جائے گا اور اس بار تم وہیں سڑ کر مر جاؤ گے۔ لہٰذا تمہیں ثابت کرنا ہے کہ تم ہمارے ساتھی ہو، مستقل طور پر ہمارے وفادار شریکِ کار بننے کے لیے تیار ہو اور اپنی وفاداری ثابت کرنے کا طریقہ تمہارے لیے میں یہ تجویز کر رہا ہوں کہ تم اپنے ہاتھ سے شیرف کو گولی مار دو گے۔"

کینٹ کے حلق سے ایک بار پھر گھٹی گھٹی بے معنی سی آواز نکلی۔

"میں مذاق نہیں کر رہا۔" وال نے اسے خبردار کیا۔ "شیرف جان چکا ہے کہ میں کون ہوں اور اسے یہ بھی معلوم ہے کہ میں پولیس کو مطلوب ہوں اس لیے میں فرار ہوتے وقت اسے ایسی حالت میں چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا کہ اس کے آزاد ہو جانے کا خطرہ باقی رہے اور تمہیں بھی میں اس وقت تک ساتھ لے جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا جب تک مجھے یقین نہ ہو جائے کہ تم ہمارے وفادار رہنے پر مجبور ہو چکے ہو اور یہ ثابت کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ تم شیرف کو گولی مار دو تاکہ تم خود بخود ہی ہمیشہ کے لیے ہمارے ساتھ وفاداری کے بندھن میں بندھ جاؤ یا پھر تم اس کے ساتھ یہیں رہو۔ بولو تم کونسا راستہ منتخب کر رہے ہو؟"

کینٹ بول نہیں پا رہا تھا لیکن اس کا ذہن ضرور کام کر رہا تھا۔ شیرف کے ساتھ یہیں رہ جانے کا مطلب یہی تھا کہ جیل کی کوٹھری ایک بار پھر اس کا مقدر ہو گی اور وال کے ساتھ جانے کے لیے بالفرض وہ اپنے دوست شیرف کو قتل کرنے کے مرحلے سے گزر بھی جاتا تب بھی جب تک زندگی باقی تھی اسے جانوروں کی طرح دوڑتے رہنا، نہ جانے کیسی کیسی تنگ و تاریک کمین گاہوں میں چھپ کر شب و روز گزارنا اور ہمیشہ کی طرح خوف کی سولی پر لٹکے رہنا پڑتا۔ نہ جانے کتنے کتنے دن اسے سورج کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔

"لاؤ... مجھے ریوالور دو۔" بالآخر کینٹ نے بوجھل آواز میں کہا۔

وال ڈونی اپنے ساتھی کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ "اسے اس کا ریوالور دے دو۔" اس نے کہا۔ "لیکن ہم دونوں اس کی پشت پر رہیں گے اور اسے اس وقت تک اپنے ریوالور کی نال پر رکھیں گے جب تک یہ شیرف کو ختم نہیں کر دیتا۔ اس کے بعد یہ دوبارہ ہمارا دوست بن چکا ہو گا۔"

شیرف نے سر نگاہوں سے کینٹ کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر تناؤ آ گیا تھا۔ اسے غالباً یقین ہو چکا تھا کہ وہ موت کی آغوش میں جانے والا ہے۔ اس کی رنگت قدرے پھیکی پڑ گئی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں بہرحال خوفزدگی کی کوئی علامت نہیں تھی۔ اس کے دانت سختی سے ایک دوسرے پر جمے ہوئے تھے کیونکہ اس کے جبڑوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ یہ بات بہرحال طے تھی کہ وہ زندگی کی بھیک مانگنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ یہ اس کے چہرے سے عیاں تھا۔

کینٹ نے ریوالور سیدھا کیا۔ اس کی نال شیرف کے سینے سے بمشکل ایک انچ دور تھی۔ "باب!" اس نے بھرائی ہوئی سی آواز میں کہا۔ "آئی ایم سوری باب...!"

پھر ایک دھماکہ ہوا اور شیرف کو جیسے ایک جھٹکا سا لگا
کینٹ تیزی سے گھوما۔ اس کے ریوالور کی نال سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ اس کا ریوالور ایک بار پھر گرجا اور وال ڈونی اچھل کر دور جا گرا۔ پیٹر کے چہرے پر حیرت جیسے منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔ کینٹ کی تیسری گولی اس کے سینے سے پار نکل گئی لیکن اس کے ساتھ پیٹر کے ہاتھ میں موجود ریوالور کا ٹریگر جیسے خود بخود دب گیا۔ گولی کینٹ کی پسلیوں کو چھوتی ہوئی گزری۔

اس کے حلق سے ہلکی سی کراہ نکلی اور اس نے پسلیوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ اس وقت تک پیٹر بھی وال کے قریب ہی فرش پر ڈھیر ہو چکا تھا۔ کینٹ، شیرف کی طرف مڑا جسے اب یقین آیا تھا کہ وہ زندہ ہے۔ کینٹ نے اسے گولی نہیں ماری تھی۔

"میں نے تمہیں گولی نہیں ماری باب!" اس نے اٹک اٹک

کر کہا۔ "میں مار ہی نہیں سکتا تھا۔ تم نے دیکھا کہ میں نے ریوالور کس صفائی سے ترچھا کر لیا تھا۔۔۔ لیکن باب۔۔۔ میں جیل نہیں جاؤں گا۔۔۔ کبھی نہیں جاؤں گا۔۔۔"

شیرف نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے تھوک نگلا۔

"میں یہاں سے جا رہا ہوں باب!" اس نے بیٹھی بیٹھی سی آواز میں کہا۔ "اگر تم وعدہ کرو کہ تم مجھے کچھ دور نکل جانے کی مہلت دے دو گے تو میں تمہاری بندشیں کھول دیتا ہوں۔ میں تمہاری زبان پر اعتبار کر لوں گا۔"

"کینٹ!" شیرف نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "یہ دونوں تمہارے بارے میں جو کچھ کہہ رہے تھے کیا وہ سچ ہے؟"

"ہاں۔۔۔ وہ سچ ہے۔" کینٹ نے آہستگی سے کہا۔

شیرف چند لمحے پُرخیال نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر گہری سانس لے کر بولا۔ "ٹھیک ہے۔ میں تمہیں نکل جانے کی مہلت دے دوں گا۔ تم مجھے کھول دو۔"

کینٹ نے چاقو سے اس کی رسیاں کاٹ دیں۔ شیرف نے آزمائشی طور پر ہاتھ پاؤں ہلائے پھر جھک کر دونوں مجرموں کی لاشوں کا معائنہ کرنے لگا۔

"یہ سرخ بالوں والا تو بڑی شدت سے پولیس کو مطلوب ہے۔" اس نے وال ڈونی کی طرف اشارہ کیا۔ "لیکن اس دوسرے کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ہے۔ بہرحال میں اس کی انگلیوں کے نشانات ڈپارٹمنٹ کو بھیج دوں گا اور ساتھ ہی یہ رپورٹ بھی کہ میں اور تم جب ان مجرموں کو گھیر چکے تو انہوں نے فائرنگ شروع کر دی اور مقابلے میں مارے گئے۔ رپورٹ بھیجتے ہی میں ان کی لاشیں دفن کرا دوں گا۔"

"تم جو چاہو کرو۔" کینٹ نے کہا۔ "میں تو جا رہا ہوں۔"

"تم کہاں جا رہے ہو گدھے؟" شیرف نے مصنوعی خفگی سے کہا۔ "ابھی تو مجھے تمہاری انگلیوں کے نشانات لینے ہیں۔"

"میری انگلیوں کے نشانات؟" کینٹ نے حیرت سے کہا۔ "وہ کس لیے؟"

"نہیں سمجھے؟ بھئی یہ جو نامعلوم مجرم مر چکا ہے اس کی انگلیوں کے نشانات کی جگہ دراصل تمہارے ہی نشانات تو جائیں گے۔" شیرف نے کہا۔ "اس طرح ریکارڈ میں جو اندراجات ہوں گے ان کے مطابق وال ڈونی کے ساتھ ساتھ جعلساز کینٹ بھی شیرف باب اور ایک معزز شہری سے مقابلے میں مارا جا چکا ہو گا اور اس کی فائل ہمیشہ کے لیے داخلِ دفتر ہو جائے گی۔ کسی کو اس کی تلاش نہیں رہے گی۔"

فرطِ مسرت سے کینٹ ہکلا کر رہ گیا۔

باس نے سکریٹری سے کہا۔ "کسی شخص نے میری بیوی سے جا کر کہہ دیا کہ میں گزشتہ رات تمہیں ایک رُومانی فلم دکھانے لے گیا تھا۔"

سکریٹری نے انداز بے نیازی سے اُس روز کی ڈاک سمیٹتے ہوئے کہا۔ "اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"صرف اتنا کہ اب تم میری سابق سکریٹری بن جاؤ گی۔"

"عملی طور پر تو جعلساز کینٹ اسی وقت ہی مر گیا تھا جب تم اس وادی میں آئے تھے۔" شیرف نے بات جاری رکھی۔ "لیکن آج وہ سرکاری طور پر بھی مر چکا ہے۔ کل اسے دفن کر دیا جائے گا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم ایک بار پھر مفرور مجرم کی حیثیت سے نامعلوم راستوں پر نکل جاؤ اور کبھی وال ڈونی جیسے کسی مجرم کے ہتھے چڑھ کر کسی مجبوری میں گرفتار ہو کر ایک بار پھر جعلسازی یا کسی اور جرم کا طوق اس طرح گلے میں ڈال لو کہ پھر نکالے نہ نکلے۔ بس صرف یہی میرا مقصد ہے۔ یہ مت سمجھنا کہ میں تمہارے اس احسان کا بدلہ اتار رہا ہوں کہ مجھے گولی مارنے کے بجائے تم اپنی جان پر کھیل گئے تھے۔"

شیرف اس کے برابر ہی دروازے میں آ کھڑا ہوا اور کھلی ہوا میں گہری گہری آسودہ سی سانسیں لیتے ہوئے بولا۔ "ایک مدت تک یہاں محنت کرنے، بنجر زمینوں کو قابلِ کاشت بنانے اور اپنی الگ تھلگ دنیا آباد کرنے کے بعد ان وسعتوں کو چھوڑ کر کہاں جاؤ گے۔ آج کے بعد سے تو تم ایک دلیر اور معزز شہری کہلاؤ گے جس نے شیرف کے شانہ بشانہ دو مفرور مجرموں کا مقابلہ کیا۔" اس نے مڑ کر کینٹ کا ہاتھ تھام لیا اور ستائشی انداز میں اس کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ "بخدا تمہارے ہاتھ میں قدرت نے بڑی صلاحیتیں بھر دی ہیں۔ لکھائی کے معاملے میں تم نے کمال کیا کہ اپنا معافی نامہ خود ہی لکھ کر جیل سے نکل آئے۔ یہاں آئے تو تمہارے ہاتھوں نے قلم چھوڑ کر بنجر زمینوں کو گلزار بنا دیا۔ اور جب تم نے اسی ہاتھ سے ریوالور میرے سینے کے قریب لا کر گولی چلائی تو میں یہی سمجھا تھا کہ گولی میرے سینے سے پار ہو گئی ہے اور پھر اسی ہاتھ سے تم نے ٹریگر دبا کر ان مشّاق اور پیشہ ور مجرموں کو سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر گولی مار دی۔ چلو۔۔۔ اب جلدی سے میرے دفتر چلو۔۔۔ مجھے ان بے مثال ہاتھوں کے نشانات کاغذ پر ثبت کرتے ہیں۔"

عشق

احمد اقبال

ایک تھا راجہ اور ایک تھی رانی۔ رانی کی ایک کنیز تھی جو ایک غلام سے عشق کرتی تھی۔ یہ ہزار سال پہلے کی کہانی ہے۔ مگر یہ کہانی تو آج بھی ویسے ہی جاری ہے اور نہ جانے کب تک جاری رہے گی۔ سرورق پر اسی مادے کے لیے ایک تاثر انگیز اور جذباتی کہانی۔ اس کہانی کا انجام یقیناً آپ کی توقع کے خلاف ہے۔

گاڑی کو اُنھوں نے سڑک سے کچھ ہٹ کے راستے پر اُتار کے درختوں کے ایک جھنڈ میں گھنی جھاڑیوں کے نیچے کھڑا کر دیا تھا۔ سر سبز درختوں کے پار کھلے آسمان پر چاند چمک رہا تھا لیکن اُس کی چاندنی پتوں اور شاخوں سے گزر کے زمین تک پہنچنے میں ناکام تھی۔ برائے نام اُجالے میں پُرانی سیاہ کار کی چمک تک سا دکھائی نہ دیتی تھی۔ سڑک پر گاڑی روکنے میں بہت سے اندیشے تھے۔ گشت کرنے والی پولیس دیکھ لیتی تو رات کے اندھیرے میں ایک جوان اور حسین لڑکی کے ساتھ ایک نوجوان مرد کو اِس سنسان مقام پر تنہا پا کے اُن پر آوارہ گردی سے لے کر فحاشی تک ہر الزام عائد کرنا کوئی مسئلہ نہ ہوتا اور اس مسئلے کو قانون کی دفعات کے بغیر حل کرنے کے لیے مدن کو کم سے کم پانچ صد روپیہ سکۂ رائج الوقت کا نذرانہ پیش کرنا پڑتا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ انسانی ہمدردی کے جذبے سے مجبور ہو کے کوئی گاڑی والا یہ سمجھتا کہ

"میاں بیوی" گاڑی کی خرابی کے باعث مشکل میں گرفتار ہیں اور مدد کے لیے رُک جاتا۔ حقیقت برعکس تھی۔ یعنی نہ تو گاڑی چلنے سے معذور تھی اور نہ وہ میاں بیوی تھے۔

لیکن اُس کا یہ مطلب بہرحال نہیں نکالا جاسکتا تھا کہ وہ میاں بیوی نہیں بن سکتے تھے بلکہ اِس وقت بھی انتظار کی کوفت سے بچنے کے لیے وہ اُسی خوش گوار، خوش حال اور تابناک مستقبل کے تصورات میں کھوئے ہوئے تھے جب وہ واقعی میاں بیوی ہوں گے اور محاورے کے مطابق بڑے بوڑھے اُن کی مثال دے کر دعا دیں گے کہ جیسے بھگوان نے اُن کے دن پھیرے ویسے ہی سب کے پھیرے۔ گزشتہ چھ ماہ تک مثبت اور منفی دلائل کی رسہ کشی کا شکار رہنے کے بعد بالآخر مدن یہ فیصلہ کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا کہ اُسے چندرلا سے سچ مچ کا پریم ہوگیا ہے۔ وہ فلمی پریم نہیں جو اُس کی پسندیدہ ہیما مالنی ایک فلم میں ششی کپور سے کرتی تھی تو دوسری فلم میں امیتابھ بچن سے۔ بلکہ وہ پریم جو آتما اور شریر کے ملاپ کا دنیاوی روپ ہوتا ہے اور جس میں آدمی پیار کے گیت گانے اور ڈائیلاگ بولنے کی بجائے گرہستی کی سوچتا ہے۔ ناری کو اپنی دھرم پتنی کے روپ میں اور اپنے بچوں کی ماں کے روپ میں دیکھتا ہے۔ چندرلا اِس معیار پر پوری اُترتی تھی۔ بے شک وہ ذات کے اعتبار سے کم تر تھی اور اُس کی سماجی حیثیت بھی گھروں میں کام کرنے والی ملازمہ ہونے کے باعث اچھی نہ تھی لیکن اُس میں بہت سی خوبیاں ایسی تھیں جو اُس کی ہزار خامیوں پر بھاری تھیں اور مدن کو ذاتی تجربات اور مشاہدہ کے باوجود کسی اور لڑکی میں نظر نہ آئی تھیں۔ ایک وہ بہت خوب صورت تھی یا یہ کہ مدن کو لگتی تھی۔ کہتے ہیں کہ لیلیٰ کو مجنوں کی آنکھ سے دیکھنا چاہیے۔ دوسری یہ کہ مدن کو چاہتی تھی۔ ایک مرد کی حیثیت سے نہیں بلکہ اپنے ہونے والے شوہر کی حیثیت سے اور اُس کی خاطر وہ سب کچھ کرسکتی تھی۔ جو ہندوستان کی ایک شوہر پرست بیوی کو کرنا چاہیے۔ پھر یہ کہ وہ خود کون سا شہزادہ گلفام یا راجہ اِندر تھا۔ چنانچہ اُس کے لیے یہی لڑکی وہ مثالی عورت تھی جس سے شادی کرکے وہ تمام عمر سکھ چین کے ساتھ بسر کرنے کی سوچ سکتا تھا۔

آخری اور سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مدن بہت حقیقت پسند تھا اور یہ جانتا تھا کہ سکھ چین کی زندگی صرف پریم پیار کے ساتھ نہیں گزرتی کیونکہ پیار پیٹ نہیں بھرتا اور پیٹ خالی ہو تو پیار نہیں ہوسکتا۔ چندرلا نے اُسے سکھ چین کی اصل ضمانت فراہم کرنے کا راستہ ڈھونڈ لیا تھا۔ مدن کے لیے لکھ پتی بن جانے کا خیال اب مستقبل کا خواب نہیں رہا تھا بلکہ بہت جلد ایک حقیقت بننے والا ہے۔

چندرلا کے ذہن میں کسی قسم کے شکوک و شبہات نہ تھے۔ جب سے اُس نے مدن کو اپنے جیون مرن کا ساتھی منتخب کیا تھا اُسی دن سے مدن اُس کے لیے دیوتا سمان ہوگیا تھا اور ساری دُنیا کے وجیہہ و شکیل، دولت مند یا پُرکشش مرد اُس کے لیے بے وجود ہوگئے تھے۔ اُس کی سابقہ زندگی رومانوی تجربات سے یکسر خالی تھی چنانچہ اُس کی زندگی میں قدم رکھنے والا یہ پہلا مرد ہی اُس کے لیے مثالی مرد تھا۔ اُسے اب خیال تھا تو اُس گھر کا جس کو آباد کرنے کی آرزو پوری ہونے کا وقت آگیا تھا اُس کے سارے خوابوں کو تعبیر ملنے والی تھی اور وہ بہت خوش تھی۔ اِس وقت تو وہ مستقبل کی بجائے حال کے ہر لمحۂ گریزاں سے برسرِ پیکار تھی۔ اپنے اندیشوں سے لڑ رہی تھی اور اپنے خوف پر قابو پانے کی جدوجہد میں مصروف تھی۔

"مدن۔ مجھے تو سردی لگ رہی ہے۔" وہ بولی۔ "یہاں چھپ کر بیٹھے رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے آج تک کسی کو ادھر آتے نہیں دیکھا۔ چلو اندر چل کے باورچی خانہ میں چائے کا ایک ایک کپ پی آئیں۔"

"چائے کی طلب تو مجھے بھی بہت سخت ہے۔" مدن نے کہا۔ "لیکن گرمی کے موسم میں مجھے سردی نہیں لگ رہی ہے۔ ہمارا یہیں انتظار کرنا بہتر ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ اتنی جلدی نہیں آسکتی لیکن خطرہ مول لینے سے کیا فائدہ۔ بعض اوقات ذرا سی بے احتیاطی بنا بنایا کام بگاڑ دیتی ہے۔"

"تم تو بڑے اعتماد سے کہتے تھے کہ رقم اب ہاتھ میں سمجھو۔" وہ مایوسی سے بولی۔ "اب یہ خطرے کا احساس کیسا؟ ہم نے احتیاط میں کوئی کمی تو نہیں چھوڑی۔"

"ہاں۔" وہ بولا۔ "پھر بھی میرا خیال ہے کہ اِس چکر میں پڑنے کی بجائے میں سارے مال پہ ہاتھ صاف کردیتا تو بہتر ہوتا۔"

"خاک بہتر ہوتا۔ یہ بھی تو ہوسکتا تھا کہ تم پکڑے جاتے۔" وہ جل کر بولی۔ "اور سات بار اگنی کنڈ کے پھیرے کرنے کی بجائے سات سال جیل میں چکی پیستے گزار دیتے۔"

"بے وقوف لڑکی۔" وہ ہنسا۔ "یہ خطرہ تو اب بھی ہے۔ میں جو وردی پہن کر جعلی پولیس افسر بن گیا ہوں یہ بھی کم سنگین جرم نہیں ہے۔ اِس میں بھی پکڑے جانے کا ڈر ہے۔ سزا سات سال نہ ہوئی تین سال ہوئی۔ بات تو ایک ہی ہے۔"

"میں تمھیں کیسے سمجھاؤں کہ وہ تمھارے خلاف کوئی جال نہیں پھیلائے گی۔" وہ بولی۔ "کیا ثبوت ہوگا۔ اُن کے

پاس؟"

"اچھا بابا تم کہتی ہو تو چلو۔ سولی تو مجھے چڑھنا ہے۔"

وہ ہتھیار ڈالتے ہوئے بولا۔

O

یہ محض ایک اتفاق تھا کہ چندرلا کو، جس کا پورا نام "چندرا وتی ماتھر" تھا۔ ایک خزانے کی موجودگی کا پتہ چل گیا۔ یہ کوئی مدفون خزانہ نہیں تھا جس کا سراغ لگانے میں آثارِ قدیمہ کے ماہر ناکام رہے ہوں یا کسی جوگی نے چندرا کو اس کا راز بتا دیا ہو۔ یہ خزانہ سب کی نظروں کے سامنے اسی گھر میں موجود تھا جہاں چندرلا ایک ملازمہ کی حیثیت سے کام کرتی تھی۔ یہ گھر ایک خبطی بڑھیا کا تھا جس کے بارے میں متضاد باتیں مشہور تھیں۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ وہ ایک سابق والیِ ریاست کی بیوہ تھی جسے ریاست کے ہندوستان میں ضم ہو جانے کا اتنا صدمہ ہوا تھا کہ وہ معزولی کے بعد حکومت کا منظور کردہ وظیفہ لینے کے لیے زیادہ دن نہ جیا۔ ایک اور روایت کے مطابق اُس کی بیوی رانی کانتی دیوی نے جواب صرف کانتی رہ گئی تھی، ایک تیر سے دو شکار کیے یعنی اپنے پتی کا دکھ دور کرنے کے لیے اُسے دھرتی سے دور آکاش پر بھیج دیا اور خود آسانی سے راجا جی کی وارث بن گئی۔ سورگ باشی راجا کے بارے میں عام خیال یہ ہی ہوا تھا کہ وہ کچھ نہیں بچا سکے تھے چنانچہ اُن کی زندگی کے آخری ایام مفلسی اور کس مپرسی کے عالم میں گزرے لیکن درحقیقت راجا جی بڑے کنجوس اور کائیاں تھے۔ انھوں نے اپنا بہت کچھ حکومت کے حوالے کرنے کی بجائے چھپا لیا تھا لیکن مرتے دم تک کسی کو اس کی خبر نہیں ہونے دی۔ کانتی بھی راجا جی سے کم نہ تھی۔ جیسی روح ویسے فرشتے۔ اُسے پیسہ اپنی جان سے زیادہ پیارا تھا اور کنجوسی میں کوئی اُس کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ صرف آدھی تنخواہ بچانے کی خاطر اُس نے پرانی اور وفادار ملازمہ چندرا سے کہا کہ باقی ملازموں کو رخصت کردینے کے بعد اُسے چندرلا کی خدمات بھی جز وقتی طور پر درکار ہیں۔ وہ اکیلی عورت ہے اور اُس کا کام ہی کتنا ہے کہ وہ کسی ملازمہ کو پورے دن کے لیے رکھے؟ لیکن وہ ملازمہ کے بغیر بھی نہیں رہ سکتی۔ اگر چندرا دوپہر کے بعد آکے چھوٹا موٹا کام کر جائے اور دونوں وقت کا کھانا پکا کے رکھ جائے تو پانچ سو کی بجائے وہ ڈھائی سو دے سکتی ہے ورنہ۔۔۔

چندرلا نے مجبوراً آدھی نوکری قبول کرلی لیکن اُس کی خوش قسمتی تھی کہ اُسے کوئی پریشانی نہیں اٹھانی پڑی مہینہ بھر بعد ہی اُسے دوسری ملازمت مل گئی جہاں اُس کا کام دوپہر تک ختم ہو جاتا تھا۔ دونوں جگہ کام آسان تھا اور ایک جگہ کے کام سے دوسری جگہ کے کام پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ چنانچہ وہ آدھا دن ایک جگہ گزارتی تھی اور باقی آدھا دن دوسری جگہ۔ صبح آٹھ بجے وہ ایک سکھ تاجر بسنت سنگھ کے گھر پہنچتی تھی اور اُس کی گاڑی میں دو بچوں کو اسکول چھوڑ کر لوٹ آتی تھی۔ ڈرائیور ایک بوڑھا جیونس سکھ تھا اور چندرلا کو حیرانی ہوتی تھی کہ اُسے راستہ کیسے دکھائی دیتا ہے۔ واپس آنے کے بعد وہ سردارنی کے سو فیصد نجی کام کرتی تھی کیونکہ دوسرے کاموں کے لیے دوسرے ملازم تھے۔ بارہ بجے اُس کو پھر اسکول جانا پڑتا تھا۔ بچوں کو لے آنے میں چندرلا کا کام اتنا ہی تھا کہ وہ بچوں کے بستے، ناشتہ دان اور تھرماس سنبھال لے۔ ایک بجے کے بعد وہ کانتی کے پاس پہنچ جاتی جہاں سورج ڈھلنے تک اُسے وہ تمام کام ختم کرنے پڑتے تھے جو پہلے وہ سارے دن میں ختم کرتی تھی۔ اُسے کانتی کی خباثت پر غصہ ضرور آتا تھا کیونکہ کام وہی تھا مگر تنخواہ آدھی رہ گئی تھی۔ تاہم ڈھائی سو روپے اتنے کم نہیں تھے کہ چندرلا کام کرنے سے انکار کر دیتی۔ خصوصاً ان حالات میں کہ ایک بجے سے پہلے اُس کے پاس کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ چندرلا نے جب سے ہوش سنبھالا تھا ایک کمرے کے اسی چھوٹے سے گھر میں مقیم تھی جو اُس کے والدین نے چھوڑا تھا۔ اُن کے مرنے کے بعد بھائی نے شادی کرلی تو چندرا کی چارپائی برآمدے میں ڈال دی گئی اور چندرا کی اپنی بھابی سے روایتی قسم کی خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ بحیثیت منصف بھائی ہمیشہ بیوی کے حق میں فیصلہ دیتا تھا اور چندرا کے لیے حالات سخت سے سخت تر ہوتے جا رہے تھے مگر وہ وہیں رہ کے ذلیل ہونے پر مجبور تھی۔ دو ماہ کی خدمت گزاری کے بعد سردارنی چندرا پر اتنی مہربان ہوئی کہ اُسے رہنے کے لیے اسٹور روم دے دیا۔ چندرا کا بھائی اُس کی خودمختاری پر بہت لال پیلا ہوا اور کبھی دوبارہ اُس کی شکل نہ دیکھنے کی دھمکی بھی دی لیکن چندرلا نے پروا نہ کی۔ تعلق پہلے کون سا مضبوط تھا کہ اُسے چھوٹ جانے کا رنج ہوتا۔ من پہلے تین میل دور اُس سے ملنے آتا تھا لیکن اب وہ خود من کے قریب ایک گھر میں تھی۔

O

ایک روز شام کے وقت چندرلا گھر میں اکیلی تھی کیونکہ کانتی ایک بڑے ڈاکٹر کے پاس گئی ہوئی تھی۔ چھوٹے ڈاکٹر

نے معدہ کے السر کا شبہ ظاہر کیا تھا اور چھ ماہ تک زیرِ علاج بھی رکھا لیکن کانتی کو افاقہ نہیں ہوا تھا۔ چھوٹے ڈاکٹروں کے مشورہ کے مطابق وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ کھاتی رہتی تھی کیونکہ خالی پیٹ رہنے سے السر کی تکلیف بڑھ جاتی تھی۔ چندرا حیران تھی کہ سارا دن الا بلا چرتے رہنے کے باوجود اُس کو بدہضمی کیوں نہیں ہوتی مگر بڑھیا کانتی کو قرار نہ تھا۔ وہ کہیں جم کر نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ بلا وجہ اِدھر سے اُدھر پھرتی رہتی تھی۔ یہاں کی چیز وہاں رکھتی تھی اور پورے گھر میں چکر لگاتی خواہ مخواہ کے کام نکالتی تھی چنانچہ اُس کو سب ہضم ہو جاتا تھا۔ اُس کا یہ گھر بھی لوگوں کے لیے آسیب زدہ مشہور تھا۔ جو بتلاتے تھے کہ پہلے اِسی جگہ کوتوالی تھی۔ ڈسٹرکٹ کورٹ کی نئی عمارت بن گئی تو یہ جگہ برسوں غیر آباد رہی اور ایک بارش میں ملبے کا ڈھیر ہو گئی۔ راجا جی نے اِس جگہ کو کوڑیوں کے مول خرید لیا اور اُس پر رانی کانتی کے لیے چھوٹا سا محل تعمیر کیا۔ کچھ لوگ یہ بھی بتلاتے تھے کہ کانتی دراصل راجا جی کی داشتہ تھی اور اپنی اصل بیوی کے ڈر سے اُنھوں نے کانتی کو الگ رکھا تھا۔ وہ بیوی راجا جی سے پہلے ہی بھگوان کو پیاری ہو گئی تھی اور معزولی کے بعد راجا جی اُس کے محل کو ایک ہندو ساہوکار کے ہاتھوں فروخت کر کے کانتی کے پاس آگئے تھے جو اب اِس حویلی میں بھٹکنے والی تنہا روح تھی۔ راجا جی بھی سال بھر میں بھگوان کو پیارے ہو گئے تھے۔

کانتی نے کہا تھا کہ شاید اُسے واپسی میں کچھ دیر ہو جائے کیونکہ بڑے ڈاکٹروں کے پاس باری آنے کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ کھانے کا وقت ہوا تو چندرا کو بھوک محسوس ہوئی۔ باورچی خانہ میں کھانے پینے کی بہت سی چیزیں موجود رہتی تھیں لیکن اتفاق سے اِس روز چندرا کو کچھ نہ ملا۔ باورچی خانہ کے چھوٹے فریج میں چھ کیلے اور چھ سیب رکھے ہوئے تھے مگر چندرا ایک بھی کھا لیتی تو کانتی کو فوراً پتہ چل جاتا اور چندرا کو جواب دہی کرنا پڑتی۔ ایک سیب یا ایک کیلے سے اُس کا پیٹ بھی کیا بھرتا۔ فریج میں ایک سیر دودھ بھی رکھا تھا لیکن چندرا یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ بلی نے فریج کھول کے دودھ پی لیا۔ اُس نے مایوس ہو کر فریج بند کر دیا پھر اُسے کھانے کے کمرے میں رکھے ہوئے اُس سے دگنے سائز کے فریج کا خیال آیا جسے کانتی نے نہ کبھی کھولا تھا اور نہ کبھی چندرا سے اُس کی صفائی کے لیے کہا تھا بلکہ ایک بار چندرا نے اُس کا سوئچ آن کر دیا تھا تو کانتی بہت ناراض ہوئی تھی کہ جب تک کسی کام کے لیے کہا نہ جائے وہ خود نہ کرے۔ اور سوئچ پھر آف کر دیا تھا۔ اُس کے بعد چندرا نے جب بھی دیکھی تو اُسے تار پلگ میں لگا ہوا نظر آیا مگر سوئچ بند ملا۔ اچانک اُس کا تجسس بیدار ہو گیا۔ جب اُس میں کچھ ہے ہی نہیں تو اُسے لگائے رکھنے کا کیا فائدہ؟ اور کانتی جیسی عورت نے کسی ضرورت کے بغیر اِتنا بڑا اور نیا فریج آخر کیوں خریدا؟۔ وہ تو گھر کی تمام غیر ضروری چیزوں کو بیچ بیچ کر ڈبہ کلنے لگاتی جا رہی تھی۔ جیسے یہ ساری دولت وہ ساتھ لے جائے گی۔ بہانہ یہ تھا کہ وظیفے کی رقم میں اب گزارا نہیں ہوتا لیکن چندرا کو معلوم تھا کہ اُس کا خرچ اب بھی بہت کم ہے۔

وہ کھانے کے کمرے کی طرف بڑھی اور بڑے فریج کا دروازہ کھولا۔ اُسے یہ دیکھ کر بہت حیرانی ہوئی کہ فریج میں کھانے پینے کی چیزوں کے سربند ڈبے بھرے ہوئے ہیں۔ ٹین کے یہ سب ڈبے ایک ہی سائز کے تھے اور اُن سب پر مختلف ناموں کے لیبل چسپاں تھے۔ یہ لیبل رنگین چھپے ہوئے تھے اور ہر ڈبے پر یہ لکھا ہوا تھا کہ اُس میں کیا ہے۔ ساتھ ہی اُس چیز کی رنگین تصویر بھی تھی اور یہ ڈبے بازار میں ملنے والے عام ڈبوں سے کسی طرح بھی مختلف نہیں تھے۔ چندرا کو اُردو پڑھنی آتی تھی۔ اُس نے ہر ڈبے پر لکھے ہوئے نام کو پڑھنا شروع کیا۔ سب ڈبے اِس طرح رکھے گئے تھے کہ دروازہ کھولتے ہی چھپے ہوئے حروف سامنے آ جاتے تھے۔ مربہ سیب، مربہ ہیڑ، مربہ گاجر۔ پھر جام جیلی اور چٹنی کے ڈبے اور ایسی ہی دوسری چیزیں۔ چندرا نے سیب کے مربے کے چھ ڈبے شمار کیے اور باقی ڈبوں کا حساب لگایا تو اُسے اندازہ ہوا کہ دس قسم کی چیزوں کے چھ چھ ڈبے موجود ہیں مگر یہ سب ڈبے ملے جلے۔ اُوپر نیچے کے شیلف میں الگ الگ رکھے ہوئے تھے۔ چندرا نے سوچا کہ اگر اِس وقت وہ سیب کے مربے کا ایک ڈبہ کھول کر کھا لے تو کانتی کو فوراً پتہ نہیں چل سکتا۔ وہ کون سا آتے ہی سارے ڈبوں کو شمار کرے گی۔ چندرا نے کبھی کانتی کو یہ چیزیں کھاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اُس کا مطلب یہ بھی نکالا جا سکتا تھا کہ کانتی یہ چیزیں چھپ چھپ کے کھاتی ہوگی تاکہ چندرا کو کچھ نہ دینا پڑے۔ کچھ مجبور ہو کے اور کچھ کانتی کے کمینے پن کا انتقام لینے کے لیے اُس نے سیب کے مربے کا ایک ڈبہ اُٹھا لیا۔ خلافِ توقع یہ ڈبہ اتنا بھاری ثابت ہوا کہ چندرا اُسے سنبھال نہ سکی اور ڈبہ اُس کے پاؤں کے قریب گرا۔ اگر ڈبہ پاؤں پر گرتا تو چندرا کا پاؤں یقیناً زخمی ہو جاتا۔ وہ سخت حیران ہوئی۔ سیب کا مربہ کتنا بھی کوٹ کوٹ کر بھرا جائے اتنا بھاری کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ ڈبہ تو ٹھوس فولاد کا

بنا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے فریج بند کر دیا۔ سیر بھر وزن کے ڈبے کو اُٹھا کے باورچی خانہ میں لائی اور اُسے کین اوپنر سے کھولا۔ اُوپر کے بند ٹین کو آدھا کاٹنے کے بعد چندرا نے ڈبہ کا ڈھکن اُٹھایا تو اُس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ڈبہ میں سیب کا مربہ نہیں تھا۔ ٹھوس سونے کے گول گول ٹکڑے تھے جن کا قطر ایک انچ کے قریب تھا۔ دیکھنے میں یہ بالکل سونے کی اشرفی لگتے تھے مگر اُن کے دونوں طرف کوئی عبارت یا کوئی نقش نہیں تھا۔ یہ خالص سونے کے ڈھلے ہوئے ٹکڑے تھے۔

اُس بھوک کا اب کہیں وجود نہ رہا تھا جس سے مجبور ہو کر چندرا نے اُن ڈبوں کو کھول کر دیکھنے کی غلطی یا جسارت کی تھی۔ حیرت سے زیادہ اب وہ خوف کے جذبات سے مغلوب تھی۔ اُس نے آدھے کٹے ہوئے ڈھکن کو دبا کر برابر کیا اور اس طرح فریج میں رکھ دیا کہ اس پر دوسرا ڈبہ آگیا اور نیچے والے ڈبے کا کٹا ہوا حصہ چھپ گیا۔ اُس کے باوجود وہ ڈرتی رہی کہ کہیں کانتی کو جو بہت چالاک عورت تھی پتہ نہ چل جائے۔ اور اس سے کچھ بعید نہ تھا کہ ڈبوں کو بھی اُس نے کسی خاص ترتیب سے رکھا ہو اور اس ترتیب میں فرق نظر آئے تو وہ فوراً سمجھ جائے کہ کسی نے اُن کو چھیڑا ہے۔ دوسرے ڈبوں کو اُٹھا کر وزن کا اندازہ کرنے سے چندرا سمجھ گئی تھی کہ اُن سب میں ایسا ہی سونا بھرا ہوا ہے۔ وہ اتنے ڈھیر سارے سونے کی لاگت کا اندازہ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ معزول راجا نے اس دولت کو حکومت سے چھپا رکھا تھا اور سونے کی ملکیت کی مقدار کے بارے میں قانون نافذ ہو جانے کے بعد کسی کو حکومت کے حوالے نہیں کیا۔ اُس نے اپنا خزانہ انتہائی چالاکی سے چھپایا تھا۔ اگر کوئی مخبری کر دیتا اور سرکاری اہل کار خانہ تلاشی کے وارنٹ لے کر آجائے تب بھی اُنھیں کچھ نہ ملتا۔ وہ الماریوں۔ تجوریوں اور صندوقوں کو کھولتے۔ دیواروں میں پوشیدہ خلا تلاش کرنے میں لگے رہتے یا ساری زمین کھود ڈالتے لیکن فریج کھول کر مربہ سیب اور مربہ مٹر کے ڈبے کبھی نہ کھولتے۔ راجا نے ایک چالاکی یہ بھی کی تھی کہ ڈبوں پر اپنے ہاتھ سے کچھ نہیں لکھا تھا یا تو اُس نے تھوڑی سی رقم لیبل چھپانے پر خرچ کر دی تھی یا بازار سے ڈبہ خرید کر اُن کے لیبل اُتار لیے تھے اور اُن ڈبوں پر چسپاں کر دیے تھے۔ چندرا اگر چاہتی تو اُن میں سے دو چار سونے کے ڈلے رکھ لیتی لیکن ایک تو اسے یقین تھا کہ اتنی احتیاط کرنے والوں نے ڈبے میں بھی گن کر سونے کے ڈلے بھرے ہوں گے اور جس دن بھی کانتی نے کھلے ڈبے کو دیکھ لیا وہ فوراً فرق معلوم کر لے گی اور چندرا کو پولیس کے حوالے کر دے گی۔ اُس گھر میں کانتی کے بعد چندرا ہی کا سب سے زیادہ عمل دخل تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ چندرا یہ سونا لے کر کیا کرتی۔ یہ کوئی نوٹ تو تھے نہیں کہ اُس کے کام آجاتے۔ سونے کا زیور بھی بیچا جا سکتا تھا یہاں تک کہ پرانی اشرفی بھی ضرورت کے وقت نکالی جا سکتی تھی مگر سونے کے اُن ٹکڑوں کی بناوٹ بالکل الگ تھی۔ وہ اُن کو بیچنے جاتی تو اس سوال کا کیا جواب دیتی کہ اُسے یہ سونا کہاں سے ملا۔ چوری کے اس مال کو بیچنا آسان نہیں تھا۔

چندرا کے اندازے کے مطابق ہر ٹکڑا ایک تولہ کا تھا لیکن ہر ڈبے میں کتنے ٹکڑے تھے۔ اس کا اندازہ مشکل تھا۔ ایک ڈبہ اگر ایک سیر کا بھی فرض کر لیا جائے تو اُس کا مطلب یہ تھا کہ فریج میں ڈیڑھ من کے قریب سونا رکھا ہوا تھا۔ چندرا کا سر گھوم گیا۔ اُس نے سونے کا ذکر ہمیشہ تولے ماشے کی زبان میں سُنا تھا۔ سیر چھٹانک اور من کے الفاظ میں نہیں۔ اُسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ایک تولہ سونے کا بھاؤ کیا ہے وہ ایک من کا حساب کیسے لگا سکتی تھی یا ڈیڑھ من کی مالیت کا اندازہ کس طرح کر سکتی تھی۔ کانتی کے واپس آنے تک وہ کھانے کے کمرے سے دُور باورچی خانہ میں چمگادڑ کی طرح چکر لگاتی رہی۔ کھانے کے کمرے سے اُس کو یوں خوف آنے لگا تھا جیسے وہاں کوئی بھوت چھپا بیٹھا ہو۔ واپس آنے کے بعد کانتی نے اُس کو دیکھا تو وہ سمجھی کہ چندرا کی طبیعت خراب ہے اور چندرا فوراً بھاگ کھڑی ہوئی۔ رات کو اُس نے مدن سے بات کی۔ مدن سردار جی کے گھر میں متعدد فرائض انجام دیتا تھا۔ مثلاً وہ چوکیدار تھا اور سیدھا گھر میں گھس آنے والوں کو روکنے کا ماہر تھا۔ سیلز مین ٹائپ کے لوگوں کو وہ زبان کی مار سے بھگا دیتا تھا اور چندے کے نام پر بھیک مانگنے والے فقیروں

کو ہاتھ کی مار سے۔ قریب المرگ شوفر اکثر بیمار رہتا تھا اور مدن اس کے فرائض بخوبی سنبھال لیتا تھا۔ ایسی ہی ڈرائیونگ کی عارضی ڈیوٹی دیتے دیتے وہ چندرا پر عاشق ہو گیا تھا۔ عاشقی اس کی فطرت میں شامل تھی۔ لیکن چندرا کے بارے میں اب وہ اس یقینی نتیجہ پر پہنچ چکا تھا کہ اس کا یہ انتخاب فائنل ہے۔ اس سے پہلے تمام آس پڑوس کی خادمائیں، دائیں اور آیائیں یا ان کی بیٹیاں کوارٹر فائنل اور زیادہ سے زیادہ سیمی فائنل تک پہنچنے میں کامیاب ہوئی تھیں۔ مدن گھر کے باہر تین میل دور رہتا تھا اور چھٹی کے بعد پیدل گھر جاتا تھا لیکن اس کے عشق صادق کا اندازہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ ہر رات وہ پھر تین میل مارچ کرکے اور دیوار پھاند کر چندرا سے ملنے آتا تھا اور آدھی رات کے بعد اسی جذبہ کے ساتھ مارچ کرتا واپس جاتا تھا لیکن صبح ڈیوٹی کے لیے دیر سے نہیں پہنچتا تھا۔ البتہ سردار جی اکثر اس کی گدی پر ہاتھ رسید کرکے کہتے تھے "سسوردا پتر۔ دن میں بھی اونگھتا ہے اور یہ تیری آنکھیں لال کیوں رہتی ہیں۔ بول؟"

مدن نے چندرا کی بات بڑے دھیان سے سنی۔ چندرا بہت نروس تھی اور اس نے خزانے کی دریافت کا واقعہ ٹوٹے پھوٹے بے ربط جملوں میں سنایا تھا۔ مدن بہت غور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ چندرا نے خواب بھی نہیں دیکھا ہے۔ وہ نشہ میں بھی نہیں ہے اور پاگل بھی نہیں ہوئی ہے لیکن اس نے سونے کی مقدار کے بارے میں شکوک و شبہات کا اظہار ضرور کیا "پاگل کی بچی۔ سونا ڈیڑھ من نہیں ہو سکتا۔ پتہ ہے اتنا سونا کتنی قیمت کا ہوتا ہے؟ کم سے کم پچاس لاکھ کا مگر تجھے تو لاکھ کا اندازہ بھی نہیں ہوگا۔؟"

"مجھے معلوم ہے۔" چندرا نے برا مانتے ہوئے کہا۔ "لاکھ میں سو سو والے سو نوٹ ہوتے ہیں۔"

مدن ہنسا۔ "سو نہیں بے وقوف پورے ہزار۔ اب تو خود ہی سوچ کہ ہر گڈی میں سو سو والے ہزار نوٹ اور پھر ایسی ہی پچاس گڈیاں ہوں تو یہ کتنی دولت ہوئی؟"

چندرا نے اس بے حساب رقم کا تصور کرنے کی بے سود کوشش کی مگر ایک لاکھ سے آگے کی سوچنا اس کو بالکل ایسا ہی لگتا تھا جیسے آسمان کی بلندی کے بارے میں سوچنا۔ آسمان سے آگے کیا ہے؟ یہ اس کی پرواز تخیل سے باہر تھا۔ اس رات وہ دونوں اپنا عشق بھول کر اس دولت کے بارے میں سوچتے رہے جس کا دسواں حصہ بھی پانچ لاکھ ہوتا تھا اور دسواں حصہ بھی پچاس ہزار بنتا تھا۔ اس ایک فیصد سے کانتی تباہ نہیں ہو سکتی تھی مگر پچاس ہزار سے ان کی زندگی بن سکتی تھی اور مستقبل سنور سکتا تھا۔ مدن کے ذہن میں پچاس ہزار منصوبے تھے جو پچاس ہزار کی رقم سے شروع کیے جا سکتے تھے لیکن سوال وہی تھا کہ یہ پچاس ہزار کیسے حاصل ہوں۔ اس نے چندرا کو خاموش رہنے کی تاکید کی اور کہا کہ وہ کوئی نہ کوئی ایسی صورت نکال لے گا جس سے کسی خرابی کے بغیر بگڑے کام بن جائیں۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ بڑھیا جو اپنی زندگی گزار چکی اتنے بڑے خزانے پر سانپ بن کے بیٹھی رہے اور ہم جن کے سامنے ابھی پوری زندگی کا مرحلہ ہے اسی مفلسی میں غلامی کرتے گزار دیں لیکن یہ جذبات سے نہیں عقل سے حل ہونے والا مسئلہ ہے جس میں جلد بازی سے فائدہ کی بجائے نقصان ہو سکتا ہے۔ چندرا کو مدن کی قابلیت میں کوئی شبہ نہیں تھا چنانچہ اسے یقین تھا کہ وہ کوئی نہ کوئی صورت ضرور نکالے گا۔ تین دن تک وہ معمول کے مطابق دونوں جگہ کام کرتی رہی۔ ہر شام کانتی کے گھر جاتے ہوئے اسے خوف ضرور محسوس ہوتا تھا کہ کہیں کانتی نے کھلا ہوا ڈبہ نہ دیکھ لیا ہو۔ اطمینان کی بات صرف یہ تھی کہ اس نے سونے کا ایک ٹکڑا بھی نہیں نکالا تھا کہ کانتی اس پر چوری کا الزام لگا سکتی۔ مدن نے یہ بھی سمجھایا تھا کہ خود کانتی بھی مجرم ہے۔ اس کے پولیس کے پاس جانے کا کوئی سوال نہیں۔ اب تو ہم اس راز سے واقف ہونے کے بعد اس کو افشائے راز کی دھمکی دے کر دبا سکتے ہیں۔

تین دن میں مدن نے اپنے پروگرام کو آخری شکل دے دی۔ سب سے پہلے تو اس نے چندرا سے کہا کہ فوری طور پر وہ کانتی کے گھر کا کام چھوڑ دے۔ یہ کوئی مشکل نہیں تھی۔ چندرا پورے کام کا آدھا معاوضہ ملنے کو بہانہ بنا سکتی تھی اور اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ سردار جی کے گھر کی آمدنی اس کے گزارے کو بہت تھی اور اس کے پاس رہنے کی جگہ بھی تھی۔ وہ فیصلہ کر چکے تھے کہ چھوٹے ٹکڑے کھانے، اترن پہننے اور احساس ذلت کے ساتھ جینے کا زمانہ ختم ہوا۔ آنے والا دور فخر و مسرت، خوشی اور خوشحالی کا ضامن ہے اور ان کی تقدیر بدلنے والی ہے۔

دوسری طرف ایک ہفتے تک مدن یہ سوچتا رہا کہ تقدیر کو بدلنے کے لیے کون سی تدبیر کارگر ہو سکتی ہے۔ ایک ہفتہ بعد مدن نے کانتی کو فون کیا۔ وہ دسویں

...تک پڑھا ہوا ذہین آدمی تھا جسے پورے اعتماد کے ساتھ بات کرنی آتی تھی۔

"دیکھیے مجھے رانی کانتی صاحبہ سے بات کرنی تھی۔" اُس نے آواز پہچاننے کے باوجود یوں بات شروع کی جیسے گھر کی خادمہ سے مخاطب ہو۔ "ذرا انھیں بتلا دیجیے۔"

"میں کانتی بول رہی ہوں۔" کانتی نے کچھ غرور بھرے لہجے میں کہا۔ بہت عرصے بعد کسی نے عزت اور احترام سے اُس کا نام لیا تھا۔ ورنہ آنجہانی راجا جی کے ٹکڑوں پر پلنے والے تمام مصاحب اور خوشامدی اُسے بھول چکے تھے اور کبھی بھولے سے بھی اُس کی خیریت پوچھنے نہیں آتے تھے۔

"رانی صاحبہ۔" مدن نے سنبھل سنبھل کے بولنا شروع کیا۔ "مجھے آپ سے ایک انتہائی اہم اور نازک مسئلے پر گفتگو کرنی تھی۔"

"پہلے یہ بتاؤ کہ تم کون ہو؟ اور کہاں سے بات کر رہے ہو؟" کانتی چوکنّی ہو گئی۔ آخر وہ کون ہو سکتا ہے جو اِس لہجے میں بات کرے اور پھر اہم نازک موضوع۔؟

"وہ میں ابھی عرض کرتا ہوں۔" مدن نے کہا۔ "پہلے یہ بتائیے کہ آپ کے آس پاس کوئی اور تو نہیں ہے؟ جو یہ گفتگو سُن رہا ہو؟"

کانتی کا تجسس بڑھ گیا۔ "ایسی ہی بات تھی تو تمھیں میرے پاس آجانا چاہیے تھا لیکن میرا تو خیال ہے فون پر ہر بات کی جا سکتی ہے۔"

"آپ کا ارشاد بجا لیکن رانی صاحبہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔" مدن عیاری سے بولا۔ "اور معاملہ کچھ ایسا ٹیڑھا ہے کہ میں فوراً آپ کے سامنے نہیں آسکتا۔"

رانی کا پیمانۂ صبر اب لبریز ہو گیا تھا اور اُسے کچھ خوف بھی محسوس ہو رہا تھا کیونکہ اُس کی چھٹی حس کہتی تھی دال میں کچھ کالا ہے لیکن وہ اُس کا اندازہ کرنے سے قاصر تھی۔

"میں سمجھی نہیں کہ تم معاملے کو اتنا پُراسرار کیوں بنا رہے ہو۔ جو کہنا ہے کہو۔ یہاں میرے سوا کوئی نہیں۔"

"رانی صاحبہ میرا تعلق ایک ایسے محکمے سے ہے جس کا کام ناجائز طور پر چھپی ہوئی دولت کا پتہ چلانا ہے۔" مدن نے اِس گفتگو کا ایک ایک لفظ احتیاط سے منتخب کیا تھا اور اپنے لہجے کی ریہرسل اسٹیج پر مکالمہ بولنے والے کی طرح کی تھی۔ "کچھ لوگ اُس کو کالا دھن بھی کہتے ہیں۔ جو اسمگلر ٹائپ کے لوگ کماتے ہیں۔ اُس کے علاوہ انکم ٹیکس سے بچائی ہوئی دولت اور اسی قسم کے دوسرے ناجائز اثاثے۔"

"میں ڈاگ شو میں اپنے کتّے کو لے گیا تھا اور وہاں سے پہلا انعام جیت لایا۔"
"تمھارے مریل کتّے کو پہلا انعام ملا؟"
"ہاں۔ ہوا یہ کہ میں کتّے کے پاس بیٹھا ہُوا چاپ کھا رہا تھا کہ میرے قریب سے جج صاحبان گزرے۔ میں نے جماہی لی اور ججوں نے پہلے انعام کا ربن میرے کالر پر پن کر دیا۔"

"یہ کیا بکواس ہے۔" کانتی نے برہمی سے کہا۔ "ایسی باتوں سے میرا کیا تعلق۔؟"

"تعلق ہے رانی صاحبہ۔" مدن نے سنجیدگی میں تھوڑے سے طنز کی آمیزش کرتے ہوئے کہا۔ "ہم سب بے ایمان تو نہیں ہیں لیکن خود کو سو فیصد ایمان دار کوئی نہیں کہہ سکتا۔ اس کے علاوہ آدمی کے سو دوست ہوں تو سو دشمن اور بدخواہ بھی ہوتے ہیں۔ کچھ سچے اور کچھ جھوٹے۔ آپ کے شوہر بڑے اچھے آدمی تھے لیکن اچھے آدمی بھی فرشتے تو نہیں ہوتے۔ کچھ لوگ اُن سے بھی حسد کرتے تھے اور اُنھوں نے محض دشمنی میں ایسی اطلاعات فراہم کی ہیں جن سے آپ کی عزت اور نیک نامی متاثر ہو سکتی ہے۔ بلکہ صاف بات کر دینا بہتر ہے کہ آپ قانونی چکروں میں پڑ سکتی ہیں۔"

"قانونی چکر؟" کانتی نے خوف زدہ ہو کے کہا۔ "تم اب بھی صاف بات نہیں کر رہے ہو۔ وہ کون بدخواہ ہیں اور انھوں نے کیا اطلاع دی ہے؟"

"رانی صاحبہ میں اُن کے نام بتانے سے قاصر ہوں۔" مدن بولا۔ "اسے میری پیشہ ورانہ مجبوری سمجھ لیجیے۔ اور ویسے تو مجھے خاموش ہی رہنا چاہیے تھا لیکن اُس سے آپ کی اور راجا جی کی عزت خاک میں مل جانے کا ڈر تھا۔ یہ میں تصور بھی نہیں کر سکتا کہ آپ پر دھوکا دہی کا کوئی مقدمہ قائم ہو اور آپ کو ایک عام مجرم کی طرح تماشائیوں کے سامنے عدالت کے کٹہرے میں لایا جائے چنانچہ میں نے مناسب سمجھا کہ پہلے آپ سے براہِ راست بات کر لوں۔ اُس میں زیادہ فائدہ تو آپ کا ہی ہے۔ اگر اِس فائدے میں سے تھوڑا سا اِس غریب سرکاری ملازم کو بھی مل جائے تو اچھا ہے۔ محکمے کے علم میں یہ بات لائی گئی ہے کہ آپ نے اپنے گھر میں سونے کی کثیر مقدار ناجائز طور پر ذخیرہ کر رکھی ہے۔ یہ اطلاع دینے والوں

نے کہا ہے کہ ابھی اُن کے نام صیغۂ راز میں رکھے جائیں لیکن اُن کی فراہم کردہ معلومات غلط ہوں تو وہ ہر سزا بھگتنے کے لیے تیار ہیں۔ اُن کے کہنے کے مطابق تو آپ کے پاس من ڈیڑھ من سونا ہے جو مجھے مبالغہ آمیز بات لگتی ہے لیکن کسی کے پاس سیر ڈیڑھ سیر سونا بھی ہو تو آپ جانتی ہیں کہ اُس کی سزا کیا ہے۔" کانتی ریسیور کو کانوں سے لگائے کھڑی تھی اور خوف سے لرزہ براندام تھی۔ اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ حاسد اور بدخواہ کون ہے جس نے یہ بھید پالیا ہے۔ "میرا خیال ہے کسی نے دشمنی میں یہ حرکت کی ہے۔" کانتی نے سنبھل کے کہا۔ "میرے گھر میں سونا کہاں؟ ہوتا تو راجا جی مجھے مرتے وقت ضرور بتا دیتے۔ میں تو وظیفے کی رقم سے بھی پورا نہیں کر پاتی اور گزر اوقات کے لیے اکثر مجھے گھر کا سامان بھی بیچنا پڑتا ہے۔ آپ کہتے ہیں من ڈیڑھ من سونا؟ آپ ان جھوٹے بدخواہوں کی بات پر بالکل اعتبار نہ کیجیے۔"

"بدقسمتی سے یہ لوگ بدخواہ ضرور ہیں لیکن حکومت کے اعلیٰ حکام کے نزدیک ناقابلِ اعتبار نہیں۔" مدن نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "کیونکہ حکومت نے دیگر ذرائع سے بھی کچھ تصدیق کی ہے۔ ابھی فائلوں میں خفیہ طور پر ضابطے کی کارروائی ہو رہی ہے مگر یہ لازمی بات ہے کہ زود یا بدیر اس پر عمل بھی ہوگا۔ میں تو اس سرکاری مشینری کا ایک بہت چھوٹا سا پرزہ ہوں۔ میرے لیے کارروائی کو ختم کرانا ناممکن ہے لیکن میں دوسری طرح سے آپ کی مدد کر سکتا ہوں اور یہ مفادِ باہمی کا تقاضا ہے کہ آپ میری تجویز کو غور سے سنیں اور قابلِ توجہ سمجھیں۔ بصورتِ دیگر وقت گزر جانے کے بعد میں آپ کی کوئی خدمت نہ کر سکوں گا۔ آپ کو یقیناً جیل ہو جائے گی۔"

"صاف کہو کہ تم مجھے بلیک میل کرنا چاہتے ہو۔" رانی نے ڈوبتے دل کے ساتھ کہا۔ جیل کا تصور بھی اُس کے لیے روح فرسا تھا۔

"رانی صاحبہ۔ بلیک میل تو بڑا گھٹیا سا لفظ ہے۔" مدن نے احتجاج کیا۔ "میں تو آپ کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ تھوڑا سا فائدہ مجھے بھی ہو جاتا لیکن آپ کو منظور نہیں تو نہ سہی۔ اتنا یاد رکھیے کہ بعد میں صرف آپ کا نقصان ہوگا اور اتنا زیادہ کہ آپ کو میری پیشکش کے ٹھکرانے کا احساس ہوگا۔ جذبات میں مشتعل ہو کے آدمی عقل سے کام نہیں لے سکتا ورنہ ایک دے کر سو بچائے جا سکتے ہوں تو یہ سودا ضرور کر لینا چاہیے۔"

"پہلے یہ بتاؤ کہ تم میری مدد کیسے کر سکتے ہو؟" کانتی نے پُرسکون ہوتے ہوئے کہا۔

"یہ میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں۔" مدن بولا۔ "زیادہ امکان یہ ہے کہ مجھے ہی تفتیش پر مامور کیا جائے گا اور میں رپورٹ دے دوں گا کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ شکایت کرنے والے بکواس کرتے ہیں اور رانی صاحبہ کے پاس اتنا سونا تو کیا پیتل بھی نہیں۔ میری رپورٹ کے بعد آپ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائیں گی۔ بدخواہ یہ سمجھیں گے کہ آپ کی رسائی بہت اُوپر تک ہے اور وہ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ بفرضِ محال پھر کبھی کسی نے ایسی رپورٹ کی تو اس پر غور ہی نہیں ہوگا۔ میں اپنے بارے میں اتنا بتا دوں کہ میں ایک پولیس افسر ہوں۔"

"اچھا پولیس افسر صاحب۔" کانتی نے کچھ دیر بعد کہا۔ "آپ کی مدد کا معاوضہ مجھے کیا دینا ہوگا؟"

"صرف پچاس ہزار۔" مدن نے کہا۔ "موازنہ آپ خود کر لیجیے کہ یہ رقم کتنی کم ہے۔"

"اور فرض کرو میں ابھی اینٹی کرپشن والوں کو خبر کر دوں؟" کانتی ہنسی۔ "انھوں نے تمھیں یہ معاوضہ قبول کرتے ہوئے پکڑ لیا تو پچاس ہزار کے ساتھ تمھاری نوکری بھی جائے گی اور تم اندر ہو جاؤ گے۔"

"میں نے ان سب امکانات کو ذہن میں رکھ کے بات کی تھی۔" مدن نے اطمینان سے کہا۔ "میرے مقابلے میں آپ کا نقصان بہت زیادہ ہوگا۔ مجھے کتنی جیل ہوگی؟ زیادہ سے زیادہ تین سال کی۔ رہائی پانے کے بعد میں کچھ بھی کر لوں گا۔ مجھے بہت سے کام آتے ہیں لیکن آپ کا سب کچھ چھن گیا تو آپ کیا کریں گی؟"

"میں یہ بھی کر سکتی ہوں کہ وہ سب سونا غائب کر دوں۔" کانتی بولی۔

مدن ہنسا۔ "آپ میرے اختیارات اور وسائل کا غلط اندازہ لگا رہی ہیں۔ میرے لیے اِسی وقت اپنے آدمی آپ کے گھر کی نگرانی کے لیے بھیج دینا کوئی مشکل نہیں۔ وہ آپ کو گھر میں سے ایک سوئی تک نہیں لے جانے دیں گے اور آپ سے ملنے جلنے والوں کو بھی روکیں گے۔ آپ کا ٹیلی فون تک ٹیپ کیا جا سکتا ہے۔"

کانتی نے محسوس کیا کہ وہ بری طرح پھنس گئی ہے اور اُس کے لیے فرار کے تمام راستے مسدود ہو گئے ہیں۔ اُس کے پاس سونے کا اتنا بڑا ذخیرہ تھا جس کے مقابلے میں پچاس ہزار کی رقم کچھ نہیں تھی۔ دوسری طرف تمام سونا ضبط ہو جانے کی صورت میں یقیناً اُس کا ہارٹ فیل ہو جاتا۔ وہ

اس پولیس انسپکٹر کی پیشکش کو قبول کر لینے کے لیے تیار ہو رہی تھی عموماً بلیک میل کرنے والے کبھی قناعت نہیں کرتے اور ان کے مطالبات کو ہمیشہ پورا کرنا پڑتا ہے لیکن یہاں صورتِ حال قدرے مختلف تھی۔ یہ پولیس افسر اس حد تک دیانت دار ضرور تھا کہ اس نے مستقبل کے تحفظ کی ضمانت فراہم کردی تھی۔ ایک بار یہ رپورٹ دینے کے بعد کہ کانتی کے خلاف شکایت کرنے والے جھوٹے ہیں وہ اپنی ہی رپورٹ کو کیسے غلط قرار دے سکتا تھا۔

"ہیلو" کانتی نے خاموشی کے طویل وقفہ کے بعد کہا۔ "مسٹر پولیس آفیسر۔ مجھے یہ معاوضہ ادا کرنا منظور ہے اب یہ بتاؤ کہ رقم تم کو کہاں اور کیسے ادا کی جائے؟"

"مجھے خوشی ہے کہ آپ نے سمجھداری سے کام لیا" مدن نے کہا "میرے لیے بھی ضروری ہے کہ میں احتیاط کے تقاضوں کو نظرانداز نہ کروں" پھر اس نے کانتی کو تفصیلی ہدایت دی کہ فلاں دن اتنے بجے وہ اپنے گھر سے روانہ ہوگی اور فلاں فلاں راستے سے گزرتی ہوئی فلاں مقام تک پہنچے گی جہاں ایک لٹے ہوئے ٹرک کا پرانا ڈھانچہ پڑا ہے اس ڈھانچے میں ڈرائیور کی سیٹ والے دروازے کی جانب تلاش کرنے پر اس کو ایک پرچہ ملے گا جس پر مزید ہدایات درج ہوں گی۔ ان ہدایات کو سمجھنے کے بعد وہ دوسرا راستہ اختیار کرے گی۔ یہ راستہ خاصا پیچیدہ ہوگا لیکن یہ ضروری ہے کہ وہ انہی راستوں سے گزرے تاکہ یہ دیکھا جا سکے کہ اس کی پرانی موریس گاڑی کے تعاقب میں کوئی دوسری گاڑی تو نہیں ہے جس میں پولیس والے سادہ کپڑے پہنے بیٹھے ہوں۔ منزلِ مقصود پر پہنچ کے وہ دروازے پر دستک دے گی۔ پہلے ایک بار۔ پھر مسلسل تین بار اور پھر پانچ مرتبہ جس سے اندازہ ہو جائے گا کہ دستک دینے والا کون ہے اور دروازہ کھل جائے گا۔ کانتی کو نقد رقم لانی ہوگی۔ سب نوٹ بڑے ہوں گے جن کے سیریل نمبر نہ ملتے ہوں۔ یہ ایسی باتیں تھیں جو مدن نے جاسوسی قسم کی فلموں کی کہانیوں میں دیکھی یا پڑھی تھیں۔

❁

اب وہ دونوں بڑی بے چینی سے کانتی کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ گاڑی کو گھنے جنگل جیسے باغ میں چھوڑ کر وہ دونوں سردار جی کے عالی شان گھر میں بیٹھے تھے کانتی کو اسی گھر میں پہنچنا تھا اور اس کے آنے میں اب بھی آدھا گھنٹہ باقی تھا۔ سردار جی اپنی سردارنی کے ساتھ مختصر دورے پر سنگاپور گئے ہوئے تھے۔ جہاں سردار جی کے بڑے بھائی کا بہت بڑا اسٹور تھا۔ جاتے وقت سردارنی نے گھر کی چابیاں چندرلا کو دے دی تھیں جس نے اپنی خدمت گزاری اور شرافت سے سب کا اعتماد حاصل کر لیا تھا۔ سردار جی کو یہ بھی علم تھا کہ چندرلا کا مدن سے معاشقہ چل رہا ہے لیکن جب سے ان کو سردارنی کی زبان سے معلوم ہوا تھا کہ وہ دونوں شادی کرنا چاہتے ہیں اور "شرافت" سے زندگی بسر کرنے کے خواہش مند ہیں ان کو کوئی اعتراض نہیں رہا تھا۔ اچھا ہے گھر کے دو نمک خوار گھر میں ہی یکجا ہو جائیں تاہم جاتے وقت وہ چندرلا کو مدن کے سلسلے میں اور مدن کو گاڑی کے ناجائز استعمال کے سلسلے میں سخت ہدایت دے گئے تھے۔

جب چندرلا باورچی خانہ میں سے چائے بنا کر لائی تو مدن فریج میں سے مختلف اشیا نوش فرمانے کے بعد ڈرائنگ روم میں ٹہل رہا تھا اور وہ سگریٹ پی رہا تھا جو مہمانوں کے لیے بکس میں میز پر رکھے رہتے تھے۔ یہی نہیں اس نے سردار جی کے بڑے لڑکے کا سوٹ بھی پہن لیا تھا جو امریکہ میں زیرِ تعلیم تھا۔ اس کی قمیص اور ٹائی کے ساتھ وہ چندرلا کو حیرت انگیز طور پر اسمارٹ لگا چندرلا خود بھی جب تک بھائی کے گھر میں تھی اور کانتی کی ملازم تھی اسے ہمیشہ اچھے اور فیشن ایبل کپڑے پہننے کی خواہش ہی رہی۔ سردارنی دولت مند ہونے کے علاوہ شوقین مزاج بھی تھی۔ جوان بیٹیوں کی ماں ہونے کے باوجود اس کے حسن کی دلکشی میں فرق نہیں آتا تھا۔ یہ حسن کچھ تو ورثہ میں ملا تھا اور کچھ سردارنی کی محنت سے قائم و دائم تھا۔ وہ اپنی خوراک اور دیگر معمولات کا خاص خیال رکھتی تھی چنانچہ اس کا بدن اپنی بیٹی سے زیادہ پرکشش اور متناسب تھا۔ بیٹی کچھ ہپی ٹائپ تھی چنانچہ اوٹ پٹانگ کپڑے پہنتی تھی جس میں اس کا چھپکلی جیسا سوکھا بدن اور بھی مضحکہ خیز لگتا تھا۔ پھر وہ میک اپ سے چڑتی تھی اور سردارنی کو اس کی حالت پر افسوس ہوتا تھا۔ "عورت کے لیے سب سے بڑا اثاثہ اس کا حسن ہے اور وہ مرد کو اپنی دلکشی کی زنجیر سے باندھ کر رکھ سکتی ہے ورنہ یہ مخلوق خوب سے خوب تر کی تلاش میں بھٹکنے لگتی ہے" وہ کہتی تھی۔ سردارنی اتنے اچھے کپڑے پہنتی تھی اور ایسے سلیقے کا میک اپ کرتی تھی کہ سردار جی آئے دن اس پر نئے سرے سے عاشق ہونے کا اعلان کرتے رہتے تھے۔ یہی سب کچھ انھوں نے چندرلا کو بھی سکھایا تھا جو بڑی ہونہار شاگرد ثابت ہوئی تھی اور شاید اسی لیے وہ مدن کو ہمیشہ کے واسطے اپنا اسیر بنانے میں کامیاب ہو گئی مدن کہتا تھا کہ وہ نوکرانی نہیں مالکن لگتی ہے۔

مدن کو ایک فیشن ایبل جوان کے رُوپ میں دیکھ کر چندرا نے خوشی سے ایک چیخ ماری ”ذرا دیکھ آئینے میں۔ کتنا اچھا لگ رہا ہے تو۔ ہمیشہ وہ ہی ایک پتلون اور قمیص پہنے پھرتا ہے۔ دل چاہتا ہے قمیص پتلون کے ساتھ تجھے بھی باہر پھینک دوں۔ آخر ایسے کپڑے کیوں نہیں پہنتا روز؟“

”پاگل کی بچی“ مدن نے قہقہہ مار کے کہا ”کہیں نوکر بھی ایسے کپڑے پہنتے ہیں؟ لیکن تو فکر مت کر بس اب چند روز کی بات اور ہے پھر ہم پچاس ہزار کے مالک ہوں گے اور یہاں سے چلے جائیں گے۔ اس رقم سے میں کوئی بزنس کروں گا۔ بہت بڑا بزنس جس میں مالک ایسے ہی سوٹ پہن کر کمروں میں بیٹھتے ہیں اور نوکروں کو کام کرتا دیکھتے رہتے ہیں۔ خود کچھ نہیں کرتے۔“

”یہ سب پیسہ تو نے کاروبار میں لگا دیا تو ہم رہیں گے کہاں؟“ چندرا فکرمند ہو کر بولی۔

مدن نے ایک اور قہقہہ مارا اور اپنے مستقبل کی شریکِ حیات کو ایک اور بے ضرر سی گالی دی ”رہیں گے ہم کرائے کے مکان میں۔ ایک سے ایک اچھا مکان کرائے پر مل جاتا ہے بعد میں کاروبار ترقی کرے گا تو اتنا منافع ہو گا کہ ہم اس سے بڑی کوٹھی بنوالیں گے۔“

”دیکھ مدن۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں یہ شیخ چلی کے خواب ہی نہ ہوں۔“ چندرا بولی ”ہو سکتا ہے وہ نہ آئے اور آئے تو اپنے ساتھ پولیس کو لے آئے۔“

”ہمارے لیے ڈرنے کی کون سی بات ہے؟“ مدن نے کہا ”ہم اپنے گھر میں ہیں۔ میرا مطلب ہے، یہاں چوری چھپے نہیں آئے ہیں۔ مالک خود ہمیں اس گھر کی چابیاں دے کر گئے ہیں۔ پھر بھی ہم احتیاط سے کام لیں گے۔ پانچ منٹ پہلے تو باہر جا کے چھپ جانا اور یہ دیکھنا کہ وہ کار میں اکیلی آئی ہے یا کسی کو ساتھ لے کر آئی ہے۔ ہو سکتا ہے پولیس والے دوسری گاڑی میں نہ آئیں۔ وہ بہت چالاک لوگ ہوتے ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ باہر کانتی کی گاڑی میں لیٹے رہیں اور ہماری ساری گفتگو سن لیں اور ریکارڈ کر لیں۔“

”لیکن تم تو اندر بات کرو گے تمہاری آواز باہر کیسے پہنچ سکتی ہے؟“ چندرا نے حیرانی سے کہا۔

”تو نہیں سمجھتی ان باتوں کو۔ ایک چیز ہوتی ہے ٹرانسمیٹر۔“ مدن نے اپنی عقل و دانش سے چندرا کو سخت مرعوب کرتے ہوئے کہا ”جو کبھی سگریٹ کے پیکٹ جتنا ہوتا ہے تو کبھی اس کمرے جتنا اور اس سے یہ ہوتا ہے کہ یہاں کی بات باہر

میرے چچا بڑے بااخلاق انسان ہیں۔
وہ ہمیشہ پڑوسیوں سے کچھ نہ کچھ مانگتے رہتے ہیں مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ پڑوسیوں کے کام نہیں آتے۔ کل کی بات ہے۔ وہ پڑوسن سے کہہ رہے تھے۔ اگر تم اپنے گھی سے مجھے آملیٹ بنا لینے دو تو میں اپنی کیتلی میں تمہیں چائے بنا لینے دوں گا۔

ریڈیو پر سُنی جا سکتی ہے۔ چھوٹا ہو تو پچاس گز تک اور بڑا ہو تو سینکڑوں میل دور جیسے ریڈیو پر ہم دہلی بمبئی یا لندن سنتے ہیں۔ کانتی یہ چیز بیگ میں چھپا کر لے آئی تو مجھے معلوم بھی نہ ہو گا اور باہر سب ریکارڈ ہو جائے گا۔“

”ایسے تو وہ بیگ میں پستول بھی چھپا کر لا سکتی ہے۔“ اپنے ہونے والے پتی مہاراج کے علم کا دل ہی دل میں اعتراف کرنے کے بعد چندرا نے بھی اپنی ذہانت کا ثبوت دیا۔

”ہاں لا سکتی ہے مگر لائے گی نہیں۔“ مدن نے ایک فلیٹ ہیٹ کو سر پر جما کے کہا۔ یہ بھی سردار جی کے بیٹے کا تھا۔ ”اس کا فائدہ کوئی نہیں۔ وہ سمجھتی ہے کہ معاملہ حکومت کے اعلیٰ حکام کی نظر میں ہے اور اسے صرف میں ہی بچا سکتا ہوں۔ پھر وہ مجھے کیوں مارے گی؟ ویسے میں اپنی حفاظت کے خیال سے غافل نہیں ہوں۔“ اس نے ایک پتلون کا پائنچہ اٹھا کے جراب میں سے اپنا اسلحہ برآمد کیا اور پھر وہیں چھپا دیا۔ جب اس نے دیکھا تو خوف سے چندرا کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ وہ ہنسا ”ڈرتی کیوں ہے پگلی۔ میں اس کو بلاوجہ استعمال نہیں کروں گا اور دیکھ کبھی کسی کے سامنے بھولے سے بھی اس کا ذکر نہ کرنا۔ اب یہ بتا کہ میں سردار جی کا نوکر لگتا ہوں یا پولیس افسر؟“

چندرا مسکرائی ”پولیس افسروں کا افسر۔ تجھے نوکر کون سمجھ سکتا ہے۔“

”اچھا اب کام کی بات سن۔“ مدن نے کہا ”اگر خطرے کی کوئی بات ہو تو مجھے فوراً سگنل دے دینا۔ ہم یہاں اسی کمرے میں ہوں گے۔ ساری کھڑکیاں بند ہیں میں اس پہلی کھڑکی کے پاس رہوں گا۔ مٹھی بھر ریت یا کنکر شیشے پر پھینک دینا میں فوراً سمجھ جاؤں گا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ پھر میں کوئی بات کیے بغیر پچھلی طرف سے غائب ہو جاؤں گا اور سوئمنگ پول پر تیرا انتظار کروں گا۔“

"اور اگر میرے ساتھ پولیس بھی آگئی تو؟"

"انہیں گھر کے اندر مجھ کو تلاش کرنے میں کچھ وقت تو لگے گا۔ جب تک وہ سوئمنگ پول تک پہنچیں گے، میں یہ لباس بدل کر اپنے اصل کپڑوں میں آجاؤں گا اور نہانا شروع کردوں گا۔ آدھی رات کے وقت نہانا کوئی جرم تو ہے نہیں اور ہمیں سردار جی نے تو منع کرکے نہیں گئے ہیں کہ سوئمنگ پول میں قدم مت رکھنا۔"

پانچ منٹ بعد چندرا باہر آگئی۔ چاندنی میں پیڑ ساکت و صامت کھڑے تھے۔ گہری خاموشی میں ہر طرف سے خطرہ اپنے وجود کا اعلان کرتا محسوس ہوتا تھا۔ چندرا نے پھر دل کو سمجھایا کہ خطرے کی کوئی بات ہی نہیں کیونکہ مدن نے بڑی عقل مندی سے اور دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے سب کچھ طے کیا ہے کانتی کچھ نہیں کرسکتی۔ کرے گی تو اپنا ہی نقصان کرے گی، ان کا کیا بگاڑے گی جنہوں نے ابھی تک کوئی جرم بھی نہیں کیا۔ اچانک اس کو سڑک پر ہیڈ لائٹس کی متوازی لکیریں دکھائی دیں۔ پھر کانتی کی دس سال پرانی اور جانی پہچانی مورس کار اندر داخل ہوئی جس کی کھڑکھڑاتی باڈی کا ہر حصہ خود گاڑی کی آمد کا اعلان کرتا تھا۔ گاڑی پورچ میں کھڑی ہوئی اور کانتی شیشے بند کرکے نیچے اتری۔ چندرا غور سے اس کو دیکھتی رہی مگر وہ بالکل پرسکون تھی اور ذرا بھی نروس نظر نہ آتی تھی۔ بظاہر اس کی گاڑی میں کوئی اور نہیں تھا اور کانتی نے پلٹ کر گیٹ کی طرف بھی نہیں دیکھا جس سے یہ اندازہ کیا جاسکتا کہ اس کو اپنے پیچھے آنے والی کسی گاڑی کا انتظار ہے۔ چندرا نے سانس روک کر رات کے سناٹے میں کسی گاڑی کے قریب آنے کی آواز سننے کی کوشش کی لیکن ہر طرف پھیلی ہوئی خاموشی میں ذرا بھی فرق محسوس نہیں ہوتا تھا۔ گیٹ سے باہر بھی سڑک دور دور تک خالی پڑی تھی۔ چندرا نے دبے پاؤں کار کے قریب جاکر اس کے بند شیشوں میں سے اندر جھانکا۔ دروازے مقفل نہیں تھے۔ دھڑکتے دل کے ساتھ پوری ہمت سے کام لیتے ہوئے اس نے ایک دروازے کو کھولا۔ احتیاط کے باوجود ایک ہلکا سا کھٹکا ہوا مگر یہ آواز کانتی کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی جو سیڑھیاں چڑھنے کے بعد دروازے پر دستک دے رہی تھی۔

چندرا بہت چوکس تھی اور جانتی تھی کہ کار کا دروازہ کھولنا خطرناک بھی ثابت ہوسکتا ہے۔ اگر اندر کوئی ہوتا تو اسے فوراً دبوچنے کی کوشش ضرور کرتا۔ اس امید میں کہ اپنی بے خبری کے باعث چندرا حلق سے آواز نکالے بغیر بے بس ہوجائے گی حالانکہ یہ ناممکن تھا۔ چندرا اپنے دفاع کے لیے تیار تھی۔ وہ دروازہ دھڑ سے مارتی اور بھاگ کھڑی ہوتی۔ حملہ آور کے باہر نکلنے سے پہلے وہ اپنی چیخ پکار سے مدن کو خبردار کرسکتی تھی کہ ایسی ویسی کوئی بات نہ کرے ورنہ پہلی باہر سننے والے موجود ہیں۔ چندرا کی ایک مٹھی میں ریت بھی تھی، جو حملہ آور کی آنکھوں میں پھینک کر وقتی طور پر اندھا بھی کیا جاسکتا تھا۔ دو چار منٹ کی اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر وہ غائب ہوسکتی تھی، اور خطرے کا سگنل دینے کے لیے ریت کی دوسری مٹھی شیشے پر پھینک کر مار سکتی تھی۔ لیکن کار میں کوئی بھی نہیں تھا۔ چندرا کو اس میں کوئی ٹیپ ریکارڈر یا ریڈیو جیسی چیز بھی نظر نہ آئی اور اس نے مطمئن ہوکر دروازے کو پھر بند کردیا اب اسے یقین آنے لگا تھا کہ رانی کانتی نے ان کی ہدایات پر دیانت داری سے عمل کیا ہے اور اب خطرے کا سگنل دینے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ کسی دوسری گاڑی کو یا تعاقب کرنے والوں کو آنا ہوتا تو اب تک ضرور آجاتے۔ کانتی اب گھر کے اندر داخل ہوچکی تھی لیکن چندرا نے چند منٹ اور انتظار کرنا مناسب سمجھا۔ اس کے دل کی دھڑکن اب معمول پر آرہی تھی۔

اسے وہ وقت یاد آیا جب زندگی میں پہلی بار اس نے خطرے کو موت کے روپ میں دیکھا تھا اور آج کئی برس بعد بھی وہ اس واقعے کا تصور کرتے ہوئے ڈرتی تھی۔ آنجہانی راجہ جی کام کے سلسلے چند روز کے لیے دہلی گئے تھے اور ان کی پہلی بیوی بھی ساتھ گئی تھی چنانچہ وہ چندرا کو بھی ہمراہ لے گئی تھی۔ یہ بات بعد میں معلوم ہوئی کہ دہلی میں راجہ صاحب کو کانتی سے ملنا تھا جس کو انہوں نے ایک سال پہلے سکریٹری کی حیثیت سے ملازم رکھا تھا لیکن چند ماہ بھی نہیں گزرے تھے کہ راجہ جی اور کانتی کے عشق کا راز فاش ہوگیا اور راجہ صاحب کی بیوی نے اس کو فوراً نوکری سے برخاست کردیا۔ وہ اس کے بعد بھی راجہ جی سے ملتی رہی کیونکہ وہ بہت چالاک عورت تھی اس سے پہلے دو شوہروں کو مار چکی تھی۔ پہلا تو ماں باپ کا پسند کیا ہوا کنگلا قسم کا لڑکا تھا جس کے پاس شرافت کے سوا کچھ نہیں تھا اگر وہ زندہ رہتا تو کانتی کو اس سے گلو خلاصی کے لیے نہ جانے کیا جتن کرنے پڑتے مگر پونا سے بمبئی جاتے ہوئے وہ چلتی گاڑی سے گر گیا۔ گاڑی کی رفتار اتنی زیادہ تھی کہ جب تک کسی مسافر نے زنجیر کھینچی تو گاڑی تین میل آگے جاچکی تھی۔ کسی نے یہ نہیں دیکھا تھا کہ وہ آدھی رات کے بعد دروازے میں کیوں جاکے کھڑا ہوا تھا۔ کانتی اوپر کی برتھ پر لیٹی ہوئی تھی اور باقی مسافر اگر سو نہیں رہے تھے تو اونگھ ضرور رہے تھے۔ کانتی کی چیخ پر وہ ہڑبڑا کر اٹھے۔ بعد میں یہ فرض کرلیا گیا کہ وہ گرمی کے باعث ہوا کھانے کے لیے دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ پھر اس کا پیر پھسلا یا کسی جھٹکے سے بھاری دروازہ بند ہوا تو اس کو پیچھے سے ٹکر لگی اور وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ کانتی کے کردار کو دیکھتے ہوئے چندرا بعض اوقات یہ سوچتی تھی کہ کانتی نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ اس نے دیکھا کہ دوسرے مسافر غافل سو رہے ہیں

اور اس کا شوہر دروازے میں کھڑا ہے۔ وہ خاموشی سے نیچے اتری اور اسے باہر دھکا دے کر پھر اوپر چڑھ گئی۔ چیخ اس نے اوپر پہنچنے کے بعد اطمینان سے ماری۔ کانتی نے دوسری شادی ایک ایسے شخص سے کی جو پچاس سال کی عمر میں خود کو پچیس سال کا نوجوان سمجھتا تھا لیکن اس کو پچاس بیماریاں لاحق تھیں جن سے وہ ستر سال کا نظر آتا تھا۔ وہ بدصورت اور بدمزاج بھی تھا اور اس کی پہلی بیوی مر چکی تھی لیکن کانتی کو اس میں دو خوبیاں نظر آئیں جو بڑے بڑے بانکے سجیلے جوانوں میں نہ تھیں۔ ایک یہ کہ وہ بہت دولت مند تھا اور دوسرے یہ کہ اس کی عمر کے دن بہت تھوڑے رہ گئے تھے۔ تیسری اضافی خوبی یہ تھی جس کا سارا کریڈٹ سابقہ بیوی کو جاتا تھا یعنی وہ بے اولاد تھا۔ چوتھی خوبی کا انکشاف کانتی پر شادی کے بعد ہوا یعنی یہ کہ وہ صاحبِ اولاد ہونے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا تھا۔ تین سال بعد بالآخر تمام بیماریوں نے مل کر اس کی جان لے لی۔ اگر کانتی کوشش کرتی تو اسے دہلی کے کسی بڑے ہسپتال میں داخل کرا دیتی یا اسے علاج کے لیے یورپ امریکہ لے جاتی۔ مگر شوہر کی بجائے اس نے شوہر کے امراض کی مدد کی اور اس کے لیے راہِ عدم کو مختصر کر دیا۔ اس وقت تک دوسرے شوہر کی آدھی دولت تو ویسے ہی کانتی کے قبضے میں آ چکی تھی۔ اس کے مرتے ہی کانتی نے سب کچھ سمیٹ لیا۔ بظاہر ایک سال سوگ منایا لیکن در پردہ عیاشی کی۔ پھر اس نے ساری جائداد وغیرہ بیچ کر مشہور کیا کہ وہ اپنا سب کچھ دان کر کے کاشی جا رہی ہے جہاں وہ اپنے شوہر کی یاد میں ایک مندر بنوائے گی اور باقی عمر وہیں گزارے گی، لیکن پانچ سال بعد وہ راجہ صاحب سے ملی تھی تو بنارس میں نہیں تھی۔ اس کی عمر چالیس سال ہو گئی تھی مگر وہ بیشتر مردوں کے نقطۂ نظر سے انتہائی حسین اور پرکشش تھی۔ دراصل اسے مردوں کے جذبات کو ہوا دینے اور انہیں عشوہ و غمزہ و ادا سے پاگل کر دینے کا فن آتا تھا۔ چنانچہ راجہ جی اس پر سو جان سے فریفتہ ہو گئے اور اگر پہلی بیوی کی مجبوری حائل نہ ہوتی تو وہ اس سے بیاہ بھی کر لیتے۔ تاہم کانتی نے راجہ جی کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا اور ان کی بیوی جلنے کڑھنے اور رونے پیٹنے کے باوجود کانتی کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔

دہلی پہنچنے کے تیسرے دن راجہ جی غائب ہو گئے جس ہوٹل میں وہ قیام پذیر تھے وہاں دوسرے دن ان کا پیغام موصول ہوا کہ وہ ریاست کے معاملات پر بات کرنے کے لیے برطانوی دور کے ایک ریذیڈنٹ سے بات کرنے کلکتہ جا رہے ہیں اور ایک ہفتہ بعد لوٹ آئیں گے۔ بے بس رانی صبر کے سوا کیا کر سکتی تھی لیکن اس نے اپنے دو بھائیوں کو فون کیا ان میں سے ایک ناگپور میں پولیس کا بہت اعلیٰ آفیسر تھا اور دوسرا وزارتِ خارجہ میں بہت اہم عہدے پر فائز تھا۔ کلکتہ کوئی چھوٹا شہر نہیں تھا مگر انہوں نے تیسرے دن راجہ کی بیوی اور اپنی بہن کو مطلع کیا کہ نہ تو برطانیہ سے کوئی ریاست کا سابق ریذیڈنٹ ہندوستان پہنچا ہے اور نہ راجہ صاحب کلکتہ میں ہیں۔ وہ کسی بڑے ہوٹل میں ہوتے تب بھی معلوم ہو جاتا لیکن پولیس نے چھوٹے ہوٹلوں کی خاک بھی چھان ماری۔ کئی افراد پر صورت شکل اور حلیہ کے باعث راجہ ہونے کا شک کیا گیا، لیکن تصدیق کرنے پر وہ دوسرے لوگ نکلے۔ پھر مخبر کی معرفت اطلاع ملی کہ راجہ صاحب کو مسوری کے "سیولائے ہوٹل" میں دیکھا گیا ہے۔ جہاں وہ اپنی بیوی کے ساتھ ٹھہرے تھے۔ اصل بیوی پر یہ روح فرسا خبر پا کے ہسٹریا کا دورہ پڑ گیا اور دو دن تک اس کی حالت دیوانوں جیسی رہی۔ اس دوران میں اپنے کمرے سے کئی فون کیے اور چندر رانی خود ان کو بستر پر پڑے آنسو بہاتے اور کانتی کو گالیاں دیتے سُنا۔

راجہ صاحب چھٹے دن ہی آ پہنچے لیکن حیرت انگیز بات یہ ہوئی کہ بیوی نے ان سے کچھ نہیں کہا اور ان کی کوئی لڑائی بھی نہیں ہوئی۔ وہ لوگ اسی روز واپس روانہ ہو گئے۔ راجہ جی اپنی گاڑی خود چلا رہے تھے۔ یہ لیفٹ ہینڈ ڈرائیو اور ایئر کنڈیشنڈ مرسڈیز انہوں نے چند مہینے پہلے ہی جرمنی سے منگوائی تھی اور اس

لطیف میمن

کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ جہاں بھی جاتے ہیں وہاں سے آرڈر لیے بغیر واپس نہیں آتے۔ پچھلے دنوں وہ ہمارے دفتر میں بھی آ موجود ہوئے۔ انہوں نے بڑے صاحب سے پوچھا۔ "آپ کو کسی نائب کی ضرورت ہے؟"

"جی نہیں!"

"اکاؤنٹنٹ کی؟"

"جی نہیں!"

"قاصد کی؟"

"جی نہیں!"

"کسی نہ کسی ملازم کی تو یقیناً ضرورت ہو گی؟"

"جی نہیں کسی کی ضرورت نہیں ہے"

کچھ دیر بعد لطیف میمن مسکراتے ہوئے باہر نکلے۔ وہ بڑے صاحب سے "نو ویکنسی" کے سائن بورڈ کا آرڈر لے آئے تھے۔

کے لیے حکومت نے ان کو خصوصی اجازت دی تھی۔ گاڑی شہر سے باہر نکل کے تھوڑی دور گئی تھی اور چھوٹی بڑی پہاڑیوں کے موڑ کاٹتی ویران میدانوں کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔ اچانک ان کو سڑک کے درمیان کچھ لوگ نظر آئے جو ہاتھوں میں ریوالور لیے کھڑے تھے اور گاڑی کو روکنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ ان لوگوں کے عزائم خطرناک ہیں۔ ان میں سے کسی کی صورت دکھائی نہ دیتی تھی کیونکہ انہوں نے منہ پر ڈھاٹے باندھ رکھے تھے۔

رانی نے چلا کر کہا کہ گاڑی روک لو۔ یہ ڈاکو ہیں۔ جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ دے کر جان بچا لینی چاہیے۔ مگر راجہ نے کہا کہ ڈاکوؤں کا کوئی بھروسہ نہیں، وہ مال لے کر بھی جان نہ بخشیں یا چندرا کو اغوا کر کے لے جائیں۔ اپنا نام سن کے چندرا نے دہشت سے چیخ ماری اور راجہ جی نے چیخ کر کہا کہ وہ سنبھل جائیں کیونکہ وہ روکنے کی بجائے گاڑی ان ڈاکوؤں کے اوپر سے گزارنے کو ترجیح دیں گے۔ کار کی رفتار کم ہوئی شاید ڈاکوؤں کو یہ تاثر دینا مقصود تھا کہ وہ تعمیل کر رہے ہیں۔ پھر طاقتور کار ایک جست لگا کے آگے بڑھی۔ چندرا کے ساتھ راجہ جی کی بیوی بھی نیچے جھک گئیں اور گاڑی کے اوپر یکے بعد دیگرے کئی فائر ہوئے لیکن صرف ایک گولی آگے والے دائیں جانب کے شیشے کو توڑتی ہوئی کار میں داخل ہوئی اور راجہ صاحب کی گردن میں پیوست ہو گئی۔ لیفٹ ہینڈ ڈرائیو کار میں راجہ جی کی بیوی سیدھی بیٹھی ہوتی تو یہ گولی سیدھی انہیں لگتی مگر وہ تقریباً ڈیش بورڈ کے نیچے تھیں اس لیے بچ گئیں۔ فائر سڑک پر سے اس وقت کیا گیا تھا جب کار حملہ آوروں کے بالکل سامنے سے گزر رہی تھی۔ وہ لوگ بروقت جست لگا کے ایک طرف ہو گئے تھے مگر کار سے ان کا فاصلہ چند فٹ بھی نہ تھا اور ان کا نشانہ خطا جانے کے امکانات بہت کم تھے۔ تیز رفتار گاڑی چند سیکنڈ میں بہت آگے نکل آئی تھی لیکن گولی لگتے ہی راجہ جی نے ایک دلخراش آواز نکالی تھی اور گاڑی بے قابو ہو گئی تھی۔ چندرا کو ان کی بیوی کی ہمت اور حاضر دماغی نے سخت متاثر کیا۔ شوہر کی چیخ سنتے ہی انہوں نے سر اٹھا کے دیکھا اور فوراً اسٹیئرنگ پکڑ لیا تھا۔ اگر راجہ جی ان پر نہ گرتے تو شاید وہ رفتار کم کرنے کے بعد گاڑی کو روکنے میں کامیاب ہو جاتیں۔ ان کی خوش قسمتی تھی کہ سامنے سے کوئی گاڑی نہیں آئی ورنہ سانپ کی طرح لہرا کر چلنے والی گاڑی سامنے سے اس کو ٹکر مارتی۔ اسٹیئرنگ تھام کر رکھنے سے گاڑی سیدھی چلنے لگی تھی لیکن راجہ جی بیوی پر گرے تو ان کے ہاتھ سے اسٹیئرنگ چھوٹ گیا۔ گاڑی ایک دم گھومی اور گندم کے کھیت میں اتر کر پچاس گز چلنے کے بعد ایک درخت سے ٹکرا کر رک گئی۔ چندرا پہلے ہی خوف سے بے ہوش ہو چکی تھی۔ ہوش آنے پر اسے معلوم ہوا کہ وہ خود تو معمولی زخمی ہوئی ہے۔ راجہ جی کی حالت خطرہ سے باہر ہے۔ گولی نے صرف گوشت کو ادھیڑا تھا۔ گردن کی ہڈی یا نرخرے کو نقصان نہیں پہنچا تھا لیکن راجہ صاحب کی بیوی دماغ کی چوٹ سے بے ہوش پڑی تھی۔ اور ڈاکٹروں نے ان کی زندگی کے بارے میں مایوسی کا اظہار کیا تھا۔ تیسرے دن وہ مر گئی اور راجہ جی ایک مہینے بعد صحت مند ہو کر ہسپتال سے رخصت ہو گئے۔

چندرا آج تک طے نہیں کر پائی تھی کہ یہ سب کیا تھا۔ کیا راجہ نے کانتی سے بیاہ کرنے کی خاطر بیوی کو راستہ سے ہٹانے کا انتظام کیا تھا؟ اور وہ کرائے کے قاتل تھے؟ یا صورتِ حال برعکس تھی؟ کہ بیوی نے شوہر کو بے وفائی کی سزا دینے اور اپنا انتقام لینے کی خاطر ان لوگوں کی خدمات حاصل کی تھیں؟ وہ کوئی بے وقوف اور کم ہمت عورت نہیں تھی اور اس کے بھائی بڑی اچھی پوزیشن میں تھے۔ ویسے بھی شکست خوردہ عورت انتقام لینے پر اتر آئے تو سب کچھ کر گزرتی ہے۔ راجہ کی بیوی جان بوجھ کے نیچے ہو گئی تھی یا یہ محض اتفاق تھا؟ اور راجہ جی اس لیے نہیں جھکے تھے کہ ان کو یقین تھا کہ گولی ان کی بیوی کو ہی لگے گی؟ یہ اور ایسے بہت سے سوالات کا جواب کوئی نہیں دے سکتا تھا اور اس امکان کو بھی خارج نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ واقعی ڈاکو ہیں اور قضا صرف راجہ صاحب کی بیوی کی آئی تھی۔ بہرصورت اس واردات یا حادثے نے کانتی کے لیے میدان کر دیا اور دنیا کی پرواہ کیے بغیر تین مہینے بعد کانتی نے راجہ سے شادی کر لی۔ راجہ کی ریاست تو پہلے ہی ختم ہو گئی تھی لیکن کانتی اپنے مخصوص حربے آزما کر شادی سے بہت پہلے راجہ سے ایک فرمائشی محل تعمیر کروا چکی تھی جو دراصل جدید قسم کی ایک کوٹھی تھی اور کنجوس راجہ نے اپنی محبوبہ دلنواز کی خاطر اس میں عیش و آرام کے تمام سامان فراہم کر دیے تھے۔ جب بیوی نہ رہی تو وہ اپنا سب کچھ بیچ کر کانتی کے پاس آ گئے۔ لوگ کہتے تھے کہ راجہ کو ریاست کے چھن جانے کا صدمہ ضرور تھا لیکن یہ کوئی جان لیوا روگ نہیں تھا۔ کانتی کے پاس آ کے وہ بیمار رہنے لگے اور کانتی نے ہر جگہ یہی کہا کہ ایک تو حکومت نے سب کچھ چھین لیا۔ پھر بھگوان نے جیون ساتھی لے لیا۔ گولی کا زخم باہر سے تو صرف مندمل ہو جانے والا زخم نظر آتا ہے مگر راجہ صاحب کو سانس اور گلے کی بہت سی بیماریاں لاحق ہو گئیں ہیں چنانچہ ان کا زندہ رہنا مشکل ہے، اور ہوا بھی یہی۔ یعنی شادی کو سال بھی پورا نہ ہوا تھا کہ کانتی تیسری بار بیوہ ہو گئی۔

⊙

نرملا نے ایک نظر میں تاڑ لیا تھا کہ کانتی کا ہینڈ بیگ بہت زیادہ پھولا ہوا ہے۔ یہ ہینڈ بیگ بھی خاصا بڑا تھا، چنانچہ

کانتی نے کندھے پر لٹکا رکھا تھا۔

"تو تم ہی میرے ہمدرد پولیس آفیسر ہو" کانتی نے ڈرائنگ روم میں آنے کے بعد کہا "نام کیا ہے تمہارا؟"

"اب آپ نے گھر دیکھ لیا ہے تو آپ سے نام چھپانا مشکل ہے" مدن نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ اور ناقدانہ نظروں سے کانتی کی صورت کا جائزہ لیتا رہا کہ وہ اداکاری کر رہی ہے یا واقعی پُرسکون ہے۔ اگر اس نے پولیس کو اطلاع دے کر سازش کا جال پھیلایا ہوتا تو وہ اتنی پُرسکون نہیں ہوسکتی تھی۔ اس کا جرم اس کے جذبات کی صورت میں چہرے سے ضرور عیاں ہوتا۔ سکون کی وجہ اس کا اعتماد بھی ہوسکتا تھا۔ اس نے خواہ مخواہ خود کو بڑھیا کہہ کر مشہور کر دیا تھا ورنہ وہ بینتالیس کی خاصی پُرکشش اور صحت مند عورت تھی۔ اس نے سفید ساڑھی باندھ رکھی تھی جس کے پلو کو شانے پر رکھنے کے لیے اس نے مور کی شکل کا ایک بروچ اپنے بلاؤز کے ساتھ پن کر دیا تھا۔ مدن نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا چنانچہ اس کا خیال تھا کہ تین بار بیوہ ہونے والی کوئی ساٹھ ستر سال کی بڑھیا ہی ہوگی لیکن کانتی کے سر کا تو ایک بال بھی سفید نہیں ہوا تھا۔ اور اس کے ہاتھوں کی اور چہرے کی جلد پر جھریوں کا کہیں وجود نہ تھا۔ وہ خاصا میک اپ بھی کر کے آئی تھی چنانچہ اس کے اعتماد کے دو ہی اسباب ہوسکتے تھے۔ ایک یہ کہ اسے اپنے حسن و شباب کی قوتِ تسخیر کا بخوبی اندازہ تھا اور وہ اپنے ہمدرد پولیس آفیسر کو نقد دولت کے بجائے دولتِ حسن سے خریدنے کا ارادہ کر کے آئی تھی۔ تین شوہروں کو وہ پہلے ہی اس دارِ فانی سے رخصت کر کے ان کا مال و متاع سمیٹ چکی تھی۔ اگر کوئی چوتھا شوہر پچاس ہزار لینے کی بجائے اپنے آپ کو کانتی کے حوالے کر دے تو یہ گھاٹے کا سودا نہیں۔ آخر پولیس میں بھی تو بے وقوف افسر ہوتے ہی ہیں۔ جو مالدار بھی ہوتے ہیں چنانچہ وہ اس وقت تک کانتی کا شوہر بن کے رہ سکتا ہے جب تک اس کو بھی قضا کا بلاوا نہ آجائے جیسے تین کو آئی ویسے ہی چوتھے کو بھی آسکتی ہے۔ چوتھی بار بیوہ ہو کر وہ پہلے سے زیادہ ہی امیر ہو جائے گی۔ مگر کانتی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اس مرتبہ اس کے ساتھ چال چلنے والی خود تقدیر

ہے۔ مدن اس کے دامِ حسن کا اسیر نہیں ہو سکتا تھا۔ مدن اس بات کے لیے بھی تیار تھا کہ کانتی رقم کی بجائے بیگ میں سے ریوالور نکالنے کی کوشش کرے تو اس کوشش کو قبل از وقت ناکام بنا دے، اور اگر وہ نوٹوں کی بجائے بیگ میں کاغذ بھر کے لائی ہے تو اسے وہ سزا دے جو اس کو تمام عمر یاد رہے۔

"میں تمہارے جواب کی منتظر ہوں اور تم ہو کہ مجھے گھورے جا رہے ہو۔" کانتی نے مسکرا کے کہا۔

مدن چونک پڑا۔ "میرا نام... شرما... کرم چند شرما ہے۔" مدن بولا۔ "دراصل میں لوگوں کی عقل پر حیران ہو رہا تھا۔ میں نے سنا تھا کہ رانی کانتی ایک بوڑھی عورت ہے۔ آپ میں تو بڑھاپے کے آثار دور دور تک نظر نہیں آتے۔ آپ سے زیادہ جوانی کا روپ کیا ہو گا؟"

کانتی اس خراجِ تحسین پر تھوڑا سا شرما کر مسکرائی۔ "مسٹر شرما! عہدہ کیا ہے آپ کا؟ یقیناً بہت بڑا ہو گا ورنہ اتنا شاندار اور اتنا بڑا گھر بنانا کسی چھوٹے افسر کے بس کی بات نہیں خواہ اس کی آمدنی اور تنخواہ کچھ بھی ہو۔ البتہ آپ اگر ایسے سودے کرتے رہتے ہیں جیسا آپ نے میرے ساتھ کیا تو الگ بات ہے۔"

"رانی صاحبہ! ہم غیر ضروری باتوں میں وقت ضائع کر رہے ہیں۔" مدن بولا۔ "آپ کو میرے اور میری آمدنی سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بتائیے آپ رقم لائی ہیں؟"

کانتی نے اقرار میں سر ہلایا۔ "پوری رقم میرے بیگ میں موجود ہے لیکن یہ رقم تمہارے حوالے کرنے سے پہلے میں اپنا اطمینان کر لینا چاہتی ہوں۔ ایک تو یہ کہ مجھے یہ ندرانہ پیش کرنے کے بعد کسی سے کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔"

"چونکہ آپ نے شریفانہ اور معقول رویہ اختیار کیا ہے۔" مدن بولا۔ "اس لیے میں بھی آپ سے شریفانہ وعدہ کر سکتا ہوں۔ اگر آپ کہیں تو بھگوان کی یا گیتا کی اور آپ کے اطمینان کی خاطر ہر طرح کی قسم کھا سکتا ہوں کہ اس کے بعد آپ تاحیات محفوظ رہیں گی۔ اگر آپ کو پھر بھی اعتبار نہیں تو میں کچھ اور نہیں کر سکتا۔ آپ کو اعتبار کرنا ہی ہو گا رانی صاحبہ! میرا ضامن کوئی نہیں ہو سکتا سوائے میرے ضمیر کے۔"

"ٹھیک ہے۔" کانتی بولی۔ "مگر مجھے یہ اطمینان بھی تو ہونا چاہیے کہ میں یہ جرمانہ صحیح آدمی کو ادا کر رہی ہوں۔"

"آپ کا مطلب ہے... کہ آپ میرا شناختی کارڈ وغیرہ دیکھنا چاہتی ہیں۔" مدن نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے افسوس ہے رانی صاحبہ کہ جیسے میں نے آپ پر اعتبار کیا کہ آپ کسی کو کچھ نہیں بتائیں گی اور کسی کو ساتھ نہیں لائیں گی۔ ایسے ہی آپ کو مجھ پر یقین کرنا ہو گا۔ ویسے بھی آپ کو یہاں کوئی اٹھا کے نہیں لایا ہے۔ میں بتا سکتا ہوں کہ میری آپ سے فون پر کیا گفتگو ہوئی تھی۔ پُرپیچ راستے میں آپ کو دو جگہ تحریری ہدایات ملی تھیں۔ اگرچہ وہ ہینڈ رائٹنگ میرا نہیں لیکن میں آپ کو ایک ایک لفظ بتا سکتا ہوں۔ میں نے بہت غور و خوض کے بعد وہ مضمون مرتب کیا تھا کسی تیسرے شخص کو یہ سب باتیں کیسے معلوم ہو سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ... اگر آپ یقین نہیں کریں گی تو کیا کریں گی پہلے سے آپ یہ رقم دے کر تو واپس جا نہیں سکتیں۔"

"تمہیں یقین ہے کہ اس میں رقم ہی ہے، بم نہیں ہے؟" کانتی ہنس کے بولی۔ "تم بہت چالاک آدمی ہو شرما! دوسرں کی مجبوری سے پوری طرح فائدہ اٹھانا جانتے ہو۔ یہ لو۔ رقم گن لو۔" اس نے اپنا ہینڈ بیگ اتار کے مدن کی طرف بڑھا دیا۔

مدن نے اپنی نگاہ کانتی پر رکھی اور ایک ہاتھ بڑھا کے بیگ لے لیا۔ بیگ کھولتے ہوئے بھی وہ ایک لمحے کے لیے غافل نہیں ہوا اور زپ کھینچ کر اسے میز پہ الٹ دیا۔ اس میں سو سو کے پرانے نوٹ تھے اور جس طرح سے ہر گڈی کو پن کیا گیا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ دس دس ہزار کی گڈی کسی بنک میں بنائی گئی ہے چنانچہ ان کو شمار کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ گڈی کی موٹائی بھی ظاہر کرتی تھی کہ اس میں سو نوٹ ہوں گے۔ دیکھنے کی بات صرف یہ تھی کہ کہیں درمیان میں کاغذ کے ٹکڑے تو نہیں یا سیریل نمبر والے نئے نوٹ تو شامل نہیں کیے گئے۔ وہ پانچ گڈیوں کے معائنے سے فارغ بھی نہیں ہوا تھا کہ یکلخت کانتی نے ہنسنا شروع کیا۔ مدن نے اسے حیرانی سے دیکھا کیونکہ وہ ہنسی کا سبب جاننے سے قاصر تھا۔ ادھر کانتی کی ہنسی تھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

"مسٹر پولیس آفیسر..." وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "کیا نام بتایا تھا تم نے؟ کرم چند شرما! مجھے معلوم ہے تم کون ہو۔ میں تمہاری اصلیت جانتی ہوں۔"

مدن پانچوں گڈیوں کو تسلی سے ایک ساتھ باندھ رہا تھا۔ اس کا ہاتھ ہی نہیں سانس بھی رک گیا اور ایک لمحے کے لیے تو اسے یوں لگا جیسے اس کے دل کی دھڑکن بھی رک گئی ہو۔ "تم... کیا مطلب ہے تمہارا... اصلیت سے...؟" وہ بولا۔

"تمہاری اصلیت یہ ہے شرما جی کہ تم دراصل مدن ہو۔" کانتی نے کہا۔ "میں تم کو پہلی نظر میں پہچان نہیں سکی تھی لیکن تمہاری صورت مجھے آشنا محسوس ہوئی تھی۔ اب مجھے یاد آ گیا ہے۔ تم کہیں معمولی حیثیت کے ملازم ہو۔ غالباً ڈرائیور۔"

"تم... تمہیں یہ سب کس نے بتایا ہے؟" مدن کے حلق سے
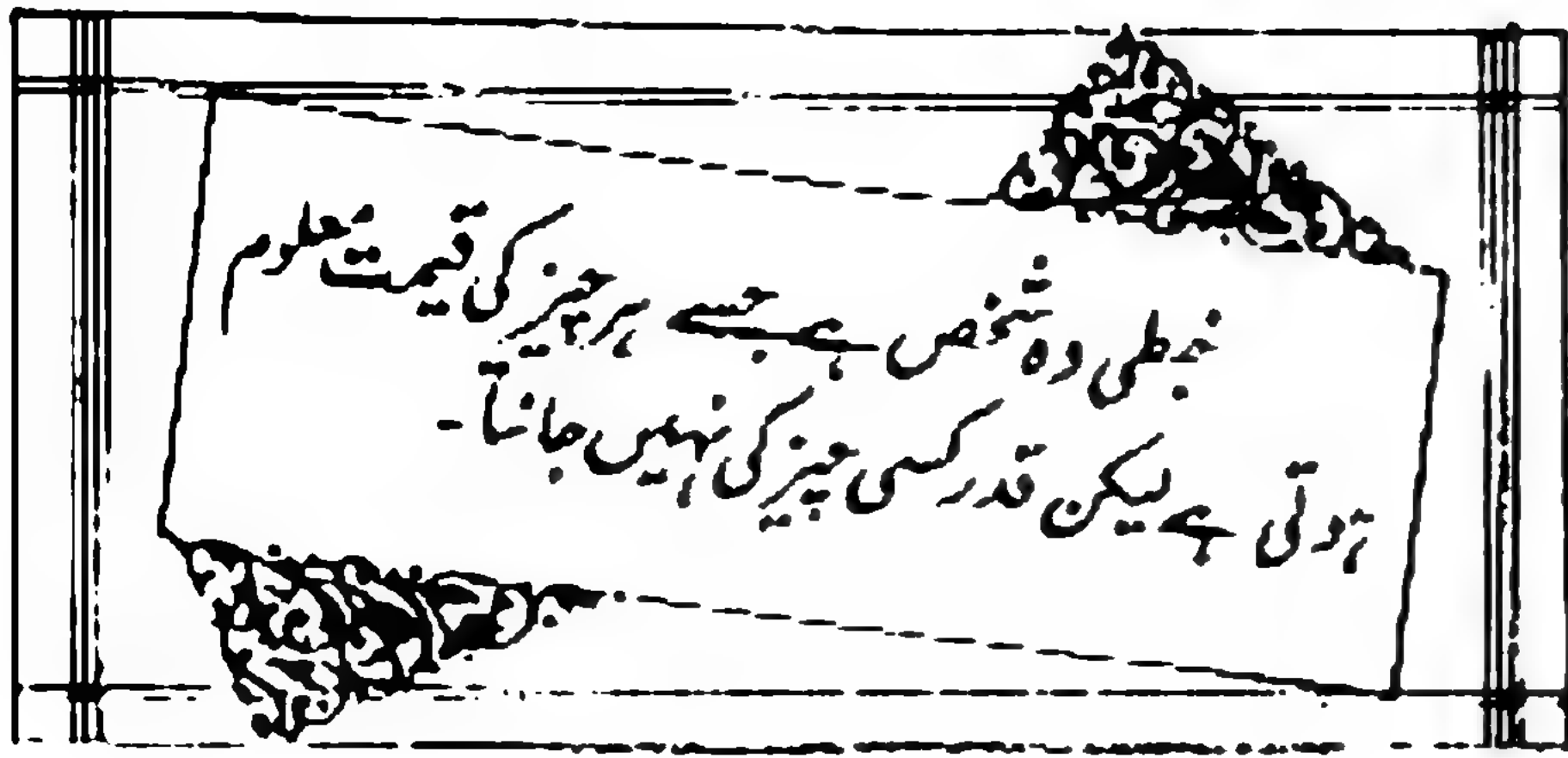
مری مری آواز نکلی۔

کانتی نے ایک اور قہقہہ مارا۔ "پہلے میرے پاس ایک لڑکی کام کرتی تھی... چندرا! تم اس سے ملنے آتے تھے۔ ایک دن میں باغ میں ٹہل رہی تھی کہ میں نے چھپ کر تمہاری باتیں سنی تھیں۔ چند قدم کے فاصلے سے۔"

خون مدن کی رگوں میں خشک ہونے لگا۔ اس کا اطمینان پانی کے بلبلے سے زیادہ ناپائدار اور عارضی ثابت ہوا تھا اور تحفظ کا وہ یقین جس کی بنیاد اس کی عقل و فراست سے بنائے ہوئے منصوبے پر تھی اس بلبلے کی طرح ختم ہو گیا تھا لیکن مدن اتنی جلدی اپنی شکست اور ناکامی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس نے سخت جدوجہد کے بعد اپنی حالت پر قابو پا لیا۔

"میرا خیال ہے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے رانی صاحبہ!" وہ مسکرا کے بولا۔ "میں کسی چندرا کو نہیں جانتا۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو مدن!" کانتی نے کہا۔ "تمہاری حالت اور تمہارا چہرہ تمہارے جھوٹ کے گواہ ہیں۔ میری غلط فہمی کا کوئی سوال نہیں۔ حقیقت تو اب میری سمجھ میں آئی ہے اس لڑکی نے میری غیر موجودگی میں میرا ایک راز دریافت کر لیا۔ مجھے گھر جا کے دیکھنا پڑے گا اور مجھے فوراً معلوم ہو جائے گا۔ خود اس میں ہمت نہیں تھی چنانچہ اس نے تمہیں ساری بات بتا دی اور تم نے مجھے فون کر دیا۔ یہ شریفانہ کپڑے پہن کر تم میری آنکھوں میں دھول جھونکنا چاہتے تھے۔ مجھے لوٹنا چاہتے تھے۔ بدمعاش!" اس نے اچانک جھپٹا مارا اور وہ بنڈل چھین لیا جو مدن کے ہاتھ میں تھا۔

مدن حیرت خوف اور صدمے سے منجمد کھڑا تھا اور بنڈل کو آخری گرہ دینی بھی بھول گیا تھا لیکن کانتی نے پچاس ہزار روپے اس سے واپس چھین لیے تو اسے یکلخت احساس ہوا کہ اب اداکاری کا وقت نہیں رہا اور خطرہ جسے وہ ٹالنا چاہتا تھا تلوار بن کے اس کے سر پر آ گیا ہے۔ اس کتے کی طرح جس کے سامنے سے کوئی دوسرا کتا ہڈی اٹھا لے وہ کانتی کی طرف لپکا۔ دوسرے لمحے پچاس ہزار واپس اس کے قبضے میں تھے لیکن کانتی اس پر آدم خور شیرنی کی طرح حملہ آور ہوئی۔ مدن اس کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ وہ ایک عورت سے مردانہ وار مقابلے کی توقع نہیں رکھتا تھا۔ اسے کانتی کی پھرتی نے بھی مہلت نہ دی۔ وہ پیچھے ہٹا، اور ایک چھوٹی سی میز کے حائل ہو جانے کے باعث الٹ کر گرا۔ کانتی پچاس ہزار کے نوٹوں کو دونوں ہاتھوں میں دبوچ کے اپنے سینے سے لگائے بھاگی۔ مدن اپنی چوٹ بھول کر اس کے پیچھے دوڑا اور ابھی وہ کمرے کے دروازے تک نہ پہنچ پائی تھی کہ مدن

خبطی وہ شخص ہے جسے ہر چیز کی قیمت معلوم ہوتی ہے لیکن قدر کسی چیز کی نہیں جانتا۔

نے اسے جا لیا۔ اس نے فرار ہوتی ہوئی کانتی کا ہاتھ پکڑ لیا لیکن کانتی نے اسے جھٹک دیا اور جست لگانے کی کوشش میں مدن منہ کے بل گرا۔ گرتے گرتے اس نے ایک ہاتھ بڑھایا اور اس کے ہاتھ میں کانتی کا جوتا آ گیا لیکن جھٹکے سے کانتی بھی نہ سنبھل سکی۔ نوٹوں کے بنڈل اس کی گرفت سے نکل گئے اور کانتی نے بے اختیار کسی سہارے کے لیے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے مگر اس کے آس پاس کچھ نہیں تھا۔ اس کا سر دروازے کی دہلیز سے ٹکرایا اور وہ وہیں گر گئی۔ مدن نے اس کو دانت پیس کر گالی دی اور ٹانگ پکڑ کے پیچھے گھسیٹ لیا۔ پھر اس نے ایک ایک کر کے تمام نوٹوں کو سمیٹا اور ایک گڈی کے نوٹ اکٹھے کیے جو کھل گئی تھی یہ نوٹ دروازے کے اردگرد دور دور تک پھیل گئے تھے۔ اطمینان کا سانس لے کر اس نے ساری رقم کانتی کے بیگ میں ڈالی اور بیگ کو ایک الماری کے اوپر رکھ دیا۔ اپنے کپڑوں اور بالوں کو درست کرنے کے بعد اس نے کانتی پر نگاہ ڈالی جو کھلے دروازے سے اندر آنے والی چاندنی کے روشن چوکھٹے میں پشت کے بل بے حس و حرکت لیٹی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ سر سے اوپر اور دوسرا دروازے کی جانب پھیلا ہوا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ مڑی ہوئی اور دوسری بالکل سیدھی تھی۔

مدن کو روشنی کے گل ہونے کا احساس اسی وقت ہو گیا تھا جب اس کے ساتھ ہی ٹیبل لیمپ بھی گر گیا تھا مگر اس کو دوسری لائٹ جلانے کی مہلت ہی نہ ملی تھی۔ چاند کی روشنی میں پڑی ہوئی کانتی کو دیکھ کر اسے یوں لگا جیسے اس کے سانس کا زیر و بم رک گیا ہے۔ اتنی جدوجہد اور مزاحمت کے بعد خود مدن کا سانس پھول گیا تھا لیکن کانتی کے سانس لینے کا پتہ بھی نہ چلتا تھا۔ ایک نامعلوم خطرے کی گھنٹی مدن کے ذہن میں یوں بجنے لگی کہ وہ جھک کر کانتی کو دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے کانتی کا ہاتھ تھام کے اس کی نبض ٹٹولی مگر نبض بھی ساکت تھی۔ مدن نے جھک کر اپنا سر کانتی کے سینے پر رکھ دیا اور کان لگا کر دل کی دھڑکن کی آواز سننے کی کوشش کی مگر اس کے شکوک اب یقین میں ڈھل گئے تھے۔ کانتی مر چکی تھی۔

نہ جانے کتنی دیر تک وہ گھٹنوں کے بل بے حس و حرکت بیٹھا رہا اور اسے چندرا کے اندر آنے کی بالکل خبر نہ ہوئی۔ جب

چندرا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ اچھل پڑا۔
"کیا بات ہے مدن؟" چندرا نے تشویش سے کہا۔ "کیا تو نے کانتی کو مار ڈالا ہے؟"
مدن اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں نے؟ نہیں ... میں نے اسے نہیں مارا۔ یہ ... یہ ساری رقم چھین کر بھاگ رہی تھی کہ دہلیز سے ٹکرا گئی۔ میرا خیال ہے سر کی چوٹ سے مر گئی۔ میں بھی دیکھ رہا تھا۔"
"لیکن اسے بھاگنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا تو نے ... وہ ..."
"نہیں چندرا! میں نے نہیں اس نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔" مدن نے صوفے پر گرتے ہوئے کہا۔ "کانتی مجھے پہچان گئی تھی۔ وہ میرا نام بھی جانتی تھی اور میرے تیرے تعلق سے بھی واقف تھی۔" اس نے کم سے کم الفاظ میں کمرے کے اندر ہونے والی تمام گفتگو اور جدوجہد بیان کر دی۔
"اب ... اب کیا ہوگا مدن! یہ تو قتل ہو گیا۔" چندرا نے کانپتے ہوئے کہا اور قالین پر بیٹھ گئی۔ اچانک اس نے یوں چیخ ماری جیسے فرش پر اسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔
"کیا ... کیا ہوا ہے چندرا؟" مدن نے بوکھلا کے اس کو سہارا دیا لیکن چندرا نے وہ بروچ اٹھا لیا تھا جس کی پن اس کو بیٹھتے وقت چبھی تھی۔ "یہ ... یہ کانتی کا بروچ ہے۔ شاید اس کش مکش میں الگ ہو گیا۔"
"ہاں۔" چندرا نے خفت سے کہا۔ "میں سمجھی کوئی جانور ہے۔"
"یہ سونے کا ہے۔" مدن نے بروچ کا معائنہ کرتے ہوئے کہا۔ "اور اس کے تاج میں ہیرے ہیں۔"
"ہاں۔ یہ کانتی کی ماں کی نشانی تھا۔" چندرا نے کہا۔ "اسے شادی کے وقت دیا تھا۔"
"کانتی کی ماں کے پاس اتنا قیمتی بروچ کہاں سے آیا؟ کیا وہ بھی رانی تھی؟" مدن نے بروچ جیب میں ڈال لیا۔
"کسی راجہ کی دین بھی تو ہو سکتا ہے۔" چندرا نے کہا۔ "بیٹی کو دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ماں اپنی جوانی میں کتنی خوبصورت ہوگی۔ مجھے معلوم نہیں اس نے کتنی شادیاں کی تھیں۔"
"ہمیں معلوم کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔" مدن نے کہا۔ "سوچنا تو یہ ہے کہ اب کانتی کا کیا کریں؟"
"کیوں نہ اسے گاڑی میں ڈال کر لے جائیں۔ اسی کی گاڑی میں۔" چندرا نے سوچ کر کہا۔ "اور گاڑی کو کہیں بھی سڑک پر چھوڑ دیں اور خود پیدل واپس آ جائیں۔"
"آدھی رات کے وقت آوارہ گردی کے الزام میں دھر لیے گئے تو سارا معاملہ چوپٹ ہو جائے گا۔" مدن نے کہا۔
انہوں نے لاش کو ٹھکانے لگانے کے بہت سے طریقوں پر غور کیا۔ اگر کانتی طبعی موت مرتی تو اس کی ارتھی کو شمشان بھومی لے جا کر ہی جلایا جاتا مگر اب اسے جلا کے راکھ کر دینے کی کوئی صورت نہ تھی۔ زمین میں گاڑنے کے لیے قبر کھودنی پڑتی تھی جو خاصا مشکل کام تھا اور اس میں وقت لگتا تھا۔ اگر کوئی دیکھ لیتا تو بات بنائے نہ بنتی۔ سب سے آسان طریقہ وہی تھا جو چندرا نے تجویز کیا تھا لیکن اس میں بھی ایک قباحت تھی۔ مدن جانتا تھا کہ جیسے ہی لاش ملے گی پولیس موت کے اسباب کا تعین کرے گی، اور انہیں معلوم ہو جائے گا کہ موت سر کی چوٹ کا نتیجہ ہے۔ گاڑی کو حادثہ پیش آتا تو یہ سمجھ لیا جاتا کہ چوٹ بھی حادثے میں آئی ہوگی لیکن حادثے کے آثار نہ ملے تو پولیس فوراً صحیح نتیجہ اخذ کرلے گی یعنی یہ کہ کسی نے کانتی کو مار کے گاڑی میں بٹھایا اور جائے واردات سے دور چھوڑ گیا۔ یہ بھی فوراً معلوم ہو جائے گا کہ وہ رانی کانتی ہے اور پولیس اس کے گھر سے تفتیش کا آغاز کرے گی تو کانتی سے تعلق رکھنے والوں کو ضرور بلائے گی۔ ان میں سر فہرست چندرا کا نام ہوگا جو ایک ہفتہ قبل تک کانتی کی ملازمہ تھی اور کئی سال تک اس کی خدمت کر چکی تھی۔ اپنے تفتیش کے طریقوں سے وہ بہت کچھ اگلوا لیں گے۔ چندرا بہرحال عورت ذات ہے۔ ناقص العقل، کمزور اور ناقابل اعتماد وہ اپنے ساتھ مدن کو بھی مروا دے گی۔ بہت سوچ بچار کے بعد مدن نے طے کیا کہ وہ کانتی کی لاش کو دریا میں ڈال دیں۔ پل پر سے رات کے وقت بھی اکا دکا گاڑیاں گزرتی رہتی ہیں۔ وسط میں ذرا سی دیر کے لیے رک کر لاش کو نیچے پھینکا جا سکتا ہے۔ پل پانی کی سطح سے اتنا اونچا ہے کہ لہروں کے شور میں لاش کے گرنے کی آواز کوئی نہ سن سکے گا اور صبح تک دریا کا بہاؤ لاش کو بہت دور لے جائے گا۔ وہ کار کو واپسی میں کانتی کے گھر پر چھوڑ دیں گے اور صبح اطمینان سے لوٹ آئیں گے۔ دریا کانتی کے گھر سے زیادہ دور نہیں ہے۔ تفتیش کے دوران پولیس چندرا کا بیان بھی لے گی۔ وہ کہہ سکتی ہے کہ رانی جی اکثر چاندنی رات میں دریا کی سیر کو جایا کرتی تھیں۔ کسی پرانی خادمہ کے بیان کو غلط کہنے والا کوئی نہ ہوگا۔ گھر میں سے کسی چیز کے چوری نہ ہونے کا یقین کر لینے کے بعد وہ اس کے سوا اور کیا سمجھیں گے کہ رانی اپنی عادت کے مطابق سیر کے لیے گئی اور کسی وجہ سے دریا میں گر گئی۔ اسے تیرنا نہیں آتا تھا اور اسے بچانے والا کوئی نہ تھا جو مدد کی پکار سن لیتا۔ سر کی چوٹ تو کسی پتھر پر سر لگنے سے بھی آ سکتی ہے۔
اتفاق رائے سے انہوں نے یہ بھی طے کیا کہ فی الحال دو چار دن تک وہ معمول کے مطابق الگ الگ رہیں گے اور

سردار جی کے لوٹتے ہی شادی کرکے ان سے اجازت چاہیں گے۔ کسی بھی بہانے۔ مثلاً یہ کہ وہ دہلی جا کے کوئی کام کرنا چاہتا ہے۔ اس نے جو تھوڑا بہت پیسہ بچایا ہے اس سے وہ رکشہ خریدے گا اور پھر ٹیکسی۔ اچانک غائب ہونے سے ان کی حیثیت مشتبہ ہو جاتی۔ ابھی وہ لاش کو اٹھا کے گاڑی میں ڈالنے کی سوچ ہی رہے تھے کہ باہر سے کسی کے کھانسنے کی آواز آئی۔ چندرا کا رنگ اڑ گیا لیکن مدن نے بڑی پھرتی دکھائی اس نے لاش کو گھسیٹ کر صوفے کے پیچھے ڈال دیا اور ٹیبل لیمپ کو سیدھا رکھ دیا۔ چندرا اتنی دیر میں اندر غائب ہو چکی تھی۔ مدن نے دروازے میں سردار جی کے بڈھے شوفر کو نمودار ہوتے دیکھا۔

"تم کاکا؟" مدن نے کوشش کی کہ اس کے لہجے سے کچھ ظاہر نہ ہو۔ "خیریت تو ہے؟"

"ہاں مدن! خیریت ہی ہے۔" وہ کھانستے کھانستے بولا۔ "دو دن سے یہ کم بخت کھانسی پیچھے لگ گئی ہے۔ اب کے سردار جی لوٹ کر آئیں تو میں کہوں گا میری چھٹی کریں۔ مجھ سے اب کام نہیں ہوتا۔ میرا بیٹا بھی کہتا ہے کیا ضرورت ہے آخر۔ میری جگہ تو یہ کام اچھی طرح سنبھال سکتا ہے۔" وہ اسی صوفے پر بیٹھ گیا جس کے پیچھے لاش پڑی تھی۔

"اس وقت کیسے آنا ہو گیا؟" مدن نے تھوڑی دیر بعد سوال کیا۔

"ایسے ہی۔ سردار جی کہہ گئے تھے جاتے ہوئے کہ گھر کا خیال رکھنا۔" وہ بولا۔ "میں ادھر سے گزر رہا تھا کہ باہر گاڑی دیکھی کون آیا ہے؟"

"گاڑی؟" مدن نے سخت حیرت کا اظہار کیا۔ "باہر کس کی گاڑی ہے؟ یہاں تو کوئی نہیں آیا۔"

"تو نے نہیں دیکھی؟" بوڑھا شوفر چکر میں پڑ گیا۔ "ایک پرانی چھکڑا مورس ہے۔" ڈرائیور ہونے کی وجہ سے وہ کاروں کے بارے میں یہ بھی بتا سکتا تھا کہ وہ کون سے سن کا ماڈل ہیں۔

وہ دونوں باہر آئے۔ بوڑھے ڈرائیور نے کار کو چاروں طرف سے گھوم پھر کے دیکھا۔

"قسم ہے واہگورو کی! ایسی چیز میں نے تو چلتی دیکھی نہیں۔ مگر ظاہر ہے چل کے ہی آئی ہوگی۔ مگر تو کہتا ہے کہ یہاں کوئی نہیں آیا۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "تو کتنی دیر سے ہے یہاں؟"

"میں... میں تو شام سے ہوں۔" مدن نے کہا۔ "لیکن میں اندر تھا۔"

"کمال ہے۔" بوڑھے شوفر نے سر ہلایا۔ "یہاں اس مصیبت کو کون چھوڑ گیا؟"

"میرا خیال ہے کسی کی گاڑی خراب ہو گئی۔ سڑک پر چھوڑنے کی بجائے اس نے گھر کے اندر کھڑا کر دیا۔" مدن نے وضاحت کی کوشش کی اور بھگوان کا شکر ادا کیا کہ گاڑی کے نمبر غیر واضح ہونے کے باعث اندھیرے میں پڑھے نہیں جاتے تھے۔ بوڑھے شوفر کی نگاہ نمبر کیسے نوٹ کر سکتی تھی۔ "صبح تک دیکھ لے۔ شاید کوئی مستری کو لے کر آجائے ورنہ پولیس کو رپورٹ کر دینا۔ کیا خبر یہ کیا معاملہ ہے۔ جس نے بھی گاڑی اندر چھوڑی اتنا نہیں کیا کہ گھر والوں کو بتا دیتا۔ کمال ہے بھئی! چندرا سے پوچھا تو نے؟ شاید اسے معلوم ہو۔"

"چندرا؟ وہ یہاں کہاں کاکا!" مدن معصومیت سے بولا۔

"دیکھ مدن! ہم سے استادی مت کر۔ میں نے آواز سنی تھی اس کی۔ اگر وہ تیرے ساتھ تھی تو چھپاتا کیوں ہے۔ شرم تو تم دونوں کو آتی نہیں ہے۔ نہ کوئی تجھے پوچھنے والا ہے نہ اسے۔ بھائی کو بھی چھوڑ آئی ہے۔ مگر میں کہتا ہوں اب بھی وقت ہے شادی کر لو۔ پاپ سے بچ جاؤ گے۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو دنیا کو کیا منہ دکھاؤ گے۔ جانتے سبھی ہیں۔" اس نے شفقت سے مدن کو ڈانٹنے اور سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"سردار جی کے آتے ہی ہم بیاہ کر رہے ہیں کاکا۔" مدن نے شرمندہ ہو کے کہا۔

بوڑھا شوفر اس سے بھی مطمئن نہ ہوا۔ اس نے خواہش ظاہر کی کہ چندرا گھر میں موجود ہے تو اس کے لیے ایک کپ گرم چائے ہی بنا دے اور جب چندرا نے اسے جلد از جلد رخصت کرنے کی نیت سے یہ فرمائش بھی پوری کر دی تو بھی وہ بیٹھا رہا اور چندرا کو شرمندہ کرتا رہا جو شادی سے پہلے اس طرح تنہائی میں غیر مردوں سے ملتی ہے۔ زمانے کو برا بھلا کہتا رہا کہ شرم و حیا نام کی کوئی چیز نظر نہیں آتی اور بار بار اپنی تشویش کا اظہار کرتا رہا کہ آخر یہ بے ہودہ گاڑی یہاں چھوڑ جانے کی بے ہودہ حرکت کرنے والا کون ہے۔ جب بالآخر وہ گیا تو رات کے دس بج چکے تھے۔

"یہ بڈھا خبیث کہاں سے ٹپک پڑا اس وقت۔" مدن نے سر کو تھام کے کہا۔ "اپنی بک بک سے اس نے میرا دماغ خراب کر دیا تھا۔ کچھ دیر اور نہ جاتا تو میں اس کو بھی قتل کر دیتا۔"

"ہوش سے کام لو مدن!" چندرا نے کہا۔ "ورنہ ہم مصیبت میں گرفتار ہو جائیں گے۔"

"میرا خیال ہے بڈھا کانتی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" مدن بولا۔ "اور جانتا بھی ہو گا تو وہی باتیں جو مشہور تھیں۔ اس نے کانتی کو یہاں آتے نہیں دیکھا نہ اسے یہ معلوم ہے کہ کانتی کے پاس کون سی گاڑی ہے۔ کل ہم اسے بتا دیں گے کہ جس کی گاڑی تھی وہ لے گیا۔ سردار جی کا دوست تھا جسے معلوم تھا کہ سردار جی سنگاپور گئے ہوئے ہیں چنانچہ اس نے کسی سے بات کرنی ضروری نہیں سمجھی۔"

"لیکن اس نے نمبر تو نوٹ کر لیا ہو گا۔ اور جب اخبار میں دیکھے گا۔۔۔"

"تیرا دماغ خراب ہے۔" مدن نے خفگی سے کہا۔ "وہ بڈھا کہاں پڑھتا ہے اور نمبر اس وقت مجھ سے نہیں پڑھا جاتا تھا تو اس نے خاک دیکھا ہو گا اور اسے صبح تک یاد رہے گا؟"

"اس کی نظر بہت تیز ہے مدن! میں نے دیکھا ہے۔" چندرا کی تشویش کم نہیں ہوئی تھی۔ "جب میں بچوں کے ساتھ سکول جاتی تھی تو میں بھی حیران ہوتی تھی کہ وہ ڈرائیونگ کیسے کرتا ہے۔ ایک بار میں نے اس سے پوچھا بھی تھا تو اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں گاجر بہت کھاتا ہوں۔ بچپن سے اب تک مجھے یہی شوق ہے اور میں نے سنا ہے کہ اس سے آنکھوں کو بہت فائدہ ہوتا ہے۔ اس نے مجھے بھی مشورہ دیا تھا۔"

"لعنت بھیج اس کے مشورے پر۔" مدن جھلا کے بولا۔ "اس کا اچانک آ جانا مجھے پریشان کر رہا ہے۔ کہیں تفتیش کے دوران میں پولیس کا اس سے رابطہ ہو گیا تو وہ گاڑی کو فوراً پہچان لے گا۔ مگر یہ ہے بہت مشکل تیری وجہ سے پولیس مجھ سے تو پوچھ گچھ کر سکتی ہے مگر اس بڈھے سے کیا پوچھے گی۔"

مدن نے سردار بشن سنگھ کی گاڑی کو باغ میں سے نکال کر واپس گیراج میں کھڑا کیا۔ چندرا اس کے ساتھ رہی کیونکہ وہ لاش کے ساتھ گھر میں اکیلی رہتے ہوئے ڈرتی تھی۔ پھر چندرا نے دروازوں کو مقفل کیا اور تمام لائٹس بجھائیں۔ مدن نے اتنی دیر میں کانتی کی لاش کو اس کی کار میں پچھلی سیٹ پر ڈالا اور لاش پر ساڑھی کا پلو پھیلا دیا۔ وہ گھر سے نکل کر ایک میل دور ہی گئے ہوں گے کہ ایک ٹریفک سارجنٹ نے ان کو رکنے کا اشارہ کیا۔ سارجنٹ کے پاس ڈبل سائلنسر والی بھاری موٹر سائیکل تھی چنانچہ فرار ہونا ناممکن تھا۔ پھر مدن نے سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی جیپ دیکھی۔ جیپ کے پاس چار کانسٹیبل کھڑے تھے۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ گاڑی کے کاغذات کہاں ہیں کس حد تک مکمل ہیں۔ ایسی صورت میں وہ اپنا ڈرائیونگ لائسنس تک نہیں دکھا سکتا تھا جو اس کی جیب میں تھا۔ چالان ہو جاتا تو اس کا نام پتہ اور گاڑی کا نمبر وغیرہ سب پولیس کے ریکارڈ پر آ جاتا۔ اس نے سنا تھا کہ یہ پولیس والے اسی طرح چھاپے مارتے ہیں۔ رشوت دے کر جان چھڑانے کے لیے مدن کی جیب میں سو روپے بھی نہیں

تھے۔ وہ پچاس ہزار تو سردار جی کے گھر میں ایک الماری کے اوپر رکھے رہ گئے تھے۔ جانتے بوجھتے اس نے اتنی بڑی رقم ساتھ رکھنے کا خطرہ مول نہیں لیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا پھیلنے لگا۔ اگر اسے جیل بھیج دیا گیا تو چندرا کا کیا بنے گا؟ اس لاش کا کیا ہوگا؟ اسے یوں لگا جیسے تقدیر اس پر خندہ زن ہے اور اس کی بے بسی کا مذاق اڑا رہی ہے لیکن اس نے حوصلہ نہیں ہارا۔ گاڑی روک کر اس نے شیشے نیچے کیے اور بڑی معصومیت کے ساتھ سارجنٹ سے پوچھا کہ بات کیا ہے؟

”کاغذات سمیت باہر تشریف لے آیئے۔“ سارجنٹ نے طنز آمیز شائستگی سے کہا۔

”دیکھیے جناب انسپکٹر صاحب!“ مدن نے متانت سے کہا۔ ”پیچھے میری والدہ لیٹی ہیں اور میں ان کو اسپتال لے جا رہا ہوں ان پر دل کا سخت دورہ پڑا ہے۔ چند منٹ کی تاخیر بھی مہلک ثابت ہو سکتی ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ واپسی میں آپ کو سب کاغذات دکھا دوں گا۔“

انسپکٹر شریف آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے ایک نظر پیچھے ڈالی۔ یہ فرض کیا کہ اگلی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے مرد عورت میاں بیوی ہیں ان کی صورت سے جو پریشانی عیاں ہے اس کا سبب بھی وہ ہی ہے جو مدن نے بیان کیا۔ ”ٹھیک ہے صاحب آپ جایئے۔“ اس نے ہاتھ ہلا کے کہا۔ ”واپسی میں ہم آپ کو کہاں ملیں گے۔“ اس نے مدن کو چھوڑ کر پیچھے آنے والی دوسری کار روک لی۔ مدن نے اتنی بڑی مصیبت کے ٹل جانے پر بھگوان کا شکر ادا کیا اور فوراً روانہ ہوگیا۔ دنیا واقعی کپڑوں کو دیکھتی ہے اگر اس نے سردار جی کے امریکہ سے آئے ہوئے لڑکے کا سوٹ نہ پہن رکھا ہوتا اور ٹائی نہ لگا رکھی ہوتی بلکہ اپنے ان ہی کپڑوں میں ہوتا جو اس نے تھوڑی دیر پہلے پہن رکھے تھے تو اس وقت جان چھڑانی مشکل ہو جاتی۔ کیسی عجیب بات ہے ماں تو ماں ہی ہوتی ہے اور اس کی جان بھی ہر بیٹے کو یکساں عزیز ہوتی ہے مگر دنیا کے لیے صرف اس شخص کی ماں کی زندگی اہم ہوتی ہے جو سوٹ بوٹ میں ہو۔ اگر میری جگہ یہ انسپکٹر ہوتا اور سچ مچ اپنی ماں کو ہسپتال لے جا رہا ہوتا تو کیا وہ کسی کے روکنے سے رکتا؟ کیا وہ قانون کے تقاضوں پر ماں کی زندگی قربان کر دیتا؟

جہاں سے دریا کا پل شروع ہوتا تھا وہاں دو سنتری ٹہل رہے تھے اور محصول چونگی والے بیٹھے تھے۔ وہ کسی کی طرف دیکھے بغیر کار کو آہستہ آہستہ چلاتا ہوا نکال لے گیا۔ پل ایک فرلانگ سے زیادہ لمبا تھا۔ لوہے کے سیاہ دیو پیکر شہتیر نصف صدی سے پل کو سہارا دیئے ہوئے تھے۔ نیچے دریا کا پانی چمک رہا تھا۔ بارشوں کے بعد دریا کا پاٹ پھیل گیا تھا اور اس کے بہاؤ کی رفتار بھی زیادہ ہوگئی تھی چنانچہ رات کے سناٹے میں وہ شور گونج رہا تھا جو موجوں کے دریا کی گہرائی میں اتر جانے والے پل کے ستونوں کے ساتھ پانی کے ٹکرانے کے ساتھ پیدا ہو رہا تھا۔ جھاگ اڑاتا پانی پل کے دوسری طرف پھر خاموشی سے بہتا جا رہا تھا۔ مدن نے فیصلہ کیا کہ وہ لاش کو دوسری طرف پھینکے گا تاکہ اس کے کسی ستون کے ساتھ اٹک جانے کا امکان نہ رہے مگر اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ پل عبور کرنے کے بعد آگے سے لوٹ کر آئے اور دوسرے کنارے پر گاڑی روکے۔ لاش اٹھا کر پوری سڑک عبور کرنا خطرناک کام تھا۔ اچانک نمودار ہو جانے والے کسی ٹرک، بس یا کار کی روشنی سیدھی اس پر پڑتی تو صاف نظر آ جاتا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ وہ کار کو سیدھا لے گیا اور پل سے ایک میل آگے جا کر واپس ہوا۔ چندرا نے اس حرکت کا سبب پوچھا تھا لیکن مدن شدید اعصابی کشیدگی کا شکار تھا۔ اس نے چندرا کو بری طرح جھڑک دیا کہ وہ بک بک نہ کرے۔ چندرا سہم کر خاموش ہوگئی۔

واپسی پر اس نے گاڑی کو پل کے عین درمیان میں کھڑا کر دیا۔ جلدی میں اس نے ہیڈ لائٹس آف کرنا بھی ضروری نہ سمجھا یہ زیادہ سے زیادہ دو منٹ کا کام تھا۔ وہ لاش کو اٹھانے والا ہی تھا کہ چندرا چلائی۔

”مدن! وہ بروچ کہاں ہے جو ساڑھی میں لگا ہوا تھا؟“ اس نے مدن کا ہاتھ تھام لیا۔

چارلی شادی کے کئی سال بعد اپنے ایک قدیم دوست کو گھر لے گیا۔ جونہی چارلی گھر میں داخل ہوا، بیوی نے بڑی محبت اور گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا۔

”تم بہت خوش قسمت ہو چارلی!“ قدیم دوست نے کہا۔ ”شادی کے کئی سال گزر جانے کے باوجود تمہاری بیوی تمہارا اس طرح خیر مقدم کرتی ہے جیسے دو چار روز پہلے ہی شادی ہوئی ہو۔“

”زیادہ خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ چارلی نے جواب دیا۔ ”میری بیوی اپنے کتے کو جلانے کے لیے کبھی کبھی یوں بھی مجھے خوش آمدید کہتی رہتی ہے۔“

"بروچ میری جیب میں ہے۔" مدن نے جھنجھلا کے کہا۔ "لے لینا بعد میں۔"

"نہیں مدن! وہ بروچ مجھے نہیں چاہیئے۔" چندرا نے عاجزی سے کہا۔ "ہمیں وہ پچاس ہزار کافی ہیں۔ وہ بروچ کانتی کی ماں کی نشانی تھا۔ اسے پھر لگا دو۔"

مدن اسے گالی دیتے دیتے رک گیا۔ کیونکہ چندرا کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اسے عورتوں کی یہ ہی جذباتی دیوانگی سخت ناگوار گزرتی تھی۔ بھلا مرنے والے کو ان چیزوں سے کیا فرق پڑتا ہے مگر یہ بحث کا وقت نہیں تھا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور وہ بروچ پھر اسی جگہ لگا دیا۔ اس طرح کہ ساڑھی کا پلو پھر بلاؤز کے ساتھ پن ہو گیا۔

"دیکھو نا مدن! تم نے جان بوجھ کر کانتی کو نہیں مارا۔ ہمارا ارادہ تو اسے قتل کرنے کا ہرگز نہیں تھا۔ ہم تو اس کا سارا سونا بھی اٹھا کے لے جا سکتے تھے لیکن ہم نے اتنی ہی رقم مانگی جتنی ہمیں ضرورت تھی اپنا گھر بسانے کے لیے۔ ہم نے گھر تو کسی کا نہیں اجاڑا اور کانتی نے بخوشی یہ رقم دینا منظور کر لیا تھا کیونکہ وہ اپنے جرم پر پردہ ڈالے رکھنا چاہتی تھی۔۔۔" چندرا بولتی رہی۔ احساسِ جرم سے بچنے اور اپنے ضمیر کو مطمئن رکھنے کے لیے جواز تلاش کرتی رہی اور بے بنیاد دلائل دیتی رہی مگر مدن اب کچھ نہیں سن رہا تھا وہ ایک ٹرک کے گزر جانے کا منتظر تھا۔ ٹرک کے نکلتے ہی اس نے لاش کو گھسیٹ کر دونوں ہاتھوں میں اٹھایا اور آہنی شہتیر تک لے گیا جس کی چوڑائی ایک فٹ کے قریب تھی۔ لاش کو شہتیر پر لٹا کر اس نے نیچے دیکھا وہ پل کے دو ستونوں کے وسط میں تھا اور لاش کے کسی ستون کے چبوترے پر گرنے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ذرا سا دھکیلنے سے کانتی کی لاش نیچے گر گئی۔ مدن کو ذرا سی دیر کے لیے چاندنی میں اس کا وجود کسی سفید سائے کی طرح تیرتا دکھائی دیا۔ اس کی سفید ساڑھی بادل کی طرح لہراتی نظر آئی۔ پھر وہ چمکتی ہوئی لہروں پر گری اور بہاؤ کے ساتھ ساتھ سفر کرنے لگی۔ وہ پلٹا ہی تھا کہ اس نے پل کے ایک سنتری کو دوڑ کر اپنی طرف آتے دیکھا۔ مدن کے پیروں کے نیچے زمین ہلنے لگی اور اس کا دل دھڑکنا بھول گیا۔

"آپ نے دیکھا جناب؟" سنتری نے چلا کر کہا۔ "ابھی ابھی کسی نے یہاں سے کود کر خودکشی کی ہے۔"

خودکشی کے نام پر مدن یکلخت سنبھل گیا۔ یہ زندہ رہنے کی جدوجہد تھی جسے آخری وقت تک جاری رکھنا ضروری تھا۔

"ہاں۔" مدن نے تھوک نگل کر خشک حلق کو تر کیا۔ "میں نے بھی یہ ہی دیکھ کر گاڑی روکی تھی۔"

"کیا دیکھا جناب؟" سنتری نے پل سے نیچے جھانکا "عورت تھی یا مرد تھا؟"

"مجھے کچھ صاف دکھائی نہیں دیا۔" مدن بولا۔ "مجھے تو یوں لگا تھا کہ جیسے کوئی شہتیر کے اوپر چڑھا ہوا ہے اور مجھے فوراً شبہ ہوا کہ کہیں دریا میں کود کر جان تو دینا نہیں چاہتا کاش میں اسے پکڑ سکتا۔ وہ تو میری گاڑی کے رکتے ہی کود گیا تھا اور جب میں نے دیکھا تو کچھ نہیں تھا۔"

"مگر میرا خیال ہے وہ عورت تھی۔" سنتری بولا۔ "غالباً سفید ساڑھی میں۔ ہوگی کوئی دکھیا بیوہ جسے سہارا دینے والا پرماتما ہی رہ گیا تھا۔ سہاگن ہوتی تو سفید ساڑھی کیوں باندھتی۔" سنتری نے لمبی سرد آہ بھری۔ "اس زمانے میں ڈوبنے والوں کو کوئی نہیں بچا سکتا۔ دریا میں طغیانی ہے۔ اب اس کی لاش ہی بہت آگے ملے گی۔"

"دنیا میں ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔" مدن نے افسوس سے سر ہلایا اور کار کی طرف بڑھا۔

"ایک منٹ جناب عالی!" سنتری نے کہا۔ "مجھے اس حادثہ کی رپورٹ دینی ہوگی آپ مجھے تھانے تک چھوڑ دیں۔"

"لیکن میں تو ادھر نہیں جا رہا ہوں۔" مدن نے پلٹ کر کہا۔

"آپ کو جانا پڑے گا جناب!" سنتری بولا۔ وہ مدن کے سوٹ اور اس کی شخصیت سے مرعوب ضرور تھا مگر اپنے اختیارات کو بھی سمجھتا تھا۔ "آپ بھی تو ایک چشم دید گواہ ہوں گے۔" اس نے پچھلا دروازہ کھولا اور اسی سیٹ پر بیٹھ گیا جہاں کچھ دیر پہلے کانتی کی لاش پڑی ہوئی تھی اور مدن نے اسی وقت سمجھ لیا کہ وہ بازی ہار گیا ہے۔

❁
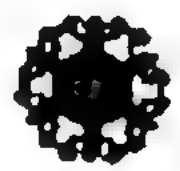
حالات اور واقعات نے مل کر اس کے خلاف ناقابلِ تردید شہادتوں کا جال بن دیا تھا۔ بات تھانے میں نام پتہ پوچھنے سے شروع ہوئی تھی جو اس نے غلط نہیں بتایا تھا بیان کے دوران میں ہی محرر نے پنسل سے سر کھجایا اور کچھ سوچا۔ "یہ تو غالباً سردار بشن سنگھ کی کوٹھی ہے۔ تم کیا لگتے ہو ان کے؟"

"میں ہ... میں ان کا..." آواز مدن کے حلق میں پھنس گئی۔ "میں ان کا نوکر ہوں۔"

یکلخت تھانے کے سارے عملے کا رویہ بدل گیا۔ محرر نے اسے گالی دی اور تھانے دار نے اس کے جھانپڑ رسید کیا۔ مدن کرسی سمیت لڑھک گیا۔ "سیدھا کھڑا ہو کتے کے بچے!"

> ممکن ہو سکے تو ساری زندگی شادی نہ کرنا لیکن اگر مجبور ہو ہی جاؤ تو کسی چھوٹے قد والی لڑکی کو اپنی بیوی بنانا ـــ اس طرح تمہیں لباس پر کم رقم خرچ کرنا پڑے گی۔
>
> مُراد علی افغانی لاہور

گورے صاحب کی اولاد! یہ کس کا سوٹ پہن کر پھر رہا ہے۔ گاڑی کس کی ہے؟ اور یہ لڑکی کہاں سے لایا تھا؟ عیاشی کر رہا تھا سالے!"
تھانیدار نے مکوں اور تھپڑوں سے اس کی تواضع کرتے ہوئے کہا۔ اور گرم گرم چائے مدن کے منہ پر پھینک دی جو اس نے کچھ دیر پہلے مدن کو ایک معزز آدمی سمجھ کے منگوائی تھی۔ مدن بے اختیار ہنس پڑا۔ پاگل کی بچی! کہتی تھی ہر روز ایسے کپڑے پہنا کرو۔ اسے چندرا کی بات یاد آگئی جسے وہ گھر چھوڑتا ہوا تھانے آیا تھا۔ مدن کی ہنسی نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور تھانے دار نے اسے تفتیش کرنے والوں کے سپرد کر دیا۔

مدن نے سب کچھ قبول کر لیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے لیے انکار کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ بعد میں سب سے پہلے سردار جی کے بوڑھے شوفر نے کار کو شناخت کیا اور اس کا نمبر بھی بتا دیا۔ اس کی نظر ہی نہیں حافظہ بھی قابل رشک تھا۔ پھر اسے ایک انسپکٹر نے پہچانا جس نے بغیر چیکنگ کے اسے جانے دیا تھا اور وہ بات بھی بتا دی جو مدن نے کہی تھی۔ مدن ان سب کو جھٹلا سکتا تھا مگر وہ پوسٹ مارٹم رپورٹ کو کیسے جھٹلا سکتا تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ رانی کانتی نے جو سفید ساڑھی پہن رکھی تھی اس پر سونے کا بنا ہوا مور جیسا بروچ لگا ہوا تھا جس کے تاج میں ہیرے جڑے گئے تھے لیکن یہ بروچ خود رانی نے نہیں لگایا تھا جس شخص نے بھی یہ بروچ لگایا تھا اس نے جلدی میں کپڑوں کے ساتھ جسم کی کھال کو بھی پن کر دیا تھا۔ چندرا نے تسلیم کر لیا کہ بروچ لگانے کے لیے اس نے ہی مدن کو مجبور کیا تھا۔ اس نے اپنے بیان میں یہ بھی بتا دیا تھا کہ رانی کانتی کے پاس کتنا سونا ہے اور کہاں ہے یہ سب کچھ اس نے مدن کے کہنے پر ہی بتایا تھا۔ ان دونوں نے اگر نہیں بتائی تھی تو صرف ایک بات یعنی یہ کہ وہ کانتی سے ۵۰ ہزار روپے وصول کر چکے ہیں انہوں نے کہا کہ افشائے راز کے بعد رانی کانتی ان سے سودا کرنے آئی تھی۔ واپس جاتے ہوئے اس کا پیر قالین میں الجھ گیا اور وہ دروازے کی دہلیز پر گری جس سے اس کے سر میں چوٹ آئی اور وہ مر گئی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں بھی موت کا یہ ہی سبب بتایا گیا تھا اور سردار جی کے گھر میں جس دروازے کی دہلیز سے کانتی کا سر لگا تھا اس پر نشان کے علاوہ کانتی کے چند بال بھی چپکے ہوئے ملے تھے چنانچہ یہ ثابت ہو گیا تھا کہ قتل غیر ارادی تھا اور بعد میں جو کچھ ہوا اس قتل پر پردہ ڈالنے کی احمقانہ کوشش تھی۔ اگر قتل نہ ہوتا تو وہ چھپاتے کیوں حادثاتی موت کی اطلاع تو پولیس کو دینی چاہیے تھی۔ مدن نے حادثے کے وقت چندرا کی موجودگی سے انکار کر دیا تھا لیکن یہ ثابت کرنے میں ناکام رہا تھا کہ موت حادثہ کا نتیجہ تھی جس میں اس کا کوئی دخل نہ تھا۔ وہ آخر تک اس موقف پر قائم رہا تھا کہ اس نے کانتی سے کچھ چھینا اور اس نے مزاحمت کی تھی اور اسی کش مکش کے دوران دروازے میں سر لگنے سے ہلاک ہو گئی تھی۔

شاید اس کی بات کی صداقت کو تسلیم نہ کیا جاتا مگر چندرا نے روتے روتے عدالت میں یہ سوال کیا کہ اگر ان کو لالچ ہوتا کیا وہ کانتی کو بتائے بغیر سونا نہیں لے سکتے تھے۔ انہوں نے تو یہ بات معلوم ہو جانے کے بعد حکومت کی اس امانت کو پھر اسی طرح رکھ دیا تھا اس میں سے سونے کا ایک سکہ تک نہیں نکالا تھا۔ ان کی ایمانداری کا ثبوت یوں ملا کہ جب ڈبے کھولے گئے تو ان سب میں سے ایک ایک تولے کے اسی ٹکڑے برآمد ہوئے اور جو ڈبہ چندرا نے کھول لیا تھا اس میں سے بھی اسی ہی ٹکڑے نکلے۔

قتل کے الزام میں عدالت نے مدن کو شک کا فائدہ دیتے ہوئے بری کر دیا لیکن حقائق کو قانون سے چھپانے شہادت کو ضائع کرنے اور غلط بیانی وغیرہ پر مدن کو تین سال کی سزا ہوئی۔ کانتی کا سارا خزانہ حکومت کی تحویل میں چلا گیا۔ چندرا اس لیے بچ گئی کہ اس کا ہر الزام بھی مدن نے اپنے سر لے لیا تھا۔ جب سرکاری گاڑی حوالاتی قیدیوں کے ساتھ اسے بھی جیل لے جانے کے لیے آ کھڑی ہوئی تو مدن نے دو منٹ کے لیے چندرا سے ملاقات کی اجازت مانگی۔ سو روپے کے عوض انہیں دو منٹ کی خلوت مل گئی۔

"تو نے مجھے بچا لیا۔" چندرا روتے روتے بولی۔ "اب میں اس دولت کو کیا کروں گی؟"

"اسے سنبھال کے رکھنا۔" مدن مسکرایا۔ "میں نے نہیں، تو نے مجھے بچا لیا ہے پاگل کی بچی! اگر تم نے ایک بھی سونے کا سکہ نکال لیا ہوتا تو یہ کیسے ثابت ہوتا کہ میں نے لالچ میں کانتی کو قتل نہیں کیا تھا مگر وہ اس سزا کی مستحق تھی۔ تین سال کچھ نہیں ہوتے۔ تو میرا انتظار کرے گی نا؟" چندرا نے روتے روتے مسکرا کے اقرار میں سر ہلایا۔ پھر گاڑی قیدیوں کو لے کر روانہ ہو گئی۔

ظفر اعجاز

لڑکی دُنیا میں تنہا ہو تو جہاں اسے دُوسری ضروریات کے لیے جدوجہد کرنا پڑتی ہے وہیں اپنی شادی کا بوجھ بھی اُٹھانا پڑتا ہے۔ ایک تنہا لڑکی کی رُوداد جس کا خیال تھا کہ اس کا شوہر اسے دھوکہ دے کر غائب ہو گیا ہے۔ سرورق کی دوسری تجسس آمیز کہانی

شیرازی نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ لڑکی اُس کا تعاقب کر رہی ہے اس لیے وہ دانستہ آہستہ چلنے لگا۔
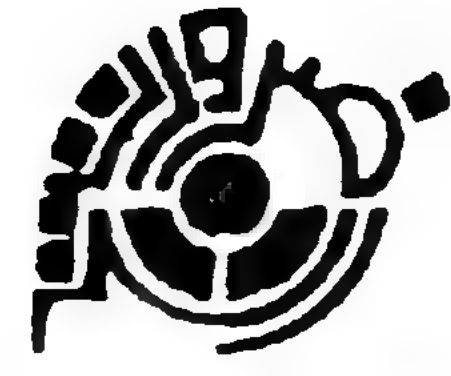
وہ نہ خوب صورت تھی نہ دل کش، نہ بدصورت۔ بس سادہ سا عام چہرہ تھا لیکن اس سادگی میں بلاشبہ کشش تھی، صورت شکل اور لباس سے وہ آوارہ بھی نہ لگتی تھی۔ اُس نے ایک بار بھی نظریں نہ ملائی تھیں۔ پریشان سی گھبرائی ہوئی سی اور بے چین سی ضرور لگتی تھی۔ شیرازی نے سڑک پار کی اور
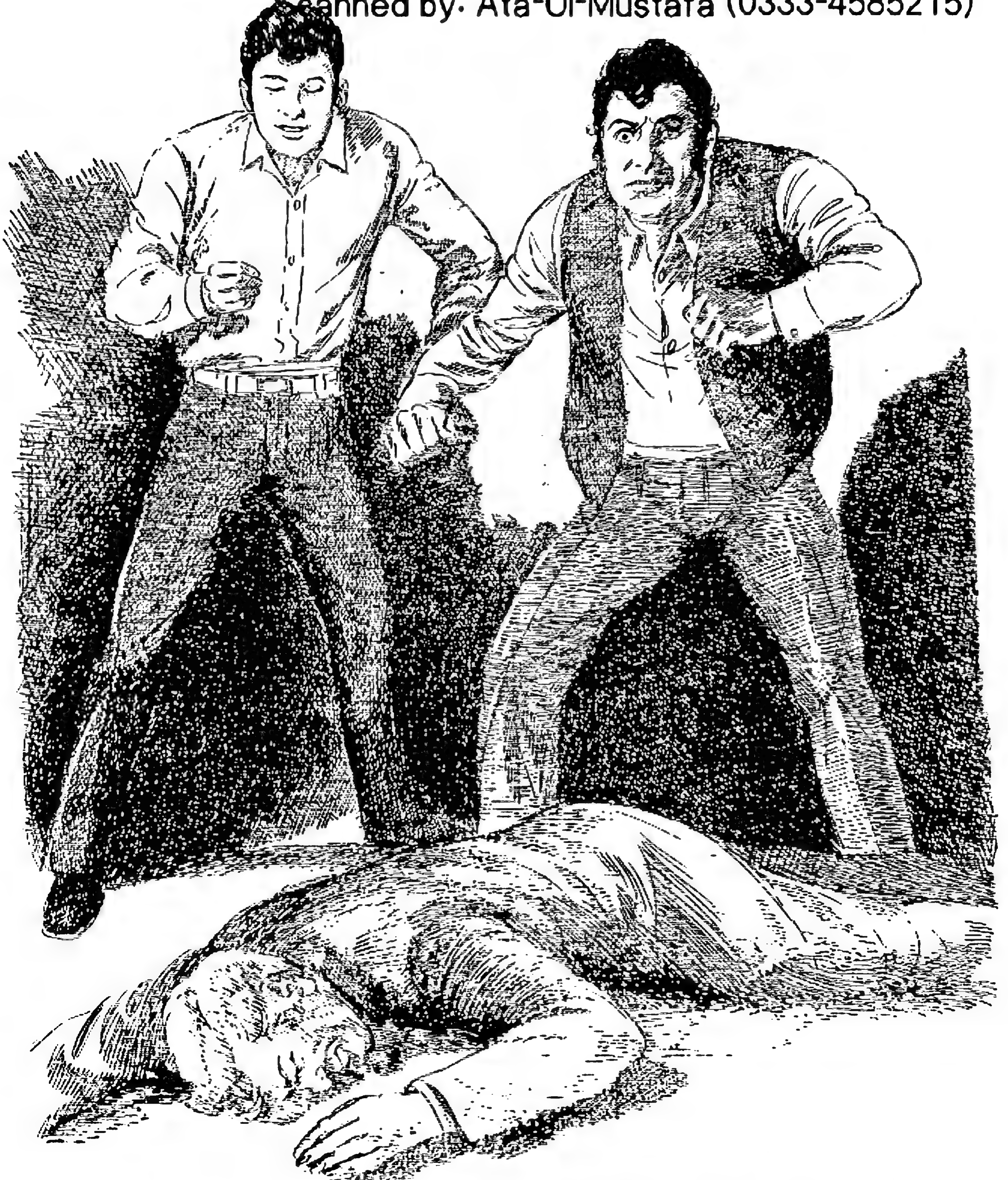
دو سے فٹ پاتھ پر ہو گیا۔ وہ ایک لمحے کے لیے رکی جیسے فیصلہ نہ کر پا رہی ہو، پھر اسی طرح چلتی رہی اب اُن کے درمیان سڑک حائل تھی لیکن وہ بار بار شیرازی کی سمت دیکھ کر دوسرے فٹ پاتھ پر چلتی رہی نیاز ٹیرس سے پہلے والے چوراہے پر پہنچ کر شیرازی نے کن انکھیوں سے دیکھا تو وہ تیزی سے سڑک پار کر رہی تھی۔ وہ حیران تھا کہ یہ کون ہے اور کیوں تعاقب کر رہی ہے۔

چند فرلانگ کے فاصلے پر پارک ویو اپارٹمنٹس تھے جہاں شیرازی کا فلیٹ تھا لیکن شیرازی کو اندر نہیں جانا تھا۔ فلیٹس کے گرد بنی ہوئی چہار دیواری کے باہر ایک قطار میں گیراج بنے ہوئے تھے، سب سے آخر میں اُس کا گیراج تھا۔ شیرازی نے دروازے کے سامنے رُک کر دیکھا، لڑکی کچھ فاصلے پر رُک گئی تھی، اُس نے گیٹ کھولا، اندر کھڑی ہوئی سیاہ رنگ کی مرسڈیز کار چمک رہی تھی، شیرازی اس کے حسن کی چمک دمک دیکھ کر مسکرا دیا۔ یہ کار اُس کے خصوصی آرڈر پہ تیار ہو کر آئی تھی اور آج پہلی بار وہ اس کار کو باہر لے کر جا رہا تھا۔

اُس نے اپنی بلیک بیوٹی کا دروازہ کھولا۔ آئینے میں اُس نے لڑکی کو گیراج کے اندر داخل ہوتے دیکھا۔ وہ خوفزدہ سی نظر آ رہی تھی لیکن کیوں؟

"معاف کیجیے گا"۔ لڑکی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

شیرازی نے اس طرح چونک کر دیکھا جیسے اُسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ "ہیلو۔ آپ مجھ سے معافی مانگ رہی ہیں؟"

"جی۔ آپ شیرازی صاحب ہیں نا؟" اُس نے بوکھلا کر پوچھا۔

"بے شک"۔ شیرازی نے کہا۔ "آپ کا خادم بلاشبہ شیرازی ہے لیکن آج تک کسی خوب صورت لڑکی نے مجھ سے معافی نہیں مانگی"۔

"شیرازی صاحب۔ کیا آپ میری مدد کریں گے؟ میں بڑی مصیبت میں ہوں"۔

"دیکھیے محترمہ۔ آپ کو یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے میں"۔

"پلیز۔ شیرازی صاحب انکار نہ کیجیے گا، میں کسی اور سے نہیں کہہ سکتی، میں آپ کو زیادہ معاوضہ بھی نہیں دے سکتی لیکن اگر آپ نے اُن کا سراغ لگا دیا تو میں شاید کچھ بہتر معاوضہ بھی دے سکوں"۔

"خوب... بہت خوب"۔ شیرازی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "محترمہ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو ہم یہ باتیں کسی ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر کر لیں؟"

وہ کوئی جواب دیے بغیر بلا تامل گاڑی میں بیٹھ گئی، شیرازی اُسے لے کر سیدھا کیفے ہوشربا پہنچا، چائے کا آرڈر دینے کے بعد اُس نے لڑکی کی سمت دیکھا جو بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی۔

"شروع ہو جائیے"۔

"جی۔؟" لڑکی نے چونک کر پوچھا۔

"اوہ۔ میرا مطلب ہے کون گم ہو گیا ہے؟ کیس کو تلاش کرنا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اور اگر کوئی حرج نہ ہو تو اپنا تعارف بھی کرا دیجیے"۔

پہلی بار اُس کے لبوں میں مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "میرا نام تابندہ ہے، شادی شدہ ہوں، شوہر کا نام ارشد ہے، بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ میں شادی شدہ ہوں اسی لیے میں کسی کو یہ بتلاتے ہوئے بھی شرم محسوس کرتی ہوں کہ مجھ پر کیا مصیبت آن پڑی ہے۔ کاش میں نے یہ حماقت نہ کی ہوتی"۔

"بے شک۔ شادی کسی حماقت سے کم نہیں"۔ شیرازی نے جلدی سے کہا۔

"میرا مطلب شادی سے نہیں تھا"۔ وہ گھبرا کر بولی۔

"اوہ۔ کوئی اور حماقت بھی کر بیٹھی ہیں آپ؟"

"ہاں۔ میں نے سرفراز کو یہ نہیں بتلایا کہ میں شادی شدہ ہوں"۔

"خدا کی پناہ۔ یعنی دوسری شادی بھی کر لی آپ نے؟"

"جی۔ جی نہیں"۔ اُس نے گھبرا کر کہا، شرم سے اُس کا چہرہ سُرخ ہو گیا تھا۔ "ابھی نہیں۔ دراصل سرفراز سے میری ملاقات حال ہی میں ہوئی ہے اور"

"اور میں سمجھ گیا۔ محبت، عشق، عہد و پیمان وغیرہ وغیرہ۔ ہے نا؟ لیکن یہ ذاتِ شریف ہیں کون؟"

"آپ سرفراز کو نہیں جانتے؟" اُس نے حیران ہو کر پوچھا۔ "لیکن مجھے تو آپ سے ملنے کا مشورہ اُسی نے دیا تھا؟"

"دلچسپ، بہت دلچسپ"۔ شیرازی ہنستے ہوئے بولا۔ "کسی جاسوسی ڈائجسٹ کی کہانی کی طرح۔ لیکن تابندہ کیا یہ ممکن نہیں کہ قسطوں کے بجائے آپ ایک ہی بار یہ کہانی سنا دیں"۔

تابندہ مسکرا دی، شیرازی کے اندازِ گفتگو نے اُس کی جھجک دور کر دی تھی۔ "معافی چاہتی ہوں"۔ اُس نے کہا۔ "میں اتنی پریشان ہوں کہ خود پہ قابو نہیں رہا تھا۔ میری مصیبت کا آغاز اُس دن سے ہوا جب میں نے اُس

منحوس ایجنسی کے دفتر میں قدم رکھا، آپ یقیناً مجھے احمق تصور کریں گے لیکن اُن کا اشتہار اتنا خوب صورت تھا کہ میں فوراً متاثر ہوگئی اور پھر وہ عورت ۔ آپ بھی اگر اُس سے ملیں گے تو اُس کے حسن اور اندازِ گفتگو کی دل کشی پر فوراً ایمان لے آئیں گے۔"

"ایک منٹ تابندہ ۔ وہ کافرادا کون ہے جو لوگوں کا ایمان ڈانواڈول کر دیتی ہے؟"

"اوہ ۔ معاف کیجیے گا، میں پھر بہک گئی۔" تابندہ نے جلدی سے کہا۔ "دراصل ۔ میری والدہ کے انتقال کے وقت تقریباً ساٹھ ہزار روپیہ بنک میں جمع تھا میرے والد کا انتقال میرے بچپن میں ہوگیا تھا، والدہ نے یہ رقم انتقال سے چند روز قبل نکال کر میرے حوالے کر دی تھی۔ میں گریجویٹ ہوں، ایک فرم میں ملازمت کرتی تھی، والدہ کی موت کے بعد تنہائی اور بے سہارا ہونے کا احساس اتنی شدت سے ہونے لگا تھا کہ جب ایجنسی والوں نے ارشد سے ملاقات کرائی تو میں بلاتامل شادی کے لیے راضی ہوگئی۔"

"اور پھر آپ کے ارشد صاحب کل جمع پونجی لے کر غائب ہوگئے؟"

"جی نہیں ۔ ایسا نہیں ہوا ۔ دراصل میں اپنی والدہ کے ساتھ مہر گڑھ کے آبائی مکان میں رہتی تھی اور ملازمت کے لیے روزانہ شہر آتی تھی، شادی کے بعد ارشد نے کہا ہنی مون کسی اچھے سے ہوٹل میں منائیں گے، ہم یہاں دلکشا ہوٹل میں آکر ٹھہر گئے، پھر تیسرے دن ارشد کے مشورے پر میں نے ایک فرم کے شیئر خرید لیے اور اُس کے لیے چالیس ہزار روپے کی نقد ادائیگی کر دی اُس نے مجھے پچاس ہزار کے شیئر دکھائے جو وہ خود خرید چکا تھا، اس لیے مجھے کوئی شک نہیں ہوا، پھر چھٹے دن وہ ہوٹل سے گیا تو واپس نہیں آیا۔ جب دو دن گزر گئے تو میں نے وہ شیئر اپنے خاندانی وکیل کو دکھائے جنھوں نے بتلایا کہ اس نام کی کسی فرم کا وجود ہی نہیں۔ میں سب کچھ سمجھ گئی، اتنا صدمہ ہوا کہ دل چاہا خودکشی کر لوں مجھے یقین تھا کہ ارشد اب واپس نہیں آئے گا۔"

"ہائیں ۔ تو کیا وہ اُس کے بعد بھی واپس آیا تھا؟"

"نہیں ۔ ایک دن اُس کا فون آیا کہ میں فکر نہ کروں وہ دو ایک دن میں واپس آ رہا ہے، پھر اُس کا ایک خط آیا کہ میں ہوٹل میں ہی قیام کروں وہ جلد واپس آ رہا ہے اُس کے بعد میں ایک سہیلی کے یہاں پارٹی میں گئی تو سرفراز سے ملاقات ہوگئی، اُس کی دل کش شخصیت نے مجھے فوراً گرویدہ

شہر کی لڑکی نے دیہات میں انڈوں سے چوزے نکلتے دیکھے تو بولی۔
"تعجب اس بات پر نہیں ہے کہ انڈوں سے چوزے برآمد ہو رہے ہیں، بلکہ اس بات پر ہے کہ یہ چوزے انڈوں میں گئے کس طرح تھے؟"

کر لیا، چند روز میں ہی مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ کاش میں نے اتنی عجلت میں ارشد سے شادی نہ کی ہوتی اور میں نے اب تک اُس کو یہ نہیں بتلایا ہے کہ میں شادی شدہ ہوں۔ شیرازی صاحب آپ میری اُلجھن کا اندازہ نہیں لگا سکتے ۔ میں۔"

"لگا سکتا ہوں محترمہ بشرطیکہ آپ موقع دیں۔" شیرازی نے بات کاٹ کر کہا۔ "سرفراز کو جب یہ نہیں معلوم کہ آپ کا شوہر موجود ہے اور فرار ہوچکا ہے تو اُس نے آپ کو میرے پاس آنے کا مشورہ کیوں دیا؟"

"ہاں ۔ معاف کیجیے گا ۔ میں بھول گئی تھی۔" اُس نے جلدی سے کہا۔ "وہ میری پریشانی کو بھانپ گیا ہے بہت کریدنے لگا تو میں نے اُسے بتلایا کہ میری ایک سہیلی ایسے چکر میں پھنس گئی ہے کہ پولیس کے پاس بھی نہیں جانا چاہتی اور بغیر کسی کی مدد کے اس مصیبت سے نجات بھی نہیں حاصل کر سکتی، اُس کے لیے پریشان ہوں ۔ سرفراز نے فوراً کہا کہ تم اُس سے کہو کہ وہ شیرازی سے مل لے وہ یقیناً مدد کرے گا، اُسی نے آپ کا پتہ بھی بتلایا تھا ۔ میں زیادہ دن ہوٹل میں قیام نہیں کر سکتی ۔ اس لیے فوراً آپ کے پاس آگئی اور۔"

"آپ کو یقین ہے کہ ارشد اب واپس نہیں آئے گا؟"

"ہاں ۔ وہ کس منہ سے واپس آسکتا ہے۔"

"اُس کی تصویر تو آپ کے پاس ہوگی۔"

"نہیں ۔ یہی تو حیرت کی بات ہے۔" تابندہ نے کہا۔ "ایجنسی والوں نے ایک تصویر مجھے دی تھی ۔ بلکہ اسی تصویر سے مجھے یہ دھوکا ہوا ارشد کافی خوبرو اور خوش مزاج ہے اور میں آسانی سے اُس کے فریب میں آگئی تھی لیکن اُس کے جانے کے بعد میں نے تلاش کیا تو تصویر غائب تھی اور پھر۔"

"بس اتنا کافی ہے، آپ مجھے ایجنسی اور اپنے وکیل کا نام اور پتہ لکھ کر دے دیجیے ۔ آپ کو یہ تو معلوم ہوگا کہ نہ میرا

تعلق پولیس سے ہے اور نہ سراغرسانی پیشہ ہے، بس لوگوں کی مدد کرنا ایک مشغلہ ہے۔ خصوصاً مصیبت زدہ خواتین کی بشرطیکہ وہ آپ کی طرح خوب صورت ہوں۔ لیکن میں کوئی وعدہ نہیں کرسکتا۔ کوشش کروں گا۔"

تابندہ کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا، اس نے جلدی سے ایک پرچے پر لکھا "سہاگ۔ ۱۸ بدری بلڈنگ کورٹ روڈ" اور شیرازی کو تھما دیا۔

"بڑا خوب صورت نام ہے ایجنسی کا۔"

"منحوس کہیے" اس نے غصے میں کہا۔ "شیرازی صاحب میں بیان نہیں کرسکتی کہ آپ کی کتنی ممنون ہوں گی۔"

"معاف کیجیے گا" شیرازی نے اس کا تکیہ کلام دہرایا۔ "یہ تشکر قبل از وقت ہے، آپ اپنے ہوٹل جاکر آرام کیجیے، میں جلد رابطہ قائم کروں گا۔"

❁

شیرازی اپنی نئی کار سے اس طرح لطف اندوز ہو رہا تھا جیسے وہ اس کی حسین محبوبہ ہو، ہوا کے دوش پر اڑتا ہوا وہ تیز رفتاری کے ساتھ کورٹ روڈ پہنچا۔ بدری بلڈنگ نیم دائرے کی شکل میں بنی ہوئی کئی منزلہ پرانی عمارت تھی، سامنے کے احاطے میں داخل ہونے کے لیے صرف ایک گیٹ تھا۔ اوپر جانے کے لیے ایک چوڑا سا پرانا زینہ تھا، پوری تین سیڑھیاں طے کرکے وہ اٹھارہ نمبر تک پہنچا، سامنے ایک خوب صورت سے بڑے بورڈ پر لکھا ہوا تھا "سہاگ"۔

شیرازی ابھی کچھ متذبذب تھا کہ دروازہ کھلا، ایک چھریرے بدن کی دراز قد لڑکی باہر نکلی، خوشی سے اس کا چہرہ دمک رہا تھا، مسکراتے لبوں پر تیز رنگ کی لپ اسٹک تھی اور اس کے بعد دروازے سے جو شخص برآمد ہوا اسے دیکھ کر شیرازی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، انسان کے روپ میں وہ ایک منی دیو نظر آتا تھا، لڑکی سے تقریباً ایک فٹ اونچا قد اور بلاشبہ تین گنا جسم، دروازے سے وہ ترچھا ہوکر نکلا، سانولا رنگ، موٹے ہونٹ، چمکتے دانت اور چمکدار قیمتی سوٹ میں ملبوس اس دیو نما شخص نے فاتحانہ نظروں سے شیرازی کو دیکھا اور لڑکی کا بازو پکڑ کر سیڑھیاں اترنے لگا۔ اس کے قدموں سے زمین ہلتی محسوس ہو رہی تھی۔

شیرازی اس لڑکی کی قسمت پر رشک کھاتا ہوا آگے بڑھا اور دروازے کے برابر لگے ہوئے بورڈ کو پڑھنے لگا۔

"سہاگ"

"موزوں شریکِ حیات کے لیے ہماری خدمات حاصل کیجیے۔"

وہ اندر داخل ہوا تو خود کو ایک چھوٹے سے خوشنما کمرے میں پایا جسے اتنے سلیقے سے آراستہ کیا گیا تھا کہ دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی، کمرے میں صرف ایک میز تھی جس کے گرد بیٹھی ہوئی گداز جسم کی عورت نے بڑی دلکش مسکراہٹ کے ساتھ خیر مقدم کیا۔ "تشریف لائیے جناب" اس نے بڑے تپاک سے کہا "کیا آپ نے وقت لیا ہوا ہے؟"

"جی نہیں" شیرازی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"کوئی بات نہیں۔ میرا خیال ہے مس آرزو آپ کے لیے وقت نکال لیں گی۔" اس نے دلکش لہجے میں کہا۔ شیرازی نے محسوس کرلیا تھا کہ وہ اس کا جائزہ لے رہی تھی جیسے دل ہی دل میں سوچ رہی ہو، خوب صورت مالدار آدمی نظر آتا ہے، بہت موٹی آسامی ہے، خاصی آمدنی ہوجائے گی۔ وہ جلدی سے اپنی کرسی چھوڑ کر اٹھی "آپ ادھر ویٹنگ روم میں تشریف رکھیں۔"

وہ شیرازی کو ایک اور آراستہ کمرے میں لے گئی جس میں آرام دہ صوفے رکھے ہوئے تھے۔ فرش پر دبیز اور قیمتی قالین تھا، کمرے کا رنگ، پردے اور سجاوٹ ہر چیز سے نفاست عیاں تھی۔ اس نے اتنا ماڈرن اور آراستہ شادی دفتر کبھی نہ دیکھا تھا۔ ذرا دیر نہ گزری تھی کہ ایک نرم و نازک لڑکی چائے لے کر کمرے میں داخل ہوئی، اس نے سبز رنگ کی دلکش ساری پہن رکھی تھی۔

"مس آرزو آپ سے چند منٹ بعد ملاقات کریں گی۔ جب تک چائے نوش فرمائیے" لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا اور چلی گئی۔

دفتر کا ماحول، انتظام، سجاوٹ، آداب ہر چیز اس کے دل میں مس آرزو سے ملنے کی آرزو کو شدید بناتی جا رہی تھی، اس نے ابھی سگریٹ کے صرف چند کش لیے تھے کہ ادھیڑ عمر عورت اندر داخل ہوئی "تشریف لائیے جناب، مس آرزو آپ کی منتظر ہیں۔"

"او، شکریہ" شیرازی اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ وہ استقبالیہ کمرے میں داخل ہوئے، ادھیڑ عمر عورت نے درمیان میں بنا ہوا دروازہ کھولا، شیرازی اندر داخل ہوا۔ کمرہ اتنا کشادہ تھا کہ دفتر کے بجائے ڈرائنگ روم معلوم ہوتا تھا۔ دریچے کے قریب عنابی رنگ کی ایک بہت بڑی آبنوسی میز رکھی ہوئی تھی، میز پر رکھے ہوئے ٹیبل لیمپ کی روشنی میں اس نے ایک مسکراتا ہوا چہرہ دیکھا جس کی چمکتی ہوئی آنکھیں اس پر مرکوز تھیں، شیرازی

کے قریب پہنچتے ہی مس آرزو کھڑی ہو گئی، وہ مبہوت بنا اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا جو نیلے رنگ کے سوٹ میں ملبوس سامنے کھڑی تھی۔ لڑکی کیا تھی حسن و جمال کا ایک ایسا مرقع تھا جو ہر دیکھنے والے کی آرزوئے حیات بن جاتا ہو گا، ایسا بے پناہ، اتنا بھرپور اور باوقار حسن شیرازی نے صرف تصور میں دیکھا تھا۔

"تشریف رکھیے" ایک متانت بھری مترنم آواز کانوں سے ٹکرائی۔

"جی۔ شکریہ" شیرازی نے خود پہ قابو پاتے ہوئے کہا۔

"میں جانتی ہوں۔ ابتدا میں اس موضوع پر بات کرتے ہوئے ہر ایک کو پس و پیش ہوتا ہے" اس نے بالکل سپاٹ لہجے میں کہا جیسے رٹا رٹایا جملہ ادا کر رہی ہو "لیکن آپ تکلف سے کام نہ لیں، مجھ کو بے تکلفی کے ساتھ سب کچھ بتلائیں۔ آپ کے ذہن میں شریکِ حیات کا ایک خاکہ ضرور ہو گا۔؟"

"اوہ۔ ہاں۔ کیوں نہیں" شیرازی نے جواب دیا۔

"ابتدا اسی ذکر سے بہتر ہو گی۔ مثلاً آپ کو کیسی لڑکی پسند ہے؟ حسن کا معیار ہر ایک کا جدا ہوتا ہے، آپ کا کیا ہے۔ تعلیم، ذوق، خاندان وغیرہ آپ ساری باتیں کھل کر کیجیے۔ لیکن باتیں تو میں خود کیے جا رہی ہوں" اس کی ہنسی میں پیاڑی چشموں کا ترنم تھا "چلیے میں چپ ہوئی جاتی ہوں۔ آپ فرمائیے"

شیرازی مسکرایا "حیرت انگیز۔ بخدا ہر چیز۔ ہر بات۔ ہر ادا حیرت انگیز"

اس نے چونک کر شیرازی کو دیکھا "جی۔ میں نہیں سمجھی"

"اگر میں شادی کی غرض سے آیا ہوتا مس آرزو، تو اب تک یہ کہہ چکا ہوتا کہ مجھے کچھ نہیں چاہیے سوائے اس جیتی جاگتی سحر خیز آرزو کے جو سامنے بیٹھی ہے" مس آرزو کا چہرہ شرم سے گلنار ہو گیا "لیکن مس آرزو۔ بدقسمتی سے میں آپ کے پاس شادی کے سلسلے میں نہیں آیا ہوں"

مس آرزو کے چہرے پہ حیرت اور ناگواری کے آثار نمودار ہوئے "آپ شادی کے سلسلے میں نہیں آئے ہیں؟"

"جی نہیں مس آرزو۔ دراصل میں ایک شوہر کی تلاش میں آیا ہوں جو ایک لڑکی کو آپ نے فراہم کیا تھا۔ میری مراد ارشد جمیل سے ہے"

"ارشد جمیل۔؟" آرزو کی نگاہوں میں خوف جھلکنے لگا تھا۔

شیرازی نے اطمینان کے ساتھ سگریٹ سلگایا اور پھر سنجیدہ لہجے میں بولا "جی ہاں آرزو۔ ارشد جمیل۔ آپ یہ نام سن کر فکرمند کیوں ہو گئیں؟"

"تم۔ کون ہو؟" آرزو نے غصے پہ قابو پاتے ہوئے کہا۔

"لیجیے۔ آپ کو تو غصہ بھی آ گیا۔ ایک شعر سناؤں"

"سنئے مسٹر۔ میرے پاس مذاق کے لیے وقت نہیں ہے میں نہیں جانتی آپ کون ہیں اور میں غیر اور انجان آدمیوں سے اپنے معزز کلائنٹ کے بارے میں بات نہیں کرتی"

"اس مرتبہ کرنا ہو گی محترمہ" شیرازی نے سرد لہجے میں کہا۔ "ممکن ہے بعد میں پولیس سے بھی بات کرنا پڑے"

"آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں؟"

"جی نہیں۔ حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ تابندہ بڑی اچھی لڑکی ہے، بھولی اور معصوم بھی، نئے نویلے شوہر کی گمشدگی پر شاید اتنی پریشان نہ ہوتی اگر وہ ساری جمع پونجی لے کر نہ بھاگ گیا ہوتا۔ مسئلہ مذاق کا نہیں سنگین ہے مس آرزو"

"میں آپ کا نام پوچھ سکتی ہوں"

"بے شک۔ مجھے شیرازی کہتے ہیں، خاصا بدنام آدمی ہوں"

"شیرازی۔ اوہ۔ تو آپ ہی وہ پراسرار شیرازی ہیں؟" اس کے لبوں پہ اچانک مسکراہٹ رقص کرنے لگی "بدنام تو خیر نہیں لیکن شہرت بہت حاصل ہے آپ کو، کیا آپ مسٹر ارشد کے دوست ہیں؟"

"جی ہاں۔ ورنہ ان کے لیے پریشان نہ ہوتا"

"لیکن شیرازی۔ ارشد جمیل اور تابندہ کی شادی میں کوئی گڑبڑ نہیں تھی۔ دونوں نے پسند کی شادی کی تھی، ارشد جمیل ہر لحاظ سے ٹھیک ٹھاک آدمی تھا، بڑا اچھا اور بڑا موزوں جوڑا تھا ان کا"

"اسی لیے ایک ہفتے بھی یکجا نہ رہ سکا؟" شیرازی نے طنزیہ لہجے میں کہا "آپ ارشد کے بارے میں کیا جانتی ہیں؟"

"اسی حد تک جتنا انھوں نے بتلایا تھا، میں نے اس پر یقین کر لیا تھا لیکن اس مرتبہ مجھے دھوکا ہوا" اس نے بڑے اطمینان کے ساتھ جواب دیا "آخر میں بھی انسان ہوں، کسی کو سمجھنے میں غلطی بھی کر سکتی ہوں، شادی کے بعد سے نہ اس نے مجھ سے رابطہ کیا، نہ اس کے بارے میں کچھ جانتی ہوں۔ اور ایجنسی کے قیام کے بعد سے یہ دوسرا موقع ہے جب کسی نے ہمارا معاوضہ نہیں ادا کیا"

"آپ نے اس کو تلاش کرنے کی کوشش کی؟"

"ان کے دیے ہوئے پتہ پر دو خطوط بھیجے جو اس ریمارک کے ساتھ واپس آ گئے کہ اس پتہ پر اس نام کا کوئی آدمی نہیں رہتا" آرزو نے بتلایا "شیرازی یقین جانیے میں اپنی حد تک ہر ممکن کوشش کر چکی ہوں، آپ نے سروس ایجنسی کا نام سنا ہو گا، یہ لوگ سراغرساں تو نہیں لیکن گم شدہ لوگوں کی تلاش

اور انشورنس انکوائری کا کام کرتے ہیں میں ہر کیس میں اُن کے ذریعہ پہلے معلومات حاصل کر لیتی ہوں پھر کسی شادی کا اہتمام کرتی ہوں ارشد کے بارے میں اب مجھے خود شبہ ہونے لگا ہے کہ یہ غلط آدمی نہ ثابت ہو معاوضے کی عدم ادائیگی خطوط کا واپس آنا یہ کچھ اچھی علامت نہ تھی ٹھہریے میں اس کی فائل آپ کو دکھاتی ہوں۔" اُس نے میز کی دراز کھول کر تلاش کرنا شروع کیا پھر فکرمند انداز میں سوچتی رہی اُس کے بعد گھنٹی بجائی، فوراً دروازہ کھلا اور وہی ادھیڑ عمر عورت اندر داخل ہوئی۔

"زونی۔ کیا ارشد جمیل کی فائل آپ کے پاس ہے؟"

"جی۔ نہیں تو" زونی نے جواب دیا۔ "آپ نے کہا تھا کہ"

"فائل یہاں بھی نہیں ہے" آرزو نے جلدی سے بات کاٹ کر کہا۔ "آپ ذرا کیبنٹ میں تلاش کرلیں۔"

"بہتر ہے" زونی کا چہرہ خوف زدہ ہو گیا تھا۔

کچھ دیر بعد آرزو نے جھنجلا کر کہا۔ "شیرازی۔ میں آپ کا وقت برباد نہیں کرنا چاہتی، میں جانتی ہوں کہ آپ ہماری کسی بات سے مطمئن نہ ہوں گے۔"

"کسی کی زندگی تباہ ہو تو آپ مطمئن ہو جائیں گی مس آرزو؟" اُس نے زہر آلود لہجے میں کہا۔

"زندگی تباہ ہو؟ کیوں خیر تو ہے، تابندہ خیریت سے تو ہے؟" آرزو نے سہم کر پوچھا۔

"ہاں۔ اب تک تو خیریت سے ہے۔"

"شکر ہے خدا کا۔ آپ نے تو مجھے ڈرا دیا تھا، میں صرف اتنا اور بتا دوں کہ میں نے دیال کو بھی ارشد جمیل کی تلاش کا کام سپرد کیا تھا۔ دیال سروس ایجنسی کا مالک ہے لیکن اُسے کامیابی نہیں ہوئی۔"

اسی لمحہ دروازہ کھلا اور زونی نے اندر داخل ہو کر کہا۔

"فائل کا کہیں پتہ نہیں ہے مس آرزو۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ جائیے۔"

"خوب۔ خوب۔ تو فائل بھی غائب ہو گئی۔" شیرازی مسکرایا۔ "معاملہ پراسرار ہوتا جا رہا ہے کیا دفتر میں چوری ہو گئی تھی!"

آرزو کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ "جی نہیں۔" اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "لیکن گزشتہ ہفتے میرا ایک کلرک ملازمت چھوڑ کر چلا گیا۔ اُسے ملازم ہوئے بہت تھوڑا عرصہ ہوا تھا، دو مرتبہ میں نے اُسے اپنے کمرے میں کاغذات الٹتے پلٹتے دیکھا جبکہ یہاں آنے کی کسی کو اجازت نہیں ہے۔ اِس لیے میں نے اُسے نکال دیا۔"

"اور وہ ارشد جاوید کی فائل چوری کر کے لے گیا؟" شیرازی مسکراتا ہوا بولا۔ "کیا آپ مجھے اس کا نام اور پتہ بتلا سکتی ہیں؟"

"جی ہاں۔ کیا آپ کے خیال میں جھوٹ بول رہی ہوں؟ آپ سے بحث کرنا بیکار ہے لیکن اگر آپ یہ ثابت کر دیں کہ ہماری ایجنسی نے آج تک کبھی کسی کے ساتھ دھوکا یا فراڈ کیا ہے تو میں آپ کو منہ مانگا انعام دوں گی۔"

شیرازی بے ساختہ مسکرا دیا۔ "بعض لوگ غصے میں بڑے اچھے لگتے ہیں۔"

"میں بے ہودہ مذاق کی عادی نہیں ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔ صورتِ حال یہی رہی تو ہو جائیں گی، ویسے مجھے آپ کا چیلنج منظور ہے۔ ارشد کے علاوہ کوئی اور کیس بھی ایسا ہے جس پر آپ کو شبہ ہو؟"

"آپ کا اُس سے کوئی تعلق نہیں۔"

"ممکن ہے ہو جائے۔ ممکن ہے میں آپ کو ایک اور مصیبت سے بچا لوں۔"

آرزو سوچنے لگی، پھر اُس نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "ایک کیس واقعی ایسا ہے، مرد تو ٹھیک ٹھاک ہے، افریقہ میں ہیروں کی کان کا مالک ہے، بے حد مالدار ہے چند روز کے لیے یہاں آیا ہوا ہے، اُسے ایک پڑھی لکھی ماڈرن بیوی کی تلاش ہے۔"

"اس افریقی گینڈے کو آپ نے اتنی نرم و نازک لڑکی حوالے کر دی؟"

"اوہ۔ آپ نے اُسے دیکھ لیا تھا؟ بڑی تیز نظر ہے آپ کی،" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "مجھے اس لڑکی کے بارے میں اطمینان نہیں، حد سے زیادہ ماڈرن ہے اور"

"آپ کا خیال درست ہے، لڑکی ٹھیک نہیں معلوم ہوتی۔"

"لیکن مشکل یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کر چکے ہیں اور کل سہ پہر سنٹرل ہوٹل میں وہ نکاح کر رہے ہیں لڑکے کو افریقہ واپس جانا ہے اس لیے وہ انتظار نہیں کر سکتا۔"

"اُن کے بارے میں کچھ اور نہیں بتائیں گی آپ؟"

"نہیں۔ فی الحال میں لڑکی کے بارے میں خود چھان بین کر رہی ہوں، اگر کوئی ضرورت ہوئی کل صبح آپ کو بتلاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ ارشد کی فائل گم ہوگئی، پتہ معلوم نہیں۔ تصویر فراہم کرسکیں گی آپ؟"

"نہیں۔ افسوس کہ وہ بھی غائب ہے۔" آرزو نے کہا۔ "البتہ حلیہ بتلاسکتی ہوں، درمیانہ قد، سیاہ بال، چوڑی پیشانی، زرد چہرہ، بھوری آنکھیں، خوب صورت خدوخال لیکن چال ڈھال میں نسوانیت، لمبا چہرہ اور اٹھتی ہوئی نوکیلی ناک۔ ہمیشہ اچھا لباس پہنتا ہے اور دھیمے لہجے میں بات کرتا ہے۔" اس نے کاغذ پر کچھ لکھ کر آگے بڑھایا۔ "اور یہ ہے اس کلرک کا نام اور پتہ۔"

"ایسا تو نہیں کہ یہ دلیپ شترن آپ کو نقصان پہنچانے کی سازش کررہا ہو؟" شیرازی نے کاغذ پر نام پڑھتے ہوئے کہا۔

"ممکن ہے۔" آرزو نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اور تو کچھ نہیں پوچھنا ہے؟"

"بس صرف ایک بات اور۔ ارشد جمیل کا پتہ کیا تھا؟"

"۲۴۔ اے، شاہجہاں آباد۔"

شیرازی نے شکریہ ادا کیا اور مسکراتا ہوا باہر نکلا اس نے پریشان حال زونی کو فوراً ہی اٹھ کر آرزو کے کمرے میں جاتے دیکھا، دفتر سے باہر نکل کر وہ تیز تیز قدم رکھتا زینے تک گیا، پھر دبے پاؤں واپس آیا، دروازہ کھلا تو زونی اپنی جگہ سے غائب تھی، وہ آہستہ سے اندر داخل ہوا۔ بدحواسی میں زونی نے مس آرزو کے کمرے کا دروازہ بھی بند نہیں کیا تھا، وہ دبے پاؤں چلتا دروازے کے قریب کھڑا ہوگیا۔ زونی بڑے پریشان لہجے میں کہہ رہی تھی۔ "مجھے یقین ہے کہ یہ دلیپ شترن کا کام ہے اور کون ایسی حرکت کرسکتا تھا، باقی تمام لوگ قابل اعتماد ہیں۔"

"بہرحال ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ مجرم کون ہے ورنہ بڑی بدنامی ہوگی اور زونی خبردار اس بات کی کسی کو خبر نہ ہونے پائے۔"

"آپ مطمئن رہیں مس۔ کسی کو ہوا بھی نہ لگنے دوں گی۔"

شیرازی نے مزید وقت ضائع نہیں کیا، دبے پاؤں باہر نکلا اور احتیاط سے سیڑھیاں اترنے لگا، اس کے لبوں پر شریر مسکراہٹ رقص کررہی تھی، وہ آرزو سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں سوچتا ہوا چلا جارہا تھا، احاطے سے نکل کر اس نے جیسے ہی زینے کی نچلی سیڑھی پر قدم رکھا کسی نے اتنے زور سے دھکا دیا کہ وہ بے تحاشا نیچے گرتا چلا گیا۔

اسے شدید چوٹ آئی ہوتی کیونکہ وہ منہ کے بل گرا تھا لیکن گرتے گرتے اس نے پھرتی سے کروٹ لی اس لیے شانے کے بل پختہ فرش سے ٹکرایا لیکن پھر بھی ناک زمین سے ٹکرا گئی۔ درد سے آنکھوں میں آنسو آگئے اس لیے ایک لمحہ کو اسے کچھ نظر نہ آسکا، دھندلائی آنکھوں سے اس نے ایک سائے کو اپنے اوپر جھکتے ہوئے محسوس کیا، کوئی بہت گرجدار آواز میں چلایا اور پھر اگلے ہی لمحہ اس کی پیشانی پر ایک بھرپور ضرب لگی اور وہ دوبارہ گر پڑا۔ فضا پر کسی کے چلانے کی دہاڑ گونجی۔ کوئی بڑی پھرتی کے ساتھ اس کی جیبوں کی تلاشی لے رہا تھا۔

شیرازی نے درد کی پروا کیے بغیر آستین سے آنسو صاف کیے اور سامنے دیکھا، ایک شخص تیزی سے بھاگتا چلا جارہا تھا لیکن احاطے کے گیٹ کے سامنے کھڑا ایک دیوقامت اس کا راستہ روکنے کے لیے دونوں ہاتھ پھیلائے آگے بڑھ رہا تھا۔ "خبردار۔ جانے نہ دینا۔" شیرازی چلایا۔ "پکڑ لو اس کو۔" اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن چکرا کر گر پڑا۔ پھر فرش پر بیٹھے بیٹھے ہی حملہ آور کو بھاگتے دیکھنے لگا۔ ایک لمحہ کو یوں لگا کہ حملہ آور اس دیوقامت کی گرفت میں آنے ہی والا ہے بھاری بھرکم جسم والا اپنے بازو پھیلائے گیٹ کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ حملہ آور جیسے ہی قریب پہنچا اس کے ایک بازو کو حرکت ہوئی، وار اوچھا پڑا تھا پھر بھی حملہ آور دور جاگرا، فرش پر کسی چیز کے گرنے کا کھٹکا ہوا۔ دیوپیکر شخص بھینسے کی طرح ڈکراتا ہوا آگے بڑھا لیکن پستہ قد حملہ آور بلا کا پھرتیلا تھا، وہ چشم زدن میں اٹھا اور پھر سر جھکا کر تیزی کے ساتھ تیر کی طرح اس دیوپیکر کی سمت لپکا۔ دیوپیکر کے دونوں آہنی بازو اسے پکڑنے کے لیے آگے بڑھے لیکن دوسرے ہی لمحہ حملہ آور نے اپنے سر سے ایک بھرپور ٹکر اس کی توند پر ماری، دیوپیکر شخص کے منہ سے ایسی آواز نکلی جیسے کسی بس کا ٹائر پنکچر ہوگیا ہو، وہ غصے میں دہاڑتا ہوا پلٹا لیکن اتنی دیر میں حملہ آور گیٹ سے باہر نکل چکا تھا۔

شیرازی بمشکل اٹھ کر کھڑا ہوا، اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا، اگر وہ دیوار کا سہارا نہ لیتا تو چکرا کر پھر گر پڑتا۔ چیخ پکار سن کر بہت سے لوگ جمع ہوگئے تھے لیکن سب سے پہلے جس پر اس کی نظر پڑی وہ آرزو تھی۔

"کیا ہوا۔ اوہ خدایا۔ آپ تو زخمی ہیں۔ کیا حملہ آور پکڑا گیا؟" اس نے گھبرا کر پوچھا۔

"وہ افریقی دیو اس کے تعاقب میں گیا ہے۔" شیرازی نے کہا۔ "وہی ہیروں کی کان والا، اگر اعتراض نہ ہو تو کچھ دیر

آپ کے دفتر میں دم لے لوں۔"

"ہاں۔ ہاں۔ آئیے، آپ کے زخم پر دوا لگانا ضروری ہے میں ڈاکٹر کو فون کر کے یہیں بلا لیتی ہوں" اُس نے شیرازی کو سہارا دیتے ہوئے کہا۔

"اتنے خوب صورت سہارے کے بعد تو ایسے زخم خود مندمل ہو جاتے ہیں" اُس نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کہا۔

اوپر پہنچ کر وہ اُسے اپنے کمرے کے باتھ روم میں لے گئی اور ضد کر کے بھیگے ہوئے تولیے سے زخم صاف کر کے جراثیم کش دوا لگائی۔ اس کے بعد اُسے آرام کرسی پر بٹھا کے زخم پر ٹیپ لگائی۔ شیرازی اُس کے نرم و نازک ہاتھوں کی پذیرائی سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ اس کے سر پر خاصا زخم لگا تھا۔ آرزو کی ضد کے باوجود شیرازی نے ڈاکٹر بلانے کو منع کر دیا۔ اسی لمحہ زونی گرم گرم کافی لے آئی۔

"اب آرام سے بیٹھ کر کافی پیجیے اور پھر بتلایئے کہ یہ سب کیا تھا؟" آرزو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کوئی جیب کترا میرا منتظر تھا۔ جیسے ہی سیڑھیوں سے اُترا اچانک حملہ کر کے میرا پرس لے بھاگا۔"

"خدا کی پناہ۔ جب اُسے پتہ چلے گا کہ کس کی رقم اڑائی ہے تو وہ خود کو ہیرو تصور کرے گا۔" آرزو نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ممکن ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ رقم کے چکر میں نہیں تھا۔"

"اوہ" وہ اچانک سنجیدہ ہو گئی "اس حملے کا تعلق ارشد جمیل کے معاملے سے تو نہ تھا؟"

"ممکن ہے۔ کیونکہ کسی جیب کترے کا اس طرح میرے انتظار میں کھڑے رہنا سمجھ میں نہیں آتا" شیرازی نے کہا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تابندہ کی باقاعدہ نگرانی ہو رہی ہے اور اسی لیے میرا یہاں تک تعاقب کیا گیا۔ بٹوے میں رقم نہیں تھی اور اُس سے وہ کچھ اندازہ نہ کر سکے گا کیونکہ آپ نے جو پتے لکھ کر دیے تھے وہ دوسری جیب میں موجود ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اُسے کسی نے میری یہاں آمد کی اطلاع دی ہو۔"

"لیکن کس نے؟"

"ممکن ہے آپ کے دفتر کے کسی فرد نے۔"

"آپ یہ کیوں نہیں کہہ دیتے کہ حملہ میں نے کرایا ہے۔" آرزو نے غصے میں کہا۔

"نہیں جانِ آرزو۔ میں ایسا الزام عائد نہیں کر سکتا لیکن اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس دفتر میں کوئی جاسوس موجود ہے۔ یا پھر تابندہ کے ہوٹل سے یہاں تک میرا تعاقب کیا گیا ہے۔"

"پھر اب کیا ارادہ ہے؟ پولیس میں رپورٹ کریں گے؟"

"نہیں۔ اگر آپ کے اس افریقی گوریلے کو حملہ آور کے پکڑنے میں ناکامی ہوئی تو میں اپنے ذرائع استعمال کروں گا وہ پولیس سے زیادہ موثر ثابت ہوں گے" ویسے اس گوریلے کا نام کیا ہے؟"

"اس کا نام شیرداد ہے" آرزو نے مسکراتے ہوئے کہا "ویسے وہ کسی گوریلے سے کم طاقت ور نہیں ہے۔"

"خدا رحم کرے اس لڑکی پر" شیرازی نے اُٹھتے ہوئے کہا "مسیحائی کا شکریہ۔"

وہ جیسے ہی دروازے سے باہر نکلے شیرداد کی گرجدار آواز سنائی دی "کم بخت اگر ہاتھ آ جاتا تو میں اُسے کچا چبا جاتا۔ لیکن جائے گا کہاں" اور پھر آرزو کو دیکھتے ہی اُس کا جبڑا بند ہو گیا۔ موٹے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھیں "اوہ مس آرزو" اس نے احمقوں کی طرح بوکھلا کر کہا۔

"آپ دوبارہ کیسے اِدھر تشریف لے آئے مسٹر شیرداد؟" آرزو نے پوچھا۔

"مم۔ میں دوبارہ؟" اُس نے بوکھلا کر کہا "اوہ۔ ویسے تو یہاں سے جانے کو کس کم بخت کا دل چاہتا ہے لیکن دراصل میں اپنا یہ لفافہ یہاں بھول گیا تھا" اُس نے صوفے پر رکھے لفافے کی سمت اشارہ کیا "لیکن جیسے ہی گیٹ میں داخل ہوا ایک شریف آدمی پر کسی بدمعاش نے حملہ کر دیا۔ اوہ شاید یہی تو تھے وہ صاحب۔ اس گیدڑ کے بچے نے آپ ہی پر حملہ کیا تھا نا؟"

"جی۔ لیکن آپ کو بھی تو ٹکر ماری تھی۔"

"مجھے۔ ٹکر۔ ؟ اوہ ہاں۔ لیکن اس جیسے چوہے مجھے کیا ٹکر مار سکتے ہیں۔ بس قسمت تھی جو بچ کر نکل گیا لیکن آپ کو کافی چوٹ آئی ہے" اُس نے دو فٹ لمبا لوہے کا راڈ دکھایا "اگر یہ بھرپور پڑ جاتا تو کھوپڑی تڑخ جاتی۔ خدا نے بڑی خیر کی۔ وہ ہرگز بچ کر نہ جاتا لیکن اچانک ایک کار اُس کے پاس آ کر رکی اور وہ اُس پر بیٹھ کر رفو چکر ہو گیا۔ آپ مرتے مرتے بچے ہیں بھائی جان۔"

"آپ کی مہربانی سے" شیرازی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اُس نے اچانک ہو ہو کر کے ہنسنا شروع کر دیا "آپ نے یہ بازو دیکھے ہیں۔ فولاد ہیں فولاد" اُس نے باڈی بلڈروں کی طرح اپنے پٹھے پھلا کر کہا۔

شیرازی کو مزہ آنے لگا تھا۔ اُس نے آگے بڑھ کر شیرداد کا بازو دبایا۔ "آپ واقعی شیرداد ہیں، ذرا چھپا کر رکھیے ان بازوؤں کو، یہاں کی لڑکیاں بڑی ندیدی ہیں۔"

ایک بار پھر ہو ہو کی آواز گونج اٹھی جیسے بوتل سے پانی گر رہا ہو۔ عجیب ہنسی تھی اُس کی۔ شیرازی نے آرزو کی سمت دیکھا جو ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ "شکریہ مس آرزو۔ آپ کی وجہ سے افریقہ کی ایک نئی نسل کا نمونہ دیکھنے کو مل گیا۔ اب میں چلتا ہوں۔"

"ٹھہریے بھائی جان۔ آپ اس طرح ہرگز نہیں جا سکتے، میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔" شیرداد نے سینہ پھلا کر کہا۔ "اس مرتبہ کوئی آپ پر حملہ کر کے دیکھے۔"

شیرازی نے ایک لمحہ کو پس و پیش کیا، وہ اس مصیبت کو گلے نہیں لگانا چاہتا تھا، پھر کسی خیال کے تحت مسکرا دیا، دونوں ساتھ ساتھ زینے سے اُترے، گیٹ کے پاس پہنچ کر اُس نے شیرازی کا بازو پکڑ لیا۔ "ٹھہرو۔ میں پہلے باہر نکل کر دیکھتا ہوں، اگر وہ پھر کھڑا ہوا مل گیا تو۔"

"اب وہ یہاں نہیں ملے گا شیرداد۔ تم اس شہر کے بدمعاشوں کو نہیں جانتے۔"

"کیوں نہیں جانتا بھائی جان۔؟ میں بھی ہندوستان کا رہنے والا ہوں۔" اُس نے سینہ پھلا کر کہا۔ "میرے والد نبی داد بہت بڑے تاجر تھے لیکن وہ کیپ ٹاؤن چلے گئے۔ وہاں اُنھوں نے ہیروں کی کان کا ٹھیکہ لے لیا تھا۔ پھر وہیں اُنھوں نے شادی کر لی لیکن مجھے افریقی لڑکیاں بالکل پسند نہیں، اس لیے شادی کرنے یہاں آیا ہوں۔" اُس نے شرماتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں پسند افریقی لڑکیاں؟"

"بہت تگڑی ہوتی ہیں۔" اُس نے رازدارانہ لہجے میں کہا اور پھر ہو ہو شروع کر دی۔

وہ ٹہلتے ہوئے اس جگہ آ گئے جہاں شیرازی کی نئی مرسڈیز کھڑی تھی، شیرازی نے دروازہ کھول کر اُسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ شیرداد کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "یہ۔ یہ آپ کی کار ہے؟"

"ہاں۔" شیرازی نے جواب دیا۔ "بیٹھو میں تمھیں چھوڑ دوں گا۔" لیکن شیرداد کار کو دیکھ کر اس طرح خوش ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی حسین لڑکی ہو، شیرازی آگے بڑھا لیکن ایک آہنی ہاتھ نے اُسے پیچھے گھسیٹ لیا اور اسی لمحہ چمک سے اُن کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں، شیرداد غصے میں فوٹو گرافر کی سمت بڑھا لیکن شیرازی نے فوراً روک لیا۔ وہ ڈیلی نیوز کے فوٹو گرافر کو پہچانتا تھا۔ اُس نے کار کی سمت قدم بڑھایا۔

"یہ نہیں ہو سکتا بھائی جان۔" شیرداد نے اُسے روک کر اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "یہ ہرگز نہیں ہو سکتا آپ اِدھر میرے برابر بیٹھیے۔ اس زخمی حالت میں آپ کو نہیں ڈرائیو کرنے دوں گا۔" شیرازی نے گھبرا کر کہا۔ "شیرداد یہ کار میں نے آج ہی خریدی ہے، تم یہاں کے ٹریفک۔"

لیکن اُس نے کار اسٹارٹ کر دی، شیرازی کے لبوں سے کراہ نکلی لیکن وہ مجبور تھا، اس گوریلے کو ہٹانا اُس کے بس کی بات نہیں تھی۔ "آپ صرف راستہ بتاتے رہیے بھائی جان اور پھر دیکھیے میری ڈرائیونگ۔"

بلاشبہ وہ بڑا اچھا ڈرائیور تھا۔ شیرازی حیران رہ گیا۔ پارک ویو پہنچ کر جب کار گیراج میں پارک کر دی تو اُس نے فخر سے سینہ پھلا کر شیرازی کی سمت دیکھا۔ "کیسا ڈرائیور ہوں بھائی جان؟"

"یار تم تو واقعی بڑے کام کے آدمی ہو شیرداد۔" شیرازی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "آؤ تمھیں کافی پلواؤں۔"

"میں نے پہلے ہی اندازہ کر لیا تھا کہ آپ بہت شریف آدمی ہیں۔" شیرازی نے خوش ہو کر کہا۔ "شریف آدمی ہمیشہ سچ بولتا ہے، میں بھی کل ایسی ہی کار خریدوں گا۔ آپ دِلوا دیں گے نا بھائی جان! نیلی کیسی رہے گی؟"

"نہیں یار۔ نیلا رنگ تم کو سوٹ نہیں کرے گا۔ ڈارک ریڈ لینا۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ مجھے بھی یہی کلر پسند ہے۔ ہائیں کیا آپ اس بلڈنگ میں رہتے ہیں؟"

"ہاں۔ اُوپر میرا فلیٹ ہے۔ آؤ۔"

وہ کچھ اُداس ہو گیا، پھر آہستہ سے بولا۔ "ایک بات کہوں بھائی جان؟ آپ کو فلیٹ میں رہنا زیب نہیں دیتا۔"

"کیوں۔؟" شیرازی نے حیران ہو کر پوچھا۔

"فلیٹ منحوس ہوتا ہے۔ ایک بار میں ایک فلیٹ کے دروازے میں پھنس گیا تھا۔"

شیرازی اپنے قہقہے کو نہ روک سکا۔ "تم بڑے دلچسپ آدمی ہو یار۔ آؤ اس بار تم کو نہیں پھنسنے دوں گا۔"

اُوپر پہنچ کر شیرازی نے دروازے میں کنجی لگائی پھر چونک پڑا۔ تالے پر تازہ خراشیں تھیں، اُسے معلوم تھا کہ فلیٹ خالی ہے کیونکہ اُس کا ملازم کا نور چھٹی لے کر گیا ہوا تھا، اُس نے پھرتی کے ساتھ دروازہ کھولا۔ کمرہ خالی تھا۔ شیرداد کو وہ بھول چکا تھا، اُس کی سمت دیکھے بغیر وہ اندر

داخل ہوا، رہائشی کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ لائٹ جل رہی تھی اور ہر چیز بکھری پڑی تھی۔

٭

شیرداد نے منہ کھولا۔ شیرازی نے جلدی سے سرگوشی میں کہا "خاموش۔ آواز نہ نکالنا" شیرداد کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، غیر معمولی جسامت کے باوجود وہ حیرت انگیز طور پر اُس کے ساتھ بالکل بے آواز چل رہا تھا۔ شیرازی نے تیزی سے ہال پار کیا اور کچن میں پہنچ کر وہ دروازہ کھولا جو عقبی زینے پر کھلتا تھا۔ لمبے سیاہ بالوں والا ایک شخص آہنی زینے سے نیچے اُتر رہا تھا۔ وہ نصف سیڑھیاں اُتر چکا تھا۔ اُس کا چہرہ زرد اور ناک چپٹی تھی، آنکھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں اُس نے پلٹ کر شیرازی کو دیکھا اور چھلانگ لگا کر کئی کئی سیڑھیاں اُترنے لگا۔ شیرازی آگے بڑھا لیکن اُسے چکر آ گیا، سر کا زخم اب تک دُکھ رہا تھا۔ "آپ بیٹھیے بھائی جان" شیرداد نے ایک ہاتھ سے اُسے پیچھے گھسیٹا "میں اِس جھینگر سے نمٹتا ہوں"۔ اُس نے دہاڑ کر شیرازی سے کہا۔

اپنی جسامت کے باوجود وہ فائر اسکیپ کے آہنی زینے سے اتنی تیزی سے اُتر رہا تھا کہ شیرازی حیران رہ گیا لیکن شیرازی جانتا تھا کہ وہ کامیاب نہیں ہوگا، اُس نے ابھی نصف سیڑھیاں طے کی تھیں کہ پُراسرار حملہ آور گیٹ سے باہر نکل گیا۔

٭

شیرداد ہانپتا ہوا کمرے میں واپس داخل ہوا تو شیرازی کمرے میں ہر سمت بکھرے ہوئے سامان کا جائزہ لے رہا تھا، ہر سمت کاغذات کپڑے اور کتابیں بکھری پڑی تھیں، میز کے پیچھے دیوار میں بنی ہوئی خفیہ الماری محفوظ تھی لیکن اُسے کھولنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی تھی، شیرداد نے ہر سمت نظر ڈالتے ہوئے کہا "بھاگ گیا سالا" وہ نڈھال ہو کر کرسی پہ بیٹھ گیا۔

"ایک نہیں دو سالے تھے" شیرازی نے جواب دیا۔ "ہماری اچانک آمد نے انھیں بھاگنے پر مجبور کر دیا۔"

اچانک شیرداد اچھل کر کھڑا ہو گیا، اُس کی نظر ہال کی دیوار پہ جمی ہوئی تھی اور منہ حیرت و استعجاب سے کھل گیا تھا، حیرت کی بات بھی تھی کیونکہ پوری دیوار پر ایسے عجیب نوادرات سجے ہوئے تھے جو اُس نے کبھی نہ دیکھے تھے۔ پھانسی کا پھندہ، ریوالور، خنجر، زہر سے بھری شیشیاں، زہریلے تیر، غرضیکہ ایسی بے شمار شیا تھیں اُن میں سے ہر ایک شیرازی کی ایک ایڈونچر کی یادگار تھی، وہ جس کسی مجرم کو ٹھکانے لگاتا اُس کی ایک یادگار چیز دیوار پہ سجا لیتا، شیرداد کو یہ حقیقت نہیں معلوم تھی کہ دراز قد، خوب صورت اور شوخ مزاج شیرازی نواب شجاعت علی خاں کا بیٹا تھا، اُس نے باپ کی موت کے بعد جاگیردارانہ زندگی کو ترک کر دیا۔ لندن اور جرمنی میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد جب وطن واپس آیا تو جرائم کے خلاف جہاد شروع کر دیا۔ وہ بلا کا ذہین، نڈر اور بے باک تھا، دولت کی کمی نہ تھی لیکن ہمیشہ سادہ زندگی بسر کرتا تھا، جلد ہی جرائم کی دنیا میں اُس کا نام خوف و احترام سے لیا جانے لگا۔ بڑے بڑے مجرم اُس کے نام سے تھراتے تھے، اُس کی سحر انگیز شخصیت بہت جلد لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتی تھی۔ اُس کا کوئی دوست نہ تھا سوائے کافور کے جو بظاہر اُس کا ملازم تھا لیکن درحقیقت اُس کا وفادار دوست، شیرازی نے افریقہ میں اُسے ایک ظالم اور جابر شخص کے چنگل سے نجات دلائی تھی، وہ بلا کا طاقتور اور ذہین تھا۔ اگر اُس وقت موجود ہوتا تو شیرداد یقیناً اُسے دیکھ کر حیران رہ جاتا۔

"بھائی جان۔ یہ۔ یہ دیوار پہ کیا سجا رکھا ہے؟ دیکھ کر ڈر لگتا ہے" شیرداد نے پوچھا۔

"یہ سب مختلف مجرموں کی یادگاریں ہیں پیارے جنھیں میں کیفر کردار کو پہنچا چکا ہوں"

"تو۔ تو آپ کوئی ڈاکو۔ میرا مطلب ہے کوئی"

"نہیں یار۔ بس جرم کے خلاف مہم جوئی میری ہابی ہے" شیرازی نے اُس کی بدحواسی پر مسکراتے ہوئے کہا۔

شیرداد چند لمحے خاموش کھڑا سوچتا رہا، پھر رازدارانہ انداز میں بولا "ایک بات بتلاؤں بھائی جان۔ کوئی خطرناک اور جرائم پیشہ گروہ تمھارے پیچھے لگ گیا ہے، تمھیں بہت محتاط رہنا چاہیے"

"فکر نہ کرو شیرداد۔ اُسے جلد ہی انجام تک پہنچا دوں گا" شیرازی نے کہا "آؤ تمھارے لیے چائے بناؤں۔ کچن میں ہی بات کریں گے"

چائے پیتے ہوئے شیرداد نے اچانک پوچھا "بھائی جان ایک بات کہوں۔ آپ کو مدد کی ضرورت ہے اور اب آپ تنہا نہیں ہیں۔ آپ کا بھائی آپ کے ساتھ ہے، جب ضرورت ہو پیلس ہوٹل سے طلب کر لیں"

"شکریہ شیرداد۔ میں یاد رکھوں گا"

شیرداد نے گھڑی دیکھی اور اچھل کر کھڑا ہو گیا "غضب

ہوگیا۔ نادرہ انتظار کر رہی ہوگی۔" وہ بدحواسی کے عالم میں بولا۔
"اچھا بھائی جان میں چلتا ہوں۔" وہ تیزی سے دروازے کی سمت بڑھا پھر رک گیا پھر پلٹ کر بولا۔ "بھائی جان۔ میں نے آپ کا نام تو پوچھا ہی نہیں۔"

شیرازی بے ساختہ ہنس دیا۔ "مجھے شیرازی کہتے ہیں۔" اُس نے بتلایا۔ شہزاد تیزی سے باہر نکل گیا۔

✱

شیرازی اپنی آرام کرسی پر دراز سوچ رہا تھا۔ اب اس بات پہ کوئی شک نہ رہا تھا کہ بدری بلڈنگ پہ ہونے والا اچانک حملہ محض اتفاق نہ تھا۔ جیب تراش اُس کی جیب سے فلیٹ اور سیف کی چابی اور ایسے کاغذات حاصل کرنا چاہتا تھا جن سے وہ معلومات حاصل کر سکے لیکن انھیں تلاش کس چیز کی تھی؟ یہ سلسلہ نابندہ سے ملاقات کے فوراً بعد شروع ہوا تھا، اُسے یقین ہو چکا تھا کہ اُس کے پیچھے آرزو کا ہاتھ نہیں تھا لیکن سوال یہ تھا کہ لمبے بالوں والے پستہ قد کو اُس کے فلیٹ کس نے بھیجا تھا؟ اُس کا بہت امکان تھا کہ سہاگ ایجنسی کا کوئی فرد ملوث ہو لیکن کون؟

شیرازی نے اُٹھ کر فون پر ایک نمبر ملایا۔ ذرا دیر بعد ایک غراتی ہوئی آواز سنائی دی۔ "ہے لو۔"

"ہیلو سکندر۔" شیرازی نے کہا۔

فون پر اچانک ایک خوفناک قہقہہ گونجا۔ "شیرازی بالو۔ ارے کہاں تھے بھیا تم اتنے دن۔ سب خیریت تو ہے۔ ارے بولو ہمارے لیے کوئی کھدمت بتلاؤ۔ ہم تو کھادم ہیں تمھارے بس حکم کرو۔"

"سکندر۔ ایک معمولی سی خدمت ہے۔ ایک جیب کترے کی تلاش ہے۔" اُس نے سارا واقعہ سنا کر لمبے بالوں والے کا حلیہ بتلایا۔ "اُس نے لوہے کی راڈ سے حملہ کیا تھا۔" شیرازی نے کہا۔

"ارے ہم مر کیوں نہ گئے اُس سے پہلے۔" سکندر غصے میں غرایا۔ "ہمارے ہوتے ہوئے کسی کی یہ مجال۔ بس اب پھکر نہ کرو، اُس کا حشر خراب کر دیں گے ہم۔"

"نہیں سکندر۔ ابھی اُسے ہاتھ نہ لگانا۔ بس یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ کون ہے اور کس کے لیے کام کر رہا ہے۔" شیرازی نے جلدی سے کہا۔

اُسے معلوم تھا کہ سکندر اسی لمحہ تلاش شروع کر دے گا۔ کسی زمانے میں سکندر شہر کا بدنام ترین بدمعاش تھا، کوئی جرم ایسا نہ تھا جس میں وہ ملوث نہ ہو لیکن یہ شیرازی کا کارنامہ تھا کہ اُس نے سکندر کی مجرمانہ زندگی سے توبہ کرا دی، اب وہ ریتی گھاٹ میں واقع "سکندر کلب" کا مالک تھا جہاں باکسنگ اور باڈی بلڈنگ کی تربیت دی جاتی تھی اور وہیں اُس کا سکندر ہوٹل بھی تھا۔ شہر کا کوئی چور اچکا اور بدمعاش ایسا نہ تھا جو سکندر کی نظروں سے پوشیدہ ہو۔ سب اُس سے ڈرتے تھے کیونکہ اُس کے شاگردوں کی تعداد سینکڑوں میں تھی جو سکندر کے اشارے پر جان دینے کو تیار رہتے تھے۔ جب شیرازی نے اُسے قتل اور ڈکیتی کے الزام میں سزا سے بچایا تھا سکندر اُس کا "کھادم" ہو گیا تھا۔ شیرازی مشکل مواقع پر اُس سے بلاتکلف مدد لیا کرتا تھا۔

اُس نے دوسرا فون ڈیلی نیوز کے رپورٹر کو کیا جو خوش قسمتی سے مل گیا۔ "اوہ ہیلو شیرازی۔" خاور خوشی سے چلایا۔ "جلدی بولو۔ خبر یقیناً سنسنی خیز ہو گی۔"

"بکواس بند کرو اور غور سے سنو۔" شیرازی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "سنسنی خیز خبر چاہیے تو دو کام کرو۔ سہاگ ایجنسی کی ڈائرکٹر مس آرزو کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرو اور اپنا بھدا سا منہ بند رکھو۔"

"ہائے کس پری چہرہ پر عاشق ہوئے ہو یار۔ کمبخت بالکل ٹھنڈی ہے، برف کی طرح۔"

"میں نے ابھی کہا کہ اپنا تھوبڑا بند رکھو۔ ورنہ کوئی خبر نہ ملے گی۔"

"اچھا بابا۔ وعدہ۔ اب نام بھی لیا تو سزاوار۔ لیکن وعدہ یاد رہے، کہانی ڈیلی نیوز کی ہے۔"

شیرازی نے فلیٹ کی حتیٰ الامکان صفائی کی اور پھر کار لے کر سیدھا جاوید موٹرز کے شوروم پہنچا۔ عاصم نے کار رکتے دیکھی تو جلدی سے باہر آیا۔ "خیر تو ہے شیرازی صاحب۔ کیا گاڑی۔۔؟"

"نہیں عاصم۔ گاڑی کا تو جواب نہیں۔ ایک کام کرنا ہے۔ اُسے فی الحال شوروم میں رکھوا اور مجھے کوئی سیکنڈ ہینڈ گاڑی چند روز کے لیے دے دو۔"

"جی ابھی تو آپ کی پرانی گاڑی سروس ہو کر تیار ہے اسی کو لے لیجیے۔" عاصم نے کہا۔ "اور ہاں۔ آج ایک کوئی مال دار گاہک آیا تھا، بالکل آپ کے ماڈل کی ایسی ہی رسٹریز مانگ رہا تھا، ادائیگی نقد لیکن شرط یہ تھی کہ رنگ ڈارک ریڈ ہو۔ بھلا بتلایئے کہ۔"

"تم رات بھر میں کسی نئی گاڑی کا رنگ تبدیل کر کے اُسے دے دو ورنہ تمھاری خیریت نہیں۔" شیرازی نے ہنستے ہوئے کہا۔

اپنی پرانی مزدا لے کر وہ آرزو کے سابقہ کلرک اور تابندہ کے گم شدہ شوہر کی تلاش میں نکلا، پتہ اُس نے آرزو سے لے لیا تھا، ڈیلوی شرن کا مکان شہر کی ایک غریب آبادی میں منومان اسٹریٹ پر تھا، یہ علاقہ ملازم پیشہ لوگوں کا تھا، ہر سمت گندگی کے ڈھیر اور بے رنگ مکانات تھے، اُس نے کار سڑک کے میدان میں کھیلتے ہوئے لڑکے کار کے گرد جمع ہو گئے، اُن سے پتہ پوچھ کر وہ کچھ دُور جانے کے بعد ایک تین منزلہ عمارت کے سامنے رُکا، یہ امرناتھ بلڈنگ تھی، دلیوی شرن کا فلیٹ دوسری منزل پر تھا۔ اُس نے اُوپر دیکھا تو ایک کھڑکی کی آڑ سے دو چہرے جھانکتے نظر آئے، ایک تو مرد تھا لیکن دوسرا بلاشبہ کسی عورت کا چہرہ تھا جو پھُرتی کے ساتھ پیچھے ہٹ گئی، شیرازی گاڑی سے اترا اور بھاگتا ہوا بلڈنگ کے عقب میں پہنچا، ایک تنگ سی گلی بلڈنگ کے پیچھے چلی گئی تھی، امرناتھ بلڈنگ کے عقبی زینے سے اُتر کر ایک عورت تیزی سے مخالف سمت میں جا رہی تھی، اچانک اُس نے گھوم کر دیکھا۔ شیرازی حیران رہ گیا۔

وہ شیرداد کی ہونے والی بیوی نادرہ تھی۔

❁

شیرازی نے اُس کا تعاقب نہیں کیا بلکہ تیزی سے زینہ طے کرتا ہوا اُوپر چڑھنے لگا، دوسری منزل پر جیسے ہی وہ مڑا ایک عورت سے زوردار ٹکر ہوئی، شیرازی اگر پکڑ نہ لیتا تو وہ گر پڑتی، اسی دوران اُس نے دروازہ کھلنے اور کسی کے تیز قدموں کی چاپ سن لی تھی، عورت اُسے غصّے میں گھور رہی تھی، شیرازی نے مسکرا کر اُسے دیکھا اور تیسری منزل کا زینہ چڑھنے لگا، موڑ پر پہنچ کر وہ رُک گیا اور آہستہ سے نیچے جھانکا، عورت وہیں کھڑی تھی لیکن وہ قطار سے بنے ہوئے باتھ روم کی سمت دیکھ رہی تھی، ذرا دیر بعد ایک باتھ روم کا دروازہ کھلا اور ایک سر باہر نکلا، عورت نے تیسری منزل کی سمت اشارہ کیا، چند لمحہ بعد ایک شخص وہاں سے تیزی کے ساتھ نکلا اور درمیان کے ایک دروازے میں داخل ہو گیا۔ عورت نیچے اُتر گئی۔

واپس دوسری منزل پر آ کر دلیوی شرن کے دروازے پر شیرازی نے بہت آہستہ سے دستک دی، جیسے ہی ذرا سا دروازہ کھلا شیرازی نے زور کا دھکا دیا۔ ایک دُبلا پتلا سا شخص گھبرا کر پیچھے ہٹا، اُس کا چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا تھا۔

"ک۔ کون ہو تم؟ یہ کیا حرکت ہے۔" وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا۔

"حرکت تو تم اب دیکھو گے دلیوی شرن۔" شیرازی نے اُسے خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ "اگر تم نے سچ سچ نہ بتلایا تو۔"

"میں کچھ نہیں جانتا۔ میں۔"

"شٹ اپ۔" شیرازی نے آگے بڑھ کر اُسے دھکا دیا۔ وہ کرسی میں دھنس گیا۔ "اگر ذرا بھی حرکت کی تو خود ذمّہ دار ہو گے۔" اُس نے آگے بڑھ کر میز کی دراز کو دیکھا، اُس میں ایک چھوٹا سا تالا لگا ہوا تھا۔ اُس نے تالے کو پکڑ کر ایک زوردار جھٹکا دیا۔ تالا کھُل گیا۔

"یہ۔ یہ تم کیا کر رہے ہو۔؟" دلیوی شرن نے گھبرا کر کہا۔

شیرازی نے خونخوار انداز میں اُس کی سمت قدم بڑھایا۔ وہ سہم کر کرسی کی پشت سے لگ گیا۔ دراز کھولتے ہی اوپر رکھی ہوئی وہ نیلی فائل نظر آ گئی جس پر سہاگ چھپا ہوا تھا۔ شیرازی نے فائل کھولی تو اُوپر ہی وہ تصویر نظر آئی، چہرہ خوب صورت لیکن نسوانیت لیے ہوئے تھا۔ بلاشبہ یہ ارشد جمیل تھا، اُس نے ورق اُلٹا، نیچے وہ دونوں خطوط لگے ہوئے تھے جو ڈاک سے واپس آ گئے تھے، اُس کے نیچے دوسرے کاغذات تھے۔ شیرازی نے فائل بند کی، میز پر بیٹھ کر جیب سے سگریٹ نکال کر جلائی اور پیکٹ دلیوی شرن کی سمت بڑھایا۔ "لو سگریٹ پیو۔" اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم اس حرکت پر پچھتاؤ گے۔"

"تم اپنی فکر کرو بیٹے۔ یہ فائل تم نے چوری کی ہے، ثبوت تمھارے گھر سے برآمد ہو چکا ہے، سزا تم کو ملے گی۔ مس آرزو کے دفتر سے اور بھی چیزیں چوری ہوئی ہیں اور تم۔"

"نہیں۔ اس فائل کے علاوہ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔" اُس نے گھبرا کر کہا۔

"پھر بھی الزام تم ہی پر آئے گا۔ کم از کم تین سال کی سزا ہو گی۔ ارشد کہاں ہے؟"

دلیوی شرن نے خشک لبوں پہ زبان پھیری۔ "مجھے نہیں معلوم۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔"

"ہمیشہ چھوٹی مچھلی پھنستی ہے۔ تمھاری قسمت خراب ہے بیٹے۔ فائل کیوں چوری کی تھی؟"

"میں۔ میں مجبور تھا۔" اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"کس نے تمھیں مجبور کیا تھا؟ بیوقوف نہ بنو دلیوی شرن، تین سال قید بامشقت اور اُس کے بعد تاریک مستقبل، تم کیوں کسی کے لیے تباہ ہونے پر تلے ہو؟"

"میں اُس کا نام نہیں جانتا۔" اُس نے شکست خوردہ

آواز میں کہا۔

"وہ تمہیں ابھی یاد آجائے گا۔" شیرازی نے اچانک جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ "کیا اس شخص نے تمہیں مس آرزو کے یہاں اسی کام کے لیے ملازمت کرنے کو کہا تھا؟"

"ہاں۔ اور میں اس کا حکم ماننے پر مجبور تھا۔"

"کیوں؟ تم اس شخص سے اتنے خوف زدہ کیوں ہو؟ وہ کیوں تمہیں بلیک میل کر رہا ہے؟"

"مجھ سے کبھی ایک غلطی ہو گئی تھی جس سے وہ واقف ہے۔ لیکن بھگوان کی قسم میں نے اور کچھ نہیں چرایا۔ اس کا موقع ہی نہیں ملا۔ مس آرزو نے مجھے اپنے کمرے میں دیکھ لیا اور فوراً نکال دیا۔"

"تم اس کا نام نہیں جانتے، حلیہ تو جانتے ہو؟ وہی بیان کرو۔"

"حلیہ؟ لیکن وہ کبھی ٹھیک سے سامنے نہیں آیا۔ وہ ہمیشہ تاریکی میں آتا ہے اور کار سے باہر نہیں نکلتا۔ وہ"

"کار کیسی ہے۔ نمبر کیا ہے؟"

"کار۔ سیاہ رنگ کی لانبی سی بیوک ہے۔ نمبر میں نے کبھی نہیں دیکھا۔"

"تمہیں ہدایات کیسے ملتی ہیں؟"

"ڈاک کے ذریعہ۔ تمہیں یقین نہیں آتا تو دیکھ لو۔"

اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک پرانا سا پرس نکالا، اس میں سے ایک خط نکال کر آگے بڑھایا، اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ "یہ ارشد جمیل کی فائل کے متعلق ہے پڑھ لو۔" اس نے کہا۔ "میں نے اسی لیے رکھ لیا تھا کہ شاید کام آجائے، لو دیکھ لو۔"

"ایک منٹ ٹھہرو۔" شیرازی نے اچانک کہا۔ آہٹ ہلکی تھی لیکن اس نے سن لی تھی۔ چند لمحہ خاموشی رہی دروازے کے پاس کوئی یقیناً تھا، اس نے قریب رکھا بھاری ایش ٹرے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ "تم سچ کہہ رہے ہو؟"

"بھگوان کی قسم۔ بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔"

شیرازی اسے باتوں میں لگائے رکھنا چاہتا تھا تاکہ باہر جو بھی ہے اسے شبہ نہ ہو۔ "نہیں بیٹے۔ تم نے اور بھی فائلیں چوری کی ہیں۔ کتنی؟"

دلیپ شرن نے ہار مان لی اور تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تقریباً پانچ چھ لیکن مجھے نہیں معلوم کہ اسے ان کی کیوں ضرورت تھی۔ کچھ اس نے خود مجھ سے لی تھیں اور کچھ دوسروں کے ذریعہ منگوائی تھیں۔"

"اوہ۔ لیکن تم نے اس پراسرار شخص کی شکل نہیں دیکھی جو کار میں آتا تھا؟"

"نہیں۔"

"تم نے کس کس کی فائلیں چوری کی تھیں؟ یہ تو یاد ہوگا؟ کیا ان میں کوئی مس نادرہ کی فائل بھی تھی؟"

"ہاں۔ نادرہ کی فائل تو سب سے آخر میں چوری کی تھی اور"

دروازہ اچانک تھوڑا سا کھلا، شیرازی نے ایش ٹرے اٹھا لیا لیکن کوئی اندر داخل نہیں ہوا۔ اور پھر اچانک گولی چلنے کا دھماکہ ہوا اور دلیپ شرن کراہتا ہوا کرسی سے نیچے گرا، گولی اس کے سر سے پار ہو گئی تھی۔

○

دروازہ زور سے بند ہوا، شیرازی نے فوراً چھلانگ لگائی لیکن اسی لمحہ باہر سے کنجی گھومنے کی آواز آئی، شیرازی نے پوری قوت سے ہینڈل کو کھینچا لیکن دروازہ مقفل تھا۔ قاتل اسے اندر بند کر کے فرار ہو چکا تھا۔ اس نے کمرے میں ہر سمت نگاہ دوڑائی لیکن دروازہ کھولنے کے لیے کوئی چیز نظر نہ آئی، دلیپ شرن کے سر سے بہنے والا خون گردن تک پھیل چکا تھا جسم بے حس و حرکت تھا، شیرازی نے ایک کرسی اٹھا کر پوری قوت سے دروازے پر ماری، کرسی ٹوٹ گئی لیکن دروازہ اتنا مضبوط تھا کہ کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ لپک کر دریچے کے پاس پہنچا اور آڑ سے باہر جھانکا لیکن کوئی نظر نہ آیا۔ عقبی احاطہ اور گلی سنسان پڑی تھی، دریچے کے بالکل برابر سے لوہے کا پائپ نیچے تک چلا گیا تھا۔ اس نے چھجے پر کھڑے ہو کر پائپ کو پکڑا اور زور دے کر آزمایا۔ پائپ مضبوط تھا، اس نے پائپ پکڑا اور نیچے پھسلنا شروع کر دیا۔ ایک عورت نے دریچے سے سر نکال کر جھانکا، شیرازی کو دیکھ کر خوف سے اس کا منہ کھل گیا لیکن اس کے چیخنے سے پہلے شیرازی نیچے پہنچ چکا تھا۔ احاطے کے دروازے سے نکل کر وہ بھاگتا ہوا گلی کے نکڑ پر پہنچا لیکن اسی لمحہ ایک چھوٹی نیلے رنگ کی کار تیزی کے ساتھ جاتی نظر آئی، فاصلہ اتنا تھا کہ وہ نمبر بھی نہ دیکھ سکا، اتنی پھرتی سے کام لینے کے باوجود قاتل فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

شیرازی جب دوبارہ زینے پر پہنچا تو وہی عورت نیچے اتر رہی تھی جسے اس نے کھڑکی سے جھانکتے دیکھا تھا، شیرازی کو دیکھ کر وہ خوف سے پیچھے ہٹی۔ "گھبراؤ نہیں۔ میں چور نہیں ہوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ دوسری منزل پر دلیپ شرن کے فلیٹ کے سامنے پہنچا، کنجی دروازے میں لگی ہوئی تھی اور ایک عورت سامنے کھڑی تھی، شیرازی نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی

تھی جس سے وہ ٹکرایا تھا۔

"تم اندر تو نہیں گئی تھیں؟" شیرازی نے پوچھا۔ عورت نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے تو پھر تم یہیں کھڑی رہو۔"

وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ ایک نظر دیکھتے ہی اُس نے اندازہ کر لیا کہ ڈیوی ٹھرن مر چکا تھا۔ اُس نے جلدی جلدی تلاشی لی۔ ڈیوی ٹھرن کی جیب سے سو روپے کے نوٹوں کی موٹی سی گڈی نکلی۔ اُس کے علاوہ ایک چھوٹی سی نوٹ بک تھی جس پر کئی نام اور پتے لکھے ہوئے تھے۔ اُن میں نادرہ کا نام بھی شامل تھا۔ اُس نے نوٹ بک جیب میں رکھی۔ نوٹوں کی گڈی کا سیریل نمبر لکھ لیا اور پھر گڈی جیب میں واپس رکھ دی۔ دوسری جیب سے ایک پرچہ نکلا جس پر تحریر تھا۔ "سنیچر کو آٹھ بجے۔ نامدار اسٹیٹ ماڈل ٹاؤن۔" اُس کے علاوہ کاغذ پر کچھ نہیں لکھا تھا۔ باہر سے عورت نے پکار کر پوچھا۔ "یہ تم اندر کیا کر رہے ہو؟"

"ذرا دیر ٹھہرو۔ میں آرہا ہوں۔" اُس نے پکار کر جواب دیا۔

شیرازی ابھی پولیس کو اطلاع نہیں دینا چاہتا تھا۔ واردات قتل کی تھی اور اُسے کئی افراد دیکھ چکے تھے اس لیے وہ پولیس کی تفتیش میں پھنس جاتا اور ابھی اُسے بہت سے کام کرنے تھے۔ وہ باہر نکلا۔ اب دونوں عورتیں زینے کے پاس کھڑی تھیں۔ شیرازی نے جیب سے کارڈ نکال کر اُن کی سمت بڑھایا۔ "یہ کارڈ رکھ لو۔ اندر نہ جانا۔ میں پولیس کو اطلاع دینے جا رہا ہوں۔"

دونوں نے خوف زدہ ہو کر اُسے دیکھا۔ "پولیس! آخر ہوا کیا ہے؟"

"ڈیوی ٹھرن کو کسی نے قتل کر دیا۔" اُس نے کہا۔

وہ دہشت زدہ عورتوں کو وہیں چھوڑ کر نکلا۔ قریبی ڈرگ اسٹور سے اُس نے اسپیشل برانچ کے ایس پی فاروقی کو فون کیا۔ فاروقی موجود نہ تھا۔ فون انسپکٹر زاہد نے ریسیو کیا۔

"میں شیرازی بول رہا ہوں۔" اُس نے کہا۔ "جنوبان اسٹیٹ کی امرناتھ بلڈنگ میں فلیٹ نمبر ۸ میں ایک قتل ہو گیا ہے۔ میں ٹھہر نہیں سکتا۔ تم فاروقی کو مطلع کر دو۔ میں جلد اُس سے خود ملوں گا۔" ریسیور رکھ کر اُس نے دوبارہ نمبر ملائے۔ ڈیلی نیوز کا رپورٹر خاور موجود تھا۔ اُس نے خاور سے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "خاور۔ گرم گرم خبر ہے اور اُسے تم چھاپ سکتے ہو۔ قتل کی واردات ہے۔ مقتول کا نام ڈیوی ٹھرن تھا۔ بلیک میلر تھا۔ کچھ عرصہ ساگ ایجنسی میں بھی ملازم رہ چکا تھا۔ اگر ممکن ہو تو یہ بات فی الحال ظاہر نہ کرنا۔"

"یار پتہ تو بتلاؤ۔ رہتا کہاں تھا یہ ڈیوی ٹھرن؟" خاور نے بےتاب ہو کر پوچھا۔

"مرے کیوں جاتے ہو۔ پتہ لکھ لو۔" اُس نے پتہ بتلایا اور اسٹور سے باہر نکلا۔

چھ سات لڑکے اُس کی کار کے پاس کھڑے تھے۔ اُس کو دیکھ کر وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گئے۔ اُن میں سے ایک جو پندرہ سولہ برس کا دراز قد اور تنومند تھا بڑی للچائی نظروں سے کار کو دیکھ رہا تھا۔ شیرازی نے مسکرا کر اُس سے پوچھا۔ "تم یہیں رہتے ہو؟"

"ہاں جی۔" اُس نے امرناتھ بلڈنگ کے سامنے والی عمارت کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس بلڈنگ میں۔"

"سیر کرو گے؟ آؤ ادھر بیٹھ جاؤ۔"

لڑکا خوشی سے ہنستا ہوا اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ باقی لڑکے اُسے رشک بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ شیرازی نے کار اسٹارٹ کی اور روانہ ہو گیا۔ مین روڈ پر پہنچتے ہی اُس نے کار پوری رفتار سے آگے بڑھائی۔ لڑکے کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ اُس کے لباس سے غربت عیاں تھی لیکن صحت و جسامت کے لحاظ سے وہ کسی تندرست و توانا جوان سے کم نہ تھا۔ پرنسس اسٹریٹ پر پہنچ کر شیرازی نے اُس سے پوچھا۔

"مزہ آیا؟ نام کیا ہے تمہارا؟"

"گوپال۔" اُس نے جلدی سے کہا۔

"تم کچھ کام نہیں کرتے؟"

"کرتا تھا جی۔" لڑکے نے کہا۔ "پھر بیمار پڑ گیا۔ تو تیر ہو گیا تھا۔ ایک مہینہ اسپتال میں رہا۔ ڈاکٹر کہتا ہے پھیپھڑا خراب ہو گیا ہے۔ بابا کے پاس رقم نہیں تھی اس لیے علاج چھوٹ گیا۔"

"گوپال تم بہت اچھے لڑکے ہو۔" شیرازی نے کہا۔ "تم تھوڑا سا کام کرو تو تمہارے علاج کے لیے رقم بھی مل سکتی ہے۔ بولو تیار ہو؟"

"ہاں جی۔ آپ حکم کریں۔"

شیرازی نے جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر اُسے دیا تو گوپال کو اپنی نظروں پر یقین نہ آیا۔ "امرناتھ بلڈنگ کے آٹھ نمبر فلیٹ پر نظر رکھنا ہے۔" شیرازی نے کہا۔ "وہاں جو آدمی رہتا تھا وہ قتل ہو گیا ہے۔ میرا تعلق پولیس سے نہیں اس لیے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے پولیس کو اطلاع دے دی ہے۔ تم کو یاد کر کے یہ بتلانا ہے کہ فلیٹ نمبر آٹھ میں رہنے والے ڈیوی ٹھرن کے پاس کون کون سے لوگ آتے تھے۔ اگر اُن کے نام پتے معلوم ہو جائیں تو اور اچھا ہے۔ ایک دو

دن میں یہ بات معلوم کر کے مجھے اطلاع دے دو تو انعام ملے گا۔ اور ہاں اگر کوئی پوچھے کہ میرے ساتھ کہاں گئے تھے تو بتلا دینا کہ شاہجہان آباد تک لے جا کر میں نے تم کو اتار دیا تھا۔ ٹھیک ہے؟"

"آپ فکر نہ کریں جی۔ میں ایسا ہی کروں گا۔"

شیرازی کو اچانک خیال آیا، اس نے فائل سے ارشد کی تصویر نکال کر گوپال کو دکھائی "کبھی اس آدمی کو دیکھا ہے تم نے؟"

"ہاں جی۔" گوپال نے خوش ہو کر کہا "یہ کئی بار امرناتھ بلڈنگ میں آتا رہا ہے۔ ہم سامنے ہی کرکٹ کھیلتے ہیں اس لیے مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ لیکن ادھر بہت دنوں سے نہیں دکھائی دیا۔"

گوپال کو وہیں اتار کر وہ اپنے فلیٹ واپس پہنچا تو فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ سپرنٹنڈنٹ فاروقی نے بلا تمہید کے اس پر برسنا شروع کر دیا "یہ کیا حرکت تھی، جانتے ہو کیا ہوا؟ انسپکٹر کھوسا تم کو قتل کے جرم میں گرفتار کرنے جا رہا تھا۔"

"تمہارے ہوتے ہوئے ڈر!" شیرازی نے مسکرا کر کہا۔ فاروقی اس کا پرانا دوست اور کلاس فیلو تھا۔

"لعنت ہو تم پر۔ ہمیشہ پھنسوا دیتے ہو۔ زبردستی یہ کیس اپنے ہاتھ میں لینا پڑا، اب جلدی سے آ کر اپنا بیان دے دو، کچھ پتہ ہے قاتل کون تھا؟"

"اگر یہ پتہ ہوتا تو تم کو کیوں زحمت دیتا۔" شیرازی نے ہنستے ہوئے کہا "بیان بھی ہو جائے گا، بس تھوڑا صبر کر لو۔" اس نے جلدی سے ریسیور رکھ دیا۔ اسی لمحہ دروازے کی گھنٹی زور سے بجی۔

شیرازی نے لپک کر میز کی دراز کھولی لیکن اس کے دونوں پستول غائب تھے، گھنٹی پھر بجی، اس نے جلدی سے کچن کی کھڑکی سے باہر جھانکا اور پھر تیزی کے ساتھ عقبی زینہ اتر کر نیچے پہنچا، احاطے میں کوئی نہ تھا، ایک خوبصورت سی سیاہ بیوک سڑک کے کنارے کھڑی تھی اس نے نمبر نوٹ کیا اور پھر دبے پاؤں سامنے والے زینے کو طے کرتا ہوا اوپر پہنچا، فلیٹ کے دروازے پر مس آرزو کھڑی بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی۔

"اوہ ہیلو آرزو۔ کیا دیر سے انتظار کر رہی ہو؟" شیرازی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

○

نیم تاریکی میں بھی اس کے حسن کی آب و تاب نمایاں تھی، شیرازی نے دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ آرزو نے جلدی سے ہاتھ روک لیا "میرا خیال ہے کہ فلیٹ کے اندر کوئی موجود ہے۔" اس نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

"ہے تو نہیں۔ ذرا دیر پہلے تھا۔" شیرازی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "کچھ زیادہ ہی محتاط ہو گیا ہوں اس لیے عقبی زینے سے نکل کر یہ دیکھنے آیا تھا کہ دروازے پر کون ہے۔" اس نے دروازہ کھولا اور آرزو کو اندر چلنے کے لیے اشارہ کیا۔ دروازہ بند کر کے وہ مڑا تو آرزو کمرے میں بکھرے ہوئے سامان کو دیکھ رہی تھی "یہ سب میں نے جنونِ عشق میں نہیں کیا ہے، کسی چور نے میرے فلیٹ کی تلاشی لی تھی، ملازم چھٹی پر ہے اس لیے صفائی نہ ہو سکی۔"

"حیرت ہے۔ پہلے جیب کترے نے حملہ کیا۔ پھر چور نے فلیٹ کی تلاشی لی۔ یہ سلسلہ کیا ہے شیرازی؟"

"آپ شام کا اخبار پڑھیں گی تو سلسلہ سمجھ میں آ جائے گا۔" شیرازی نے دراز سے ارشد جمیل کی فائل نکال کر سامنے رکھی آرزو کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"یہ فائل آپ کو کہاں سے ملی؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"دیوی شرن کے پاس سے۔" شیرازی نے جواب دیا اور اسے تمام تفصیل سناتے ہوئے کہا "اسے فائل چوری کرنے کے لیے سہاگ میں ملازمت کی ہدایت ایک پراسرار شخص نے دی تھی جو عموماً ایک سیاہ بیوک میں آتا تھا۔"

"آپ واقعی حیرت انگیز آدمی ہیں شیرازی۔" اس نے بڑی شیریں آواز میں کہا "میں آپ کو یہی بتلانے آئی تھی کہ نادرہ ٹھیک لڑکی نہیں ہے، دیال کا جو آدمی اس کی نگرانی کر رہا تھا اس نے نادرہ کو دیوی شرن کے فلیٹ جاتے دیکھا تھا۔"

"آرزو۔ اگر آپ نے اسے فرار ہوتے دیکھا ہوتا تو بہت لطف اندوز ہوتیں۔"

"میں کئی ہفتوں سے پریشان تھی۔ اب تک پانچ فائلیں چوری ہو چکی ہیں، ان میں بعض ایسے افراد کی ہیں جن کی شادی کو برسوں گزر چکے ہیں اور جو بڑی خوش و خرم ازدواجی زندگی بسر کر رہے ہیں۔"

"لیکن دیوی شرن کے پاس بس یہی ایک تھی افسوس کہ میں زیادہ پوچھ گچھ نہ کر سکا کیونکہ کسی انجانے قاتل کی گولی نے اس کی کھوپڑی میں سوراخ کر دیا۔"

آرزو سکتے کے عالم میں اسے گھورتی رہی، اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا "اوہ میرے خدا۔ نوبت قتل تک پہنچ گئی۔" اس نے کچھ دیر بعد کہا۔

"ہاں۔ اور سلسلہ ابھی شروع ہوا ہے۔" شیرازی نے کہا۔

"آپ کے پاس ان گم شدہ فائلوں والے افراد کی کچھ تفصیلات ہیں؟"

"ہاں۔ میں دراصل اسی لیے آئی تھی۔ کچھ تفصیلات دفتر میں موجود تھیں اور باقی زونی نے اپنی یادداشت کے ذریعہ مکمل کی ہیں۔ میرا خیال ہے ان سے کام چل جائے گا۔" اس نے کاغذات شیرازی کو دیتے ہوئے کہا۔

"آپ کو زونی پر کس حد تک اعتماد ہے؟"

"زونی پر؟ میں ان پر اتنا ہی اعتماد کرتی ہوں جتنا اپنی ذات پر۔"

"تب پھر آپ کے دفتر میں کوئی نہ کوئی ناقابلِ اعتماد فرد ضرور موجود ہے۔ ذرا غور کر کے بتلایئے۔"

"دفتر میں کل سات افراد ہیں۔" اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ "ہماری ایجنسی بہت مشہور ہے، کام بھی بہت ہے ہمارے پاس۔ استقبالیہ میں زونی سمیت تین، دو پبلسٹی کے شعبے میں اور دو وزیٹر جو ہر رشتے کے سلسلے میں چھان بین کے لیے لڑکے اور لڑکی کے گھر جاتی ہیں اور پھر مجھے اپنے تاثرات بتلاتی ہیں۔ اگر ضرورت ہوتی ہے تو میں خود جا کر بھی ملاقات کرتی ہوں۔ لیکن میں کسی پر شبہ نہیں کر سکتی۔"

"آپ کا طریقۂ کار واقعی بہت موثر ہے۔" شیرازی نے کہا۔ "مس آرزو۔ اگر کسی نے آپ کو پسند کر لیا تو۔؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"اسے مایوسی ہوگی شیرازی۔ کیونکہ میں شادی شدہ ہوں۔" شیرازی کا منہ حیرت سے پھیل گیا، اس کی کیفیت دیکھ کر وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ "شیرازی۔ کیا اب آپ یہ معلوم کرنے پر توجہ دیں گے کہ یہ فائلیں کیوں چوری کی گئیں؟"

"شہر میں پولیس کا محکمہ بھی موجود ہے۔" شیرازی نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بے شک۔ لیکن اس طرح بات اخبارات تک پہنچ جائے گی اور اگر ایسا ہوا تو میرا بزنس تباہ ہو جائے گا لیکن آپ بغیر کسی پبلسٹی کے اس کا پتہ چلا سکتے ہیں۔"

"لیکن آرزو۔ میں تابندہ سے وعدے کا پابند ہوں البتہ اگر اس کوشش کے دوران ان گم شدہ فائلوں سے متعلق کچھ معلوم ہو گیا تو تم کو ضرور مطلع کروں گا۔"

اسی لمحہ دروازے پر دستک ہوئی، شیرازی جانتا تھا کہ گھنٹی کے بجائے دستک صرف اخبار والا دیتا ہے اس لیے دروازہ کھول کر اخبار لیا اور پھر مسکراتا ہوا آرزو کے پاس پہنچا۔

"آرزو۔ شاید۔ یہ تصویر آپ کو پسند آئے۔"

اخبار کے صفحۂ اول پر شیر دادا کے ساتھ اس کی تصویر چھپی تھی۔ اس کے نیچے شیرازی پر حملے کی خبر تھی۔ "اتنا مال دار احمق میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔" آرزو نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"آرزو۔ آج کل آپ کا ذہن بہت منتشر ہے۔ یہ شخص احمق نہیں۔ بلا کا چالاک ہے۔ وہ آپ کے دفتر میں کوئی لفافہ چھوڑ کر نہیں آیا تھا، اس نے واپس آنے کا جھوٹا بہانہ بنایا تھا کیونکہ جس صوفے پر سے اس نے لفافہ اٹھایا تھا میں اس پر بیٹھا ہوا تھا، وہاں پہلے کوئی لفافہ نہ تھا۔"

"واقعی؟" آرزو نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں۔ مجھے شبہ ہے کہ وہ یہ معلوم کرنے آیا تھا کہ میں آپ کے دفتر میں کس لیے آیا تھا۔ یہ گوریلا مجھے پسند ضرور آیا ہے لیکن فی الحال اس پر ذرا بھی اعتبار کرنا نادانی ہوگی۔ امید ہے آپ۔" اس کا جملہ نامکمل رہ گیا کیونکہ کسی کے تیز تیز قدموں کی چاپ زینے پر سنائی دی۔ آنے والے قدم کسی عورت کے تھے۔ دوسرے ہی لمحہ گھنٹی زور سے بجی۔ آرزو دروازے کی سمت لپکی۔ "زونی معلوم ہوتی ہے۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ اگر کوئی خاص بات ہو تو یہاں آ جائے۔" لیکن شیرازی نے آگے بڑھ کر اسے بازو سے پکڑا اور پیچھے گھسیٹ لیا۔ گھنٹی پھر بجی۔ "نہیں۔ ضروری نہیں کہ یہ زونی ہو۔ آپ یہیں ٹھہریں، دروازہ میں کھولتا ہوں۔"

شیرازی نے دروازہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھولا اور پھرتی سے ایک سمت ہٹ گیا، یہ اچھا ہوا ورنہ تابندہ اتنی تیزی سے داخل ہوئی تھی کہ ٹکر ہو جاتی۔

"شیرازی صاحب۔ ارشد کا خط مجھے ابھی ابھی ملا ہے وہ۔" اور پھر اچانک اس کی نظر آرزو پر پڑی، حیرت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں، وہ کینہ بھری نظروں سے اسے گھور رہی تھی۔

"ارے بھئی۔ آپ دونوں تو ایک دوسرے سے واقف ہیں۔" شیرازی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کاش ایسا نہ ہوا ہوتا۔" تابندہ نے سرد لہجے میں کہا۔ "انھوں نے میرے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے۔"

"مجھے افسوس ہے تابندہ۔ میں اس غلطی کی تلافی کی ہر ممکن کوشش کروں گی لیکن یقین جانو اس میں میرا کوئی قصور نہ تھا۔" آرزو تیزی کے ساتھ فلیٹ سے باہر نکل گئی۔

چند لمحہ خاموشی طاری رہی، پھر تابندہ نے شرمندہ لہجے میں کہا۔ "شاید مجھ سے غلطی ہو گئی، مجھے اتنا تلخ لہجہ اختیار

نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"کوئی بات نہیں۔" شیرازی نے تسلی دی۔ "جذبات کی رَو میں ایسی غلطی ہو جاتی ہے۔ ہاں کہاں ہے وہ خط جس کا تم ذکر کر رہی تھیں؟"

اُس نے ایک کے بجائے دو لفافے پرس سے نکالے۔

"آج شام تو یہ ملا ہے لیکن میں پہلا خط بھی لیتی آئی تاکہ آپ تحریر ملا کر اندازہ کر لیں کہ یہ ارشد نے ہی لکھا ہے۔ مجھے تو کوئی فرق محسوس نہیں ہوا۔"

شیرازی نے دیکھا کہ دونوں لفافوں پر ایک مضافاتی ڈاک خانے پر "آب نگر" کی مہر تھی، تحریر میں بھی بظاہر کوئی فرق نہ تھا، دستخط بھی یکساں معلوم دیتے تھے، مختصر سا خط تھا۔ "تابندہ ڈارلنگ۔ میں تم سے بہت شرمندہ ہوں لیکن حالات مجھے کچھ بہتر نظر آتے ہیں، تم ہوٹل میں ہی مقیم رہو، تمہاری رقم محفوظ ہے بلکہ کچھ منافع کے ساتھ واپس مل جائے گی۔ میں جلد تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ تمہارا ارشد۔"

"مجھے تو تحریر میں فرق نہیں معلوم ہوتا۔" شیرازی نے کہا۔ "یہ ضرور ممکن ہے کہ اس سے بجبر یہ لکھوایا گیا ہو اور مقصد صرف تم کو مطمئن رکھنا ہو۔" تابندہ۔ تم نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ ممکن ہے ارشد بھی کسی فریب کا شکار ہو گیا ہو اور جب تم دوبارہ ملو تو وہ بالکل بے گناہ اور مظلوم ثابت ہو۔"

"ممکن ہے۔ لیکن یہ بھی تو ممکن ہے شیرازی صاحب کہ یہ خط صرف اس لیے لکھا گیا ہو کہ کہیں میں پولیس کو خبر نہ کر دوں۔"

"ہاں۔ ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا، اچھا چھوڑو اس بحث کو یہ بتلاؤ کہ مس آرزو سے تمہاری خفگی کا سبب صرف یہ ہے کہ اُس نے ارشد سے تمہیں ملوایا یا اور کچھ؟"

"اُس کے علاوہ مجھے اُس سے کوئی شکوہ نہیں شیرازی صاحب۔"

"کیا ارشد کے پاس کوئی سیاہ رنگ کی بیوک تھی؟"

"نہیں تو۔ اُس کے پاس تو ایک پرانی ٹرائمف ہے۔"

"تم جب مس آرزو کے دفتر میں گئی تھیں تو کس کس سے ملاقات ہوئی تھی؟ کسی نے تم پر خاص توجہ دی تھی؟ میرا مطلب ہے ارشد کے علاوہ۔"

"آرزو اور زونی کے علاوہ؟ ہاں۔ یاد آیا، وہاں ایک دبلا پتلا سا نوجوان بھی تھا، کیا نام تھا اُس کا۔ یہ پتہ نہیں کچھ سارن جیسا نام تھا، وہ میرے ارد گرد بہت گھومتا تھا۔ ایک دن باہر ملا تو ڈنر کی دعوت بھی دی تھی۔ لیکن پتہ نہیں کیوں مجھے اس کی شکل سے ہی چڑ ہو گئی تھی، میں نے ارشد سے بھی اُس کی شکایت کی تھی لیکن اُس نے ہنس کر ٹال دیا۔"

شیرازی سوچتا رہا پھر سنجیدہ لہجے میں بولا۔ "سنو تابندہ۔ یہ معاملہ ہر لمحہ پیچیدہ اور پُراسرار ہوتا جا رہا ہے، مجھے اس کے پیچھے کوئی سازش نظر آتی ہے لیکن تم فکر نہ کرو البتہ میرا ایک دوستانہ مشورہ ہے، تم سرفراز کو سب کچھ سچ سچ بتلا دو۔ اور پھر دیکھو کیا ردِ عمل ہوتا ہے۔"

"سب کچھ بتلا دوں۔؟" اُس نے گھبرا کر پوچھا۔

"ہاں تابندہ۔ سب کچھ، یہ بہت ضروری ہے، پھر جو بھی ردِ عمل ہو تم اُس سے کہو کہ مجھ سے ملاقات کرے، تمہاری ملاقات اُس سے کب ہوگی؟ کیا یہ ممکن ہے کہ تم اُسے رات کو میرے ساتھ ڈنر کھانے کے لیے مدعو کر لو؟"

"ہاں۔ وہ خود مجھے ڈنر کے لیے دعوت دے گیا تھا۔"

"ٹھیک۔ وہ آئے یا نہ آئے لیکن تم ٹھیک آٹھ بجے دلکشا کے ڈائننگ ہال میں میرا انتظار کرنا۔"

تابندہ کے جانے کے چند منٹ بعد وہ تیزی کے ساتھ باہر نکلا، دلکشا ہوٹل اس کے فلیٹ سے بمشکل دس منٹ کے فاصلے پر تھا۔ تمام راستے وہ چوکنا رہا لیکن اس کے علاوہ کسی نے تابندہ کا تعاقب نہیں کیا، وہ جیسے ہی ریسپشن پر کنجی لینے کے لیے رکی شیرازی تیزی سے آگے نکل کر سیڑھیوں پر پہنچ گیا، اُسے معلوم تھا وہ لفٹ سے آئے گی اس لیے بھاگتا ہوا تیسری منزل پر پہنچ گیا لیکن کاریڈور میں جانے کے بجائے زینے کی آڑ میں ہی رک گیا۔ ذرا دیر بعد لفٹ رکنے کی آواز آئی، تابندہ لفٹ سے اتر کر سیدھی اپنے کمرے تک گئی۔ وہ جیسے ہی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی شیرازی تیزی سے آگے لپکا۔ اچانک اُسے تابندہ کی خوف زدہ آواز سنائی دی۔

"تم۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" پھر اس کے لبوں سے گھٹی ہوئی چیخ نکلی جیسے کسی نے منہ دبا دیا ہو۔

شیرازی نے بہت آہستہ سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا، کمرے میں مکمل سناٹا طاری تھا، تابندہ فرش پر بے حس و حرکت پڑی تھی، پتہ نہیں بے ہوش یا مردہ، لانبے بالوں والا ایک پستہ قد شخص ڈریسنگ ٹیبل کی تلاشی لینے میں اتنا منہمک تھا کہ شیرازی جب سر پہ پہنچ گیا تب چونکا، پھر بھی برق رفتاری کے ساتھ وہ جیب سے پستول نکال کر گھوما لیکن شیرازی نے بھی بڑی سرعت کے ساتھ اُس کے جبڑے پر آہنی مکا رسید کیا تھا۔ پستہ قد دور جا گرا، پستول سے چلنے والی گولی چھت سے ٹکرائی، دھماکے سے کمرہ گونج اٹھا، شیرازی نے لپک کر فرش پہ گرا ہوا پستول اٹھا لیا، پستہ قد بے حس و حرکت پڑا تھا لیکن بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ پھر بھی اُس میں اٹھنے کی سکت نہ تھی، اسی لمحہ دروازے پہ ہلکی سی آہٹ ہوئی، شیرازی پھرتی کے ساتھ پلٹا۔

دیو پیکر شیر داد دروازے میں کھڑا تھا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ اس کے پیچھے ہوٹل کا اسٹیوارڈ اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"خدا کی پناہ بھائی جان — یہ کیا ہو رہا ہے؟ پستول تو ہٹا لیجئے کہیں چل نہ جائے اور" پھر اچانک اس کی نظر تابندہ پر پڑی، وہ پستول کی پروا کیے بغیر لپک کے آگے بڑھا۔ "ارے یہ تو زندہ ہے میں سمجھا تھا مار ڈالا آپ نے بیچاری کو" اس نے تابندہ کو اٹھایا اور بستر پر لٹا دیا۔ "اور یہ کون ذات شریف چاروں خانے چت پڑے ہیں۔ خدا کی پناہ — یہ تو وہی جھینگر کی اولاد ہے جس نے آپ پر حملہ کیا تھا۔ آپ ہٹ جائیے، مجھے روکئے گا نہیں — آج اس کو نہیں چھوڑوں گا —" اس نے شیرازی کو ہٹاتے ہوئے کہا اور کسی درندے کی طرح غراتا ہوا آگے بڑھا۔ "آج نہیں چھوڑوں گا تجھے — کچا چبا جاؤں گا —"

وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر جھینگر کی اولاد کی گردن دبوچنے کے لئے جھکا۔ دوسرے ہی لمحہ ناک پر ایک بھرپور مکا پڑا۔ لمبے بالوں والے نے برق رفتاری سے شیر داد کی پھیلی ہوئی ٹانگوں کے درمیان سے نکل کر شیرازی کے پستول والے ہاتھ پر جھپٹا مارا۔ لیکن شیرازی پھرتی کے ساتھ ہٹ گیا۔ اس نے دروازے کی سمت چھلانگ لگائی، شیرازی نے ٹانگ ماری اور وہ دروازے کے پاس منہ کے بل گرا۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھ سکتا شیرازی نے پستول کا دستہ اس کی گردن پر مارا، لمبے بالوں والا کراہ کر ڈھیر ہو گیا۔ شیرازی نے اسے بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور گھسیٹ کر کرسی پر ڈال دیا۔ شیر داد اب تک اپنی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو صاف کر رہا تھا۔ اچانک وہ دھاڑ کر اٹھا۔ "میں اس کی ہڈیاں چبا جاؤں گا —"

شیرازی درمیان میں آ گیا۔ "پہلے آنسو صاف کر لو اور پھر تابندہ کو ہوش میں لانے کی کوشش کرو۔" اس نے غصے میں کہا۔

"لیکن بھائی جان —"

"ہڈیاں اور گوشت بعد میں چبانا — شکل سے ہی آدم خور لگتے ہو،" شیرازی نے ڈانٹا۔ "ویسے میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم یہاں کیسے پہنچ گئے؟"

"میں بہرہ تو نہیں ہوں بھائی جان — برابر والے کمرے میں تھا، گولی چلنے کی آواز سن کر بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا تو آپ پر نظر پڑی۔"

"خوب — ہر بات کا جواب تمہارے پاس موجود رہتا ہے۔" شیرازی نے طنز کیا۔

لیکن اسی وقت ہوٹل کا منیجر اور عملے کے کئی افراد بھاگتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے، شیرازی نے انہیں صورتحال بتلا کر پولیس کو طلب کرنے کی ہدایت کی، پندرہ منٹ کے اندر ایک سب انسپکٹر دو سپاہیوں کے ساتھ پہنچ گیا، شیرازی نے سب انسپکٹر کو یہ نہیں بتلایا کہ لمبے بالوں والا پہلے اس کی جیب بھی صاف کر چکا تھا، اسے حیرت تھی کہ شیر داد نے بھی زبان بند رکھی۔ منیجر نے ہوٹل کی خاتون اسٹیورڈ کو بلا لیا تھا جو تابندہ کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھی، پولیس لمبے بالوں والے کو ہتھکڑی پہنا کر لے گئی۔ منیجر نے بتلایا کہ اس نے ڈاکٹر کو بلا لیا ہے، شیرازی نے جھک کر دیکھا، تابندہ کے گلے پر اب تک انگلیوں کے نشان تھے۔ اس نے شیر داد کو اشارہ کیا اور دونوں کمرے سے باہر نکل آئے۔

"آپ میرے کمرے میں چل کر بیٹھئے بھائی جان" شیر داد نے کہا۔ "میں گرم گرم کافی پلواتا ہوں آپ کو، ویسے آپ انسان نہیں چھلاوہ ہیں ہر جگہ پہنچ جاتے ہیں۔"

"اپنے متعلق کیا خیال ہے شیر داد — تم پیلس ہوٹل سے دلکشا کب منتقل ہو گئے؟"

"میں — میں منتقل نہیں ہوا بھائی جان — آپ غلط نہ سمجھئے، پیلس میں نادرہ مقیم ہے میں نہیں، اب ہمارا ایک ہوٹل میں قیام مناسب نہیں تھا بس ایک دن کی تو بات ہے، کل ہم ہمیشہ کے لئے ایک ہو جائیں گے۔" — شیرازی جانتا تھا کہ شیر داد جھوٹ بول رہا تھا لیکن خاموش رہا۔ "آپ کو ہماری شادی میں آنا ہوگا، اب یہاں میرا کون ہے آپ کے سوا — آپ ہی میرے بزرگ ہوں گے اور شادی کے گواہ بھی — ہے نا بھائی جان —؟"

"تم کو جھوٹ بولنا بھی نہیں آتا شیر داد" شیرازی نے کہا۔

"آپ مجھے جھوٹا کہہ رہے ہیں بھائی جان؟ کوئی بات نہیں آپ بڑے ہیں — کوئی اور کہتا تو میں اس کی گردن توڑ دیتا۔"

"شکریہ شیر داد — ویسے اطلاعاً عرض ہے کہ میری گردن بہت مضبوط ہے۔" شیرازی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "کافی کا شکریہ۔"

دلکشا کے منیجر سے اسے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ تابندہ اور اس کے شوہر کی آمد کے چار دن بعد شیر داد وہاں آیا تھا اور اس نے خاص طور پر تابندہ کے برابر والا کمرہ کرایہ پر لیا تھا۔ فلیٹ واپس پہنچ کر اس نے پیلس ہوٹل فون کیا تو یہ تصدیق ہو گئی کہ شیر داد نے وہاں بھی قیام کیا تھا، اس کا کمرہ اب تک وہاں بک تھا لیکن وہ کئی دن سے وہاں نہیں گیا تھا اور نادرہ بھی واقعی پیلس میں مقیم تھی۔ وہ دوسری منزل پر کمرہ نمبر ۲۰۳ میں ٹھہری ہوئی تھی جب کہ شیر داد تیسری منزل کے کمرہ نمبر ۳۲۳ میں مقیم تھا۔ اس انکشاف نے شیرازی کو الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ شیر داد کی شخصیت پراسرار ہوتی جا رہی تھی۔ تابندہ میں اس کی دلچسپی ان گنت شبہات کو جنم دے رہی تھی۔

کافور کو آج واپس آ جانا تھا۔ شیرازی نے اس کے نام ایک پرچہ لکھ کر میز پر چھوڑا اور سیدھا پرنس کلب پہنچا۔ خاور اتفاق سے موجود تھا۔ اسے ساتھ لے کر وہ ڈنر کھانے ہوٹل شہر یار روانہ ہو گیا۔

کھانے کا آرڈر دینے کے بعد شیرازی نے کہا: "اب سناؤ خاور۔ تم نے اب تک کیا تیر مارا؟"

"سب سے پہلے تو یہ سن لو کہ میرا باقاعدہ تعاقب کیا جا رہا ہے۔" خاور نے بتلایا۔ "اور پھر مجھے یہ بتلاؤ کہ یہ سب کیا چکر ہے؟"

"نہیں۔ پہلے تم مجھے یہ بتلاؤ کہ مس آرزو کے بارے میں کیا معلوم کیا؟"

"مس آرزو نہیں۔ مسز جاوید کہو شیرازی۔ پونم روڈ پر اس کا ایک بڑا شاندار بنگلہ ہے 'ارم'۔ اس کی شادی چھ برس قبل ایک مالدار شخص جاوید آذری سے ہوئی تھی جو منشیات کا عادی تھا، دو سال پہلے ایک ہسپتال میں اس کا انتقال ہو گیا اس سے ایک بیٹا ہے۔ آرزو بڑی تنہا زندگی بسر کرتی ہے، دولت کی افراط کے باوجود نہ وہ کلب جاتی ہے نہ سوسائٹی کے ہنگاموں میں شریک ہوتی ہے خود کو مصروف رکھنے کے لئے یہ ایجنسی کھول رکھی ہے، صاف ستھرا کاروبار ہے، اس کے خلاف کوئی ایک بات بھی نہیں معلوم ہو سکی۔ سہاگ کی مصروفیات کے بعد اپنے پانچ سالہ بچے کے ساتھ وقت گذارتی ہے۔"

"شاباش تم نے واقعی محنت کی ہے" شیرازی نے ہنستے ہوئے کہا: "چلو اسی بات پر بل میں دے دوں گا۔"

ہاں دیوی شرن وہاں صرف چند ہفتے ملازم رہا تھا۔ ویسے اب تک پولیس نے اس سمت توجہ نہیں کی ہے۔"

"صرف تمہاری اطلاع کے لئے۔ قاتل گرفتار ہو چکا ہے۔" شیرازی نے اسے دلکشا کا واقعہ سناتے ہوئے کہا: "لیکن یہ خبر ابھی شائع ہونے کے لئے نہیں ہے۔ اس نے کوئی بیان نہیں دیا، نام تک نہیں بتلایا، اب پولیس سے یہ تفصیلات تم کو معلوم کرنا ہیں۔"

"کمال ہے شیرازی۔ تم یہ خبر اتنی دیر سے سنا رہے ہو مجھے فوراً جانا چاہیئے، ویسے تمہارا کیا خیال ہے، یہ افریقی گوریلا اس معاملے میں ملوث ہے؟"

"ہاں۔ لیکن کسی حد تک۔ ابھی یہ نہیں کہا جا سکتا۔ تم اس کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرو اور خاور۔ محتاط رہنا مجھے اس سازش کے پیچھے خطرناک لوگ نظر آتے ہیں۔"

"شکریہ دوست" خاور نے ہنستے ہوئے کہا "تعاقب شروع ہوتے ہی میں نے اندازہ کر لیا تھا معاملہ خطرناک ہے۔"

شیرازی اپنے فلیٹ پہنچا تو کافور واپس آ چکا تھا، ہر چیز ایک بار پھر سلیقے سے سجی ہوئی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے سلام کیا: "میری غیر حاضری میں کسی نے فلیٹ کی تلاشی لی تھی سر۔ کوئی خاص بات ہوئی تھی؟"

"ہاں کافور بہت سی خاص باتیں" شیرازی نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا: "تمہارے بغیر تو سارا کام چوپٹ ہو جاتا ہے۔"

"شکریہ سر۔ میں نے آپ کی ہدایت کے مطابق سکندر کو فون کیا تھا۔ اس نے بتلایا کہ اب تک کوئی کامیابی نہیں ہوئی اس کے خیال میں یہ کسی پیشہ ور جیب کترے کی حرکت نہیں تھی۔"

"اس کا خیال ٹھیک ہے کافور۔ ویسے وہ جیب کترا اب حوالات میں ہے۔"

"اوہ تو آپ نے سارا معاملہ پہلے ہی نمٹا دیا؟"

"نہیں کافور۔ ابھی تو صرف ابتدا ہوئی ہے۔ کیا فاروقی نے فون کیا تھا؟"

"دو مرتبہ سر۔ وہ ٹھیک ساڑھے دس بجے خود آ رہے ہیں، آپ کو انتظار کرنے کے لئے کہا ہے۔ آپ کے لئے کافی لے آؤں پھر تفصیل سنائیے گا۔"

کافی کے دوران شیرازی نے اسے اب تک پیش آنیوالے واقعات کی تفصیل سنائی۔ کافور تعلیم یافتہ اور ذہین شخص تھا، وہ اس کا ملازم ضرور تھا لیکن شیرازی اسے ملازم سے زیادہ دوست تصور کرتا تھا۔ کافور نے تمام واقعات سننے کے بعد کہا: "معافی چاہتا ہوں سر لیکن میرے خیال میں آپ نے تمام لوگوں پر اعتماد کر کے اچھا نہیں کیا ہے۔ آپ نے مس آرزو، مسٹر شیر داد کو بھی ہر بات بتلا دی ہے۔ آخر کیوں؟"

"ممکن ہے میں نے غلطی کی ہو کافور۔ سوال یہ ہے کہ فاروقی کو کس حد تک بتلایا جائے۔ مس آرزو کو ڈر ہے کہ اگر یہ باتیں پولیس کے علم میں آ گئیں تو ان کا بزنس تباہ ہو جائے گا۔"

"لیکن سر۔ اب جب کہ قاتل گرفتار ہو چکا ہے میرے خیال میں آپ کو فاروقی صاحب کو سب کچھ بتلا دینا چاہیئے، اسی میں سب کا مفاد ہے، اور فاروقی صاحب بعض باتوں کو خود راز رکھ سکتے ہیں۔"

اسی لمحے گھنٹی بجی۔ "لو شاید وہ فاروقی آ گئے" شیرازی نے کہا۔

کافور نے دروازہ کھولا کسی نے بھاری آواز میں کہا "مجھے شیرازی صاحب سے ملنا ہے۔ بہت ضروری کام ہے، کیا وہ موجود ہیں؟"

"آپ ایک منٹ انتظار کریں۔ میں دریافت کرتا ہوں" نوجوان نے بڑی پھرتی کے ساتھ آگے بڑھنے کی کوشش کی لیکن دوسرے ہی لمحہ اس کا بازو کافور کی گرفت میں تھا اور گرفت بھی ایسی کہ وہ کراہ اٹھا، اس کی عمر کافور کے لگ بھگ تھی اور یوں بھی طاقتور نظر آتا تھا لیکن مڑے ہوئے بازو نے اسے بالکل بے بس

کردیا تھا۔ اس نے غصے میں کافور کو گھورا۔ کافور نے بڑے ملائم لہجے میں کہا۔ "میں نے آپ کو انتظار کرنے کے لئے کہا تھا جناب"

شیرازی دروازے میں کھڑا ہال میں ہونیوالے اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "انہیں اندر آنے دو کافور۔"

کافور نے اسے چھوڑ دیا، وہ اپنا بازو سہلاتا ہوا آگے بڑھا۔

"غلطی میری تھی لیکن یہ شخص بلا کا پھرتیلا اور طاقت ور ہے۔۔۔۔ مجھے آپ سے ایک اہم مسئلہ پر بات کرنا ہے شیرازی صاحب۔"

"فرمائیے۔ کیا اہم مسئلہ ہے۔"

"میری ایک دوست آپ کے پاس مشورے اور مدد کے لئے آئی تھیں۔ مسئلہ بھی انہیں کا ہے۔ میری مراد مس تابندہ سے ہے۔"

"ہاں تابندہ میرے پاس آئی تھی۔۔۔ اندر آجاؤ سرفراز، وہ تم سے آٹھ بجے ملنے والی تھی، تم اس کے نہ پہنچنے پر پریشان ہو رہے ہوگے۔ وہ بالکل خیریت سے ہیں لیکن۔۔۔"

"لیکن کیا شیرازی صاحب۔۔۔؟"

"سپرنٹنڈنٹ فاروقی یہاں پہنچنے والے ہیں۔ تفصیل میں ان کی موجودگی میں بتلاؤں گا۔"

سرفراز کرسی پر بیٹھا ہوا کافی پی رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر دیوار پر پڑی۔ "ہائیں یہ کیا۔۔۔ یہ تو بلیک میوزیم معلوم ہوتا ہے۔"

"تم نے بلیک میوزیم کا نام کہاں سنا؟" شیرازی نے چونک کر پوچھا۔

"اوہ۔۔۔ میں اپنے ایک دوست کے ساتھ ایک مرتبہ پولیس ہیڈ کوارٹر گیا تھا۔ کئی سال پرانی بات ہے۔ وہ مجھے تہہ خانے میں واقع بلیک میوزیم دکھانے لے گیا تھا جہاں مشہور مجرموں کی یادگاریں دیکھی تھیں۔" اس نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"شیرازی صاحب، یہ تابندہ کس مصیبت میں پھنس گئی ہے؟ مجھے شروع سے ہی شک تھا، وہ ہر لمحہ خوفزدہ اور پریشان سی رہتی تھی۔"

"اب تو تم کو اندازہ ہوگیا ہوگا لیکن تم نے بھی تو اسے تاریکی میں رکھا، تمہارا اصلی نام کیا ہے؟"

سرفراز اتنی زور سے اچھلا کہ کافی چھلک کر میز پر گر پڑی۔

"اوہ معاف کیجئے گا۔" اس نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ کافور نے کپڑا لے کر فوراً میز صاف کر دی۔ "میرا اصلی نام عزت یار ہے لیکن میں عام طور پر اپنی عرفیت سرفراز کے نام سے ہی پکارا جاتا ہوں۔ عزت یار کچھ ہے بھی تو دشوار" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اسی لمحہ کچن سے کافور نے آواز دی۔ "سر۔ کیا آپ ایک منٹ کے لئے زحمت کریں گے؟"

شیرازی معذرت کر کے اٹھا اور کچن میں پہنچا۔ "بولو۔ کیا قیامت آگئی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"آپ اس شخص کے سامنے ساری باتیں فاروقی صاحب کو بتلانے جا رہے تھے۔ لیکن آپ نے کچھ محسوس کیا؟"

"تمہارا مطلب یہی ہے نا کہ اس نے اب بھی اپنا نام غلط بتلایا ہے، اتنی عقل تو میرے پاس بھی ہے کافور تم فکر نہ کرو، لو شاید فاروقی آگیا۔"

*

شیرازی نے ابتدا سے لے کر اب تک کے تمام واقعات تفصیل کے ساتھ بیان کر دیئے، فاروقی توجہ اور خاموشی کے ساتھ سنتا رہا، درمیان میں سرفراز کئی بار چونکا اور کچھ بولنا چاہا لیکن پھر خاموش رہ گیا، لیکن جیسے ہی شیرازی خاموش ہوا وہ پریشانی کے عالم میں بولا۔

"آپ نے تو مجھے پریشان کر دیا شیرازی صاحب، اگر یہ سب کچھ سچ ہے تو کیا تابندہ کو اس گروہ سے خطرہ ہے؟ میرا مطلب ہے کہ وہ اس سے کیا چاہتے ہیں؟"

"ہاں۔۔۔ اس سارے معاملے میں تابندہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ وہ لوگ تابندہ سے کیا چاہتے ہیں یہ تو مجھے نہیں معلوم لیکن خود سوچو۔۔۔ پہلے دیوی شرن کا اس میں غیر معمولی دلچسپی لینا اور ڈنر کی دعوت دینا اور پھر ارشد کی شادی کا فراڈ۔ اس کے بعد ارشد کی فائل کی گمشدگی تاکہ اس کے بارے میں کوئی سراغ نہ لگایا جاسکے، پھر دیوی شرن کا قتل تاکہ وہ کچھ بتلا نہ سکے اور آخر میں شیرداد کی تابندہ میں اتنی دلچسپی کہ اس کے برابر والا کمرہ حاصل کر کے ہوٹل میں قیام کرے۔۔۔ اور اس کے بعد تابندہ پر حملہ تاکہ اس کے کمرے اور سامان کی تلاشی لی جاسکے۔ تابندہ کے پاس ایسی کیا چیز ہے جسے وہ حاصل کرنا چاہتے ہیں؟" اس نے فاروقی کی سمت دیکھا۔

"ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا سوائے اس کے کہ آرزو اور اس کی ایجنسی کے خلاف ہمارے پاس ذرہ برابر کوئی ثبوت نہیں ہے دونوں کی اچھی شہرت ہے، جس شخص کو تابندہ کے کمرے سے گرفتار کیا گیا وہ اپنی زبان نہیں کھولتا۔ ہمارے پاس اس کے خلاف کوئی ریکارڈ نہیں تھا، اس کی شناخت بھی اب تک ہم نہیں کر سکے۔۔۔ لیکن لوگوں نے پہچان لیا ہے کہ دیوی شرن کا قاتل وہی ہے۔۔۔ اس لئے اب تم ہماری نظروں میں مشتبہ نہیں رہے۔" اس نے مسکرا کر شیرازی سے کہا۔ "ویسے تمہارا اپنا کیا خیال ہے شیرازی؟"

"ابھی کچھ نہیں۔۔۔ سوائے اس کے کہ اس معمہ کی کنجی تابندہ ہے۔۔۔ اسی لئے اس کی سخت حفاظت اور نگرانی کا انتظام ہونا چاہئے۔"

"تم اس کا فکر نہ کرو، تم نے پہلی مرتبہ ہم سے کوئی راز نہیں رکھا شیرازی۔۔۔ اس لئے ہمارا بھی مکمل تعاون تم کو ملے گا۔" وہ جانے

کے لئے کھڑا ہو گیا۔

"آپ جا رہے ہیں سر؟" سرفراز نے بھی فوراً کھڑے ہو کر مودبانہ لہجے میں کہا۔

فاروقی کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد سرفراز بھی چلا گیا۔ شیرازی نے مسکراتے ہوئے کافور کی سمت دیکھا۔ "کیا خیال ہے تمہارا کافور؟"

"میرے خیال میں آپ نے صاف گوئی سے کام لیکر اچھا کیا سر، ویسے میں سرفراز اور شیرداد کے پراسرار کردار سے مطمئن نہیں ہوں۔"

"ہاں کافور — وہ جتنا چالاک بنتا ہے اتنا نہیں ہے شروع سے ہی اس نے ڈرامائی انداز اختیار کیا تھا جس کا فریب ایک دم ظاہر ہو گیا، اس کے برخلاف تابندہ بہت سیدھی سادھی ہے تم ملو گے تو اندازہ ہوگا۔" اس نے کہا۔ "ایک بات اور ہے، سرفراز کا اس طرح تابندہ کی محبت میں گرفتار ہونا بھی بے مقصد نظر نہیں آتا، لیکن میرا خیال ہے کہ — بلیک میوزیم کے ذکر نے اس کو کسی حد تک بے نقاب کر دیا تھا۔ پھر ذرا غور کرو — سرفراز ایک اجنبی تھا جس کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے، میں نے اس کی موجودگی میں فاروقی کو ساری تفصیلات سنائیں، فاروقی نے اس کی موجودگی پر ایک بار بھی اعتراض نہ کیا، یہ بات کیا باعث تعجب نہیں ہے؟ اور پھر آخری ثبوت — فاروقی جب جانے کے لئے کھڑا ہوا تو سرفراز بھی اچھل کر باادب کھڑا ہو گیا، اس کا انداز گفتگو کتنا مودبانہ تھا — جیسے کوئی ماتحت اپنے افسر سے بات کر رہا ہو۔"

"بیشک — بیشک آپ سچ کہتے ہیں، اس کا مطلب ہے، سرفراز کا تعلق اسپیشل برانچ سے ہے؟"

"ہاں — اور اسے فاروقی نے تابندہ پر نظر رکھنے کے لئے لگایا ہے، اسے بہت اہم رول دیا گیا ہے اور — اگر یہ سچ ہے تو گویا مجھے پولیس نے تابندہ کے ذریعہ اس مہم پر لگایا ہے۔"

وہ دونوں دیر تک اس پہلو پر غور کرتے رہے، پھر شیرازی نے دلکشا ہوٹل فون کر کے تابندہ کی خیریت پوچھی، اس نے تبلایا کہ سرفراز اس سے ملنے آیا تھا، وہ بہت خوش لگ رہی تھی، شیرازی مطمئن ہو گیا۔

صبح دستک کی تیز آواز سے اس کی آنکھ کھلی، اس نے دریچے کے باہر دیکھا، اجالا پھیل چکا تھا لیکن سورج ابھی نہیں نکلا تھا۔ کوئی مسلسل دروازہ پیٹ رہا تھا، پھر کافور کی آواز سنائی دی۔ "فرمائیے — آپ کو کس سے ملنا ہے؟"

"کس سے ملنا ہے؟ کیا میں غلط جگہ آ گیا ہوں؟ نہیں یہی فلیٹ ہے — میرے بھائی جان کہاں ہیں؟ ارے تم ہٹو راستے سے — تم ہو کون راستہ روکنے والے — میں کہتا ہوں ہٹتے ہو یا نہیں؟"

شیرداد نے کافور کو دھکا دے کر ہٹانا چاہا — اور یہی اس کی غلطی تھی، کافور نے اس کی کلائی کو مضبوطی سے پکڑا اور دوسرے ہی لمحہ شیرداد تکلیف سے دھاڑا، شیرازی مسکراتا ہوا آگے بڑھا۔

"چھوڑ دو کافور بس کافی ہے۔" اس نے کہا۔ "اب ان کو سبق مل گیا ہے۔ آئندہ کسی شریف آدمی کو دھکا نہیں دیں گے۔"

"خدا کی پناہ — یہ انسان ہے یا کوئی بلا؟ بھائی جان اس نے کس چیز کا ہاتھ پایا ہے — فولاد کا؟" اس نے کلائی سہلاتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال غلط نہیں تو یہ جوجتسو جانتا ہے۔"

"تم رات کو سوتے نہیں ہو شیرداد۔ اتنے سویرے سویرے ہنگامہ کرنے آ گئے۔" شیرازی نے کہا۔ "غنیمت جانو کلائی ٹوٹی نہیں۔"

"ہنگامہ کرنے نہیں بھائی جان — ذرا ادھر آئیے۔ باہر دیکھئے سڑک پر۔" شیرازی نے کھڑکی سے جھانکا۔ گہرے سرخ رنگ کی نئی مرسڈیز سڑک کے کنارے کھڑی تھی۔ "آج یہ نادرہ کو شادی کا تحفہ دوں گا۔"

"صرف یہی تبلانے کے لئے مجھے اتنے سویرے جگا دیا؟" شیرازی نے غصے میں پوچھا۔

"نہیں ایک بات اور بھی پوچھنا تھی۔ کبھی سمار ریلو کا نام سنا ہے آپ نے؟" اس نے شیرازی کا چہرہ بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"سمار ریلو — ؟ کسی جانور کا نام ہے کیا؟" لیکن شیرداد جواب دینے کے بجائے ہوہو کرتا فلیٹ سے باہر نکل گیا۔ شیرازی حیرانی کے ساتھ دیکھتا رہ گیا۔

❁

شیرازی لباس تبدیل کر کے کمرے میں آیا تو کافور انسائیکلوپیڈیا کے صفحات میں الجھا ہوا تھا۔ "کوئی کامیابی ہوئی؟" شیرازی نے اپنی ٹائی درست کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں سر۔" اس نے جواب دیا۔ "ملتے جلتے نام تو ہیں لیکن سمار ریلو نام کا نہ کوئی جانور ہے نہ مقام۔" کافور نے جواب دیا۔

"کوشش جاری رکھو — اگر کوئی فون آئے تو میں دلکشا ہوٹل میں ہوں اس کے بعد علی امجد اینڈ کمپنیس کے دفتر جاؤں گا، ہاں ایک کام اور کرنا ڈیلی نیوز کے دفتر فون کر کے خاور سے کہنا کہ کسی طرح مس آرزو اور رزدانی کی تصویر حاصل کرے۔"

وہ فلیٹ سے نکل کر باہر آیا۔ کافور نے نئی مرسڈیز گیراج سے نکال کر باہر کھڑی کر دی تھی، شیرازی نے کار کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ دوسری جانب سے ایک آدمی تیزی سے نکل کر بھاگا، شاید وہ کار کی تلاشی لے رہا تھا، شیرازی تیزی کے ساتھ اس کے تعاقب میں دوڑا، کچھ فاصلے پر ایک اور شخص بغل میں بریف کیس لئے کھڑا تھا اور اپنے موزے درست کر رہا تھا، شیرازی نے اسے آواز دی۔ "پکڑ لو اس کو — چور ہے — پکڑ لو اس کو۔" لیکن وہ جیسے ہی بریف کیس

والے شخص کے قریب پہنچا اس نے ٹانگ آگے بڑھادی، شیرازی منہ کے بل گرا، اس سے پہلے کر وہ اٹھ سکتا دونوں آدمی غائب ہو چکے تھے، غصے میں کپڑے جھاڑتا ہوا وہ کار کی سمت واپس آیا۔ کار اسٹارٹ کی تو ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس نے جیب سے سگریٹ نکال کر منہ میں لگائی اور لائٹر کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا تو سگریٹ نیچے گر گئی، غصے میں وہ سگریٹ اٹھانے کے لئے نیچے جھکا۔ اور اسی وقت دھماکا ہوا۔

اسے ہوش آیا تو ہر سمت شعلے ہی شعلے تھے۔ شدید حیرت کے عالم میں اس نے محسوس کیا کہ کوئی اسے باہر گھسیٹ رہا ہے، کئی ہاتھوں نے اسے اٹھا کر فٹ پاتھ پر لٹا دیا۔ پھر کئی لوگوں نے اسے دوبارہ اٹھایا اور جلتی ہوئی کار سے دور لے گئے، شعلوں کی شدید آنچ کے باوجود اسے گرمی کے بجائے سردی سے کپکپی آرہی تھی۔ پھر اسے کچھ ہوش نہ رہا۔

آئینے میں اپنا حلیہ دیکھ کر وہ بے ساختہ ہنس پڑا، پیشانی پر ایک جگہ پلاسٹر چپکا ہوا تھا، ایک سمت کی بھنویں جل گئی تھیں، حادثے کو آدھ گھنٹہ سے زیادہ گذر چکا تھا، اس نے اٹھ کر دریچے سے باہر جھانکا، کار کا جلا ہوا ڈھانچہ اب تک گرم تھا، اس کے گرد مجمع موجود تھا، ایک پولیس والا سب کو دور ہٹا رہا تھا، فائر بریگیڈ کا عملہ ڈھانچے پر پانی ڈال رہا تھا۔ کافور نے دوا کی گولیاں اور کافی کا کپ لا کر سامنے رکھا۔

"ڈاکٹر نے کہا تھا کہ یہ گولیاں کھا لیجئے گا۔ ویسے آپ کا بچ جانا کسی معجزے سے کم نہیں ہے سر۔" اس نے کہا۔ "آپ نے اس مہم میں اب تک بڑی لاپرواہی سے کام لیا ہے۔ خدا کے لئے اب بڑی احتیاط کریں"۔

"تم ٹھیک کہتے ہو کافور۔ سگریٹ کا گرنا اور اسے اٹھانے کے لئے میرا جھکنا محض اتفاق تھا اور اسی نے مجھے بچا لیا۔ ڈیش بورڈ کی آڑ نہ ہوتی تو میں بھی دھماکے میں اڑ جاتا"۔

"فاروقی صاحب کا فون آیا تھا۔ میں نے انہیں تفصیل بتلا دی تھی اور یہ بھی کہ آپ خیریت سے ہیں"۔

سامنے کھڑے مجمع کی وجہ سے شیرازی عقبی دروازے سے باہر نکلا اور پیدل ہی دلکشا ہوٹل کی سمت روانہ ہو گیا، وہ سوچ رہا تھا کہ کافور نے سچ ہی کہا تھا، اس نے ہر بات سب کے سامنے کہہ کر کسی نہ کسی کی دشمنی مول لے لی تھی، کسی کو اس کا وجود اب خطرہ محسوس ہونے لگا تھا، لیکن کس کو؟ آرزو، شیر داد، تابندہ۔ ؟ کون اسے راستے سے ہٹانا چاہتا تھا، فی الحال یہ اندازہ کرنا مشکل تھا۔ وہ لفٹ سے اوپر پہنچا، تابندہ کے کمرے کے سامنے اسپیشل برانچ کا ایک آدمی نگرانی کے لئے بیٹھا ہوا تھا، شیرازی کو پہچان کر وہ مسکرایا۔

شیرازی نے دستک دی، ذرا دیر بعد قدموں کی چاپ سنائی دی لیکن دروازہ کھلا تو وہ حیران رہ گیا۔ تابندہ کے بجائے مس آرزو سامنے کھڑی تھی۔

"او ہو۔ آپ یہاں موجود ہیں؟" شیرازی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تابندہ خیریت سے تو ہے؟"

"جی ہاں۔ اندر آجائیے۔ یہ آپ نے حلیہ کیا بنا رکھا ہے؟"

"اب تک تو صرف سنا تھا کہ محبت میں حلیہ بگڑ جاتا ہے، اب تجربے نے یہ بات بھی ثابت کردی"۔ اس نے آرزو کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"تو پھر آج سے توبہ کر لیجئے عشق سے"۔ آرزو نے شوخ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

وہ اندر داخل ہوئے، تابندہ کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔

"مجھے یقین تھا آپ ضرور آئیں گے شیرازی صاحب۔ میں کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں، آپ نے میری جان بچائی ہے۔"

"یہ محض اتفاق تھا۔ سناؤ طبیعت کیسی ہے؟"

"بالکل ٹھیک ہوں۔ اور ہاں، سرفراز آئے تھے۔ انہوں نے مجھے سب کچھ بتلا دیا، آپ نے اچھا کیا جو انہیں حقیقت بتلا دی ورنہ مجھ میں تو ایسا کرنے کی ہمت نہ تھی، اور شیرازی صاحب۔ سرفراز مجھ سے بالکل خفا نہیں ہیں، اس کے برخلاف وہ"۔ تابندہ اچانک رک گئی چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔

"پہلے سے زیادہ محبت کرنے لگے ہیں۔ یہی کہنا چاہ رہی تھیں نا تم؟" شیرازی نے ہنستے ہوئے کہا، تابندہ صرف مسکرا کر رہ گئی۔ شیرازی اچانک آرزو کی طرف مڑا۔ "اور ہاں آرزو۔ سمار ہلیو کا کیا حال ہے۔ ٹھیک تو ہے وہ۔" اس نے آرزو کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"سمار ہلیو کون؟" آرزو نے حیران ہو کر پوچھا۔ "میں نے تو یہ نام پہلی بار سنا ہے"۔

شیرازی مسکرا کر رہ گیا اور بات ٹال دی، کچھ دیر بعد آرزو چلی گئی، شیرازی نے تابندہ کی سمت دیکھا۔ "تمہاری لڑائی ختم ہو گئی؟"

"میرا خیال ہے آرزو بڑی بااخلاق خاتون ہیں۔ بیچاری دو مرتبہ عیادت کے لئے آچکی ہیں"۔ تابندہ نے کہا۔ "اور ہاں شیرازی صاحب ابھی آپ نے سمار ہلیو کا نام کیوں لیا تھا؟"

شیرازی نے چونک کر اسے دیکھا۔ "تم جانتی ہو اسے؟"

"ہاں۔ یہ تو اس قصبے کا نام ہے جہاں میرے تایا رہتے تھے"۔ تابندہ نے کہا۔ "امی کے انتقال سے پہلے ہم اکثر وہاں جانے کا ارادہ کیا کرتے تھے، میرے تایا افریقہ میں تھے اسی قصبے میں یہ

شیرازی چند لمحے تک حیرت سے تابندہ کو دیکھتا رہا۔ اسے یقین نہ آرہا تھا کہ سماریلو کا راز اتنی آسانی سے افشا ہو جائے گا، پھر اس نے فوراً ہی خود پر قابو پالیا۔ "تابندہ۔ مجھے اپنے تایا کے بارے میں تفصیل سے بتلاؤ۔ جو کچھ بھی جانتی ہو سب کچھ۔"

تابندہ کی آنکھیں غمگین ہو گئیں۔ "میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا کیونکہ وہ نوجوانی میں ہی افریقہ چلے گئے تھے اور پھر کبھی واپس نہیں آئے۔ اکثر ان کا ذکر ضرور سنتی رہی تھی ان کا نام شوکت یوسف تھا والد کے انتقال کے بعد پہلی مرتبہ ان کا خط آیا، انہوں نے مجھے بڑی محبت اور شفقت کے ساتھ تسلی دی تھی، میں نے اس کے جواب میں پہلی بار ان کو خط لکھا، پھر ہماری خط و کتابت جاری رہی، انہوں نے افریقہ میں شادی کر لی تھی، ان کا صرف ایک لڑکا تھا لیکن جوانی میں مر گیا۔ کچھ عرصہ بعد بیوی کا انتقال ہو گیا، وہ بالکل تنہا تھے، ہیروں کا کاروبار کرتے تھے ان کی اپنی کانیں تھیں، انہوں نے بار بار مجھے لکھا کہ دنیا میں میرے سوا ان کا کوئی نہ تھا اس لئے میں امی کو لے کر وہیں آجاؤں، میں نے ضد بھی کی لیکن امی افریقہ جانے کو تیار نہ ہوئیں اور پھر ان کا انتقال ہو گیا۔ امی کے انتقال کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ افریقہ چلی جاؤں گی۔ لیکن اچانک ان کے انتقال کی خبر ملی۔"

"ان کے انتقال کی خبر تم کو کس نے دی؟"

"تایا کافی مشہور آدمی تھے، سماریلو میں ان کی بڑی عزت تھی، وہاں کی سماجی زندگی میں وہ سرگرم حصہ لیتے تھے اور اسی لئے انہوں نے ایک مقامی اخبار "سماریلو ٹائمز" میرے نام جاری کرا دیا تھا جو باقاعدگی سے آتا رہتا تھا۔ ایک دن اسی کے ذریعہ مجھے اطلاع ملی کہ سڑک پار کرتے ہوئے ایک کار نے ان کو ٹکر ماری اور وہ جائے حادثہ پر ہی ہلاک ہو گئے۔" اس نے غور سے شیرازی کی سمت دیکھا اور افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "آپ شاید یہ پوچھیں گے کہ ان کی دولت کیا ہوئی؟ انہوں نے اپنا مکان اور سب کچھ میرے نام چھوڑ دیا تھا، لیکن۔ نقد رقم صرف چند ہزار تھی، اس کے علاوہ وہ ایک کان تھی جو ان کے وکیل کے خط کے مطابق بیکار تھی کیونکہ اس کی کھدائی ہو چکی تھی، اس کان کے علاوہ کئی میل کے بنجر پہاڑی علاقے کی مالک میں ہوں۔ ان کے وکلا نے کاغذات کا جو لفافہ بھیجا تھا وہ میں نے امجد اینڈ کینس کو دے دیا تھا۔"

"کاغذات میں کیا تھا۔؟"

"پہاڑی علاقے کی ملکیت کی دستاویزات، چند کنجیاں جو شاید مکان وغیرہ کی تھیں۔ میں نے انہیں دیکھا بھی نہیں" اس نے گھڑی کی سمت دیکھا "ارے۔ ایک بجنے والا ہے،" سرفراز نے لنچ پر بلایا تھا۔ اس نے چونک کر کہا۔

"ایک منٹ ٹھہرو۔ تم مجھے امجد اینڈ کینس کے نام ایک خط لکھ دو کہ میں تمہارے نمائندے کی حیثیت سے آرہا ہوں۔ ممکن ہے وہ کچھ مزید روشنی ڈال سکیں۔"

تابندہ نے بلا تامل تحریر لکھ کر دے دی۔ شیرازی کے ذہن میں ایک خاکہ تیزی سے ابھر رہا تھا، تابندہ کے تایا کا تعلق افریقہ سے تھا، شیر داد بھی افریقہ سے آیا تھا۔ وہ تابندہ کے کمرے کے برابر آکر مقیم ہوا تھا۔ پھر ایک دوسرے شخص نے تابندہ کے کمرے کی تلاشی لینے کے لئے اسے تقریباً قتل کر دیا تھا۔ انہیں جس چیز کی بھی تلاش تھی اس کا تعلق سماریلو سے تھا، ممکن ہے وہ کوئی ایسی دستاویز ہو جو تابندہ کے وکیل کے پاس محفوظ ہے۔ اور۔ ممکن ہے اسی دستاویز کے لئے تابندہ کے تایا کو بھی قتل کر دیا گیا ہو۔ ان کی موت اتفاقی حادثہ نہ ہو۔

شیرازی جب پیلس ہوٹل پہنچا تو معلوم ہوا شیر داد جا چکا تھا وہ حیران تھا کہ آخر اس احمق کو شادی کے لئے سنٹرل ہوٹل کے انتخاب کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ وہ ٹیکسی کر کے سنٹرل ہوٹل پہنچا، شیر داد کی سرخ مرسیڈیز کھڑی ہوئی تھی، وہ اس ہال نما کمرہ میں پہنچا جہاں شادی کی تقریب کا انتظام تھا، اسٹیج پر بیٹھا ہوا شیر داد چمکدار سوٹ میں کارٹون لگ رہا تھا۔ قاضی صاحب بھی آچکے تھے، انجانے مہمان بیٹھے ہوئے تھے جنہیں شاید ہوٹل سے ہی پکڑ لیا گیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی شیر داد دھاڑا۔

"بھائی جان۔ ادھر آجائیے، میرے پاس۔ قاضی صاحب کو گواہ کی ضرورت ہے۔"

شیرازی اسٹیج پر پہنچ کر اس کے پاس بیٹھ گیا "بڑے جچ رہے ہو۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "لیکن دلہن کہاں ہے؟"

"بس آتی ہی ہو گی۔ بیچاری کے ماں باپ تو ہیں نہیں، سہیلیاں اسے دلہن بنا کر لائیں گی۔"

لیکن جب آدھ گھنٹہ گزر گیا اور نادرہ نہیں آئی تو شیر داد پریشانی اور اضطراب کے عالم میں پہلو بدلنے لگا، لیکن جب چار بج گئے تو شیرازی نے کہا۔ "کیا چکر ہے شیر داد؟"

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اسے تین بجے پہنچ جانا چاہیے تھا۔ آخر کہاں چلی گئی تو"

"ممکن ہے سماریلو چلی گئی ہو۔" شیرازی نے کہا۔

شیر داد اچھل پڑا "سماریلو۔" تو اس نے حیرت زدہ نظروں سے شیرازی کو دیکھا "تو آپ نے پتہ چلا لیا؟ لیکن نادرہ کہاں ہے؟" اور پھر اس سے پہلے کہ شیرازی کچھ سمجھ سکتا شیر داد نے اچھل کر دونوں ہاتھوں میں اس کی گردن دبوچ لی "تم۔ تم۔ ضرور یہ حرکت تمہاری ہے، تم نے نادرہ کو غائب کر دیا ہے، میں تمہارا گلا گھونٹ دوں گا۔"

اس نے دھاڑتے ہوئے کہا۔ وہ اچانک بپھرا ہوا درندہ بن گیا تھا۔

"جلدی بتاؤ کہاں ہے نادرہ۔۔؟" وہ دہاڑا۔

شیرازی بول نہیں سکتا تھا، شیرداد کے آہنی ہاتھوں کی گرفت سے اس کی سانس گھٹ رہی تھی، کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی تھی۔ "کہاں ہے وہ۔ کہاں ہے وہ؟" شیرداد نے اسے جھنجوڑتے ہوتے کہا۔ شیرازی کو یقین ہو چکا تھا کہ چند لمحہ اور گذر گئے تو موت یقینی تھی، اس نے تمام تر قوت سے کام لیتے ہوئے اپنے دائیں پیر سے شیرداد کے گھٹنے پر ٹھوکر ماری، درد سے کراہ کر شیرداد نے اس کی گردن چھوڑی اور گھٹنا سہلانے لگا، لیکن پھر فوراً ہی دوبارہ جھپٹا، اس بار شیرازی کا بھرپور مکا اس کی ٹھوڑی پر پڑا، وہ لڑکھڑاتا ہوا پیچھے ہٹا۔ شیرازی نے پھرتی کے ساتھ پستول نکال کر تان لیا، مہمانوں میں بھگدڑ مچ گئی، ایک لڑکی خوف سے چلانے لگی۔

اسی لمحہ دروازہ کھلا اور مس آرزو اندر داخل ہوئی۔ افراتفری کا یہ منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"نادرہ کہاں ہے۔؟" شیرداد اتنی زور سے دہاڑا کہ آرزو سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔

"میرا خیال تھا وہ یہاں پہنچ چکی ہوگی" آرزو نے کہا "مجھے تھوڑی دیر ہو گئی تھی اس لئے ہوٹل جانے کے بجائے سیدھی یہاں آگئی خدا کرے اسے کوئی حادثہ نہ پیش آگیا ہو"۔

"حادثہ۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں تم دونوں کو زندہ نہ چھوڑوں گا۔ تم میں سے کسی ایک کی سازش ہے۔ میں۔" وہ غصے میں بپھرا ہوا آگے بڑھا۔

"خبردار شیرداد۔ یہ ڈرامہ اب ختم کرو۔ ایک قدم آگے بڑھایا تو فائر کر دوں گا"۔ شیرازی کا لہجہ اتنا خوفناک تھا کہ شیرداد رک گیا۔

"اگر نادرہ نہیں آئی تو۔"

"نادرہ اب نہیں آئے گی احمق۔ تم ہوش میں آجاؤ۔"

وہ چند لمحہ شیرازی کو گھورتا رہا۔ پھر تیزی کے ساتھ باہر نکل گیا، شیرازی آہستہ چلتا ہوا آرزو کے پاس پہنچا۔ "تم نے تو اسے منع نہیں کر دیا؟" اس نے آہستہ سے پوچھا۔

"بخدا نہیں۔ مجھے کچھ خبر نہیں"۔ آرزو نے پریشان لہجے میں کہا۔

قاضی صاحب جلدی سے اٹھ کر ان کے پاس پہنچے۔ "وہ۔ میری فیس کا کیا بنے گا جناب؟" انہوں نے شیرازی سے پوچھا۔

"آپ کی فیس کا؟" وہ مسکراتا ہوا آرزو کی سمت مڑا۔ "اگر یہ بتائیں ہوں تو میں ادا کر سکتا ہوں"۔

"شٹ اپ۔" آرزو نے غصے میں کہا اور باہر نکل گئی۔

⁂

شیرازی ہلیس ہوٹل پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ شیرداد اور مس آرزو ایک ساتھ کھڑے بات کر رہے تھے۔ شیرداد کا کمرہ بند تھا اور وہ دروازے کے سامنے کھڑے تھے، شیرازی پر نظر پڑتے ہی شیرداد غرایا۔

"تم پھر آگئے۔" اس کا مودبانہ لہجہ اب بدل چکا تھا، آرزو نے مڑ کر دیکھا تو دور ہٹ گئی۔

"مجھے چھوت کی بیماری نہیں ہے"۔ شیرازی نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر شیرداد کی سمت دیکھا۔ "مجھے تم سے ضروری بات کرنا ہے شیرداد۔"

"میں تم سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا"۔

"بات تو تم کو کرنا ہوگی۔ سمار بلو کا معاملہ اب صاف کرنا ہوگا"

"اوہ۔ تو یہ بات ہے۔" شیرداد غرایا۔ "بولو کیا کہنا ہے؟"

"یہاں نہیں اپنے کمرے میں چلو۔ اس کا کرایہ آخر کس لئے دے رہے ہو؟"

آرزو معذرت کر کے فوراً چلی گئی، شیرداد نے جیب سے چابی نکالی لیکن دروازہ نہیں کھولا۔ "اب بولو کیا بات ہے"؟

"بات یہ ہے کہ اب اداکاری چھوڑ دو اور صاف صاف بتلاؤ کہ تم کون ہو، یہاں کیا کرنے آئے ہو اور نادرہ سے شادی کا یہ ڈرامہ کیوں رچایا تھا؟"

"ڈرامہ؟ تمہارا خیال ہے یہ ڈرامہ تھا؟"

"معاملہ سنگین ہو چکا ہے شیرداد، اب تک دو قتل ہو چکے ہیں ایک سمار بلو میں دوسرا یہاں اور مجھے اندیشہ ہے کہ سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے"۔ شیرازی کا لہجہ سفاک ہو گیا تھا۔ "پولیس کو تم زیادہ دیر دھوکا نہیں دے سکتے، کون احمق یہ یقین کرے گا کہ تم نادرہ سے واقعی شادی کرنا چاہتے تھے، وہ تم کو دھوکا دے رہی تھی، پتہ نہیں دولت کے لالچ میں یا کسی اور مقصد سے تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اس کا تعلق دیوی شرن سے تھا، میں نے خود اسے وہاں سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا"

شیرداد اسے خونخوار نگاہوں سے گھور رہا تھا، شیرازی کا ہاتھ جیب میں رکھے ہوئے پستول پر تھا، وہ اس خطرناک شخص کو اب کوئی موقع نہ دینا چاہتا تھا۔

"ٹھیک ہے، میرا خیال ہے ہم تنہائی میں بیٹھ کر باتیں کر لیں" اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا اور پھر اندر داخل ہوا، لیکن اچانک وہ دم بخود کھڑا رہ گیا اس کی جسامت کی بنا پر شیرازی کو کچھ نظر نہ آرہا تھا۔ پھر شیرداد تیزی سے آگے بڑھا، اس کے حلق سے عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں جیسے کوئی اس کا گلا گھونٹ رہا ہو۔

اور تب شیرازی کی نظر مسہری پر پڑی۔ نادرہ بستر پر چت پڑی

تھی، ساکت اور دہشت زدہ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، کسی نے اس کو گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا تھا۔

شیرداد جیسے ہی لاش کی سمت بڑھا شیرازی نے روک دیا۔

"خبردار ہاتھ نہ لگانا۔"

شیرداد نے چادر اٹھا کر آہستہ سے لاش کی گردن تک اٹھا دی اور پھر شیرازی کی سمت مڑا۔ "تم ٹھیک کہتے تھے۔ معاملہ واقعی بہت سنگین ہو چکا ہے۔" اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔

شیرازی نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا اور پھر شیرداد کی سمت آیا جو کرسی پر اس طرح دراز ہو گیا تھا جیسے نڈھال ہو چکا ہو۔

"تم آج کسی وقت ہوٹل آئے تھے؟"

"نہیں۔"

"میرے پاس سے جانے کے بعد تم پھر کہاں رہے؟ سنٹرل ہوٹل پہنچنے سے پہلے تم کہیں اور ضرور گئے ہو گے۔"

"دیر تک میں کار پر گھومتا رہا۔ پھر اپنے دفتر گیا۔ اوہ۔ میں نے سبھاش روڈ پر ہارون بلڈنگ میں ایک کمرہ کرایہ پر لے رکھا ہے، اس دفتر میں اکثر میں تنہائی کا وقت گذارتا ہوں کیونکہ عقبی زینے سے آمدورفت کے دوران کوئی مجھے دیکھ نہیں سکتا۔ اس لئے سنٹرل ہوٹل پہنچنے سے پہلے شاید ہی کسی نے مجھے دیکھا ہو۔ اوہ میں تمہارا مقصد سمجھ رہا ہوں، یہ حقیقت ہے کہ میرے لئے یہ ثابت کرنا ممکن نہ ہو گا کہ نادرہ کے قتل کے وقت میں کہاں تھا۔ لیکن مجھے یہ معلوم تو نہیں تھا کہ نادرہ میرے کمرے میں قتل ہونے والی ہے۔"

"تمہارا وجود ان کے لئے بہت خطرناک بن چکا ہے شیرداد۔ تم نے دیوی شرن کی حقیقت معلوم کر لی تھی۔ یہ سچ ہے نا؟ یہیں سے ابتدا ہوئی دیوی شرن کو جب یہ معلوم ہوا کہ تم کتنے مالدار ہو تو اس نے نادرہ کے ذریعے تم کو پھانسنے کی سازش کی۔ تم نے جانتے بوجھتے نادرہ کو یہ تاثر دیا کہ اس سے شادی کرنے پر تیار ہو۔ تم اس کے ذریعے معلوم کرنا چاہتے تھے کہ چکر کیا ہے۔ کیا تم اس سے شادی کر لیتے؟"

"کچھ پتہ نہیں۔ ویسے تم جانتے ہو کہ ان جیسی لڑکی سے کون شادی کر سکتا ہے۔ پہلے مجھے یقین تھا کہ عین موقع پر کوئی بہانہ کر دے گی۔ لیکن کل مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ صیاد خود اپنے دام میں پھنس گیا، وہ مجھ سے محبت کرنے لگی تھی اور شادی کے لئے تیار تھی۔"

"یہی اس کی موت کا سبب بن گیا۔" شیرازی نے کہا۔ "لیکن شوکت یوسف کو کم از کم ایک مخلص دوست افریقہ میں ضرور نصیب تھا۔"

"تم ان کے بارے میں کیا جانتے ہو؟" شیرداد نے چونک کر پوچھا۔

"سب کچھ۔ مجھے تابندہ نے سب کچھ بتلا دیا ہے۔ لیکن یہ بات اسے بھی نہیں معلوم کہ شوکت یوسف کو ان کی جائیداد کی وجہ سے قتل کر دیا گیا۔" شیرازی نے کہا۔ "شوکت یوسف کے وکیل نے جو کاغذات تابندہ کو بھیجے تھے ان میں کوئی ایسی دستاویز ضرور ہے جس کی کسی کو تلاش ہے، اسی کو حاصل کرنے کے لئے ارشد کی شادی اس سے کرائی گئی جب اس سے بھی کام نہ بنا تو تمام دوسرے ذرائع استعمال کئے گئے، کیا تم جانتے ہو کہ ارشد کہاں ہے؟"

"نہیں۔"

"ہمیں ہر قیمت پر اسے تلاش کرنا ہو گا۔ ویسے تمہارا کیا مقصد ہے شیرداد؟ صرف دوستی کا حق ادا کر رہے ہو یا اور کوئی بات ہے؟"

"تم اتنے ذہین ہو کہ یہ بھی اندازہ کر لو گے۔" اس نے ایک افسردہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "ویسے حقیقت کے قریب پہنچ گئے ہو۔ شوکت یوسف جس کان سے ہیرے نکال رہے تھے وہ مکمل ہو چکی تھی اور اس لئے بند کر دی گئی لیکن اچانک انہوں نے اس پورے پہاڑی علاقے کو خرید لیا اور اپنی تمام جمع پونجی اس پر لگا دی ہر آدمی اس پر حیران ہوا کیونکہ ماہرین کی رپورٹ کے مطابق اس علاقے میں ہیرے کی اب کوئی بڑی کان نہ تھی۔ موت سے تین دن قبل انہوں نے مجھے فون کیا، میں وہاں سے دور ایک دوسرے علاقے میں رہتا تھا۔ انہوں نے بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا کہ میں فوراً ان کے پاس پہنچ جاؤں کیونکہ انہوں نے ایک حیرت انگیز بات دریافت کی تھی میں نے انکار کر دیا کیونکہ ہمارے تعلقات ان دنوں کشیدہ ہو چکے تھے۔ اور پھر مجھے ان کی موت کی خبر ملی، میں سماریلو پہنچا، میں نے جب معلومات کرنا شروع کیں تو انکشاف ہوا کہ دو دن سے ان کے پاس چند لوگ بار بار ملنے آ رہے تھے، ان میں ایک لانبے بالوں والا مقامی کریچین بھی تھا۔ جسے تم دیکھ چکے ہو۔"

"اوہ۔ تو اس دن سہاگ ایجنسی میں تمہارے دوبارہ آنے کا یہی مقصد تھا؟"

"ہاں، جب میں نادرہ کے ساتھ وہاں واپس جا رہا تھا تو میں نے اسے کچھ فاصلے پر کھڑے دیکھ لیا تھا اسی لئے میں نادرہ کو رخصت کر کے فوراً واپس آ گیا مجھے یقین تھا کہ وہ ہیرے۔ میرا مطلب ہے شوکت یوسف کے قتل میں ملوث ہے۔ میں اس کو زندہ نہ چھوڑتا۔ لیکن تم جانتے ہو کیا ہوا۔"

"خوب۔ لیکن اب کیا ارادہ ہے؟ بہتر تو یہی ہو گا کہ پولیس کو اطلاع دے دو کیونکہ جلد ہی نادرہ کی لاش کا پتہ لگ جائے گا اور اگر تم نے پولیس کو اطلاع نہ دی تو تمہارے خلاف ان کا شبہ اور مضبوط ہو جائے گا۔ ابھی موقع ہے۔"

"لیکن لاش میرے کمرے میں ہے۔ کیا وہ مجھ پر قتل کا شبہ نہ کریں گے؟ میرے پاس کوئی ثبوت بھی نہیں ہے کہ صبح سے اب تک

میں کہاں تھا؟"

"شبہ تو وہ ضرور کریں گے۔ ممکن ہے شبہ میں گرفتار بھی کرلیں۔ لیکن اطلاع دینے سے شبہ کم ہوگا۔ اور پھر میں بھی کوشش کروں گا کہ۔۔۔"

"نہیں۔ میں اگر پولیس کے چکر میں پھنس گیا تو ان کو راستہ صاف مل جائے گا۔ اور شاید وہ چاہتے بھی یہی ہیں، اسی لئے نادرہ کو میرے کمرے میں قتل کیا گیا۔"

"ہاں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ چاہتے ہوں کہ تم راہ فرار اختیار کرو اور وہ تم کو تنہا پاکر آسانی کے ساتھ راستے سے ہٹا دیں، آج صبح مجھے بھی قتل کرنے کی کوشش کی گئی، میری کار کو بم کے دھماکے سے تباہ کر دیا گیا۔ شاید اس لئے کہ ان کے خیال میں تم نے یا نادرہ نے وہ دستاویز مجھے دے دی یا پھر اس لئے کہ اس کا راز جاننے کے بعد میں بھی ان کے لئے خطرہ بن گیا ہوں، اور نادرہ اور دیوی سرن کو بھی اسی لئے ختم کر دیا گیا ممکن ہے ان کو یہ اندازہ ہوگیا ہو کہ نادرہ تم سے محبت کرنے لگی ہے اور شادی کے بعد سب کچھ تم کو بتلادے گی۔"

"اگر ایسا ہے تو پھر میں اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گا جب تک ان میں سے ایک ایک سے انتقام نہیں لے لیتا۔" شیرداد نے غصے میں پھنکارتے ہوئے کہا۔ "میں جارہا ہوں، بعد میں مجھے پھانسی بھی ہوجائے تو پروا نہیں۔"

"ٹھہرو شیرداد۔ پہلے تم یہ سوچ لو کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟"

"انجام کچھ بھی ہو شیرازی۔ جن لوگوں نے نادرہ کو قتل کیا وہی شوکت یوسف کے قتل کے بھی ذمہ دار ہیں اور اگر میں نے ان سے انتقام نہیں لیا تو میرا وجود بیکار ہے۔"

اسی لمحہ فون کی گھنٹی بجی، شیرداد اچھل پڑا۔ اس نے حیران نظروں سے شیرازی کی سمت دیکھا۔ "شرط لگالو۔ آرزو ہوگی" اس نے آہستہ سے کہا۔ "لیکن۔ بات سنو بھائی جان، مجھے پہلے تو یہ خیال ہی نہ آیا۔ یہ بات آرزو کو کیسے معلوم ہوئی کہ میں نے ٹیلس میں بھی کمرہ لے رکھا ہے، میں نے تو اسے نہیں بتلایا تھا۔"

"جس طرح مجھے معلوم ہوگئی۔" شیرازی نے کہا۔ "تم ٹھہرو۔ فون میں سنتا ہوں۔" اس نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھایا اور آواز بدل کر کہا۔ "ہیلو۔"

"ہیلو شیرداد۔" کسی نے کہا

"شیرداد تو نہیں ہیں۔ کوئی پیغام ہو تو دے دو۔" شیرازی نے کہا۔

"اوہ۔ مسٹر شیرازی بول رہے ہیں" کسی نے قہقہہ لگا کر کہا۔ آواز میں زہر بھرا ہوا تھا۔ "تم نے خود اپنی موت کو دعوت دی ہے شیرازی، اور اس مرتبہ تم نہیں بچ سکو گے۔ شیرداد سے کہو مجھ سے بات کرے۔"

"وہ یہاں نہیں ہے۔"

"بکواس مت کرو۔ میں جانتا ہوں کہ تم دونوں کمرے میں موجود ہو اور پریشان ہو کہ اس کی ہونے والی بیوی کی لاش سے کیسے نجات حاصل کرو، شیرداد سے کہہ دو کہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر افریقہ واپس چلا جائے اور جس جگہ میں یہاں آیا ہے اسے بھول جائے ورنہ اس کا بھی وہی انجام ہوگا جو نادرہ کا ہوا۔ اور تم بھی کان کھول کر سن لو، اسی میں عافیت ہے کہ شیرداد کا ساتھ دینا چھوڑ دو۔ وہ خطرناک قاتل ہے یقین نہ آئے تو اس سے پوچھ لو کہ ملبو اور حنیف کو کس نے قتل کیا تھا، اگر وہ باز نہ آیا تو یہاں بھی پھانسی کا پھندہ اس کا انتظار کرے گا۔" لائن منقطع ہوگئی۔

شیرداد نے اس کی سمت دیکھا۔ "یہاں سے فوراً نکل چلو پھر بات کریں گے۔" شیرازی نے جواب دیا۔ وہ عقبی زینے سے اتر کر ہوٹل سے باہر چلے گئے۔ شیرازی نے ٹیکسی کو ہاتھ دیا تو شیرداد فوراً بولا۔

"ٹیکسی کی کیا ضرورت ہے۔ میری کار باہر کھڑی ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔ لیکن وہ میری کار میں بم رکھ سکتے ہیں تو تمہاری کیسے محفوظ رہ سکتی ہے، بہتر ہے کہ اسے یہیں کھڑی رہنے دو۔" اس نے کہا۔ "ہم تمہارے دفتر چل رہے ہیں۔"

شیرداد نے سچ کہا تھا۔ عقبی زینے سے اس کے دفتر تک جاتے ہوئے کوئی بھی نہ ملا۔ اس کے دفتر کا کمرہ زینے کے عین سامنے تھا۔ کمرہ مختصر سا تھا لیکن شاندار فرنیچر سے سجایا گیا تھا، بیضوی میز کے گرد ریوالونگ کرسی رکھی تھی اس کے قریب ہی ایک کیبنٹ تھی جس پر پانی کا بھرا ہوا خوبصورت جگ رکھا تھا جس کا خوبصورت ڈھکن چمک رہا تھا، میز پر نیلے رنگ کا ٹیلیفون سٹ رکھا ہوا تھا۔ میز کے سامنے تین کشن دار کرسیاں رکھی تھیں۔ شیرازی نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "بڑا خوبصورت دفتر بنایا ہے تم نے۔"

"یہ دفتر میں نے اسی حالت میں چھ ماہ کے لئے کرایہ پر لیا ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بس یہ کرسی اپنے سائز کی منگوائی ہے۔"

"لاؤ ذرا سا پانی پلواؤ۔ تم نے جب سے گلا گھونٹنے کی کوشش کی حلق میں خراش ہوگئی ہے۔"

"اب تو معاف کردو بھائی جان غلطی ہوگئی تھی۔" شیرداد نے اپنی مخصوص ہو ہو کی آواز میں قہقہہ لگایا۔ "پیاس تو مجھے بھی لگ رہی ہے۔" اس نے جگ اٹھایا، پانی انڈیل کر گلاس شیرازی کو دیا اور دوسرے گلاس میں پانی بھر کے جگ میز پر رکھ دیا۔ "اب یہ بتلاؤ کہ کس کا فون تھا؟"

شیرازی نے جواب دیئے بغیر گلاس اٹھا کر منہ سے لگایا، اچانک

اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں، پانی پیے بغیر اس نے گلاس میز پر رکھا۔ شیرداد اتنی دیر میں گلاس منہ سے لگا چکا تھا۔ شیرازی نے لپک کر اتنی زور سے ہاتھ مارا کہ گلاس دور جا گرا۔ چھناکے کی آواز کے ساتھ ٹوٹتا ہوا شیشہ فرش پر بکھر گیا، شیرداد گھبرا کر کھڑا ہوگیا۔ "یہ۔۔ یہ کیا حرکت تھی؟" وہ غصے میں غرّایا۔

"بیٹھ جاؤ۔" شیرازی نے سرد لہجے میں کہا۔ "وہ بہت چالاک معلوم ہوتے ہیں۔۔ یہ پانی دیکھ رہے ہو؟" اس نے گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اس میں زہر ملا ہوا ہے۔"

"زہر۔۔؟" شیرداد کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

"ہاں۔ اس میں سفید ذرات دیکھ رہے ہو؟ پتہ نہیں آرسینک ہے یا اور کوئی چیز۔ خدایا کتنی خوبصورت کہانی بنتی، افریقہ کے مالدار تاجر نے اپنی ہونے والی بیوی کو قتل کرکے خودکشی کرلی! انہوں نے تمہارے اس خفیہ دفتر کا بھی پتہ لگا لیا تھا۔ کمبخت بلا کے چالاک ہیں"۔

"بھائی جان۔۔ میں تم سے پھر معافی چاہتا ہوں" شیرداد نے احمقوں کی طرح دیدے پھاڑ کر کہا۔ "تم دشمن ہوتے تو مجھے مرجانے دیتے"

شیرازی نے کوئی جواب نہ دیا۔ چند لمحہ خاموشی سے بیٹھا سوچتا رہا۔ اگر وہ یہ پانی پی جاتا تو شاید اب تک اس دنیا کو الوداع کہہ چکا ہوتا۔ خوف سے اس کا جسم سرد پڑ گیا۔ پھر وہ چونک کر اٹھا۔

"یہ جگ مجھے دے دو شیرداد۔ اور خبردار یہاں سے باہر نہ نکلنا۔۔ میں یہ معلوم کرتا ہوں کہ اس میں زہر تھا تو کون سا۔ میں تم سے فون پر رابطہ رکھوں گا"۔

ٹیکسی کر کے وہ سیدھا اپنے دوست ڈاکٹر انصاری کی لیبارٹری پہنچا۔ اسے جگ دے کر پانی کا تجزیہ کرنے کی درخواست کی اور پھر سیدھا اپنے فلیٹ پہنچا، صبح سے پے درپے واقعات اتنی تیزی سے پیش آرہے تھے کہ اس کا ذہن دھندلا کر رہ گیا تھا۔ گمنام فون پر کسی نے شیرداد کو قاتل کہا تھا۔ کیا یہ ممکن تھا کہ اس نے خود ہی نادرہ کو قتل کردیا ہو اور پھر شیرازی کو زہر دینے کی کوشش کی ہو لیکن اسے یقین تھا کہ اگر ایک لمحہ بھی دیر کرتا تو شیرداد اس زہریلے پانی کو پی چکا ہوتا۔ اگر پانی میں زہر کا ثبوت مل گیا تو شیرداد پر شبہ کرنا زیادتی ہوگی۔ کافور نے کھانا میز پر لگاتے ہوئے بتلایا کہ مس آرزو کی تصویر مل گئی تھی لیکن زرقی کی تصویر دستیاب نہ ہوسکی تھی۔ لنچ سے فارغ ہوکر اس نے کافور کو اب تک پیش آنے والے واقعات کی روداد سنائی، ابھی وہ اس پر بحث کر ہی رہے تھے کہ گھنٹی بجی، وہ چونک اٹھا۔

لیکن دروازہ کھلا تو اسے گوپال نظر آیا۔ اس نے فوراً گوپال

کو اندر بلالیا۔ وہ سہما ہوا اندر داخل ہوا "بیٹھو گوپال۔ تمہاری طبیعت اب کیسی ہے؟" شیرازی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ کی مہربانی سے ٹھیک ہے جی۔" گوپال نے کہا "آپ نے جو حکم دیا تھا اسے پورا کرکے آیا ہوں۔ دیوی شرن کے فلیٹ میں آنے والے لوگوں میں پانچ افراد تھے۔" اس نے بتلایا۔ "ان میں ایک تو وہ عورت نادرہ تھی۔ اور اس کے بعد وہ لمبے بالوں والا تھا جو اب حوالات میں ہے۔ میرے باپ نے بتلایا ہے کہ اس نے دیوی شرن کو قتل کیا تھا۔"

"تمہارے باپ کو کیسے معلوم؟"

وہ پولیس میں ہیڈ کانسٹبل ہے جی۔ میں نے آپ کو نہیں بتلایا تھا، اس نے لمبے بالوں والے کو فوراً پہچان لیا تھا۔ اور اس کے بعد وہ عورت تھی جو کالی بیوک گاڑی میں آتی تھی، وہ بڑی مالدار لگتی تھی۔"

"بیوک گاڑی میں؟" شیرازی نے چونک کر کہا اور پھر میز کی دراز سے آرزو کی تصویر نکال کر گوپال کے سامنے رکھ دی ۔۔۔ "یہی عورت تھی نا؟"

گوپال نے سر ہلایا۔ "نہیں جی۔ اسے تو میں نے وہاں آتے کبھی نہیں دیکھا۔" اس نے کہا۔ شیرازی نے اطمینان کی سانس لی۔

"اس کے بعد وہ آدمی ارشد تھا جس کے بارے میں میں نے آپ کو پہلے بھی بتلایا تھا۔ اور پھر دیال تھا۔"

"کون ۔۔۔؟" شیرازی اچھل پڑا

"دیال ۔۔۔" گوپال نے اسے حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ اسے جانتے ہیں جی ۔۔۔ وہ تو ہر دوسرے تیسرے دن وہاں آتا تھا۔"

"ٹھیک ہے گوپال۔ تم بڑے کام کے لڑکے ہو، دیوی شرن کے فلیٹ پر نگاہ رکھنا اور مجھ سے ملتے رہنا" شیرازی نے کہا۔ "اور سنو اپنا علاج جاری رکھنا۔ لو یہ دواؤں کے لئے رکھ لو" اس نے سو کا نوٹ اسے دیا

گوپال شکریہ ادا کرکے چلا گیا تو کافور نے کہا "مسئلہ اور پیچیدہ ہو گیا سر۔ دیال کی اطلاع پر مس آرزو نے شیرداد کو قابل اعتماد تسلیم کر لیا تھا۔ اور اب یہ واضح ہو گیا کہ دیال اور دیوی شرن ملے ہوئے تھے۔"

اسی لمحہ فون کی گھنٹی بجی، کافور نے رسیور اٹھا کر شیرازی کو دیا۔ ڈیلی نیوز کے ایڈیٹر کا فون تھا "میں خاور کے لئے پریشان ہوں، وہ کل رات سے گھر نہیں پہنچا۔ کیا آپ کو معلوم ہے وہ کہاں ہو سکتا ہے؟"

"نہیں!" شیرازی نے جواب دیا۔ "اس دوران اس نے مجھ سے بھی رابطہ قائم نہیں کیا۔ لیکن۔ اگر اس نے فون کیا تو فوراً مطلع کروں گا۔"

کافور نے معنی خیز نظروں سے اسے دیکھا۔ "معاملات سنگین ہوتے جا رہے ہیں۔" شیرازی نے کہا۔ "میں نے خاور کو دیال کے بارے میں معلومات حاصل کرنے پر مامور کیا تھا اور وہ کل رات سے گھر نہیں پہنچا۔ کوئی فون تو نہیں آیا تھا اس کا؟"

"نہیں سر۔" کافور نے کہا "میرا خیال ہے ہمیں سکندر سے مدد لینا چاہیئے۔ اس کے آدمی دیال اور اس کی ایجنسی کے بارے میں معلومات حاصل کرسکتے ہیں۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو کافور، سکندر کو ابھی فون کردو ۔۔۔ میں ذرا امجد اینڈ کینیش کے دفتر جا رہا ہوں" اور ہاں ذرا ڈاکٹر انصاری کو فون کرکے اس پانی کے بارے میں بھی معلوم کرلینا۔"

شیرازی نے علی امجد سے پہلے ہی وقت لے رکھا تھا۔ وہ ٹھیک وقت پر ان کے دفتر پہنچ گیا۔ ابھی ان کی سیکرٹری نے شیرازی کا کارڈ اٹھایا ہی تھا کہ دفتر کا دروازہ کھلا۔ علی امجد خود باہر نکل آئے لیکن وہ تنہا نہیں تھے ۔۔۔ مس آرزو بھی ان کے ساتھ تھیں۔ "خدا حافظ مس آرزو۔" انہوں نے کہا اور شیرازی کی سمت مڑے۔ "فرمایئے جناب۔"

دفتر بڑا شاندار تھا۔ شیرازی نے اندازہ کرلیا کہ امجد اینڈ کینیش کی فرم کامیاب بزنس کر رہی تھی، کرسی پر دراز ہو کر اس نے سگریٹ جلائی اور پھر مسکراتے ہوئے پوچھا "آپ کب سے مس آرزو کے وکیل ہیں؟"

"بہت عرصہ سے۔" علی امجد نے محتاط سا جواب دیا۔ میز پر رکھی ہوئی فائل پر مس آرزو کا نام اور پتہ درج تھا۔ "آپ نے کس سلسلے میں زحمت کی ہے شیرازی صاحب۔"

"میں مس تابندہ ۔۔۔ میرا مطلب ہے تابندہ ارشد کے بارے میں کچھ گفتگو کرنے آیا ہوں ۔۔۔ اور میرے خیال میں ان کی زندگی خطرے میں ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ان پر ایک قاتلانہ حملہ ہو چکا ہے؟"

امجد نے حیرت زدہ ہو کر اسے دیکھا۔ "نہیں۔ لیکن کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کس حیثیت میں یہ دریافت کررہے ہیں؟"

"ان کے نمائندے کی حیثیت میں" شیرازی نے تابندہ کا خط نکال کر سامنے رکھ دیا۔ "شاید اب آپ اطمینان سے گفتگو کرسکیں۔ مجھے یقین ہے کہ قاتلانہ حملہ کا مقصد اس جائداد کی دستاویزات حاصل کرنے کے سلسلے میں تھا جو ان کے تایا نے سماریلو میں چھوڑی ہے ۔۔۔ آپ اس بارے میں کیا جانتے ہیں؟"

امجد نے خط پڑھنے کے بعد اسے دیکھا۔ "شکریہ شیرازی صاحب ۔۔۔ اب میں واقعی اطمینان سے بات کرسکتا ہوں، شوکت یوسف صاحب نے اپنا مکان اور کان کنی کا پہاڑی علاقہ تابندہ کے نام چھوڑا ہے۔"

"آپ کے خیال میں کیا وہ علاقہ قیمتی ہے؟"

"قیمتی ؟" امجد نے حیران ہو کر کہا۔ "جناب وہ کروڑوں کی جائیداد ہے۔ اس میں ان کانوں کا نقشہ ہے جو ان پہاڑیوں میں واقع ہیں اور شوکت صاحب کے خط کے مطابق وہ سمارٹیلو کی سب سے قیمتی کانیں ہیں۔ لیکن اس راز سے ان کے علاوہ کوئی واقف نہیں۔"

"میرا خیال ہے ان کا قاتل ضرور واقف تھا۔" شیرازی نے کہا۔ "کیا آپ نے یہ راز تابندہ کو بتلا دیا تھا؟"

"نہیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ جانتی ہیں۔" امجد نے کہا۔ "لیکن اب خیال آیا کہ انہوں نے مہر بند لفافہ میرے حوالے کر دیا تھا۔"

"کیا وہ کاغذات محفوظ ہیں؟"

"ہا۔ں۔ لیکن آپ کو اب یہ بتلانا ضروری ہو گیا ہے کہ تقریباً دو ہفتے پہلے میرے دفتر کی سیف توڑ لی گئی تھی۔ اس کے بعد میں نے تمام کاغذات بنک منتقل کر دیئے ہیں۔ پولیس میں بھی رپورٹ کر دی گئی تھی، لیکن ایک بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ مس تابندہ کے کاغذات بالکل محفوظ ہیں، کوئی چیز چوری نہیں ہوئی اور ۔۔۔"

"میں آپ کا فون استعمال کر سکتا ہوں؟" اس نے جلدی سے کہا اور ریسیور اٹھا کر امجد کی سیکرٹری سے کہا۔ "براہ کرم مس آرزو کا نمبر ملا دیجئے۔ شکریہ۔" امجد نے اسے حیرت سے دیکھا۔ اسی لمحہ گھنٹی بجی۔ شیرازی نے ریسیور اٹھایا۔ "ہیلو۔ سہاگ ایجنسی؟ زونی میں شیرازی بول رہا ہوں، ذرا مس آرزو سے بات کرا دیں گی؟" وہ چند لمحہ انتظار کرتا رہا پھر آرزو کی آواز سنائی دی۔ "جی شیرازی فرمائیے؟" ۔۔۔ شیرازی نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "آرزو۔ آپ کو احساس ہو چکا ہو گا کہ آپ کتنی مصیبت میں ہیں ۔۔۔ مسٹر امجد کی یقین دہانیوں کے باوجود اگر یہ معاملہ طشت ازبام ہوا تو آپ کی ایجنسی کا بزنس تباہ ہو جائے گا۔"

"میں اپنے معاملات خود نمٹا سکتی ہوں شیرازی۔ شکریہ۔"

"لیکن اب بہت سے دوسرے بھی اس سے متاثر ہوں گے۔ آرزو۔ آپ کو اپنی نہیں تو ان کی فکر ضرور ہونا چاہیئے، پولیس کسی بھی لمحہ نادرہ کے قتل کے سلسلے میں آپ کے پاس پہنچنے والی ہے، میرا مشورہ صرف اتنا ہے کہ میرے پہنچنے سے پہلے کوئی بیان نہ دیں، میں جلد از جلد پہنچنے کی کوشش کروں گا۔" کچھ سنے بغیر اس نے ریسیور رکھ دیا۔ علی امجد کی مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی وہ پریشانی کے عالم میں اسے گھور رہے تھے۔ "اگر آپ کو آرزو سے ذرا بھی ہمدردی ہے مسٹر امجد تو براہ کرم قانونی مشیر کی حیثیت سے آپ بھی انہیں منع کر دیں کہ پولیس کو کوئی بیان نہ دیں اور میرا انتظار کریں۔ میں نہیں چاہتا کہ انہیں قتل کے الزام میں پھانسی ہو۔"

"مسٹر شیرازی ۔۔۔" امجد نے کہا۔

لیکن شیرازی کمرے سے باہر جا چکا تھا۔ وہ سیدھا جاوید موٹرز پہنچا، اپنی گاڑی کی تباہی کا ذکر کئے بغیر ایک سیکنڈ ہینڈ مرسڈیز لی، عاصم ایسی ضروریات پوری کرنے کا عادی ہو چکا تھا۔

شیرازی پوری رفتار سے گاڑی بھگاتا ہوا آرزو کے بنگلے ارم پہنچا۔ گاڑی سڑک پر چھوڑ کر وہ کشادہ لان کے درمیان بنی ہوئی روش سے گذر کر دروازے تک پہنچا۔ اس نے دوبارہ گھنٹی بجائی لیکن جب کوئی جواب نہ ملا تو تیزی سے چلتا ہوا عقب میں پہنچا۔ عقبی دروازے پر بھی گھنٹی لگی تھی لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ دروازے کے برابر ہی ایک کھڑکی تھی جو کھلی ہوئی تھی، اس نے ہر سمت نگاہ ڈالی، پائیں باغ کی وجہ سے اسے کوئی دیکھ نہ سکتا تھا، اسے یقین ہو چکا تھا کہ مکان میں کوئی نہیں ہے، وہ کھڑکی کے ذریعہ اندر داخل ہو گیا، شاندار سجے ہوئے بنگلے کی نچلی منزل میں کوئی نہ تھا، وقت ضائع کئے بغیر وہ سیڑھیاں پھلانگ کر اوپر پہنچا۔ اس نے سامنے کمروں کو دیکھ ڈالا، لیکن یہاں بھی کوئی نہ تھا، آرزو کے بیڈ روم میں کھڑے ہو کر وہ سوچنے لگا، شیلف پر آرزو اور اس کے شوہر کی تصویر تھی، خوابگاہ کی سجاوٹ آرزو کے ذوق نفیس کا ثبوت تھی۔ اور تب پہلی مرتبہ اس نے کھٹ کھٹ کی ہلکی آواز سنی۔ اس نے چونک کر ہر سمت دیکھا، آواز پھر سنائی دی، شیرازی لپک کر اس دروازے تک پہنچا جو باہر سے بند تھا، اس نے دروازہ کھولا تو ایک اور بیڈ روم میں داخل ہو گیا، لیکن یہ کمرہ شاید عرصے سے استعمال نہ ہوا تھا، ہر چیز سے سیلن کی بو آ رہی تھی، اور یہاں بھی کوئی نہ تھا کھٹ کھٹ کی آواز پھر آئی اور اس مرتبہ بڑی واضح تھی، اس نے لپک کر دروازہ کھولا۔ باتھ روم میں پانی سے بھرے ٹب کے باہر کوئی پڑا تھا۔ شیرازی نے لائٹ جلائی۔ حیرت سے اس کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں ۔۔۔

ساحل سمندر

پر تعطیلات کا زمانہ گزارنے کے لئے آنے والے ایک صاحب کو اپنی بیوی کو میٹرنٹی ہوم لے جانا پڑا کیونکہ ایک ماہ قبل ہی بچے کی ولادت ہونے والی تھی۔

انتظار گاہ میں بیٹھے ہوئے انھوں نے دوسرے پریشان حال صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"میری تو ساری چھٹیاں ناس ہو گئیں۔ بھلا یہ بھی کوئی وقت تھا؟"

"آپ کی تو خیر چھٹیاں ہی ناس ہوتی ہیں۔" دوسرے پریشان حال صاحب نے کہا۔ "مجھ سے پوچھیے مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔ میں تو یہاں ہنی مون منانے آیا تھا۔"

باتھ روم کے فرش پر خاور چت پڑا ہوا تھا، اس کے دونوں ہاتھ پشت کی سمت بندھے ہوئے تھے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا لیکن پیر کھلے ہوئے تھے جنہیں وہ فرش پر پٹخ رہا تھا، اس کے ہونٹ نیلے ہو کر سوج گئے تھے لباس بھیگا ہوا تھا، وحشت زدہ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں شیرازی نے تیزی سے لپک کر اس کے منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا نکالا۔ "خاور۔ فکر نہ کرو دوست میں آگیا ہوں"۔ اس نے اپنے شدید غم و غصے سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور اس کے ہاتھ کی رسیاں کھول کر آہستہ آہستہ مالش کرنے لگا، خاور نے اسے تشکر بھری نظروں سے دیکھا لیکن سوجی ہوئی زبان کے باعث وہ بول نہ سکتا تھا۔ شیرازی نے اسے دونوں بازوؤں پر اٹھایا اور بستر پہ لٹا دیا۔

"آرام سے لیٹے رہو، اٹھنے کی کوشش نہ کرنا میں ابھی آتا ہوں" وہ ایک بار پھر نیچے پہنچا اور اسٹڈی روم میں پہنچ کر آرزو کی میز کی درازوں کی تلاشی لینے لگا۔ لیکن کوئی کارآمد چیز نہ ملی۔ بڑی دراز مقفل تھی اس نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا۔ ذرا دیر بعد دراز کھل گئی، اندر رکھی ہوئی نیلی فائلوں کو باہر نکالا۔ پہلی نظر ڈالتے ہی وہ سمجھ گیا، یہ وہی فائلیں تھیں جن کے چوری ہونے کا آرزو نے ذکر کیا تھا۔

وہ دم بخود کھڑا تھا۔ بار بار ایک ہی خیال ذہن میں آرہا تھا۔ ۔کیا دیوی شرن درحقیقت آرزو کا ہی آلۂ کار تھا۔ کیا یہ فائلیں اس نے چوری کر کے جس پراسرار بیوک والے شخص کو دی تھیں وہ آرزو کا آدمی تھا جس نے یہ تمام فائلیں خفیہ طور پر واپس لا کر آرزو کے حوالے کر دی تھیں، اس نے فائلوں کے اندر سے تمام کاغذات نکال کر جیب میں رکھ لئے۔ اس کے بعد بھاگتا ہوا اوپر پہنچا، خاور پہلے سے کچھ بہتر نظر آرہا تھا لیکن ابھی بولنے اور حرکت کرنے کے قابل نہیں ہوا تھا، شیرازی نے الماری کھولی، اندر مردانہ کپڑے ٹنگے ہوئے تھے۔ بلاشبہ یہ آرزو مرحوم کے شوہر کا کمرہ تھا۔ شیرازی نے پہلے خاور کا لباس تبدیل کیا پھر نیچے جا کر کچن میں گرم گرم کافی تیار کی۔ خاور بمشکل تھوڑی سی کافی پی سکا لیکن گرم کافی سے حلق تر ہوتے ہی اس کی حالت سدھرنے لگی۔ خاور کو کار تک لے جانا ایک مسئلہ تھا۔ شیرازی کو فوراً خیال آیا کہ عقبی کھڑکی کھلی ہوئی تھی، دشمن ہر لمحہ تعاقب کر رہا تھا۔ خطرے کا احساس ہوتے ہی اس نے خاور کو کچھ دیر اور آرام کرنے کی ہدایت کی تیزی سے نیچے پہنچا لیکن جیسے ہی کھڑکی بند کرنا چاہی اسے وہ شخص نظر آیا۔

شیرازی چونک گیا۔ اسے یقین تھا کہ جب وہ "ارم" میں داخل ہوا تو یہ شخص یہاں موجود تھا۔ سیاہ فام افریقی پستہ قد تھا لیکن مضبوط جسم کا مالک تھا۔ وہ آہستہ آہستہ بنگلے کے سامنے والے لان کی سمت جا رہا تھا۔ کھڑکی بند کر کے شیرازی نے تیزی سے ہال پار کیا اور اس دریچے کے پاس پہنچ گیا جو بنگلے کے سامنے والے لان کی سمت تھا پردے کی آڑ سے وہ دیکھنے لگا، سیاہ فام ذرا دیر بعد نمودار ہوا اور ایک درخت کی آڑ میں کھڑا ہو گیا، اس کی نگاہیں گیٹ کی طرف مرکوز تھیں، دونوں ہاتھ کوٹ کی جیب میں تھے، کیا وہ آرزو کا منتظر تھا۔ اسے خیال آیا کہ عقبی کھڑکی کھلی تھی اگر یہ شخص چوری کی نیت سے آیا تھا تو بآسانی اندر داخل ہو سکتا تھا۔ پھر اس کی یہاں آمد کا مقصد کیا تھا؟ اچانک وہ تیزی سے پلٹا اور اس میز کے پاس واپس آیا جس سے فائلیں برآمد ہوئی تھیں، اسے یاد آیا کہ ایک بڑا سا لفافہ بھی اندر رکھا ہوا تھا۔ اس نے لفافہ نکال کر کھولا، اندر رکھے ہوئے کاغذات نکالے ۔۔۔ اور ان پر نظر پڑتے ہی اچھل پڑا۔

یہ شوکت یوسف کے کاغذات اور پہاڑی علاقے کے نقشے کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں تھیں، شیرازی حیرت زدہ نظروں سے ان کو گھورتا رہا، نیچے شوکت یوسف کے نام اور دستخط واضح تھے، اس نے کاغذات تہہ کر کے جیب میں رکھے اور دریچے کے پاس آ کر باہر جھانکا سیاہ فام اسی طرح کھڑا تھا۔ چھ بج رہے تھے۔ پتہ نہیں کب تک انتظار کرنا پڑے۔ شیرازی ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کرے کہ اس نے سیاہ فام کو چونکتے ہوئے دیکھا۔ وہ گیٹ کی سمت دیکھ رہا تھا۔ شیرازی نے نگاہیں اٹھائیں تو گیٹ کے اندر ایک بھاری بدن والی آیا کو داخل ہوتے ہوئے دیکھا جس نے ایک بچے کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا، ان دونوں نے ابھی نصف لان ہی پار کیا تھا کہ سیاہ فام تیزی سے ان کی سمت بڑھا۔ شیرازی صورت حال کو فوراً سمجھ گیا۔ اس نے جلدی سے سامنے کا دروازہ کھولا اور بھاگتا ہوا آیا کی سمت بڑھا جو خطرے سے بالکل بے خبر تھی۔

سیاہ فام اب آیا سے صرف دس بارہ گز کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ شیرازی نے چلا کر آیا کو خبردار کیا اور پھرتی کے ساتھ جیب میں ہاتھ ڈال کر پستول نکالا، لیکن اسی لمحہ قریبی جھاڑی سے ایک دوسرا شخص اچانک برآمد ہوا اس کے ہاتھ میں لمبی سی لکڑی تھی اور اس سے پہلے کہ شیرازی سنبھل سکتا اس نے پوری قوت سے لکڑی اس کے پیروں پر ماری، شیرازی لڑکھڑایا اور پھر گرتا چلا گیا۔ دونوں حملہ آور تیزی سے آیا کے پاس پہنچے جو دہشت زدہ کھڑی رہ گئی تھی، ایک نے اسے دھکا دیا، دوسرے نے بچے کو بازوؤں میں دبایا اور جب تک شیرازی اٹھتا وہ گیٹ سے باہر تھے۔ شیرازی جب گیٹ کے باہر نکلا تو ان کی کار دور نکل چکی تھی، وہ اپنی کار کی سمت بھاگا پھر اسے خاور کا دھیان آیا اور وہ وہیں رک گیا۔ حملہ آوروں کو پکڑنا اب دشوار تھا اور خاور کو وہ تنہا چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ وہ بنگلے کے اندر پہنچا تو آیا دہشت زدہ کھڑی تھی، اس کا سر شاید کیاری کی منڈیر سے ٹکرایا تھا جس سے خون بہہ رہا تھا۔ شیرازی بھاگتا ہوا بنگلے کے اندر پہنچا، پولیس ایمرجنسی کا نمبر ڈائل کیا اور انہیں اغوا کی رپورٹ دے کر کار کا رنگ بتلایا کیونکہ نمبر وہ نہیں دیکھ سکا تھا۔ ایک بھاری

آواز نے اس کا پتہ اور نام پوچھا۔ "میں شیرازی بول رہا ہوں"
اس نے آرزو کے بنگلے کا پتہ بتلانے کے بعد کہا "تم سپرنٹنڈنٹ فاروقی کو فوراً اس واردات کی اطلاع دے دو" اس نے جھانک کر دیکھا، تین چار آدمی آیا کے گرد جمع تھے، وہ چیخ چیخ کر انہیں کچھ بتلا رہی تھی، شیرازی بھاگتا ہوا بالائی منزل پر پہنچا۔

وہ خاور کو سہارا دے کر اپنے ساتھ لئے جب لان پر پہنچا تو پولیس کی کار سائرن بجاتی گیٹ میں داخل ہو رہی تھی۔ انسپکٹر کو مختصر حالات بتلانے کے بعد وہ خاور کو اپنی کار تک لایا اور اسے آرام سے بٹھانے کے بعد روانہ ہوگیا۔ خاور نے آہستہ آہستہ ہوش میں آتے ہوئے اسے بتلایا کہ اسے دیال کی ایجنسی کے خلاف کوئی مواد نہ مل سکا تو وہ آرزو کے بنگلے پر پہنچا، اس نے سوچا تھا کہ شاید نوکروں سے کچھ کام کی بات معلوم ہو جائے لیکن آیا اور ایک بوڑھے ملازم سے جب کوئی کارآمد بات نہ معلوم ہوئی تو واپس روانہ ہوا لیکن گیٹ سے باہر نکلتے ہی کسی نے اس پر حملہ کیا، وہ تاریکی میں حملہ آور کو نہ دیکھ سکا اس کے بعد اسے کچھ خبر نہیں کہ کیا ہوا کیونکہ وہ بیہوش ہوگیا تھا۔

جب آنکھ کھلی تو وہ پانی بھرے ٹب میں بندھا ہوا پڑا تھا۔ وہ یقیناً ڈوب کر مر جاتا لیکن ضرب شاید اتنی شدید نہ تھی اس لئے دم گھٹتے ہی ہوش میں آگیا، اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے لیکن جانے کس طرح وہ جدوجہد کر کے خود کو ٹب سے باہر گرانے میں کامیاب ہوگیا۔ اور پھر اڑتالیس گھنٹے سے اسی بے بسی کے عالم میں پڑا تھا کہ شیرازی اس کی رہائی کے لئے وہاں پہنچ گیا۔

آرزو اگر اس وقت وہاں پہنچ جاتی تو شاید شیرازی اسے زندہ نہ چھوڑتا۔ اس کے جسم میں غیظ و غضب کی آگ بھری ہوئی تھی۔

خاور کو اس کے گھر چھوڑ کر شیرازی سیدھا آرزو کے دفتر پہنچا، اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ دفتر میں کوئی نہ تھا، لیکن آرزو کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا، وہ اندر داخل ہوا۔ آرزو اپنی کرسی پر تنہا بیٹھی ہوئی تھی۔

شیرازی نے دروازہ کو اندر سے مقفل کیا۔ کرسی گھسیٹی اور آرزو کے سامنے بیٹھ گیا، چند لمحہ دونوں ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھتے رہے۔ "ہاں میری آرزو۔ اب بتلاؤ کیا خیال ہے؟" اس نے آہستہ سے کہا۔

"کیسا خیال۔ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" آرزو نے پوچھا۔

"تم نے نادرہ کے بارے میں پولیس سے بات کی؟"

"نہیں۔ اب تک وہ یہاں نہیں آئے، اور اس سلسلے میں بدحواس ہونے سے فائدہ؟"

"تم واقعی غیر معمولی مضبوط اعصاب کی عورت ہو۔ تم

بیوی

"زیادہ اہم ہے یا پاجامہ؟"

"ایسے بے شمار مقامات ہیں جہاں ہم بیوی کے بغیر بھی جا سکتے ہیں۔"

"مجھے اپنی دونوں بیویوں سے دکھ کے علاوہ کچھ اور نہیں ملا۔"

"کس طرح؟"

"پہلی بیوی میرے ایک قریبی دوست کے ساتھ فرار ہوگئی۔"

"اور دوسری؟"

"دوسری فرار نہیں ہوئی۔"

کو دولت کی بھی کمی نہیں۔ پھر آخر اس گوریلے کی مصیبت گلے کیوں پالی جو بالآخر سنگدل قاتل ثابت ہوا۔"

"میں یقین نہیں کر سکتی کہ یہ حرکت شیرداد کی ہے۔ ایسی سنگدلانہ حرکت وہ نہیں کر سکتا، نہیں۔ تم کو ایسا سنگین الزام لگانے کا حق نہیں پہنچتا شیرازی۔"

"چلو چھوڑو اس ذکر کو۔ یہ بتلاؤ کہ یہ جانتے ہوئے کہ تابندہ کروڑوں کی جائداد کی مالک ہے تم نے اس کو ایک دغاباز شوہر کے پلے کیوں باندھ دیا۔"

"پتہ نہیں تم کیا بکواس کر رہے ہو۔ تابندہ اور کروڑوں کی مالک، میں سوچ بھی نہیں سکتی۔"

"واقعی ۔۔۔ ؟ تو پھر اس کے بارے میں کیا خیال ہے۔" اس نے جیب سے سمار ریلو کی جائداد کی دستاویزات کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں نکال کر آرزو کے سامنے رکھ دیں۔ وہ چند لمحہ ان کو دیکھتی رہی پھر شیرازی کی سمت دیکھا۔

"مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔"

"اوہ ۔ تو پھر تم کو یہ بھی نہیں معلوم ہوگا کہ یہ کاپیاں اور تمام گمشدہ فائلیں تمہاری اسٹڈی والے کمرے کی میز کی بڑی دراز سے برآمد ہوئی ہیں۔" اس نے فائلوں سے نکالے ہوئے کاغذات میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "اور یہ بھی خبر نہیں ہوگی کہ تمہارے مرحوم شوہر کی خوابگاہ والے کمرے کے باتھ روم میں ڈیلی نیوز کا رپورٹر خاور بندھا ہوا پڑا تھا، درحقیقت اسے بھرے ہوئے ٹب میں مرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا تھا۔"

آرزو کا چہرہ غصے اور خوف سے بھیانک ہوگیا تھا، وہ

کانپتی ہوئی آواز میں دہاڑی "شٹ اپ ۔ تم ۔ تم ۔ یہ سب مجھے دہشت زدہ کرنے کے لئے کہہ رہے ۔ ایسا نہیں ہو سکتا ۔ یہ ناممکن ہے ۔"

"میں نے خاور کو اس کمرے سے خود رہا کرایا ہے آرزو ڈارلنگ ۔ تم بڑی مصیبت میں پھنس چکی ہو، پولیس کو جب یہ سب کچھ معلوم ہوگا تو وہ ایک اور سوال کرے گی ۔ ارشد کی لاش تم نے کہاں چھپا دی ہے ۔؟"

"میں ۔ کچھ ۔ نہیں جانتی" آرزو نے تھکی ہوئی آواز میں کہا ۔ "کچھ نہیں جانتی ۔"

"ہوش میں آؤ آرزو ۔" شیرازی نے اس کے شانے جھنجھوڑتے ہوئے کہا ۔ "مجھے سب کچھ بتلا دو ۔ اسی میں تمہاری عافیت ہے ، میں ۔"

فون کی گھنٹی زور سے بجی ، آرزو نے ہاتھ بڑھایا ۔ "نہیں ۔ رسیور نہیں اٹھانا" شیرازی جلدی سے بولا لیکن آرزو نے رسیور اٹھا لیا ۔ "ہیلو ۔" اس نے کہا ۔ "نہیں ۔" شیرازی نے پھر منع کیا ۔ لیکن اچانک آرزو کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا ، آنکھیں دہشت سے پھیل گئی تھیں ، شیرازی رسیور چھیننے کے ارادہ سے تیزی کے ساتھ آگے بڑھا لیکن آرزو نے دیوانوں کی طرح دوسرے ہاتھ سے وار کیا ، تھپڑ اس کی آنکھ پر لگا اور شیرازی آنسو صاف کرتا ہوا پیچھے ہٹ گیا اس نے آرزو کی آواز سنی ، وہ سرگوشی میں کہہ رہی تھی : "ہاں ۔ میں سمجھ گئی ۔ تم اطمینان رکھو ۔" اس نے رسیور میز پر رکھا ، لہرائی اور پھر میز پر گری ، وہ بیہوش ہو چکی تھی ۔

شیرازی نے اسے اٹھا کر صوفے پر لٹا دیا ۔ گلاس میں پانی لا کر اس کے منہ پر چھڑکا ، آرزو نے آنکھیں کھول دیں ، اس نے سہارا دے کر آرزو کو اٹھایا اور گلاس منہ سے لگا دیا ۔ چند گھونٹ پانی پی کر آرزو نے اسے رحم طلب نظروں سے دیکھا ، اس کے چہرے پر شدید صدمہ کے آثار تھے ، شیرازی سمجھ گیا کہ آرزو کو اپنے بچے کے اغوا کی اطلاع مل چکی ہے ۔ "فون کس کا تھا آرزو ؟" اس نے پوچھا لیکن آرزو خاموش رہی وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سامنے گھور رہی تھی ۔

"میں جانتا ہوں آرزو ۔ تمہارا بچہ میرے سامنے اغوا ہوا ہے لیکن اگر تم نے زبان نہ کھولی تو شاید وہ ۔ واپس نہ مل سکے ۔"

"نہیں ۔ اوہ خدایا ۔ نہیں ۔ میں زبان نہیں کھول سکتی ۔ اس نے کہا ہے کہ اگر پولیس یا کسی کو بتلایا تو راحیل زندہ نہ ملے گا ۔ میں نہیں جانتی وہ کون تھا ۔ اوہ شیرازی کیا تم مجھے تنہا نہیں چھوڑ سکتے ۔ خدا کے لئے چلے جاؤ ۔"

"جب تک تم مجھے نہیں بتلاؤ گی میں نہیں جاؤں گا ۔"

"اس نے خبردار کیا ہے ۔ اگر میں نے اس کے کہنے پر عمل نہیں کیا تو ۔ میں بھی مجبور ہوں ۔"

"ٹھیک ہے آرزو ۔ لیکن اچھی طرح سمجھ لو ۔ تم پر قتل کا الزام بھی عائد ہوگا اور اپنی صفائی میں کوئی ثبوت نہ دے سکو گی ، مت کھولو اپنی زبان ، مر جانے دو راحیل کو ۔"

"شٹ اپ ۔ شٹ اپ ۔" وہ کسی بپھرے ہوئے درندے کی طرح اچانک شیرازی پر جھپٹی تھی ۔ اگر وہ پیچھے نہ ہٹ جاتا تو آرزو کے ناخن اسے لہو لہان کر دیتے ۔ "جتنا چاہے چیخ لو ۔ خوب اداکاری کر لو ۔ لیکن اس طرح راحیل واپس نہیں ملے گا ۔" شیرازی نے کہا ۔ آرزو پوری آواز سے چیخی اور پھر دیوانوں کی طرح جھپٹی شیرازی نے اس کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لئے ، کچھ دیر جدوجہد کے بعد آرزو کا جسم اچانک ڈھیلا پڑ گیا اور اس کے شانوں سے لگ کر سسکیاں لینے لگی ۔

اسی لمحہ ایک دھماکہ ہوا ، پشت پر اتنی زور کا دھکا لگا کہ وہ آرزو سمیت فرش پر گر پڑا ۔ دروازے کا پٹ اس کی پشت سے ٹکرایا تھا ، اور پھر کسی نے اس کے کوٹ کا کالر پکڑ کر ایک سمت اچھال دیا ، شیرازی دور جا کر گرا ۔

شیرداد گھٹنوں کے بل جھک کر آرزو کو تسلی دے رہا تھا ۔ وہ کسی دیرینہ عاشق کی طرح جملے بول رہا تھا ۔ پھر اس نے گھوم کر شیرازی کی سمت دیکھا ، اس کی نظروں میں شدید حقارت تھی ۔ "اگر ۔ اگر تم نے آرزو کو ذرا بھی تکلیف پہنچائی ہے ۔ تو میں تمہیں قتل کر دوں گا ۔ خدا کی قسم ابھی قتل کر دوں گا ۔"

شیرازی نے کچھ جواب دیئے بغیر فون پر اپنے فلیٹ کا نمبر ملایا ، کافور کی آواز سنتے ہی کہا ۔ "ڈاکٹر انصاری نے کچھ رپورٹ دی کافور ؟ اوہ ٹھیک ہے ۔" اس نے رسیور رکھا اور شیرداد کی سمت مڑا ۔

"کافور نے ابھی بتلایا کہ ڈاکٹر انصاری کی رپورٹ کے مطابق پانی میں زود اثر زہر ملا ہوا تھا ۔ اسٹرکنین ۔ صرف اس بنا پر میں اب بھی تم پر اعتبار کرنے کو تیار ہوں ۔ لیکن تم پر میلو اور حبیب کے قتل کا الزام اب بھی باقی ہے ، میرا گلا گھونٹنے کی کوشش ، نادرہ کا قتل ۔ شیرداد تم پولیس پر اپنی بیگناہی کس طرح ثابت کرو گے ؟ تم کو وہ فون یاد ہے جو ہوٹل میں آیا تھا ؟ اس نے مجھے سب بتلا دیا تھا ۔"

"وہ جھوٹا ہے ۔ میلو اور حبیب کو میں نے نہیں قتل کیا تھا ۔ نادرہ کی طرح ان کی لاشیں بھی میرے کمرے میں ڈال دی گئی تھیں لیکن یہ محض اتفاق تھا کہ اس دن میں سمار ہلو میں نہیں تھا ، پولیس یہ بات تصدیق کر چکی ہے ۔" شیرداد نے کہا ۔ "تم اس طرح بات نہیں ٹال سکتے شیرازی ۔ تم نے آرزو کو ۔"

"سنو احمق ۔ آرزو ایک برف کی سل کی مانند تھی ، ان کا

شوہر منشیات کا عادی تھا، نشے کے عالم میں مرگیا، ان کا واحد بچہ بھی ذہنی طور پر نارمل نہیں ہے، ازدواجی زندگی ایک عذاب تھی، دولت کی افراط کے باوجود یہ عورت ہمیشہ ذہنی کرب و اذیت کا شکار رہی، صرف خود کو مصروف رکھنے کے لئے سہاگ ایجنسی کا سلسلہ شروع کر دیا، لیکن یہاں بھی چین نہ ملا، ان کے اسٹاف میں چند جرائم پیشہ افراد گھس آئے، مجھے نہیں معلوم کہ یہ کس طرح ہوا بس ایک اندازہ ہے، ان کو پہلے میری بات کا یقین نہیں آیا تھا لیکن اب یقیناً آچکا ہوگا، جس طرح تم کو نادرہ کے قتل میں پھنسانے کی کوشش کی گئی تھی اسی طرح ان کے خلاف بھی سازش کی گئی۔ ان کو ملزمہ ثابت کرنے کے لئے ان کی بیوک استعمال کی گئی، ان کی میز میں جوری کے کاغذات رکھے گئے یہاں تک کہ ایک لاش رکھنے کی کوشش بھی کی گئی تاکہ سارے گروہ کی سرغنہ ان کو تصور کر لیا جائے۔ لیکن جب اس سے بھی کام نہ بنا تو ان کے لڑکے کو اغوا کر لیا گیا تاکہ یہ زبان نہ کھول سکیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں آرزو؟" آرزو نے گردن ہلا کر ہاں کہی "میں چاہتا ہوں کہ یہ سب کچھ تبلا دیں، انہیں معلوم ہے کہ اصل مجرم کون ہے۔ اسی میں عافیت ہے آرزو۔ مجھ پر بھروسہ کرو"۔

"نہیں میں زبان نہیں کھول سکتی۔ پہلے مجھے اس حقیقت کا بالکل پتہ نہ تھا۔ میں مجبور ہوں شیرازی"

"شیرداد۔ اگر انہوں نے زبان نہ کھولی تو دیوی شرن اور نادرہ کے قتل کا الزام انہیں پر عائد ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پولیس راحیل کے اغوا کو بھی انہیں کا ڈرامہ سمجھے۔ لیکن وقت نہیں ہے، تم ان کو لے کر فوراً اپنے دفتر چلے جاؤ تاکہ یہ پولیس کے ہاتھ نہ لگ سکیں، ان سے حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کرو۔ جاؤ۔ جلدی کرو۔ پولیس کسی بھی لمحہ پہنچنے ہی والی ہے"۔

دونوں کے جانے کے بعد شیرازی اطمینان سے آرزو کی کرسی پر بیٹھ گیا، اس نے میز کی دراز کھولی اور کاغذات کو دیکھنے لگا، اس کی نظر اسٹاف اپائنٹمنٹ کی فائل پر پڑی، شیرازی نے فائل اٹھا کر کھولی، سب سے پہلے کاغذ پر زرفی کی تصویر کے ساتھ اس کے مکمل کوائف تحریر تھے، اس نے پڑھنا شروع کیا، لیکن قدموں کی چاپ سن کر اس نے جلدی سے فائل دراز میں رکھ دی اور داہنا ہاتھ جیب میں ڈال کر پستول پر رکھ لیا لیکن اندر داخل ہونے والا سپرنٹنڈنٹ فاروقی تھا۔ اس نے حیرت سے شیرازی کی سمت دیکھا۔ شیرازی مسکرا دیا۔ "دوسری شادی کا ارادہ ہے کیا؟" شیرازی نے پوچھا۔

"مس آرزو کہاں ہیں؟"

"یہ معلوم ہوتا تو میں یہاں بیٹھ کر جھک کیوں مار رہا ہوتا"۔

"مجھے معلوم ہے کہ تم اس کے بنگلے میں موجود تھے شیرازی۔۔۔ اور تم نے یقیناً مسز تابندہ کی دستاویزات کی وہ کاپیاں دیکھ لی ہوں گی، سماریلو کی اس جائداد نے تابندہ کو بہت مالدار بنا دیا ہے، اس نئی کان کی دریافت کے بعد ہی مسٹر شوکت یوسف حادثے میں ہلاک ہو گئے"۔

"ہلاک نہیں۔ قتل ہو گئے"۔ شیرازی نے کہا۔ "مجھے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے فاروقی، لیکن کیا تم جانتے ہو کہ دیوی شرن سے ملنے والوں میں دیال بھی شامل تھا؟"

"ہاں۔ دیوی شرن اس کو بھی بلیک میل کر رہا تھا اور نادرہ کو بھی، وہ آرزو کے یہاں کام کرنے والے بیشتر افراد کو بلیک میل کر رہا تھا یہ خوبصورت عورت تو بلا کی مکار نکلی"۔

"یہ بالکل جھوٹ ہے"۔ انہوں نے چونک کر دیکھا، دروازے میں کھڑی زرفی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ "آرزو بڑی ستم رسیدہ اور معصوم لڑکی ہے"۔

"بالکل تمہاری طرح زرفی"۔ شیرازی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "تم آرزو سے چھپ کر اس کی کار میں دیوی شرن سے ملتی رہی ہو"۔

"ہاں۔ یہ سچ ہے، میں یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ وہ آرزو کو کیوں ستا رہا تھا، وہ آرزو سے کیا چاہتا تھا۔ لیکن تم دونوں یہاں کیا کر رہے ہو، کیا تم کو خبر ہے کہ بیچاری پر کیا قیامت ٹوٹ پڑی ہے؟"

"ہاں۔ ہمیں بھی معلوم ہے۔ اور آرزو کو بھی"۔

"آرزو کو معلوم ہو چکا ہے؟ کیسے۔ وہ ہے کہاں؟ اسے کس نے اطلاع دی؟"

"تم نے اور تمہارے ساتھی نے"۔ شیرازی نے کہا۔ "فاروقی تم کو سب کچھ معلوم ہو چکا ہے سوائے اس کے کہ اس گروہ کی سرغنہ زرفی ہے، آرزو کی سب سے زیادہ قابل اعتماد دست راست زرفی"۔ فاروقی حیرت سے زرفی کو دیکھ رہا تھا۔

"تم دونوں کا دماغ چل گیا ہے، تم مجھ پر شک کر رہے ہو؟ میں نے تو خود آرزو کو بارہا سمجھایا کہ اسٹاف میں کوئی خطرناک اور سازشی مجرم گھس آیا ہے، اور میرا خیال ہے میں نے اسے پہچان بھی لیا تھا، وہ عموماً جوڑوں کے انتخاب میں آرزو کو راضی کر لیا کرتا تھا، اسی نے مسٹر شیرداد کے لئے نادرہ کا انتخاب کیا تھا اور اسی نے تابندہ کی شادی ارشد جمیل سے کرائی تھی۔ وہ۔۔۔"

"لیکن وہ ہے کون؟" شیرازی نے جلدی سے سوال کیا۔

زرفی نے میز کی دراز سے فائل نکالی اور ورق الٹ کر ایک تصویر شیرازی کے سامنے رکھ دی۔ "نہیں۔ یہ ناممکن ہے"۔ شیرازی اچھل پڑا۔ "تمہارا یہ جھوٹ ابھی مکمل ہو جائے گا"۔ اس نے فائل فاروقی کی سمت بڑھائی۔ "دیکھو۔ یہ تمہارا اپنا آدمی ہے نا فاروقی؟"

"تیرا آدمی؟" فاروقی نے حیران ہو کر کہا۔ "میرے اسٹاف سے اس کا کبھی تعلق نہیں رہا، اس سے تو پہلی مرتبہ تم نے اپنے فلیٹ میں تعارف کرایا تھا۔ تم نے اسی کے سامنے ساری باتیں کی تھیں اس لئے میں یہی سمجھا کہ تمہارے اعتماد کا آدمی ہے۔"

"یہ ہمارے اسٹاف کا آدمی ہے۔" زدنی نے غصے میں چلا کر کہا۔ "میں نے اسے کبھی پسند نہیں کیا۔ یہ وزیٹر کی پوسٹ پر کام کرتا ہے اور ہر رشتے کی چھان بین کرنا اس کی ذمہ داری ہے۔ پتہ نہیں کیوں آرزو اس سے بہت متاثر ہیں، اس کی ہر بات مان لیتی ہیں یہاں تک کہ وہ اکثر و بیشتر ان کی بیوک بھی لے جاتا ہے۔"

شیرازی کا چہرہ فق تھا، اس نے بدحواسی کے عالم میں فون اٹھا کر نمبر ملانا شروع کیا۔ "میں بھی کتنا احمق ہوں۔ اب تک اس کو تمہارا آدمی سمجھ کر نظر انداز کرتا رہا" اس نے فاروقی کی سمت دیکھ کر کہا۔ "ہیلو۔" چند لمحہ گفتگو کے بعد اس نے بے بسی کے عالم میں فاروقی کی سمت دیکھا۔ "فاروقی۔ انسپکٹر زاہد وہاں موجود ہے، اس نے بتلایا کہ تابندہ کچھ دیر پہلے سرفراز میرا مطلب ہے عزت یار کے ساتھ کہیں چلی گئی۔"

فاروقی اور زدنی چلے گئے لیکن شیرازی سیدھا اپنے فلیٹ واپس پہنچا، اسے اپنی حماقت کا بڑی شدت کے ساتھ احساس تھا، وہ خود کو مجرم تصور کر رہا تھا۔ فلیٹ خالی تھا، کافور موجود نہیں تھا لیکن وہ ایک خط رکھ کر گیا تھا۔ اس نے لکھا تھا۔ "تنہائی میں غور کیا تو خیال آیا کہ ہم نے سرفراز کے بارے میں تصدیق نہیں کی، میں نے پولیس ہیڈ کوارٹر اور فاروقی صاحب کے دفتر فون کر کے معلوم کیا، سرفراز یا اس کے حلیئے کے کسی آدمی کا تعلق اسپیشل برانچ سے نہیں ہے، میرا خیال ہے مسز تابندہ خطرے میں ہیں اس لئے دلکشا ہوٹل جا رہا ہوں۔ امید ہے آپ معاف کر دیں گے۔" شیرازی نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ اسی لمحے فون کی گھنٹی بجی لیکن کافور کے بجائے فاروقی کی آواز سنائی دی، اس نے بتلایا کہ تابندہ کو عزت یار کے ساتھ ہوٹل سے گئے دو گھنٹے گذر چکے تھے، عزت یار اپنے گھر کے پتہ پر بھی موجود نہیں تھا، پولیس کا جو سب انسپکٹر ان کا تعاقب کر رہا تھا اسے بھی عزت یار جل دے کر غائب ہو گیا۔

شیرازی سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اسے توقع تھی کہ کافور ہر ممکن کوشش کرے گا، لیکن اتنے چالاک مجرم سے اس کا اکیلے نمٹنا مشکل نظر آتا تھا، وہ پریشانی کے عالم میں ٹہلنے لگا، پندرہ بیس منٹ بعد فون کی گھنٹی بجی تو وہ اچھل پڑا۔ لپک کر فون اٹھایا۔ کافور کی آواز سن کر وہ خوشی سے بے ساختہ مسکرا دیا۔ "میں اس وقت مہ گزنہ کے ایک میڈیکل اسٹور سے بول رہا ہوں سر" کافور نے کہا۔ "سرفراز اپنے ساتھ مسز تابندہ کو لیکر ڈلیس روڈ کے ایک دو منزلہ مکان قدیر منزل میں ہیں، ان کی کار باہر کھڑی ہے، میں نے فاروقی صاحب کو بھی فون کر دیا ہے۔"

"تم وہیں ٹھہرو۔ میں پہنچ رہا ہوں"۔ شیرازی نے کہا اور ریسیور رکھ کر تقریباً بھاگتا ہوا باہر نکلا۔

✱

شیرازی جب وہاں پہنچا تو قدیر منزل پولیس کے محاصرے میں تھی، عمارت کی بالائی منزل پولیس کی گاڑیوں کی سرچ لائٹ کی زد میں تھی، پرانی طرز کی اس عمارت کے سامنے کشادہ احاطہ تھا جس میں درخت لگے ہوئے تھے، وہ گاڑی سے اتر کر جیسے ہی آگے بڑھا فائر کی تیز آواز فضا میں گونجی۔ ایک پولیس افسر نے لپک کر راستہ روک لیا۔ "آپ اندر نہیں جا سکتے، مجرم گولیاں چلا رہے ہیں۔"

"مجھے فاروقی کے پاس پہنچا دو۔" شیرازی نے کہا۔

سب انسپکٹر نے تاریکی میں اسے غور سے دیکھا اور پہچان لیا۔ ذرا دیر بعد وہ فاروقی کے پاس تھا جو ایک درخت کی آڑ میں چھپا ہوا تھا۔ "اوہ تم آ گئے، صورت حال خراب ہے" تابندہ اور آرزو کا بچہ مکان میں موجود ہیں۔ عزت یار کے علاوہ اس کے دو اور ساتھی بھی اوپر ہیں، میں نے فون پر ان سے بات کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ اگر انہیں فرار ہونے کا موقعہ نہ دیا گیا تو تابندہ اور بچے کو قتل کر دیں گے، وہ ملک سے باہر جانے کے لئے طیارہ بھی مانگ رہے ہیں۔"

"عمارت میں داخلے کی کوئی صورت نہیں؟"

"میں نے ہیڈ کوارٹر سے امداد مانگی ہے جو آتی ہی ہو گی" فاروقی نے کہا۔ "ان کے پاس رائفلیں ہیں اور اگر ہم عمارت میں داخل ہونے میں کامیاب ہو بھی جائیں تو تابندہ اور بچے کی زندگی کی کون ضمانت دے گا۔"

"سنو فاروقی۔ تم صرف ایک کام کرو، ان کو بات چیت اور فائرنگ سے اپنی جانب متوجہ رکھو" اس نے عمارت کی سمت دیکھتے ہوئے کہا۔

"شیرازی۔ میں تمہیں کوئی احمقانہ خطرہ نہیں مول لینے دوں گا۔"

"اطمینان رکھو ڈیر۔ اب مزید حماقت نہیں کروں گا" شیرازی نے ہنستے ہوئے کہا۔

وہ پیڑوں کی آڑ لیتا ہوا احاطے سے باہر نکلا، شیر داد کو تلاش کرنے میں اسے کوئی دشواری نہ ہوئی، جو باہر مجمع میں کھڑا کسی درندے کی طرح غرا رہا تھا۔ شیرازی کو دیکھتے ہی وہ اس کی سمت لپکا۔

"بکواس کی مہلت نہیں شیر داد، تم میرے ساتھ آؤ۔ آج تمہارا امتحان ہے" شیرازی نے اس کو دیکھتے ہی کہا اور مجمع سے دور لے گیا۔

پندرہ منٹ بعد وہ قدیر منزل کے برابر والی عمارت کی چھت پر تھے۔ نیچے فائرنگ کا سلسلہ جاری تھا۔ شیرازی نے نائیلون کی

رسی کا پھندا بنا کر شیرداد کی سمت بڑھایا، اسے قدیر منزل کے اوپر والے اس پول میں پھنسانا ہے۔" اس نے اشارے سے بتلایا۔ "آج تمہاری قوت کا امتحان ہے شیرداد۔"

قدیر منزل کی چھت پر تقریباً چار فٹ بلند ایک پختہ کھمبے میں جھنڈا لگانے کا آہنی پول لگا ہوا تھا۔ رسی کافی لانبی تھی، پانچویں کوشش میں شیرداد کامیاب ہوگیا۔ رسی کا چوڑا پھندا آہنی پول سے گذر کر سمینٹ کے کھمبے میں جاکر پھنس گیا، دونوں عمارتوں کے درمیان تقریباً بیس فٹ کا فاصلہ تھا۔ لیکن شیرازی آج جان پر کھیل کر بھی اپنی غلطی کا کفارہ ادا کرنے کو تیار تھا۔

قدیر منزل کی چھت پر پہنچنے میں اسے زیادہ دیر نہیں لگی۔ رسی کے سہارے چھت تک کا فاصلہ طے کرتے ہوئے ذرا سی غلطی اسے موت کے منہ میں پہنچا سکتی تھی لیکن اس پر جو جنونی کیفیت طاری تھی جس نے اسے ہر خطرے کے احساس سے بے نیاز کر دیا تھا۔

وہ زینے کی سمت بڑھا جو دوسری منزل کو جاتا تھا۔ فائرنگ تیز ہو گئی تھی۔ پولیس لاؤڈ سپیکر پر مجرموں کو خبردار کر رہی تھی۔ اس شور و غل میں اس کے قدموں کی چاپ سنے جانے کا اندیشہ نہیں تھا۔

سیڑھیاں اتر کر وہ کاریڈور میں پہنچا جو بالکل تاریک پڑا تھا۔ صرف ایک کمرے سے روشنی جھلک رہی تھی۔ شیرازی دبے پاؤں اس سمت بڑھنے لگا۔

فائر کی تیز آواز کے ساتھ شیشہ ٹوٹنے کا چھناکا ہوا اور پھر کسی نے غصے میں کہا۔ "ہم زیادہ دیر مقابلہ نہیں کرسکتے۔ بچ کر نکلنے کی اب کوئی امید نہیں ہے۔"

"مرنا تو ایک دن یقینی ہے۔ آج نہ سہی کل۔" سرفراز کی آواز سنائی دی۔ "افسوس یہ رہے گا کہ شیرازی زندہ بچ گیا، کاش وہ بھی یہاں ہوتا۔"

"ہم کئی روز تک مقابلہ جاری رکھ سکتے ہیں۔" کسی نے کہا۔ "تم شیرازی کو یہاں بھیجنے کا مطالبہ کیوں نہیں کرتے۔ دیکھیں اس میں کتنی ہمت ہے۔"

"خیال برا نہیں ہے لیکن ابھی ذرا صبر کرو۔ ہمارے پاس کھانے کا ذخیرہ بھی کافی ہے اور تفریح کے لئے تابندہ جیسی حسینہ بھی موجود ہے۔" سرفراز نے قہقہہ لگایا۔ "تم دونوں مورچہ سنبھالے رہو میں ذرا اس کی خبر لے آؤں۔" قدموں کی چاپ سنتے ہی شیرازی دیوار سے چپک کر کھڑا ہوگیا۔ دروازہ کھلا تو اسے سرفراز کا چہرہ صاف نظر آیا، وہ پستول ہاتھ میں لئے ہوئے باہر نکلا، شیرازی نے اندازہ کر لیا تھا کہ وہ پانچ چھ کی تعداد میں ہیں کیونکہ فائرنگ نیچے کی منزل سے بھی ہو رہی تھی۔ وہ عمارت کے ہر سمت مورچہ جمائے بیٹھے تھے۔ سرفراز زینے سے اتر کر پہلی منزل پر پہنچا تو شیرازی اس سے زیادہ دور نہ تھا، گراؤنڈ فلور پر جانے والے زینے پر کسی نے آواز دی، سرفراز نے وہیں سے اسے ہدایت کی کہ اپنی جگہ نہ چھوڑے اور عمارت کے گرد جو بھی نظر آئے بے دریغ گولی مار دے۔

وہ ایک دروازے کے سامنے رکا، جیب سے کنجی نکالی، دروازے کا تالا کھول کر اندر داخل ہوا۔ اس نے دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ دوسرے ہی لمحہ اس کی آواز سنائی دی۔ "کیسا مزہ آرہا ہے تابندہ ڈارلنگ۔ گھبراؤ نہیں رات بے کیف نہیں گذرے گی اور اس ناتواں شوہر سے کوئی امید نہ رکھو۔ اس کے دن تو اب پورے ہو چکے ہیں۔"

کسی نے جواب نہیں دیا۔ لیکن بچے کی سسکیاں سنائی دینے لگیں۔ سرفراز نے غصے میں حکم دیا۔ "اسے چپ کراؤ ورنہ ہمیشہ کے لئے خاموش کر دوں گا۔"

"بچہ ہے۔ فائرنگ سے دہشت زدہ ہوگیا ہے۔" تابندہ نے آہستہ سے کہا۔ "اتنے ظالم تو نہ بنو۔"

شیرازی نے دروازے میں جھانکا۔ ایک نحیف اور بیمار سا شخص بستر پر لیٹا تھا، اس کے ہاتھ اور پیر مسہری سے بندھے ہوئے تھے۔ یقیناً وہ ارشد جمیل تھا، بڑھی ہوئی داڑھی اور میلے لباس سے ظاہر تھا کہ وہ یہاں کافی دنوں سے قید تھا۔ تابندہ بستر کے پاس کھڑی تھی، اس کے دونوں ہاتھ پشت کی سمت باندھ کر اسی رسی کو مسہری سے باندھ دیا گیا تھا۔ تابندہ کے پاس فرش پر دہشت زدہ راحیل بیٹھا ہوا تھا، وہ تابندہ کی دونوں ٹانگیں پکڑے سے چمٹا ہوا تھا اور زور زور سے سسکیاں لے رہا تھا۔

شیرازی نے پستول ہاتھ میں لیا اور اندر داخل ہوکر دروازہ بند کر دیا۔ سرفراز پھرتی کے ساتھ گھوما۔ "ہاتھ نیچے رکھنا سرفراز ورنہ بے دریغ گولی مار دوں گا۔ میں خود آگیا، اب تو خوش ہو؟"

سرفراز کا چہرہ غصے اور حقارت سے بگڑ گیا۔ اس نے تیزی سے ہاتھ کو حرکت دی۔ لیکن شیرازی غافل نہ تھا۔ اس نے دو فائر کئے۔ پہلی گولی سرفراز کے ہاتھ پر لگی اور پستول چھوٹ کر دور گرا۔ دوسری اس کی ران پر، وہ کراہ کر وہیں بیٹھ گیا، شیرازی نے جلدی سے مڑ کر دروازے کو اندر سے مقفل کر لیا۔ اس کے بعد کھڑکی کے پاس پہنچا اور پٹ کھول کر فضا میں پے در پے تین فائر کئے۔

فاروقی کے لئے یہ طے شدہ اشارہ تھا۔ پولیس کو عمارت میں داخل ہونے میں صرف چند منٹ لگے، صرف چار پولیس والے زخمی ہوئے۔ دو مجرم مارے گئے بقیہ نے ہتھیار ڈال دئے۔

شیرازی کا ڈرائنگ روم بھرا ہوا تھا، کافور نے سب کے لئے پوری ضیافت کا اہتمام کر رکھا تھا۔ ایک طرف صوفے پر شیرداد

گوریلوں کے انداز میں بیٹھا ہوا تھا۔ آرزو کا ہاتھ اس نے پکڑ رکھا تھا۔ دوسرے صوفے پر تابندہ اور ارشد جمیل بیٹھے تھے۔ زوبی اپنے ساتھ بیٹھے راحیل سے کھیل رہی تھی، خاور میز کے کونے پر بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ یہ سرفراز یا عزت یار کے گروہ کی گرفتاری کا تیسرا دن تھا۔

"عزت یار جب سہاگ ایجنسی کے نمائندے کی حیثیت سے ملنے آیا تو میں اس سے بے حد متاثر ہوا تھا" ارشد کہہ رہا تھا۔ "جلد ہی ہم گہرے دوست بن گئے، اسی کے مشورے پر میں نے اپنی اور تابندہ کی تمام جمع پونجی بزنس میں لگا دی۔ مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا کہ عزت مجھ سے فراڈ کر رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے مجھے اپنے گھر دعوت دی اور اپنی اصلی شکل میں آ گیا، اس نے مجھے بتلایا کہ تابندہ کے ہوٹل کے کمرے میں سہاگ ایجنسی کا اشتہاری کتابچہ اسی نے لے جا کر رکھا تھا۔ اسی نے آرزو کو مشورہ دیا تھا کہ وہ تابندہ کو شوہر منتخب کرنے کی ترغیب دے، ویسے میں کم از کم اس کام کے لئے اس کا یقیناً ممنون ہوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے تابندہ کی سمت دیکھا۔

"اسی نے دیوی شرن کو سہاگ میں ملازم رکھایا تھا، اسی کے حکم پر فائلیں چوری کی گئیں تاکہ اسے بلیک میلنگ کی سازش کا رنگ دیا جا سکے۔ اس نے یہ سب کچھ مجھے فخریہ انداز میں سنایا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں تابندہ کی وہ دستاویزات حاصل کر کے اسے دے دوں جو سمار یلو کی جائیداد سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس نے مجھے ایک خط لکھنے پر بھی مجبور کیا لیکن جب دوبارہ یہ کوشش کی تو میں نے انکار کر دیا، اس کے بعد مجھے قید یہ منزل منتقل کر دیا گیا اور ہر ممکن اذیت دی گئی۔ لیکن میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ مر جاؤں گا مگر کوئی ایسی حرکت نہ کروں گا جس سے تابندہ کو مزید نقصان پہنچے۔" تابندہ نے پیار سے اس کا ہاتھ دبایا۔ "وہ کمینہ مجھے ہر روز آ کر اپنے کارناموں کی تفصیل سناتا تھا۔ اس نے مجھے یقین دلانے کی کوشش کی کہ جلد ہی وہ مجھے ہلاک کر کے تابندہ سے شادی کرے گا اور پھر سمار یلو کی ساری دولت پر اس کا قبضہ ہو گا لیکن میں جانتا تھا کہ وہ جھوٹا ہے۔ دن بدن اس کے غصے اور دھمکیوں میں شدت آتی جا رہی تھی جس سے اندازہ ہو جاتا تھا کہ اسے مسلسل ناکامی ہو رہی ہے۔ اسے سب سے زیادہ پریشانی اس بات کی تھی کہ شیر داد یہاں کیوں آیا ہے۔"

"کیوں آیا ہے؟" شیر داد غرایا۔ "اسے معلوم نہ تھا کہ۔۔"

"تم چپ رہو جی۔" آرزو نے ڈانٹا۔

"اوکے ڈارلنگ۔" شیر داد بڑی سعادت مندی کے ساتھ چپ ہو گیا۔

"اسی نے نادرہ کو شیر داد کے پیچھے لگایا۔ اور جب تک شیرازی سے تمہاری ملاقات نہیں ہوئی تھی عزت یار کو اپنی کامیابی کا یقین تھا۔ اس کے ساتھ تین خطرناک افریقی بھی تھے جو سمار یلو میں مسٹر شوکت یوسف کے قتل کے ذمہ دار تھے۔ ان کا سرغنہ ایک لمبے بالوں والا کریمین تھا جس کا نام ٹوڈا تھا۔ اسی نے عزت یار کو اس سازش پر آمادہ کیا تھا لیکن عزت یار کسی پر بھروسہ نہیں کرتا تھا، جب شیرازی نے دیوی شرن کا پتہ لگا لیا تو انہوں نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اسے ہلاک کر دیا اور یہ فیصلہ کر لیا کہ شیرازی اور شیر داد دونوں کو ختم کرنا ضروری ہے۔ ان کو نادرہ پر بھی شک ہو گیا تھا اس لئے ٹوڈا نے خود اسے ہلاک کر کے شیر داد کو پھانسنے کی سازش کی، اور اس تمام سازش کا الزام آرزو پر ڈالنے کے لئے وہاں پر چوری شدہ فائلیں اور کاغذات چھپا دیئے۔ اسی دوران خاور وہاں پہنچ گیا انہوں نے سوچا اگر اس کی لاش بنگلے سے برآمد ہو تو آرزو مستقل طور پر راستے سے ہٹ جائے گی۔ یہ عزت یار پر اتنا بھروسہ کرتی تھی کہ اسے کسی کام میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوئی۔ خدایا اتنا مکار شخص میں نے کبھی نہیں دیکھا، میرا خیال ہے وہ ذہنی مریض ہے۔"

"شیر داد تم کچھ نہ بتلاؤ گے؟" شیرازی نے کہا۔

"کیوں نہیں بھائی جان۔" شیر داد نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ "کیا آپ یقین کریں گے کہ میں شوکت یوسف کا بیٹا ہوں؟"

"تم۔۔" شیرازی اچھل پڑا۔

"ہاں۔ نالائق بیٹا جسے انہوں نے گھر سے نکال دیا تھا۔ لیکن موت سے پہلے انہوں نے مجھے ہیروں کی نئی کان کی دریافت کے بارے میں اطلاع دیتے ہوئے واپس آنے کا حکم دیا۔ لیکن ظالموں نے مجھے ان سے ملاقات کا موقع نہ دیا، وہ میرے پہنچنے سے پہلے حادثے میں ہلاک ہو گئے۔ انہوں نے موت سے پہلے اپنی تمام دولت میرے نام اور تمام جائیداد تابندہ کے نام منتقل کر دی تھی۔ میں اپنے باپ کے قاتلوں کا سراغ لگاتا یہاں پہنچا تھا لیکن بھائی جان۔ تم نہ ملتے تو۔۔"

"او بھیا۔" تابندہ دوڑ کر شیر داد سے لپٹ گئی۔

"بھائی بہن کا ملاپ مبارک ہو شیر داد" ارشد نے کہا۔

"شیر داد کو ایک اور ملاپ کی مبارکباد بھی دو ارشد" شیرازی نے آرزو کی سمت دیکھتے ہوئے کہا۔

آرزو کا چہرہ شرم سے تمتما اٹھا۔ اس نے غصے میں شیرازی کو گھورا۔

لوٹ سیل

محی الدین نواب

منّو بھائی چند ماہ پہلے ادیبوں اور صحافیوں کے درمیان ایک معروف شخص تھے لیکن جب سے ان کی سلسلہ وار کہانی "سونا چاندی" لاہور ٹی وی سے نشر ہو رہی ہے تب سے منّو بھائی ہر شہری، ہر محلے اور ہر گھر میں اس طرح پہچانے جانے ہیں جیسے وہ اپنے ہی گھر کے آدمی ہوں پہلے وہ مخصوص حلقوں میں معروف تھے اب عوام میں مشہور ہیں۔ یہ شہرت ان کی منہ بولتی صلاحیتوں کا انعام ہے بے شک انہوں نے ٹی وی ڈراموں میں ایک نیا اسٹائل پیش کیا ہے۔ ایک سیدھی سادی کہانی کے پیچھے پورے معاشرہ کی سنگینی کو پیش کرنے کا منفرد انداز ایسا ہے کہ اب کتنے ہی لکھنے والے منّو بھائی کے اس انداز کو ضرور اپنانے کی کوشش کریں گے۔

کالم نویسی میں بھی منّو بھائی کا اپنا ایک منفرد انداز ہے۔ ایک کالم میں انہوں نے محبت اور نفرت کے متعلق نئی معلومات فراہم کی ہیں۔ یہ معلومات اتنی دلچسپ ہیں کہ ہم اپنے قارئین کے سامنے منّو بھائی کے اس کالم کو مختصر طور سے پیش کر رہے ہیں۔

منّو بھائی نے ایک امریکی ماہرِ نفسیات جان للی کی تحقیقات کے بارے میں لکھا ہے: "امریکی ماہرِ نفسیات جان للی نے پندرہ سالہ تحقیق کے بعد انسانی جسم کے اندر محبت کے غدود دریافت کئے ہیں۔ اس غدود کا نام پچوٹری یا پیوٹری غدود ہے۔ پروفیسر جان للی کہتے ہیں کہ صرف وہی انسان محبت کرتا ہے جس کے جسم میں پچوٹری غدود موجود ہوں۔ جب پچوٹری غدود والا لڑکا پچوٹری غدود والی لڑکی کو دیکھتا ہے تو ان دونوں کے پچوٹری غدود جوہری توانائی کا تبادلہ کرتے ہیں اور دونوں میں بیک وقت محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر ایک خاص کرنٹ ان کے جذبات میں پختگی پیدا کرتا ہے۔ تو محبت عشق میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

طبِ جدید اور ماڈرن سرجری جو معجزے دکھا رہی ہے۔ پروفیسر جان للی کی یہ تحقیق اور یہ دعویٰ اگر درست ہے تو اس کے پیشِ نظر پچوٹری غدود کے ٹیکے یا کیپسول بھی تیار کئے جا سکتے ہیں۔ جن لوگوں کے پچوٹری غدود زیادہ بڑھ جائیں یعنی محبت زیادہ بڑھ جائے۔ ان کے فالتو غدود ان دماغوں میں منتقل کئے جا سکتے ہیں۔ جو ان غدود سے یا محبت سے محروم ہیں۔ اس طرح معاشرے میں پچوٹری غدودوں یا محبتوں کا توازن پیدا کیا جا سکتا ہے۔ پچوٹری غدودوں کی ہم آہنگی معاشرے کی اصلاح کا سبب بن سکتی ہے۔"

پروفیسر جان للی کی اس تحقیقات کے متعلق ذکر کرتے ہوئے منّو بھائی اب اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ پچوٹری غدود کی دریافت کے بعد نفرت و حقارت، غم و غصہ اور شک و شبہ کے غدود کا دریافت ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ کیونکہ معاشرے کی خرابی کی اصل وجہ پچوٹری غدود نہیں ہے۔ وہ منفی غدود ہیں جو پچوٹری غدود کو یا محبت کو غلط راہ پر ڈالتے ہیں۔ محبت جرم نہیں ہے۔ محبت تو خداوند کریم کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ جو اس دنیا کی تزئین و آرائش کرتی ہے۔ زیبائش و آفرینش کا سبب بنتی ہے۔ محبت کو جرم بنانے والے حرص اور ہوس کے غدود ہیں جو محبت کو زبردستی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اگر کسی معاشرے کے افراد کو حرص و ہوس کے غدود سے نجات دلا دی جائے تو تمام نفرتوں اور ظلم و ستم سے نجات مل جائے گی اور محبت کے غدود اپنے وہی فرائض سرانجام دینے لگیں گے جو قدرت نے انہیں دے رکھے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اگر محبت کے غدود دوسرے تمام مخالف غدودوں کے اثرات سے محفوظ ہو جائیں تو پورا معاشرہ سنورے ہوئے بالوں کے ساتھ اجلے لباس میں دکھائی دے گا۔ اُجلا لباس اس کے ذہنوں میں بھی اجالے بھر دے گا۔ گلی کوچے بھی صاف ستھرے دکھائی دیں گے۔ صاف ستھری اور اُجلی نسلیں پیدا ہوں گی۔ کھیتوں میں چارہ اور کھلیانوں میں دانے بڑھ جائیں گے۔ گائے، بھینس پہلے سے زیادہ دودھ دینے لگیں گی۔ درختوں میں زیادہ رسیلے پھل لگیں گے اور محبت کی فراوانی ہر چیز، ہر شئے اور ہر نعمت کی فراوانی کر دے گی اور نعمتوں کی فراوانی کا نام ہی جنّت ہے اور جنّت میں اصلاحِ معاشرہ کی ضرورت نہیں پڑتی؟

منّو بھائی کے اس آخری فقرے کے پیشِ نظر محی الدین نواب نے اپنے ملکی حالات پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ ہمارا ملک جنّت نہیں ہے تقریباً پانچ برس سے ہمارے ہاں جو اصلاحِ معاشرہ کی مہم چلی ہے اس کا اب تک خاطر خواہ نتیجہ سامنے نہیں آیا ہے۔ اس کی وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ ہمارے ہاں پچوٹری غدود کی کمی ہے۔ اصلاحِ معاشرہ کی مہم شاید ابھی اور سات برس تک جاری رہے گی۔ اس دوران پچوٹری غدود کے ٹیکے اور کیپسول تیار ہو جائیں گے۔ اس کے بعد اصلاحِ معاشرہ کی کوشش اتنی آسان ہو جائے گی کہ پلک جھپکتے میں ہمارا ملک جنّت بن جائے گا۔

تو آئیے! محی الدین نواب آپ کو ۱۹۹۰ء کے زمانے میں لے جا رہے ہیں۔ جہاں اصلاحِ معاشرہ کی مہم کامیاب ہو چکی ہے۔

موجودہ کہانی میں نواب صاحب نے جہاں بڑے ملکوں کی ریشہ دوانیوں کا ذکر کیا ہے وہیں چھوٹے ممالک کو زندہ رہنے کا بہترین گُر سکھانے کی بھی سعی کی ہے۔ کاش چھوٹے ممالک اپنے اندر وہ خصوصیات پیدا کرلیں جس کا کوئی توڑ بڑے ممالک کے پاس نہ ہو۔ سرّی رَقی کی تیسری کہانی

ایک بہت بڑے ملک کی انٹیلی جنس والے ایک بہت ہی خفیہ اجلاس میں شریک تھے۔ اس خفیہ اجلاس میں اس بڑے ملک کا سربراہ اور وزیرِ خارجہ وغیرہ بھی موجود تھے۔ اس اجلاس میں ایک اہم سوال زیرِ بحث تھا اور وہ سوال تھا: پاکستان میں پچھلے سات برس سے کوئی تخریبی کارروائی کیوں نہیں ہو رہی ہے؟"

وزارتِ خارجہ کے سیکریٹری نے کہا "دنیا کا ہر بڑا ملک کسی چھوٹے ملک میں اپنی مرضی کی حکومت قائم کرنے کے لئے اپنے ایجنٹ یا دلالوں کے ذریعے اس ملک میں تخریبی کارروائی کراتا ہے۔ ہماری مخالفت میں جو بڑا ملک ہے وہ بھی یہی کرتا ہے اور ہم بھی پاکستان میں یہی کرتے رہے لیکن جن دلالوں کو اور جن جماعتوں کو ہم تخریبی کارروائی کے لئے بڑی سے بڑی مالی امداد دیتے تھے اب وہ جماعتیں ہم سے امداد لینے سے انکار کرتی ہیں اور انہوں نے تخریبی کارروائیوں سے توبہ کرلی ہے۔ وہ سب اپنے ملک کے وفادار بن گئے ہیں۔ یہ اچانک انقلاب کیسے آیا؟"

"اس ایک سوال کا جواب حاصل کرنے کے لئے ہم نے بہت کوششیں کیں۔ پاکستان میں ہمارے سفارت خانے کا پورا عملہ موجود ہے لیکن اس سفارت خانے کا ہر فرد پاکستان پہنچ کر پاکستان کا وفادار بن جاتا ہے اور ہمارے ملک کے لئے جاسوسی کرنا بھول جاتا ہے۔ ہم نے کتنے ہی افسروں کو وہاں سے بلایا اور ان کی جگہ دوسروں کو بھیج دیا۔ جنہیں واپس بلایا۔ ان سے طرح طرح کے سوالات کئے۔ وہ صرف محبت اور امن و آشتی کی باتیں کرتے ہیں۔ انہیں دھمکیاں دی گئیں، سزا کا خوف دلایا گیا۔ ان پر سختیاں بھی کی گئیں لیکن ہمارے ملک کے وہ جاسوس ہمارے ہی منہ پہ کہتے رہے کہ وہ پاکستان سے غداری نہیں کریں گے۔ وہاں کا نمک کھایا ہے۔ اس سے نمک حلالی کرتے رہیں گے۔ پھر انہیں ذہنی اذیتیں پہنچائی گئیں، انہیں بجلی کے جھٹکے دیئے گئے۔ پھر رفتہ رفتہ سال، دو سال بعد وہ کچھ نارمل ہوئے۔ پاکستان کی وفاداری پہلے جیسی تو نہ رہی لیکن وہ یہ بتانے سے قاصر تھے کہ ان کے ساتھ کیا ہوا۔ وہ کیوں پاکستان کے وفادار بنے رہے تھے؟ ان کے ساتھ ایسا کیا سلوک کیا گیا تھا یا کس طرح انہیں سحر زدہ کیا گیا تھا؟

"ہمیں اپنے سفارت خانے کے لوگوں سے یا جاسوسوں سے صرف ایک ہی جواب ملتا ہے کہ پاکستان میں اصلاحِ معاشرہ کی مہم کامیاب ہو چکی ہے اور وہاں کا ہر فرد نیک ہدایات پر دل و جان سے عمل کرتا ہے لیکن یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ جب سے انسانوں نے اقتدار کی ہوس کو اپنایا ہے۔ اس وقت سے لے کر آج تک کسی ملک کی تاریخ میں ایسا نہیں ہوا کہ ایک ملک کے بچے سے لے کر بوڑھے تک ہم خیال اور ہم آواز ہوں اور سب کے سب

Jasoosi Digest February 1983

نیک اور پارسا ہیں۔ سب کے سب تعمیری کام کرتے ہیں اور کوئی تخریب کاری کی طرف مائل نہ ہوتا ہو۔ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی اور ہم یہ سمجھنا چاہتے ہیں۔

"اس سلسلے میں ہماری انٹیلی جنس کے ڈائرکٹر جنرل نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ میں ڈائرکٹر جنرل سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنی رپورٹ پیش کریں۔" یہ کہہ کر وزارتِ خارجہ کا سیکریٹری بیٹھ گیا۔

ڈائرکٹر جنرل نے اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا: "معزز حاضرین! جب ہم نے یہ دیکھ لیا کہ یہاں سے جانے والے ہمارے آدمی پاکستان کے ہو کر رہ جاتے ہیں اور اس ملک سے غدّاری نہیں کرنا چاہتے تب ہمارے سامنے دوسرا راستہ تھا اور وہ یہ کہ ہم پاکستان کی کسی ایک اہم شخصیت کو وہاں سے اغوا کر کے یہاں لائیں۔ پھر اس کی زبان سے اندرونی راز اگلوائے جائیں۔ ۲۵ فروری کو وہاں کی حکومت کا ایک اعلیٰ افسر خیر سگالی دورے پر دوسرے بڑے ملک کی طرف جا رہا تھا
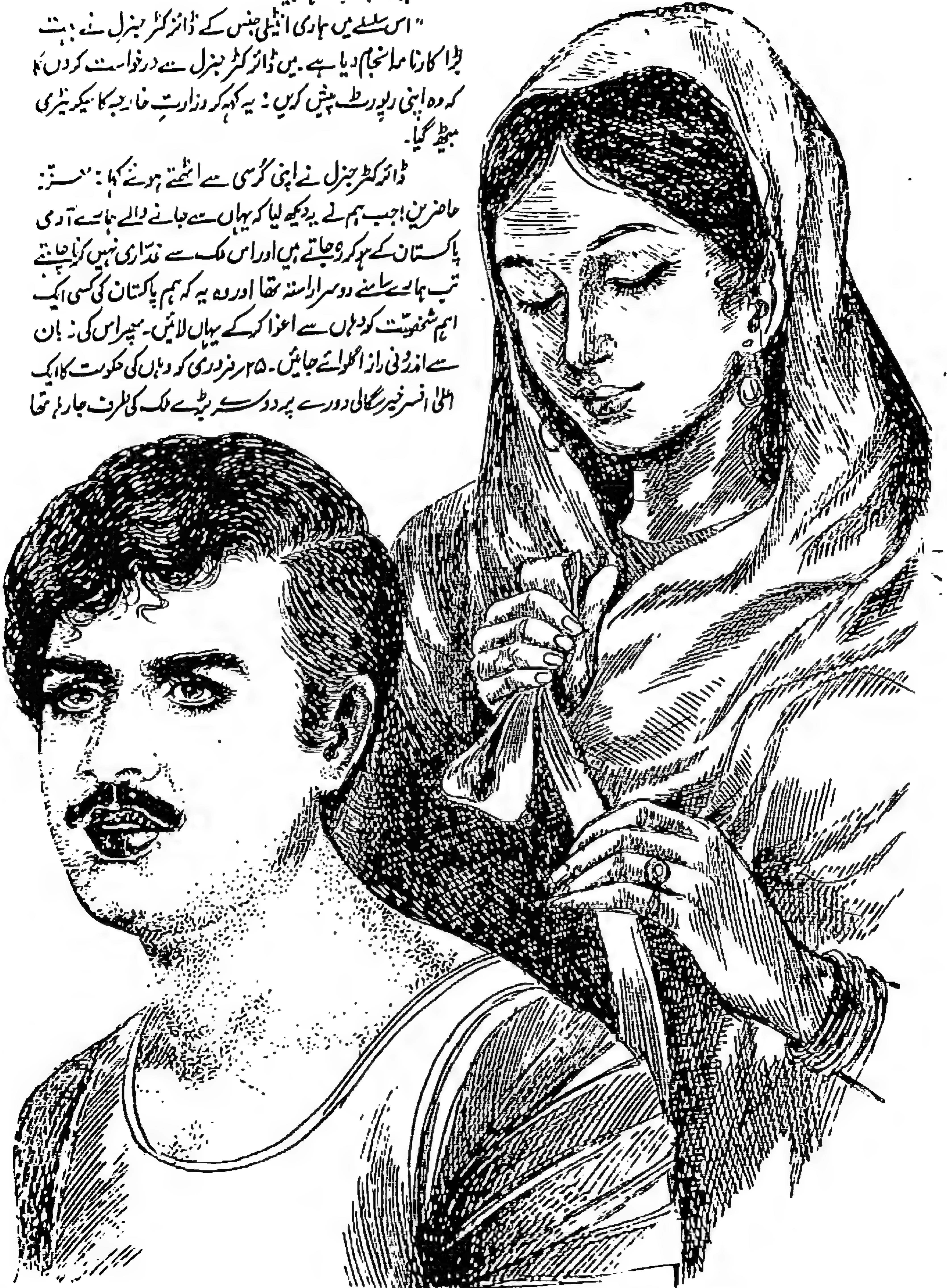
ہم اسے اغوا کر کے یہاں لے آئے۔ کسی محبِ وطن پاکستانی سے سوال جواب کے ذریعے حقیقت تک پہنچنا ناممکن تھا۔ اس لئے ہم نے پہلے ہی سے طریقۂ کار کا تعین کر لیا تھا۔ ہم نے اس اعلیٰ افسر کو ایسے انجکشن لگائے جس سے اس کا دماغ کمزور ہوتا گیا۔ یہ ایک سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ انسان کے دماغ کو کمزور بنا دیا جائے تو محبت اور وفاداری کے جذبے بھی کمزور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ پھر دماغی کمزوری ایک ایسے نقطے پر پہنچ جاتی ہے۔ جہاں انسان صرف چڑچڑا بن کر رہ جاتا ہے۔ بات بات پر جھنجلاتا ہے۔ نفرت سے کاٹنے کو دوڑتا ہے ایسے ہی وقت اسے اپنے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔" ڈائرکٹر جنرل نے یہ کہہ کر وہاں کھڑے ہوئے ایک مسلح گارڈ کی طرف اشارہ کیا۔ وہ گارڈ وہاں سے پلٹ کر باہر چلا گیا پھر ڈائرکٹر جنرل نے کہا۔

"معزز حاضرین! اب میں آپ لوگوں کے سامنے مسٹر کمال طارق کو پیش کرتا ہوں۔ یہ وہی پاکستانی اعلیٰ افسر ہے جسے ہم نے اغوا کیا تھا اور ہم نے اسے اس حال پر پہنچا دیا ہے کہ وہ اپنے طور پر کوئی مدافعت نہیں کر سکتا۔ اس کے اندر سے محبت، امن و آشتی اور وفاداری کا جذبہ ڈھل گیا ہے۔ دماغی طور پر وہ اس قدر کمزور ہو گیا ہے کہ صرف اپنے مطلب کی بات کرتا ہے۔ آپ خود دیکھ لیں۔"

سب نے دیکھا۔ اس کمرے کا دروازہ کھل گیا تھا اور دو مسلح جوان ایک شخص کو وھیل چیئر پر بٹھا کر لا رہے تھے۔ وہ شخص نہایت ہی کمزور اور بیمار نظر آ رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ بڑبڑا رہا تھا۔ "مجھے تم لوگوں نے کیوں قید کیا ہے؟ کل سے مجھے کھانے کے لئے نہیں دیا گیا۔ پینے کے لئے ایک گھونٹ پانی بھی نہیں ملا۔ یہ کیا ظلم ہے۔ مجھے کھانے کو دو، مجھے پینے دو۔"

ڈائرکٹر جنرل نے مسکرا کر پوچھا "کیا پاکستان واپس نہیں جاؤ گے؟"

"مجھے صرف کھانا چاہئے۔ میرا حلق خشک ہو رہا ہے۔ مجھے پانی پلاؤ، میرا دل رہ رہ کر بُری طرح دھڑکتا ہے۔ خدا کے لئے میرا علاج کرو۔"

ڈائرکٹر جنرل نے فاتحانہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا "آپ لوگوں نے دیکھ لیا۔ اب یہ صرف اپنی ذات کے متعلق گفتگو کرتا ہے حب الوطنی اس کے دل و دماغ سے نکل چکی ہے۔"

ایک شخص کھانے کی ٹرالی دھکیلتا ہوا اس کمرے میں داخل ہوا۔ اس ٹرالی میں طرح طرح کے کھانے اور پانی کا جگ رکھا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی کمال طارق مچلنے لگا لیکن اس کے پاس کھڑے ہوئے مسلح جوانوں نے اسے دونوں طرف سے تھام لیا تھا اور اسے بیٹھے رہنے پر مجبور کر رہے تھے۔ اجلاس میں شریک ہونے والے ایک ممبر نے سوال کیا "مسٹر طارق! یہ کیسی حب الوطنی ہے؟ ہم نے تو سنا ہے کہ لوگ اپنے وطن کے لئے اپنی آخری سانس بھی قربان کر دیتے ہیں؟"

طارق نے کہا "میں ... میں کیا بتاؤں ... مجھے اپنا وطن بہت عزیز ہے۔ میں اپنے وطن پر جان دینا چاہتا ہوں لیکن جان دینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ زندہ رکھ کر پھر مجھے مارا جائے اور مارنے کے بعد پھر زندہ کیا جائے۔ یہ لوگ مجھے جس قسم کا انجکشن لگاتے ہیں اس کا اثر اتنا اذیت ناک ہوتا ہے کہ میں اپنا دماغی توازن کھو بیٹھتا ہوں۔ جب ذہنی حالت ذرا بحال ہوتی ہے تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا میں کہاں ہوں؟ کیا کر رہا ہوں؟ زندہ ہوں یا مُردہ ہوں؟ یہ میرے ساتھ غیر انسانی سلوک کیا جا رہا ہے۔ میں بولتے بولتے لڑکھڑانے لگتا ہوں۔ میرا دماغ اتنا کمزور ہو گیا ہے کہ میں صرف اپنی بھوک پیاس اور علاج کے متعلق ہی سوچ سکتا ہوں اور تم لوگوں سے التجا کر سکتا ہوں۔"

ڈائرکٹر جنرل نے کہا "تمہیں یہ سارے کھانے کھلائے جائیں گے پانی پلایا جائے گا۔ تمہارا علاج اس طرح کرایا جائے گا کہ تم پہلے کی طرح تندرست ہو جاؤ گے لیکن پہلے ہمارے سوالوں کا صحیح صحیح جواب دو۔"

چند لمحوں تک خاموشی رہی۔ کمال طارق نے سوالیہ نظروں سے ڈائرکٹر جنرل کی طرف دیکھا۔

ڈائرکٹر جنرل نے پھر سوال کیا "ہمیں سچ سچ بتاؤ کہ پاکستان کے تمام باشندے کس طرح ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، اور سب ہی اپنے ملک کے وفادار کیسے بن گئے ہیں۔ ہم نے تمہارے کتنے ہی آدمیوں کو آزمایا ہے۔ کوئی بھی دولت یا اقتدار کے لالچ میں بکنا نہیں چاہتا۔ آخر یہ کیا راز ہے کہ سب ہی تعمیری ذہن رکھتے ہیں۔ کوئی تخریب پر آمادہ نہیں ہوتا؟"

"مجھے کچھ کھانے دو۔"

"پہلے جواب دو۔"

"میرا حلق خشک ہو رہا ہے۔ خدا کے لئے ایک گھونٹ پانی دے دو۔"

ڈائرکٹر جنرل کے حکم سے تھوڑا سا پانی اسے پلایا گیا پھر سوال کیا گیا۔ اس نے انکار میں سر ہلا کر کہا "بے شک میرا دماغ بالکل کمزور ہو گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے میرا سر میرے جسم پر بھاری ہے اور میں اسے سنبھال کر نہیں رکھوں گا تو یہ سر نیچے گر پڑے گا۔ اس کے باوجود میں اپنے وطن کے بارے میں کچھ نہیں ..."

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی ایک شخص سامنے آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑی سی سرنج تھی۔ اسے دیکھتے ہی کمال طارق ایک دم سے گھبرا گیا۔ ہذیانی انداز میں چیخنے لگا "نہیں نہیں، مجھے انجکشن نہ لگاؤ۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔"

ڈائرکٹر جنرل نے کہا۔ "تمہیں اسی طرح زندہ رکھ کر مارا جائے گا۔ اور مار مار کر زندہ کیا جائے گا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تم کب تک انکار کرو گے۔ اگر اپنی زندگی چاہتے ہو تو سوال کا جواب دو۔"

کمال طارق نے سرنج کی طرف دیکھا۔ تھوک نگلتے ہوئے اس نے آنکھیں بند کیں۔ پھر لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہا۔ "مجھے موت منظور ہے۔"

ڈائرکٹر جنرل نے کہا۔ "یہ اس طرح نہیں مانے گا۔ اسے دوسرے کمرے میں پہنچا دو۔"

دوسرے کمرے میں ایک بستر بچھا ہوا تھا۔ وہاں ایک عورت بستر کے سرہانے میز کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ دو جوان کمال طارق کو اٹھا کر لائے اور اس بستر پر لٹا دیا۔ دوسرے کمرے میں ڈائرکٹر جنرل نے ایک شخص سے کہا۔ "پروفیسر کمال طارق کا ذہن بالکل کمزور ہو چکا ہے۔ آپ بڑی آسانی سے تنویمی عمل کے ذریعے اسے ٹرانس میں لا سکتے ہیں۔ ساری معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔"

پروفیسر نے کہا۔ "یس سر! میں ابھی کوشش کرتا ہوں۔ وہ ضرور سب کچھ اگل دے گا۔"

یہ کہہ کر پروفیسر اسی کمرے میں چلا گیا۔

دو گھنٹے کے بعد اسی کمرے میں پھر اجلاس منعقد ہوا۔ اب اس اجلاس میں اس عورت کا اضافہ ہو گیا تھا جو اندر تنویمی عمل کے دوران کمال طارق کے سرہانے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے ایک فائل کو کھولتے ہوئے کہا۔ "معزز حاضرین! پروفیسر نے تنویمی عمل کے دوران جو سوالات کئے اور مسٹر کمال طارق نے ایک معمول کی حیثیت سے جو جوابات دیئے۔ میں نے ان کا ایک ایک لفظ نوٹ کیا ہے۔ وہ میں آپ کے سامنے پیش کر رہی ہوں۔ توجہ فرمائیں۔"

اس عورت نے فائل کے پہلے صفحے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "جب پروفیسر نے مسٹر کمال طارق کو پوری طرح اپنا معمول بنا لیا تو اسے تحکمانہ انداز میں کہا۔ "مسٹر طارق! تم میرے معمول، مطیع اور فرماں بردار رہو۔ میں جو سوال کروں گا اس کا صحیح جواب دو گے۔"

مسٹر طارق نے جواب دیا۔ "میں تمہارے ہر سوال کا صحیح جواب دوں گا۔"

"سوال یہ ہے کہ کسی بھی معاشرے کے تمام افراد نیک اور شریف نہیں ہوتے۔ کچھ اچھے ہوتے ہیں اور کچھ برے ہوتے ہیں۔ کچھ ذہین ہوتے ہیں، کچھ کند ذہن ہوتے ہیں اور کچھ بہادر ہوتے ہیں، کچھ بزدل ہوتے ہیں۔ اسی مناسبت سے وہ سب اپنے اپنے مزاج کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ تو معاشرہ میں مختلف مزاج کے لوگ نظر آتے ہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ایک معاشرے

مردم خور قبیلے کے سردار کو تبدیلیٔ آب و ہوا کی غرض سے بحری سفر پر جانا پڑا۔ دوران سفر اسٹیورڈس نے بصد ادب و احترام اس کے سامنے مینو پیش کیا۔

"یہ کیا ہے؟" سردار نے پوچھا۔

"جہاز میں تیار ہونے والے کھانوں کی فہرست ہے۔ اس میں سے جو کھانے آپ پسند فرمائیں گے۔ آپ کی خدمت میں پیش کر دیئے جائیں گے۔"

"نہیں، مجھے اس فہرست کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" سردار نے مینو واپس کرتے ہوئے کہا۔ "میرے لئے مسافروں کی فہرست لے آؤ۔"

کے سبھی افراد ہم مزاج ہوں۔ مسٹر کمال طارق! میں تم سے سوال کرتا ہوں۔ اس کا تفصیلی جواب دو کہ تمہارے پاکستانی معاشرے کے تمام افراد ہم مزاج کیسے بن گئے؟"

مسٹر کمال طارق نے جواب دیا۔ "دنیا کا ہر مذہب یہ سکھاتا آیا ہے کہ اگر نیک ہدایات پر عمل کیا جائے تو معاشرے کے تمام افراد نیک اور شریف بن سکتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مذہب نیکی کا درس کبھی نہ دیتا۔ ہمارے اسلام میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھایا ہے، اپنے کردار سے اور قرآنی آیات سے اتنی نیک ہدایتیں دی ہیں کہ ان پر عمل کیا جائے تو زندگی کے ہر شعبے میں انسان ایک کامیاب زندگی گزار سکتا ہے لیکن اس سلسلے میں ایک بنیادی سوال یہ پیدا ہوا کہ انسان نیک ہدایات پر عمل کیوں نہیں کرتے؟ جب اس سوال کا جواب ڈھونڈا گیا تو پتہ چلا کہ ہر بات، ہر ہدایت محبت سے سمجھ میں آتی ہیں۔ اگر انسان کے دماغ میں محبت کی فراوانی ہو تو وہ تمام ہدایات کو سمجھ کر اس پر عمل کر سکتا ہے۔ محبت سے ان ہدایات کو اپنا سکتا ہے۔ اس طرح سوچ بچار کے دوران ہمارے دماغ میں پچوٹری غدود کا خیال آیا۔"

پروفیسر نے سوال کیا۔ "کیا وہی پچوٹری غدود جس کا ذکر آٹھ سال پہلے پروفیسر جان للی نے اپنے ایک مقالے میں کیا تھا؟"

"جی ہاں! وہی پچوٹری غدود۔ اتفاق سے ہمارا ایک پاکستانی ماہر نفسیات پروفیسر جان للی کا اسسٹنٹ تھا اور وہ اس کے ساتھ پچوٹری غدود کی تحقیقات میں پندرہ سال تک برابر شریک رہا تھا۔ ہمارے اس پاکستانی ماہر نفسیات کو اس غدود کے متعلق تمام معلومات حاصل تھیں اور ان معلومات سے ہمارے

ملک نے فائدہ اٹھا لیا۔ اس پر ضروری تجربات کئے۔ تحقیقات ہوتی رہیں اور اس طرح ہم نے اسی غدود کے ٹیکے اور کیپسول تیار کر لئے۔"

پروفیسر نے سوال کیا: "پچوٹری غدود کے ذریعے معاشرے کی اصلاح کیسے ہوگئی؟"

"پچوٹری غدود کے ذریعے دماغوں میں محبت کی کمی کو پورا کیا گیا ہے۔ اب ہر پاکستانی باشندے کے دل و دماغ میں محبت کے جذبے موجزن رہتے ہیں وہ ایک دوسرے کے کام میں آنے کی لگن میں رہتے ہیں، ہر لمحہ یہ خیال رہتا ہے کہ کسی کو ان کی ذات سے نقصان نہ پہنچے۔ لوگ ایک دوسرے کی حفاظت کرتے ہیں ایک دوسرے کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے کی کوششیں کرتے ہیں اور ان کی ان کوششوں کے نتیجے میں معاشرہ خوبصورت ہوتا چلا جا رہا ہے۔"

"لیکن پاکستان کے کروڑوں باشندوں کے دماغ میں پچوٹری غدود کیسے پہنچائے گئے ہیں؟"

"اس طرح کہ جیسے بچے کی پیدائش کے بعد چیچک کے، پولیو کے، اور ہیضے کے ٹیکے لگائے جاتے ہیں۔ اسی طرح ہر بچے کو پچوٹری غدود کا ٹیکہ لگایا جاتا ہے۔ بڑی عمر کے لوگوں کے لئے ہر علاقے، ہر محلے میں ایک چھوٹا سا پچوٹری ہسپتال کھلا ہوا ہے۔ وہاں ہر ایک کا شناختی کارڈ اور راشن کارڈ وغیرہ چیک کیا جاتا ہے اور اس کے ذریعے ان لوگوں کو طلب کیا جاتا ہے۔ ان کا طبی معائنہ ہوتا ہے اور انہیں ایک پچوٹری کارڈ بنا کر دیا جاتا ہے جس کے ذریعے پتہ چل جاتا ہے کہ کس نے پچوٹری ٹیکہ نہیں لیا ہے یا پچوٹری کیپسول نہیں کھایا ہے جو ایسا نہیں کرتے ہیں، انہیں سمجھا بجھا کر ٹیکہ لگا دیا جاتا ہے... یا کیپسول کھلا دیا جاتا ہے۔ یہ ٹیکہ یا کیپسول پانچ سال کے لئے کافی ہوتا ہے۔"

پروفیسر نے سوال کیا: "کیا یہ لوگوں کے ساتھ زبردستی نہیں ہے؟"

"ہرگز زبردستی نہیں ہے۔ اگر ایک انسان کا دماغ کمزور ہوتا ہے، تو ڈاکٹر اور حکیم اسے سمجھاتے ہیں کہ وہ بادام کھایا کرے۔ مقوی غذائیں استعمال کیا کرے تاکہ دماغ سوچنے، سمجھنے، لکھنے پڑھنے اور کام کرنے کے قابل ہو۔ جب دماغی قوت کے لئے دوائیں کھائی جاتی ہیں تو محبت کی فراوانی کے لئے دوا کا استعمال کرنا جرم یا زبردستی تو نہیں ہے۔ آج کا پاکستانی معاشرہ اس بات کا زندہ ثبوت ہے کہ وہاں ظلم اور تشدد نہیں ہے۔ وہاں امن، سلامتی اور محبت ہی محبت ہے۔"

پروفیسر نے پھر ایک سوال کیا: "مسٹر کمال طارق! یہ تو تم نے اپنے پاکستانی باشندوں کے متعلق بتایا ہے لیکن جو لوگ بیرونِ ملک سے پاکستان جاتے ہیں وہ پاکستان کے وفادار کیسے بن جاتے ہیں؟ ہمارے سفارت خانے کے لوگوں نے کبھی یہ شکایت نہیں کی کہ انہیں زبردستی یا سمجھا بجھا کر پچوٹری ٹیکے لگائے گئے ہوں۔"

کمال طارق نے جواب دیا: "باہر والوں کو کبھی یہ معلوم نہیں ہوتا کہ انہیں کس طرح پچوٹری ٹیکے لگائے گئے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ بین الاقوامی قوانین کے مطابق جب کوئی ایک ملک سے دوسرے ملک کی زمین پر پہنچتا ہے تو ایئرپورٹ یا بندرگاہ میں اسے حفاظتی ٹیکے لگائے جاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں جو لوگ باہر سے آتے ہیں۔ ہم انہیں دوسرے حفاظتی ٹیکوں کے علاوہ پچوٹری ٹیکہ بھی لگا دیتے ہیں۔ اور یہ بات، ظاہر نہیں کرتے۔ کیونکہ محبت کو ایک دل سے دوسرے دل میں منتقل کرنا کوئی جرم نہیں ہے بلکہ ایک نیکی ہے اور وہ نیکی ہم بغیر احسان جتائے کر لیتے ہیں۔ ہمارے ملک میں آنے والا کوئی غیر ملکی یہ شکایت نہیں کر سکتا کہ ہم نے اس کے ساتھ نیکی کی ہے اور اسے محبت کرنا سکھایا ہے۔"

پروفیسر نے پوچھا: "ہمیں پاکستانی معاشرے کے متعلق تفصیل سے بتاؤ۔"

کمال طارق آہستہ آہستہ بتانے لگا۔ کہنے لگا: "پاکستانی معاشرہ اتنا خوبصورت ہو گیا ہے کہ اس کی تفصیل زبان سے بیان نہیں کی جا سکتی۔ وہاں جو کچھ ہو رہا ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ لوگوں کے لئے ایک مثال ہے۔ ایک سبق ہے۔ ہمارا ملک، ہمارا ملک..... ہمارا ملک۔"

اس عورت نے فائل کو بند کرتے ہوئے کہا: "معزز حاضرین! ..... اس کے بعد کمال طارق کی آواز دھیمی ہوتے ہوتے بالکل معدوم ہو گئی۔ وہ پروفیسر کے سوال پر آگے کچھ نہ بول سکا۔ شاید اس لئے کہ وہ کل سے بھوکا پیاسا تھا اور دماغی طور پر اس قدر کمزور ہو گیا تھا کہ بولنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ وہ ہپناٹزم کی قوت کے زیرِ اثر زبردستی بولتا جا رہا تھا۔ لیکن جبر کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ جب کمال طارق اس حد سے گزر گیا تو اس کی آواز مر گئی۔ تھوڑی دیر بعد پروفیسر نے اسے ٹٹول کر معلوم کیا کہ اس کی آواز کے ساتھ اس کا دماغ اور اس کا جسم بھی مر چکا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔ تھوڑی دیر تک اس کمرے میں گہرا سناٹا چھایا رہا۔ پھر ڈائریکٹر جنرل نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا: "اس رپورٹ کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اب ہمارے جاسوسوں کو پاکستان میں اس طرح سے داخل ہونا چاہئے کہ انہیں پچوٹری ٹیکے نہ لگائے جا سکیں اور دھوکے سے کیپسول نہ کھلایا جائے۔"

کسی نے کہا: "پاکستان کی سرحدیں بہت محفوظ اور مستحکم

ہیں۔ کوئی پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ چند سال پہلے جو اسمگلر سرحدوں کے پاس ملک کی معیشت کو تباہ کر رہے تھے۔ وہ اسمگلر بھی پکڑے گئے ہیں۔"

ایک فوجی نے کہا: "پاکستان کی طرح اور بھی ایسے ملک ہیں جن کے فوجی بہت ہی فرض شناس اور مستعد ہوتے ہیں۔ کسی اسمگلر کو، کسی ملک دشمن کو اپنی سرحد میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے۔ اس کے باوجود سرحدیں شمال سے جنوب اور مغرب سے مشرق تک اتنی دور تک پھیلی ہوئی ہیں کہ کہیں سے بھی سرنگ بنا کر یا جنگل جھاڑیوں سے نکل کر کسی بھی ملک کے اندر پہنچا جا سکتا ہے اگر کسی کو پہنچانا مقصود ہو تو یہ کام میں اپنے ذمہ لیتا ہوں۔ جتنے آدمی کہو گے اتنے میں پاکستان کے اندر پہنچا دوں گا لیکن یہ ایک شرط ہے۔"

سب نے اس فوجی کی طرف دیکھا۔ اس نے کہا: "شرط یہ ہے کہ جو جاسوس یہاں سے بھیجے جائیں۔ وہ ایشیائی ہوں۔ خصوصاً ہندوستانی یا پاکستانی ہوں تاکہ وہ وہاں کے ماحول میں۔ وہاں کے لوگوں میں وہاں کی تہذیب میں گھل مل جائیں۔ ہمارے جیسے غیر ملکی وہاں پہنچتے ہی کہیں نہ کہیں گرفت میں آ جائیں گے۔"

اس ملک کے سربراہ نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "بے شک ہمارے ملک میں برسوں سے ایسے پاکستانی اور ہندوستانی آباد ہیں۔ جو ہمارے ملک کے وفادار ہیں۔ وہ دولت اور بڑے عہدے کے لالچ میں ہمارے کام آ سکتے ہیں۔"

فوجی افسر نے کہا: "جناب ایک بات اور ہے۔ یہ پاکستانی ان آٹھ برسوں میں اپنے رشتہ داروں سے ملنے کے لئے ضرور اپنے ملک گئے ہوں گے انہیں ضرور بچھو ٹری ٹیکے لگائے گئے ہوں گے۔ اس طرح یہ لوگ اپنے ملک کے وفادار ذہنی طور پر بن گئے ہوں گے۔ لہٰذا انٹیلی جنس والوں کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسے پاکستانیوں کو ڈھونڈ نکالیں جو پچھلے دس برسوں میں کبھی اپنے وطن کی طرف نہ گئے ہوں گے۔ ایسے ہی لوگوں کو ہم اپنے کام میں لا سکتے ہیں۔"

انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر جنرل نے کہا: "میں ایسے لوگوں کو ڈھونڈ نکالوں گا اور وہ ایسے ذہین، شاطر اور حاضر دماغ ہوں گے کہ پاکستان میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے جعلی بچھو ٹری کارڈ بنوائیں گے جس کے ذریعے یہ ثابت ہو جائے گا کہ انہیں بچھو ٹری ٹیکے لگا دیئے گئے ہیں یا کیپسول کھلا دیئے گئے ہیں۔ اس طرح وہ بچو ٹری حملے سے محفوظ رہیں گے۔"

اجلاس میں بیٹھے ہوئے ایک دانشور نے کہا: "اس دنیا میں جب بھی محبت کا ایک نیا انداز پیدا ہوتا ہے تو نفرت کے ہزاروں ہتھیار ایجاد ہو جاتے ہیں۔ اگر بچھو ٹری غدود کے ذریعے انسانی دماغ میں محبت کی فراوانی ہو جاتی ہے تو ہمارے علم الاجسام کے ماہرین انسان میں نفرت اور حرص اور ہوس کے غدود بھی دریافت کر سکتے ہیں۔ اور یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ جب ایک چیز ایجاد ہوتی ہے تو اس کے توڑ میں دوسری چیز کے ایجاد ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگتا۔ ہمارے ملک کے ماہر نفسیات علم الاجسام کے ماہرین، ڈاکٹرز اور سائنسدان یہ سب مل کر جی جان سے کوشش کریں تو حرص و ہوس کے غدود فوری طور پر دریافت ہوں گے اور اس کے ٹیکے اور کیپسول بھی تیار کئے جا سکیں گے۔"

اس دانشور کی اس بات پر سب متفق ہو گئے۔ ان کا متفقہ فیصلہ یہ تھا کہ گھر کا بھیدی لنکا ڈھاتا ہے۔ لہٰذا پاکستان کے اندر تخریبی کارروائیوں کے لئے بیرونِ ملک کے پاکستانیوں کو بڑی سے بڑی قیمت اور لالچ دے کر خریدا جائے اور انہیں اپنا آلۂ کار بنا کر چور دروازے سے پاکستان میں داخل کیا جائے۔ دوسرا فیصلہ یہ تھا کہ بچو ٹری غدود کے جواب میں ایسے منفی غدود دریافت کئے جائیں جن سے بچو ٹری غدود کی کارکردگی کمزور پڑ جائے۔ جب محبانِ وطن کے کردار کمزور، عقائد مشکوک اور نظریات بے جان ہو جائیں گے تو پاکستان کو بین الاقوامی منڈیوں میں آسانی سے خریدا جا سکے گا۔

✻

رات کے دو بجے وہ لانچ ساحل پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ گہری تاریکی ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔ وہ لوگ ٹارچ کی محدود روشنی میں یکے بعد دیگرے لانچ سے اترنے لگے۔ وہ تعداد میں بارہ تھے۔ ان میں آٹھ مرد تھے۔ ایک ادھیڑ عمر کی عورت تھی اور تین نوجوان لڑکیاں تھیں۔ تینوں لڑکیاں بے حد خوبصورت تھیں۔ وہ سب کے سب ذہین، تعلیم یافتہ اور موقع شناس تھے۔ ان کے آباؤ اجداد تقریباً تیس، چالیس برس پہلے سے ہندوستان اور پاکستان کو چھوڑ کر بیرونِ ملک میں آباد ہو گئے تھے۔ اس لئے وہ سب مغربی تہذیب کے سانچوں میں ڈھلے ہوئے تھے۔ مشرقیت ان میں برائے نام تھی اور حب الوطنی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ کبھی انہوں نے وطن کی مٹی کو چھو کر بھی نہیں دیکھا تھا اور چونکہ مٹی کی عظمت کو نہیں سمجھتے تھے۔ اس لئے وطن کو مٹی میں ملانے آئے تھے۔

وہ سب ایک سیاہ فام گول مٹول سے آدمی کی رہنمائی میں آگے بڑھنے لگے۔ اس سیاہ فام نے بتایا کہ کراچی شہر وہاں سے پینسٹھ کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ سات کلو میٹر کے فاصلے پر ایک ریسٹ ہاؤس ہے جہاں راحت عزیزی صاحب ان آنے والوں کا انتظار کر رہے ہیں۔

راحت عزیزی کا اصل نام کچھ اور تھا۔ وہ بھی بیرونی ملک سے

ایک جاسوس کی حیثیت سے آیا تھا۔ چند ماہ پہلے اس نے ایک سرکاری افسر راحت عزیزی کو قتل کر کے اس کی جگہ لے لی تھا۔ وہ ایسا زبردست بہروپیا ہے کہ دوسرے سرکاری افسروں کو اس پر شبہ نہ ہو سکا۔ وہ اور اس کی ساتھی عورت مسٹر اور مسز راحت عزیزی کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔

سات کلو میٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ لوگ ریسٹ ہاؤس میں پہنچ گئے۔ وہاں مسٹر اور مسز راحت عزیزی نے ان کا استقبال کیا۔ ریسٹ ہاؤس کے چاروں طرف ویرانی اور سناٹا تھا۔ سامنے دو ویگن کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ ریسٹ ہاؤس کے تین کمرے تھے۔ ایک میں مسٹر اینڈ مسز راحت عزیزی کا قیام تھا۔ دوسرے میں مہمان ٹھہرائے گئے اور تیسرے کمرے میں چار لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔

راحت عزیزی نے ان لاشوں کو دکھاتے ہوئے کہا "یہ چاروں ایک ہی خاندان کے افراد تھے۔ اس بوڑھے کا نام بابا خیر الدین تھا۔"

راحت عزیزی نے اپنے ایک ساتھی کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا "مسٹر بابر! آج سے تم بابا خیر الدین کی حیثیت سے زندگی گزارو گے اور اس بوڑھی کا نام صابرہ بیگم ہے۔" راحت عزیزی نے ایک ادھیڑ عمر کی عورت کی طرف انگلی اٹھا کر کہا "اسماء! آج سے تم صابرہ بیگم کے روپ میں رہو گی۔ یہ جو نوجوان لڑکے کی لاش ہے اس کا نام رضی الدین ہے۔ مسٹر! تم آج سے رضی الدین بن کر رہو گے اور یہ نوجوان لڑکی اس کا نام سلیقہ ہے لہٰذا مس للی تم سلیقہ کا رول ادا کرو گی۔"

بابا خیر الدین کا رول ادا کرنے والے بابر نے سوال کیا "ہمیں یہ بتایا جائے کہ کیا ہم چاروں ان چاروں کے میک اپ میں رہا کریں گے؟"

راحت عزیزی نے کہا "بالکل نہیں۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر پلاننگ کی ہے۔ بابا خیر الدین کا یہ مختصر سا خاندان لاہور چھوڑ کر کراچی میں آباد ہونے کے لئے آرہا تھا۔ مجھ سے خط و کتابت رہی کیونکہ یہ میرے ہی محکمے سے تعلق رکھتا تھا۔ میں نے ہی اسے کراچی آنے کے لئے کہا۔ یہاں یہ خاندان کراچی والوں کے لئے بالکل اجنبی ہے۔"

سوال کیا گیا "کیا ان کے شناختی کارڈ سے ہم پہچانے نہیں جائیں گے؟"

"بالکل نہیں۔ تمہاری اپنی تصویروں کے ساتھ تم لوگوں کے شناختی کارڈ میرے پاس تیار ہیں اور تم اپنے اصلی چہروں کے ساتھ ہی بابا خیر الدین، صابرہ بیگم، رضی الدین اور مس سلیقہ کے نام سے کراچی شہر میں رہو گے۔"

پھر سوال کیا گیا "اگر لاہور کے جاننے والے یہاں خیر الدین کو نہ پائیں گے تب کیا ہوگا؟"

"یہ خاندان والے اتنے مشہور نہیں تھے اور نہ ہی ان کا حلقہ احباب وسیع تھا۔ یہ لوگ یہاں بالکل اجنبی ہیں۔ اگر لاہور سے کبھی کوئی آئے گا تو پہلے انہیں تلاش کرے گا کہ اتنے بڑے شہر میں یہ خاندان کہاں رہتا ہے اور ایسی کوئی بات ہو گی اور بھانڈا پھوٹنے والا ہو گا تو اس وقت تک فرار کا دوسرا راستہ نکل جائے گا۔ ورنہ جب تک اس خاندان کے نام سے ہم اپنا کام کر سکتے ہیں، کرتے رہیں گے۔"

راحت عزیزی نے دوسرے جوانوں کو حکم دیا کہ ریسٹ ہاؤس سے ذرا دور جا کر گڑھا کھودیں اور ان لاشوں کو اس میں دبا دیں اس کے بعد وہ وہاں سے چلیں گے، باقی آٹھ افراد جو رہ جائیں گے انہیں لاہور بھیجا جائے گا۔ لیکن اس سے پہلے راحت عزیزی انہیں اپنے مکان میں چھپا کر رکھے گا، اور انہیں ٹریننگ دے گا کہ لاہور میں انہیں کس حیثیت سے رہنا ہے اور کیسے رہنا ہے؟ چند روز کی ٹریننگ کے بعد انہیں لاہور میں اپنے ایک خاص آدمی کے پاس بھیج دیا جائے گا۔

صبح چھ بجے سے پہلے گڑھا وغیرہ کھود کر لاشوں کو دفن کر دیا گیا۔ پھر وہ لوگ دو ویگن کاروں میں بیٹھ کر شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں راحت عزیزی نے ایک اٹیچی کھول کر چار عدد شناختی کارڈ نکال کر اپنے چاروں ساتھیوں میں تقسیم کرتے ہوئے کہا "اپنے اپنے شناختی کارڈ اور ان کے نمبر وغیرہ پڑھ لو۔ اس میں تمہاری تاریخ پیدائش وغیرہ سب کچھ درج ہے۔"

اس کے بعد اس نے ان چاروں کو پیچو ٹری کارڈ تقسیم کئے ان کارڈوں کی رو سے بابا خیر الدین، صابرہ بیگم، رضی الدین اور مس سلیقہ کو پیچو ٹری ٹیکے لگائے جا چکے تھے اور انہیں آئندہ پانچ سال تک ٹیکے لگانے یا کیپسول کھانے کی ضرورت نہیں ہے ان کارڈوں کے ساتھ ان کی میڈیکل رپورٹ بھی درج تھی کہ وہ لوگ ہر چھ مہینے میں ایک بار طبی معائنے سے گزرتے آئے ہیں لہٰذا آئندہ چھ ماہ تک بھی انہیں کسی قسم کے طبی معائنے کی ضرورت نہیں تھی۔

پھر راحت عزیزی نے کہا "ویگن کار کے پچھلے حصے میں ایک بڑا سا سوٹ کیس رکھا ہوا ہے۔ اس میں تم چاروں کے لباس رکھے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ تمہارے ضروری کاغذات مثلاً رضی الدین کے تعلیمی سرٹیفکیٹ ہیں۔ رضی الدین کی تعلیم مکمل ہو چکی ہے اور سلیقہ! تم نے اپنی تعلیم مکمل نہیں کی کیونکہ تمہاری یادداشت بہت کمزور ہے۔ میڈیکل رپورٹ میں لکھا ہوا ہے۔ اس لئے تم پڑھ نہیں سکتیں۔ بہت سی باتیں بھول جاتی ہو اور یہ تمہارے حق میں بہتر ہے یہاں عجیب و غریب باتیں دیکھ کر تم کبھی حیرانی کا اظہار کرو گی تو دوسرے

یہ سمجھ کر خاموش ہو جائیں گے کہ تم ہزار بار یہاں کے ماحول کو دیکھنے کے بعد بھی ان باتوں کو بھول گئی ہو۔"

سلیقہ نے پوچھا "کیا ہمارے مختصر سے خاندان کا یہی ایک بڑا سا سوٹ کیس ہے جو پیچھے رکھا ہوا ہے جبکہ یہ خاندان لاہور سے یہاں آرہا ہے تو گھر کا پورا سامان ہونا چاہیئے۔"

راحت عزیزی نے کہا "یہی باتیں تو تم لوگوں کے سمجھنے کی ہیں۔ یہاں ایک شخص بھی جائیداد یا گھریلو سامان جمع کرنے کا شوقین نہیں ہے۔ اس ملک میں جتنے مکانات ہیں، سب سرکاری ہیں۔ ہر مکان میں فرنیچر اور زندگی کی ضرورت کا دوسرا سامان موجود رہتا ہے۔ کوئی بھی کسی مکان میں جا کر رہ سکتا ہے۔ یہاں جو بڑی بڑی بلڈنگیں تھیں، ان میں بھی مختلف خاندانوں کو آباد کر دیا گیا ہے۔ جو لوگ دولت مند تھے، وہ اب دولت اپنے پاس رکھنا نہیں چاہتے۔ ان کا کہنا ہے کہ دولت ہمارے دوسرے بھائیوں کے کام آنی چاہیئے۔ ہم تنہا مال و دولت سمیٹ کر کیا کریں گے۔ یہ سب محبت کا جذبہ ہے جو اپنی دولت دوسروں پر لٹانے پر مجبور کرتا ہے۔"

بابا خیرالدین کا رول ادا کرنے والے نے کہا "تعجب ہے مجھے دولت ملے تو میں سب کی سب سمیٹ کر رکھ لوں۔"

راحت عزیزی نے کہا "تم دولت کہاں رکھو گے؟ اب پورے پاکستان میں تمام بینک سرکاری ہیں۔ لوگ روزانہ جو کماتے ہیں وہ اپنے طور پر ضرورت کے مطابق خرچ کرتے ہیں۔ جو بچ جاتا ہے وہ سرکاری بینکوں میں لے جا کر جمع کر دیتے ہیں۔ کسی کے نام کا اکاؤنٹ نہیں ہے کہ کس نے کتنی رقم جمع کی ہے۔ کیونکہ اگر کوئی ناگہانی ضرورت پیش آ جائے تو انہیں حکومت کی طرف سے اچھی خاصی مالی امداد مل جاتی ہے۔"

صابرہ بیگم کا رول ادا کرنے والی ادھیڑ عمر کی عورت نے کہا "پھر بھی کتنی جلدی مالی امداد مل سکتی ہے۔ اگر کوئی اچانک ہی بری طرح بیمار پڑ جائے تو؟"

"تو یہاں کے تمام بڑے اور چھوٹے ہسپتالوں میں مفت علاج ہوتا ہے۔"

"لیکن کوئی آپریشن کا مسئلہ ہو جس میں زیادہ سے زیادہ رقم کی ضرورت ہو؟"

"خواہ ہزاروں روپے کی ضرورت پیش آئے۔ ہسپتال والے کبھی مریض سے ایک پیسہ بھی طلب نہیں کریں گے۔ یہ سب کچھ سرکار کی طرف سے ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اب وہ پہلے جیسے ڈاکٹر نہیں ہیں کہ علاج کے لئے دوائیں تجویز کریں اور نسخہ لکھ کر دے دیا کہ بازار سے خرید لو۔ ساری دوائیں ہسپتال سے ہی دستیاب ہو جاتی ہیں۔"

رفیع الدین نے کہا "پھر بھی فاضل اخراجات کے لئے فاضل رقم کی ضرورت ہوتی ہے مثلاً میں جیسے نماز پڑھنے کے لئے ایک جناح کیپ پہنتا ہوں لیکن میں ایک فیلٹ ہیٹ بھی خریدنا چاہتا ہوں، تب کیا ہوگا؟"

"تب یہ ہوگا کہ تمہاری اپنی روزانہ کی آمدنی میں سے جو رقم بچتی ہے، وہ رقم تم سرکاری بنک میں جمع کرنے کے بجائے اس سے ایک فیلٹ ہیٹ خرید لو گے۔"

"اگر میں دو فیلٹ ہیٹ خریدنا چاہوں، تو؟"

"یہاں ہر ہفتے، ہر گھر میں زنانہ پولیس کی عورتیں آتی ہیں۔ گھر کے اندر کا جائزہ لیتی ہیں۔ اگر تمہارے گھر میں دو عدد فیلٹ ہیٹ ہوں گے تو وہ ایک فیلٹ ہیٹ اٹھا کر لے جائیں گی اور اسے سرکاری اسٹور میں جمع کروا دیں گی۔"

سلیقہ نے کہا "مرد یہ برداشت کر لیتے ہیں۔ اپنے شوق کی ایک ہی چیز پر گزارہ کر لیتے ہیں لیکن عورتیں تو مختلف قسم کے زیورات چاہتی ہیں۔ زیورات کا ایک سیٹ ہو تو دوسرے سیٹ کی بھی تمنا ہوتی ہے۔"

راحت عزیزی نے کہا "یہ بھی کوئی مشکل بات نہیں ہے اگر تمہارے پاس زیورات کا ایک سیٹ ہے اور تم نے اسے پہن لیا ہے اور آئندہ اسے پہننا نہیں چاہتیں۔ کوئی نیا سیٹ پہننا چاہتی ہو تو اپنا پرانا سیٹ دکان دار کو دے کر اس سے دوسرا نیا سیٹ لے کر آ سکتی ہو لیکن بیک وقت زیورات کے دو سیٹ اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتیں۔ رکھو گی تو زنانہ پولیس کی عورتیں ایک سیٹ اٹھا کر لے جائیں گی اور اسے بھی سرکاری اسٹور میں جمع کرا دیں گی۔"

"یعنی یہاں پابندیوں میں رہ کر اپنی آرزوئیں پوری کی جا سکتی ہیں۔"

"ہاں! یہاں تم اپنی ہر آرزو پوری کر سکتی ہو۔ ایک سے ایک بہترین لباس پہن سکتی ہو۔ طرح طرح کے زیورات پہننے کا شوق پورا کر سکتی ہو، جیسا چاہو ویسا فیشن کر سکتی ہو۔ کسی قسم کی یہاں پابندی نہیں ہے۔ پابندی صرف اتنی ہے کہ ایک وقت میں تمہارے پاس صرف ایک ہی چیز رہے۔ کوئی عورت کسی دوسری عورت کے سامنے یہ دعویٰ نہ کرے کہ اس کے پاس زیورات کے دو یا دس سیٹ ہیں اور دو ساڑھیاں ہیں۔ کوئی مرد یہ غرور نہ کرے کہ اس کا لاکھوں روپے کا بنک بیلنس ہے اور سینکڑوں ایکڑ زمینوں کا وہ مالک ہے۔ یہاں کوئی اپنی جائیداد پر فخر نہیں کر سکتا۔ یہاں ملکیت کے تصور کو بالکل فنا

کر دیا گیا ہے۔ یہاں جو کچھ ہے وہ سب کا ہے اور سب کے لئے لازم ہے کہ وہ چیزوں کو محدود انداز میں صرف اپنی ضرورت کے مطابق استعمال کریں۔ ایک سے زیادہ کی ہوس نہ کریں۔"

اب وہ کراچی شہر میں داخل ہو گئے تھے۔ ان کی گاڑی ایک کشادہ سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ سڑک کے اطراف دُور تک بڑے بڑے خوبصورت مکانات نظر آ رہے تھے۔ تمام مکانات اور دکانیں ایک ہی ڈیزائن کی تھیں اور دکانیں سب کی سب کھلی ہوئی تھیں۔ راحت عزیزی نے کہا "یہ ساری دکانیں رات بھر اسی طرح کھلی رہتی ہیں اور دکاندار اپنے گھر جا کر سو جاتے ہیں۔"

رضی الدین نے حیرانی سے پوچھا "کیا یہاں پر چوری کا ڈر نہیں ہے؟"

"چوری کون کرے گا، اور کس لئے کرے گا؟ جب ساری ضروریات پوری ہو جاتی ہیں اور ضرورت سے زیادہ سامان کوئی اپنے گھر میں رکھ نہیں سکتا تو وہ چوری کر کے چوری کا مال کہاں لے جائے گا؟"

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر راحت عزیزی نے کہا "دراصل تم لوگ پہلی بار اس ماحول کے مطابق معلومات حاصل کر رہے ہو۔ اس لئے ایسے سوالات کرتے ہو۔ تم ذرا غور کرو کہ جن کے دماغوں میں محبت ہی محبت بھری ہو، وہ کسی طرح دوسرے کا مال چوری کر کے اسے نقصان کیسے پہنچائیں گے؟ وہ تو محبت سے سوچیں گے کہ اس کا نقصان نہ ہو بلکہ ہماری ذات سے ان کو مزید فائدہ پہنچے۔ تو ایسی صورت میں چوری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

خیر الدین نے کہا "یہ ٹھیک ہے کہ محبت کی عینک لگا کر دیکھا جائے، سوچا جائے اور عمل کیا جائے۔ تو چوری، بے ایمانی، حرص و ہوس اور دشمنی سب کچھ ختم ہو جاتی ہے۔ پھر بھی کچھ لوگ نفسیاتی مریض ہوتے ہیں۔ عادتاً کوئی چیز دکان سے اٹھا کر یا کسی کے گھر سے اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ ایسے نفسیاتی مریض کا کیا کیا جاتا ہے؟"

"جیسا کہ تم لوگوں کے پاس میڈیکل رپورٹ کا کاغذ موجود ہے۔ اسی طرح ہر ایک کی میڈیکل رپورٹ میں یہ بات درج ہوتی ہے کہ وہ نفسیاتی مریض ہے یا نہیں۔ جو لوگ نفسیاتی مریض ہوتے ہیں انہیں چوری کرنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔"

خیر الدین نے حیرانی سے پوچھا "کیا سرکاری طور پر چوری کی اجازت دی جاتی ہے؟"

"ہاں! اس لئے دی جاتی ہے کہ جب وہ چوری کر کے کوئی چیز اپنے گھر میں لا کر رکھتا ہے تو زنانہ پولیس کی عورتیں وہ چیز اٹھا کر پھر سرکاری اسٹور میں جمع کرا دیتی ہیں۔"

وہ سوسائٹی کے علاقے میں پہنچ گئے۔ وہاں بڑی بڑی شاندار کوٹھیاں نظر آ رہی تھیں۔ سلیقہ نے پوچھا "یہاں تو دولت مندی کے آثار نظر آ رہے ہیں؟"

راحت عزیزی نے کہا "بالکل نہیں! یہاں جو لوگ آباد ہیں ان کے پاس بھی روزانہ کی وہی آمدنی ہے جو ایک عام آدمی کے پاس ہوتی ہے۔ تم کسی بھی کوٹھی میں جا کر دیکھ لو۔ اگر کوٹھی کے نچلے حصے میں ایک خاندان آباد ہے تو دوسری منزل پر دوسرا خاندان نظر آئے گا۔ یعنی کوٹھی کسی کی ملکیت نہیں ہے۔"

"لیکن ان کوٹھیوں کی اندرونی سجاوٹ تو دوسرے مکانوں سے بہتر ہو گی؟"

"ہرگز نہیں۔ تم اپنے مکان کو بھی اسی طرح سجا بنا کر رکھ سکتے ہو۔ پردے بدل سکتے ہو۔ سال چھ مہینے میں صوفے بدل سکتے ہو۔ یہاں جتنی دکانیں ہیں، تم اپنے گھر کی کوئی چیز لے جا کر وہاں تبادلے پر دوسری چیز لا سکتے ہو۔"

"پھر دکاندار کو کیا فائدہ پہنچے گا؟"

"دکاندار ہوتے کہاں ہیں۔ جتنی بھی دکانیں ہیں وہاں سب سرکاری ملازم ہیں۔ یہاں دکانداری اور منافع خوری کا تصور ہی نہیں ہے۔ ایک قصاب گوشت تولتے وقت اس میں زیادہ ہڈیاں نہیں ڈالے گا کیونکہ وہ سرکار کی طرف سے تولتا اور بیچتا ہے۔ وہ جو کچھ کمائے گا، وہ سرکاری خزانے میں جائے گا۔ قصاب کو یا سبزی فروش کو یا کسی بھی دکان دار کو روزانہ کی اُجرت ملتی ہے۔"

خیر الدین نے پیچھے مڑ کر سڑک کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "وہ دوسری گاڑی کہاں ہے؟ ہمارے دوسرے ساتھی کہاں چلے گئے؟"

راحت عزیزی نے کہا "انہیں میری بیگم اپنے مکان میں لے گئی ہیں۔ تم لوگوں کو ناظم آباد کے ایک مکان میں پہنچایا جائے گا۔ وہ مکان پہلے ہی تم لوگوں کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ خیر الدین نے لاہور سے یہاں کے رہائشی مکانوں کے افسر کے نام درخواست بھیجی تھی کہ وہ کراچی میں آ کر قیام کرنا چاہتا ہے اس کے لئے وہ مکان الاٹ کر دیا گیا تھا۔ اب تم لوگ اسی مکان میں رہو گے۔"

ان کی گاڑی ناظم آباد کی طرف جانے لگی۔ سلیقہ گاڑی کے دونوں طرف دیکھتی جا رہی تھی۔ سڑکوں کے اطراف

میں بہت ہی چہل پہل نظر آ رہی تھی۔ صاف ستھرے مکانات اور دکانیں تھیں اور راستے، گلیاں اتنی صاف ستھری نظر آ رہی تھیں کہ کچرے کے طور پر ایک تنکا بھی کہیں نظر نہیں آتا تھا۔ انسانوں کے چہرے کھِلے ہوئے، تر و تازہ دکھائی دیتے تھے اگرچہ سلیقہ انہیں قریب سے نہیں دیکھ رہی تھی لیکن حسن دور سے بھی نظر آ جاتا ہے۔ وہ لوگ جو سڑکوں کے کنارے چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ وہ خوش لباس بھی تھے اور خوش مزاج بھی لگ رہے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ ایک نئی دنیا میں چلی آئی ہو۔ ایسی جگہ جسے بلاشبہ جنت کہا جا سکتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جنت میں شیطان کا گزر نہیں ہوتا لیکن اس کی ایجنٹ عورت کا گزر ہو جاتا ہے۔ جو اسے بہلا پھسلا کر شجرِ ممنوعہ کی طرف لے جاتی ہے اور اس جنت میں سلیقہ پہنچ گئی تھی۔

✿

دنیا کے ہر ملک میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو خدمتِ خلق کے لئے اپنی زندگی وقف کر دیتے ہیں۔ ایسے لوگ کسی بھٹکے ہوئے کو راستہ دکھا کر گھر تک پہنچا دیتے ہیں، کسی بیمار کو ہسپتال پہنچا کر اس کا علاج کراتے ہیں، کسی ضرورت مند کی ضرورت پوری کر دیتے ہیں یا کسی مجبور کی مجبوری دُور کر دیتے ہیں اور اس کے صلے میں وہ ایک پیسہ بھی معاوضے کے طور پر کسی سے نہیں لیتے۔ نہ ہی کسی پر احسان جتاتے ہیں۔ یہ لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ اگر غور کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ ایسے لوگوں کے دل میں محبت پلتی رہتی ہے۔ وہ دوسرے انسانوں کے متعلق محبت سے سوچتے ہیں اور محبت سے ان کے کام آنا چاہتے ہیں۔ وہ صرف خدا کی خوشنودی اور رسولؐ کے عمل کے مطابق عمل کرنا چاہتے ہیں تو جو بنیادی جذبہ ہوتا ہے وہ محبت کا ہوتا ہے۔

سن ۱۹۹۰ء کا پاکستان ایک مثالی ملک بن گیا تھا۔ اس ملک کا ہر باشندہ خدمتِ خلق کے جذبے سے سرشار تھا۔ محبت سے اپنی ذات کے متعلق نہیں، دوسرے کے متعلق سوچتا تھا اور دوسرے کے کام آنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتا تھا۔ وہاں کسی کی اب ذاتی کوٹھی نہیں تھی۔ اسی طرح ذاتی کار بھی نہیں تھی۔ سب کچھ سرکاری تھا۔ کسی کو لمبے سفر کے لئے یا فوری سفر کے لئے کار کی ضرورت ہوتی تھی تو وہ کار دینے والے کے شعبے میں جا کر اپنے ضروری کاغذات دکھا کر دو چار گھنٹے کے لئے یا دو چار دنوں کے لئے وہ کار حاصل کر لیتا ہے۔ جب وہ کار لے کر سیر پر نکلتا تھا تو کوئی ہاتھ دے کر رُکنے کے لئے کہتا تو وہ اس راہگیر کے اشارے پر رُک جاتا تھا۔ اس راہگیر کو اگر اسی کی سمت کہیں جانا ہوتا تو وہ

محبت سے اس راہگیر کو بٹھا لیتا تھا۔ ماتھے پر شکنیں نہیں پڑتی تھیں اور نہ ہی ناگواری کا کوئی اظہار کیا جاتا تھا کیونکہ محبت کا جذبہ کارفرما ہوتا تھا۔

ایسے ہی ایک کار والے نے ایئرپورٹ کے لگیج ہال کی طرف بڑھتے ہوئے ایک نوجوان کو مخاطب کیا۔ ”ہیلو مسٹر! کیا تم ناظم آباد کی طرف جانا چاہتے ہو۔ میری گاڑی حاضر ہے۔“

نوجوان نے اس کی طرف دیکھا، پھر مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کا بہت بہت شکریہ۔ واقعی میں ناظم آباد کی طرف جا رہا ہوں مگر آپ کو زحمت ہوگی۔“

”واللہ! زحمت کیا ہوگی۔ یہ تو ہمارے لئے باعث رحمت ہے۔ آئیے تشریف لائیے۔“

وہ دونوں وہاں سے چلتے ہوئے پارکنگ ایریا میں آئے۔ وہاں ایک کار کھڑی ہوئی تھی۔ کار کی پچھلی سیٹ پر ایک شخص سوٹ میں ملبوس فیلٹ ہیٹ پہنے بیٹھا ہوا تھا۔ کار والے نے نوجوان سے کہا۔ ”یہ بھی ایک مسافر ہیں۔ انہیں بھی ناظم آباد کی طرف جانا ہے۔ آپ پچھلی سیٹ پر تشریف رکھیں۔“

نوجوان پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”واہ، ہمارا پاکستان کیسا جنت کا نمونہ بن گیا ہے۔ قدم قدم پر آرام اور آسائشیں ہیں۔ اب وہ بات نہیں رہی کہ دھوپ میں، بارش میں، سردی میں سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر بس کا انتظار کریں یا منی بس والوں کی خوشامدیں کریں۔ اب تو جہاں جاؤ وہاں جانے کے لئے آسانی سے خود بخود گاڑیاں دستیاب ہو جاتی ہیں۔“

گاڑی آگے بڑھ گئی۔ کچھ دور جانے کے بعد پاس بیٹھے ہوئے اس شخص نے پوچھا۔ ”آپ کی تعریف؟“

نوجوان نے کہا۔ ”میرا نام جاوید رہبر ہے۔ میں ایک انجینئر ہوں اور اسلام آباد سے ٹرانسفر ہو کر یہاں کراچی آیا ہوں۔ آپ کی تعریف؟“

اس فیلٹ ہیٹ والے نے کہا۔ ”مجھے قاسم کہتے ہیں اور میں ہیلتھ آفیسر ہوں۔ ویسے جب آپ ٹرانسفر ہو کر آئے ہیں تو آپ کے ساتھ سامان نظر نہیں آ رہا ہے۔“

رہبر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آپ تو جانتے ہی ہیں کہ اب پاکستان کے لوگ اپنا سامان اپنے ساتھ اٹھا کر نہیں چلتے ایک جگہ سے دوسری جگہ خالی ہاتھ جاتے ہیں۔ جب دوسری جگہ پہنچتے ہیں تو وہاں اپنی ضروریات کا تمام سامان انہیں مل جاتا ہے۔“

قاسم ہیلتھ آفیسر نے کہا۔ ”یہ تو میں جانتا ہوں لیکن ضروری کاغذات تو ہمیشہ ساتھ رہتے ہیں۔“

”جی ہاں! وہ اب بھی میرے ساتھ ہیں۔ میں نے یہاں قمیص کے اندر سینے کے پاس تمام کاغذات رکھے ہوئے ہیں بات اصل میں یہ ہے کہ جب میں اسلام آباد سے چلا تو ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ میں نے کاغذ کو بچانے کے لئے اسے اندر چھپا کر رکھ لیا۔ اب یہ اسی جگہ محفوظ ہیں۔ گھر جا کر وہاں سے نکالوں گا۔“

گاڑی تیز رفتاری سے فاصلہ طے کرتی جا رہی تھی۔ وہ لوگ اب حسن اسکوائر کو پیچھے چھوڑ کر لیاقت آباد کی طرف بڑھ رہے تھے۔ تب فیلٹ ہیٹ والے نے کہا۔ ”مسٹر رہبر! ہم سب جانتے ہیں کہ تم کراچی میں بالکل اجنبی ہو۔ تمہارا آگے پیچھے کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔ اسلام آباد میں بھی تم تنہا زندگی گزارتے تھے۔ یہاں اگر تمہیں قتل کر دیا جائے تو کوئی تمہارا رونے والا نہیں ہے۔ ہاں، اس حکومت کو تشویش ہوگی کہ اب پاکستان میں رفتہ رفتہ قتل کیوں ہونے لگے ہیں؟ جرائم کیوں بڑھتے جا رہے ہیں؟.... تخریب کار کہاں سے آئے ہیں؟ اور کہاں چھپے رہتے ہیں؟ یہ یہاں کی پولیس اور انٹیلی جنس والے نہیں سمجھ پائیں گے۔ ہاں ہم اب سمجھ رہے ہو کہ چند لمحوں بعد دیکھنے کے قابل نہیں رہو گے۔ تم اپنے کاغذات نکال کر چپ چاپ ہمارے حوالے کر دو۔“

اس کی باتوں کے دوران رہبر نے دیکھا کہ اس نے جیب سے ریوالور نکال لیا تھا اور ریوالور کا رخ ان کی طرف تھا۔

رہبر نے پوچھا۔ ”کیا تم لوگوں کا تعلق سرخ تخریب کاروں سے ہے؟“

ریوالور والے نے پوچھا۔ ”تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”اس لئے کہ میرا تعلق بھی اسی سرخ تخریب کار تنظیم سے ہے۔ یقین نہ ہو تو ابھی میں کوڈ ورڈز میں باتیں کر سکتا ہوں بشرطیکہ تم بھی اسی کوڈ ورڈز میں جواب دو۔“

ریوالور والے نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”پھر تو تم خوب پھنسے ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آج ہم تم سے سرخ تنظیم والوں کا کوڈ ورڈز بھی معلوم کر لیں گے۔ اس طرح ہمارے آدمی تمہاری تنظیم میں پہنچ کر تم لوگوں کے طریقہ کار کو معلوم کر سکیں گے۔“

رہبر نے کہا۔ ”ہمارا طریقہ کار بھی تم لوگوں جیسا ہے۔ ہم بھی پہلے یہ معلومات حاصل کرتے ہیں کہ کون آفیسر یا اس ملک کا خاص آدمی ایک شہر سے دوسرے شہر ٹرانسفر ہو رہا ہے۔ اگر وہ اکیلا زندگی گزارتا ہے یا اس کے دوست احباب زیادہ نہیں ہیں یا کسی دوسرے شہر ٹرانسفر ہونے کے بعد وہ اجنبی چہرہ ہوگا صرف شناختی کارڈ کے ذریعے سے پہچانا جائے گا، تو ایسے لوگوں کو ہم

شکار کرتے ہیں۔"

"ہوں! تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارا نام جاوید رہبر نہیں ہے۔ جاوید رہبر کوئی اور تھا؟"

رہبر نے کہا "ہاں! اسلام آباد میں جو جاوید رہبر تھا اسے ہماری تنظیم کے لوگوں نے قتل کر دیا ہے۔ اس کا چہرہ بگاڑ دیا۔ اس کے کاغذات مجھے دیئے۔ میرا ایک الگ شناختی کارڈ ہے جو میرے چہرے کے مطابق ہے اور میں اس شناختی کارڈ کے مطابق یہاں کراچی میں اپنی ڈیوٹی انجام دیتا رہوں گا۔ اگر کوئی اسلام آباد کا شناسا یہاں پہنچ جائے تو شاید میرا بھید کھل جائے ورنہ شناختی کارڈ کے مطابق میں جاوید رہبر رہوں گا۔"

ریوالور والے نے کہا "جاوید رہبر کے متعلق ہمیں بھی پوری معلومات حاصل ہیں۔ ہم نے سوچا تھا کہ ٹرانسفر ہو کر یہاں کراچی پہنچے گا تو یہاں ہم اسے ٹریپ کریں گے جیسا کہ تمہیں جاوید رہبر سمجھ کر کر رہے ہیں۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ سرخ تنظیم والوں نے اسلام آباد میں ہی جاوید رہبر کو قتل کر دیا ہے اور اس کی جگہ تمہیں بھیج رہے ہیں۔ اب تمہاری جگہ میں جاوید رہبر بنوں گا۔ میرے پاس بھی جاوید رہبر کا مکمل شناختی کارڈ ہے صرف تصویر میری ہے۔"

رہبر نے اپنے کوٹ کی جیب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اچھا تو تم لوگوں نے میری کوٹ کی جیب سے لگے ہوئے بیج کو دیکھ کر سمجھ لیا تھا کہ میرا تعلق انجینئرنگ کے شعبے سے ہے چونکہ میں اسلام آباد سے آنے والی فلائیٹ سے آیا ہوں۔ اس لئے میرا نام جاوید رہبر ہوگا؟"

ریوالور والے نے کہا "ہاں! اسی لئے ہم نے تمہیں کار میں بٹھاتے ہی تمہارا نام معلوم کر لیا تھا اور مطمئن ہو کر ہی اب تمہیں ٹریپ کر رہے ہیں۔"

رہبر نے کہا "دوستو! تمہارا اور ہمارا مقصد ایک ہی ہے کہ ہم تخریب کاری کے ذریعے یہاں دہشت پھیلائیں۔ یہاں کی حکومت نے اصلاح معاشرہ کے ذریعے لوگوں کے دلوں میں اتنی محبت بھر دی ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص پر حکومت کرنے کو برا سمجھتا ہے۔ سب برابر کا درجہ رکھتے ہیں۔ کوئی حاکم بننا نہیں چاہتا کوئی شخص سیاست دان بننا نہیں چاہتا۔ اگر یہی حال رہا تو بڑی طاقتوں کے لئے مشکلات پیدا ہو جائیں گی اور بڑی طاقتیں یہی چاہتی ہیں کہ حکومتیں بدلتی رہیں، پالیسیاں بدلتی رہیں اور ان کا بھلا ہوتا رہے۔"

"بے شک ہم سب کا مقصد یہی ہے لیکن ہمارا ذاتی مقصد یہ ہے کہ تمہارا ملک بھی ہمارے راستے میں نہ آئے۔ راستے میں جو بھی آئے گا ہم اسے نیست و نابود کر دیں گے جیسا کہ ابھی تمہیں کرنے والے ہیں۔ میں آخری بار پوچھتا ہوں۔ تم سیدھی طرح وہ تمام ضروری کاغذات نکال کر دیتے ہو یا تمہیں گولی مارنے کے بعد وہ کاغذات حاصل کئے جائیں۔"

جاوید رہبر نے ہنستے ہوئے کہا "گولی تو تم ہر صورت میں مارو گے کیونکہ تمہارا طریقۂ کار بھی ہماری تنظیم جیسا ہے۔ وہاں اگلی سیٹ پر ایک چھوٹا سا اٹیچی رکھا ہوا ہے۔ میں جانتا ہوں اس میں تیزاب ہوگا۔ مجھے قتل کرنے کے بعد میرا چہرہ بگاڑ دیا جائے گا کہ کوئی مجھے پہچان نہ سکے۔ میرا شناختی کارڈ اور میرے دوسرے ضروری کاغذات مجھ سے لے لئے جائیں گے۔ اگر مجھ جیسے مقتول کے لباس سے بھی کسی طرح کا سراغ ملنے کا اندیشہ ہو تو لباس اتار کر بھی اس اٹیچی میں رکھ لیا جاتا ہے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی ڈرائیو کرنے والے کے حلق سے چیخ نکلی۔ اس نے کار کے سامنے آنے والے کو ایک گندی گالی دیتے ہوئے ایک جھٹکے سے بریک لگائے۔ شاید کوئی جانور سامنے آ گیا تھا۔ اچانک بریک لگنے سے جاوید رہبر کا بھلا ہو گیا۔ ریوالور والا اگلی سیٹ کی پشت سے ٹکرایا۔ رہبر پھرتی سے پاس والے دروازے کو کھول کر وہاں سے نکلا۔ پھر بھاگتا ہوا چلا گیا۔ اسے اپنے پیچھے آواز سنائی دی "رک جاؤ، ورنہ گولی مار دوں گا۔"

رہبر جانتا تھا کہ ویسے بھی وہ لوگ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ وہ کشادہ سڑک کو عبور کرنے کے لئے بھاگتا رہا۔ اسی وقت ٹھائیں سے فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ رہبر کو یوں لگا جیسے موت اس کے بازو کو پکڑ کر کھینچ رہی ہو۔ تاہم وہ اپنی بقا کے لئے بھاگتا رہا۔

کار ڈرائیو کرنے والا چھوٹی سی اٹیچی کو بغل میں داب کر گاڑی سے نکل آیا۔ ارادہ تھا کہ بھاگنے والا گولی لگنے سے گرے گا تو اس اٹیچی سے تیزاب نکال کر اس کے چہرے کو بگاڑا جائے گا۔ اور مرنے والے کے پاس سے جو ضروری کاغذات اور ضروری چیزیں برآمد ہوں گی۔ ان سب کو سمیٹ کر اٹیچی میں رکھ لیا جائے گا۔ لوگوں کی بھیڑ لگے گی اور دوبارہ کار تک پہنچنے کا موقع نہیں ملے گا تو وہ اس اہم اٹیچی کو لے کر فرار ہونے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

دوسری طرف ریوالور والے کا نشانہ بھٹک گیا تھا۔ رہبر سڑک پار کر چکا تھا مگر پھر بھی نشانے پر تھا۔ ریوالور والے نے دوسرا فائر کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ شاید ریوالور جام ہو گیا تھا۔ اس نے ذرا جھک کر بائیں پاؤں کو اٹھایا اور دایاں ہاتھ موزے کے اندر ڈال کر وہاں سے ایک چاقو نکال لیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ چاقو کھل چکا تھا اور تیر کی طرح سنسناتا ہوا رہبر کی طرف جا

رہا تھا لیکن رہبر کی تقدیر مہربان تھی۔ چاقو اس کے کان کے پاس سے سنسناتا ہوا آگے نکل گیا تھا۔

سڑک پر زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ آس پاس جتنے بھی لوگ تھے وہ سہم کر اپنی اپنی جگہ رہ گئے تھے۔ ریوالور کو دیکھ کر کوئی آگے بڑھنا نہیں چاہتا تھا۔ کہیں سے کسی نے چیخ کر پوچھا: "محبت کرنے والوں کی بستی میں یہ کیا ہو رہا ہے ؟"

ایک اور سمت سے کہا گیا: "ریوالور اور چاقو والے کو شاید کچھ ٹری ٹیکے نہیں لگے ہیں۔"

ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں: "انہیں پکڑو۔ انہیں ٹیکے لگاؤ۔ انہیں کیپسول کھلاؤ، انہیں محبت کرنا سکھاؤ۔"

لوگوں کی چیخ و پکار کے دوران وہ دونوں کار میں بیٹھ کر فرار ہو گئے۔ جاوید رہبر نے بھاگنے کے دوران گاڑی کی آواز سنی تھی۔ اس نے سمجھا کہ وہ لوگ کار میں بیٹھ کر آ رہے ہیں۔ وہ فوراً ہی ایک گلی میں مڑ گیا۔ قریب ہی ایک مکان کا دروازہ کھلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ دوڑتا ہوا وہاں تک پہنچ گیا۔ ایک بار پلٹ کر دیکھا، گاڑی نظر نہیں آ رہی تھی۔ مگر خطرے کا احساس حاوی تھا۔ اس نے مکان میں داخل ہو کر دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔

اب وہ بند دروازے سے لگا بری طرح ہانپ رہا تھا۔ اسے بازو میں جلن کا احساس ہوا۔ اس نے کراہتے ہوئے دیکھا۔ اس کی آستین لہو سے بھیگ رہی تھی۔ گولی اس کے بازو کو چھیدتے ہوئے گزر گئی تھی۔ موت اس کے بازو کو چھونے میں ناکام رہی تھی۔ اسی وقت ایک مترنم سی آواز سنائی دی۔ "کون ہو تم ؟"

اس نے چونک کر آواز کی سمت دیکھا۔ ایک بے حد حسین لڑکی باتھ روم کے دروازے سے نکلتے ہوئے اسے حیرانی سے دیکھ رہی تھی اور پوچھ رہی تھی: "تم نے ہمارے گھر میں آنے کی جرأت کیسے کی ؟"

وہ گم صم سا ہو کر اسے دیکھتا رہ گیا۔ اپنے زخم کی تکلیف بھول گیا۔ اس لڑکی کی نگاہیں مرہم کا کام کر رہی تھیں۔ "کیا تم گونگے بہرے ہو ؟ یہاں سے چلے جاؤ، ورنہ میں شور مچا دوں گی۔"

اس نے اپنے بازو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "میں زخمی ہوں۔"

"زخمی ہو تو ہسپتال جاؤ۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو ؟ کیا تمہارے دل میں محبت کے جذبات نہیں ہیں ؟ کیا تم نے کچھ ٹری انجکشن نہیں لگوا لیا ہے ؟"

اس بات پر وہ چونک گئی۔ پھر جلدی سے سنبھل کر بولی۔

"ہاں..... ہاں! میں نے کیپسول کھائے ہیں۔ مجھے انجکشن سے ڈر لگتا ہے۔"

"چلو کیپسول ہی سہی۔ لیکن ان کا تو کوئی اثر تم پر نہیں ہوا۔ تمہارے دل میں محبت نہیں ہے۔ اگر محبت ہے تو آگے بڑھ کر اس کا اظہار کرو، ثابت کرو کہ تم اس ملک کے قانون کے مطابق محبت کرنا جانتی ہو اور نفرت کے نام سے بھی واقف نہیں ہو۔"

وہ فوراً ہی مسکرا کر آگے بڑھتے ہوئے بولی: "مجھے افسوس ہے کہ تم زخمی ہو گئے ہو۔ میرے گھر میں مرہم پٹی کا سامان نہیں ہے ورنہ میں تمہارے کسی کام آ سکتی۔ تمہیں تو فوراً ہی ہسپتال جانا چاہئے میں یہاں اجنبی ہوں۔ تم جانتے ہو گے کہ یہاں قریب کوئی ڈاکٹر مل سکتا ہے یا نہیں ؟"

وہ بولا: "اتفاق سے میں بھی اجنبی ہوں۔ تم یہاں کب سے ہو ؟"

"میں اپنے والدین اور بھائی کے ساتھ آج ہی صبح یہاں آئی ہوں۔"

"اور میں بھی ابھی اس شہر میں آیا ہوں۔ اچھی لڑکی! تمہارا نام کیا ہے ؟"

"میرا نام سلیقہ ہے مگر تم وقت ضائع کر رہے ہو۔ خون بہہ رہا ہے، تمہیں فوراً ہی جانا چاہئے۔"

"معلوم ہوتا ہے تم مجھے بھگانا چاہتی ہو۔ لیکن میں یہاں سے جا نہیں سکتا۔"

وہ تیور بدل کر ذرا ناگواری سے بولی: "کیوں نہیں جا سکتے کیا ارادہ ہے تمہارا ؟"

وہ بولا: "دیکھو دیکھو! تمہارے تیور بدل گئے ہیں۔ تم محبت سے خالی نظر آ رہی ہو۔"

وہ سنبھل کر پھر مسکرانے لگی۔ رہبر نے اسے غور سے دیکھا۔ پھر کہا: "ہم دونوں کو یہاں کے قریبی ہسپتال میں جانا ہوگا۔"

"میں بھلا کیوں جاؤں گی ؟"

"میں تمہارا طبی معائنہ کراؤں گا۔ مجھے شبہ ہے کہ تم نے کچھ ٹری ٹیکے نہیں لگائے ہیں۔ اور نہ ہی کیپسول کھائے ہیں تمہاری حرکتوں اور تمہاری باتوں سے صاف پتہ چل رہا ہے کہ تم محبت کرنا نہیں جانتی ہو۔"

"میں جانتی ہوں لیکن جاننے کا مطلب یہ تو نہیں ہے جو بھی گھر میں گھسا چلا آئے اس سے محبت کرنا شروع کر دی جائے۔ میں ایک لڑکی ہوں۔ کتنوں سے محبت کر سکتی ہوں ؟"

"ایک لڑکی ساری دنیا سے محبت کر سکتی ہے۔ محبت کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ ہیر رانجھے اور سسی پنوں کی طرح عشق کیا جائے۔"

عشق اور بات ہے اور کسی سے بہن کی طرح، بیٹی کی طرح، ماں کی طرح ایسے دوسرے ایسے مقدس رشتوں کی طرح محبت کی جا سکتی ہے۔ کیا تمہیں یہ نہیں معلوم کہ جب ایک نوجوان لڑکی اور ایک نوجوان لڑکا ایک دوسرے سے پہلی بار ملتے ہیں، ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں اور ایک دوسرے کو پسند آتے ہیں تو کیا کہتے ہیں؟"

سلیقہ نے بے اختیار پوچھا "کیا کہتے ہو؟"

رہبر نے جواب دیا "پہلے لڑکا لڑکی سے پوچھتا ہے، کیا تمہاری شادی ہو چکی ہے۔ اگر لڑکی کنواری ہے تو وہ کہتی ہے نہیں، ابھی میری شادی نہیں ہوئی ہے۔ تب لڑکا کہتا ہے میں تمہیں بیوی بنانا چاہتا ہوں۔ اگر تم مجھے بیوی کی محبت دے سکتی ہو تو میں خود کو خوش نصیب سمجھوں گا۔ اگر تمہیں اعتراض ہو تو کوئی بات نہیں۔ محبت ہمارا اوڑھنا بچھونا ہے۔ ہم پاکیزہ محبت کریں گے۔"

سلیقہ نے کہا "یہ مجھے بتانے کی ضرورت نہیں ہے میں جانتی ہوں۔"

"اگر تم جانتی ہو تو مجھ سے یہ نہ کہتیں کہ تم ایک لڑکی کتنوں سے محبت کرو گی۔ اگر تمہارے دل میں تھوڑی محبت ہوتی تو تم اتنی دیر سے میرے بازو سے لہو بہنے کا تماشا نہ دیکھتیں۔ فوراً ہی اپنے دوپٹے کا ایک سرا پھاڑ کر کم از کم پٹی ہی باندھ دیتیں۔ خون کو بہنے سے روک دیتیں۔ پھر اپنے محلے پڑوس والوں سے التجا کرتیں کہ مجھے ہسپتال تک پہنچایا جائے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی دروازے کے باہر گلی میں بہت سے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ جیسے بہت سے لوگ آ رہے ہوں۔ پھر کسی نے چیخ کر کہا "بھائی! تم کہاں جا رہے ہو؟ کس مکان میں تم نے پناہ لی ہے؟ ہم تمہاری مدد کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے سامنے آؤ، ہمیں بتاؤ کہ وہ تمہارے دشمن کون تھے؟ جو فرار ہو گئے اور تمہیں کوئی نقصان تو نہیں پہنچا ہے، اگر پہنچا ہے تو ہم سب مل کر تمہارا نقصان پورا کریں گے، تمہارے کام آئیں گے!"

رہبر نے سلیقہ کی طرف دیکھ کر کہا "دیکھو! اسے کہتے ہیں محبت، یہ سارے علاقے والے مجھے تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ محبت سے مجبور ہیں۔ جب تک دشمنوں سے مجھے محفوظ نہیں رکھیں گے اور جب تک یہ میرے کسی کام نہیں آ جائیں گے، اس وقت تک یہ سارے محبت کے مارے چین سے سو نہیں سکیں گے۔ بہر حال میں جا رہا ہوں۔"

یہ کہہ کر رہبر دروازے کی طرف پلٹ گیا۔ ہاتھ اٹھا کر چٹخنی کی طرف لے گیا۔ تاکہ دروازہ کھولے۔ ایسا کرتے وقت وہ جان بوجھ کر دیر کر رہا تھا کہ سلیقہ جواباً کچھ کہے یا اسے روکے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس نے دروازے کی طرف سے پلٹتے ہوئے سلیقہ کو پھر ایک بار سر سے پاؤں تک ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ پھر اس کی طرف انگلی اٹھا کر کہا "میں نے تمہیں اچھی طرح پہچان لیا ہے۔ تم نے ابھی تک نہ تو پچھتری ٹیکے لگائے ہیں نہ کیپسول کھائے ہیں۔ تمہارے دل میں اتنی سی محبت اور ہمدردی بھی نہیں ہے کہ میں جا رہا ہوں تو تم رسمی طور پر اتنا کہہ دو کہ آؤ ہسپتال تک پہنچنے سے پہلے میں تمہارے زخم پر کوئی کپڑا باندھ دوں۔ تم محبت سے بالکل خالی ہو۔"

اس نے پھر چٹخنی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ سلیقہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ کو پکڑتے ہوئے کہا "سوری! دراصل بات یہ ہے کہ میں کچھ پریشان ہوں۔ اس لئے میں تمہیں نہیں روک رہی تھی۔ مجھے افسوس ہے کہ تم زخمی ہو۔ میں ابھی تمہارے زخم پر پٹی باندھ دیتی ہوں۔ ذرا ٹھہرو۔"

اس نے اپنا ہاتھ چھڑا کر کہا "نہیں میں تمہارے راز کو کسی حد تک پا گیا ہوں۔ تم پاکستانی نہیں ہو یا پھر ایسی پاکستانی ہو جس کی زندگی غیر ملک میں گزرتی رہی ہے اور اب تم کسی سلیقہ کے شناختی کارڈ اور ضروری کاغذات کے تحت یہاں آ گئی ہو۔"

سلیقہ ایک دم سے گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ پریشان ہو کر اسے دیکھتے ہوئے بولی "یہ جھوٹ ہے۔ تم مجھے الزام دے رہے ہو۔ میں ثابت کر سکتی ہوں کہ میرا نام سلیقہ ہے۔ میں اپنے ماں باپ کی بیٹی ہوں، اپنے بھائی کی بہن ہوں۔ یہاں سب لوگ موجود ہیں لیکن کسی ضرورت سے قریبی مارکیٹ تک گئے ہیں۔ میرے کاغذات بھی یہ ثابت کر دیں گے کہ میں نے پچھتری کیپسول کھائے ہیں۔"

رہبر نے بازو کی تکلیف کے باوجود مسکراتے ہوئے کہا۔ "اپنے کاغذات دکھانے اور ثبوت پیش کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ایک ہی طریقہ کافی ہے۔ میں کل یہاں آؤں گا اور اپنے ساتھ کسی ڈاکٹر کو یا لیڈی پولیس کو لے کر آؤں گا۔ وہ تمہیں ہسپتال لے جا کر تمہارا معائنہ کریں گے اور اس حقیقت کو سمجھیں گے کہ تمہارے پچھتری کے کاغذات درست ہیں یا نہیں۔"

وہ بہت زیادہ پریشان ہو گئی۔ اس نے کہا "تم خواہ مخواہ میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟"

"میں تمہارے پیچھے نہیں پڑوں گا۔ جو سچ ہے وہ صاف صاف کہہ دو۔"

"دیکھو! تمہارے زخم سے بہت لہو بہہ رہا ہے۔ تمہیں فوری

طور پر طبی امداد کی ضرورت ہے۔"

اس نے اپنے بازو کو دیکھا۔ تکلیف برداشت کرتے ہوئے تائید میں سر ہلا کر کہا "ہاں! بے شک مجھے فوری طور پر طبی امداد کی ضرورت ہے۔ میں جا رہا ہوں، کل پھر آؤں گا۔ تم اچھی طرح سوچ لو۔ اگر تمہارا کوئی راز ہے تو میں یہ وعدہ کرتے ہوئے جا رہا ہوں کہ تمہارا راز داں بن کر رہوں گا۔ کیونکہ تم بہت حسین ہو اور میرے دل میں سما گئی ہو۔ میں تمہیں چاہنے لگا ہوں۔ شاید یہ بچوڑی ٹیکے کا اثر ہے کہ میں تم پر جان بھی دے سکتا ہوں۔ چاہے تم پاکستانی ہو یا نہ ہو۔"

اس نے چٹخنی نیچے گرا دی۔ دروازہ کھولتے ہی کہا۔ "اب جلدی سے میرا دوسرا بازو تھام لو تاکہ باہر والے یہ دیکھ سکیں کہ تم مجھ سے ہمدردی اور محبت کر رہی ہو۔"

سلیقہ نے فوراً ہی آگے بڑھ کر اس کے بازو کو تھام لیا۔ وہ سلیقہ کا سہارا لیتے ہوئے برآمدے میں آیا۔ باہر گلی میں آنے جانے والے لوگ انہیں دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ پھر رہبر نے کہا "تم انہیں آواز دے کر کہو کہ میں ہی وہ زخمی ہوں جو قاتلوں سے بھاگ کر یہاں پناہ لینے آیا ہوا ہوں۔"

سلیقہ نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ تمام لوگ وہاں جمع ہونے لگے۔ کتنے ہی اس کے آس پاس آ گئے اور اسے سہارا دے کر کہنے لگے "چلو ہم ابھی تمہاری مرہم پٹی کریں گے اور ڈرنے کی بات نہیں ہے۔ وہ جو مجرم تھے وہ فرار ہو گئے ہیں اگر وہ تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر جاتے تو ہم انہیں محبت سے سمجھانے اور جرم سے باز رکھنے کی کوشش کرتے۔"

سلیقہ حیرانی سے ان لوگوں کی باتیں سن رہی تھی۔ کیا یہ ملک ایسا ہو گیا ہے کہ کچھ لوگ اس اجنبی جوان کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ مگر یہ سارے لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ قاتلوں کو بھی سمجھا بجھا کر راہِ راست پر لایا جا سکتا ہے۔ اس مجمع سے ایک بوڑھے نے ہنستے ہوئے کہا "یہ تو تم سمجھنے اور بوجھنے والی کہاں تھی۔ انہیں تو سمجھا بجھا کر کتابیں بند ہو گئیں۔ علم تھک گیا، پیغمبروں کی ہدایات کے عملی نمونے بے اثر ہو گئے۔ یہ ایسے سمجھنے والے کہاں تھے۔ انہیں سمجھانے کے لئے تو بچوڑی ٹیکے اور کیپسول ایجاد کئے گئے۔ اب کوئی قاتل اسی طرح سمجھتا ہے کہ جب وہ گرفتار ہو جاتا ہے تو اسے ٹیکے لگا دیئے جاتے ہیں یا کیپسول کھلا دیئے جاتے ہیں اور وہ اپنی تمام شیطانی حرکتوں سے باز آ جاتا ہے اور بے اختیار اس کے گلے لگ جاتا ہے، جس کا گلا وہ کاٹنے والا تھا۔"

سلیقہ اب اپنے مکان کے برآمدے میں تنہا کھڑی ہوئی تھی۔ باقی تمام لوگ اس اجنبی زخمی جوان کو اسپتال لے جا رہے تھے۔ کتنے ہی دانش مند لوگوں کو سمجھا رہے تھے۔ وہ چپ نہ ہوں۔ گھر میں آرام کریں۔ اجنبی زخمی جوان کو حفاظت سے اس کے گھر پہنچا دیا گیا ہے۔ تمہیں جب تک زندہ رہے اس کے ساتھ ساتھ چلی جا رہی تھیں۔ کوئی ایک دوسرے سے ہمدردی اور محبت میں پیچھے نہیں رہنا چاہتا تھا۔ ورنہ پہلے یہ ہوتا تھا کہ کوئی کسی زخمی کو اپنے ساتھ نہ لے جاتا جب تک کہ وہ اس کا دوست ہو تو باقی دوسرے مطمئن ہو کر اپنے اپنے گھروں میں بیٹھ جاتے تھے مگر اب محبت کسی کو بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیتی تھی۔ جب تک وہ اپنے پڑوسیوں سے یہ معلوم نہ کر لیتے کہ انہوں نے کھانا کھایا ہے یا نہیں، وہ خیریت سے ہیں یا نہیں اس وقت تک وہ کھانا نہیں کھاتے تھے۔ جب تک یہ نہ معلوم ہوتا تھا کہ بیمار کو دوا مل گئی ہے اور وہ سکون سے سو رہا ہے۔ اس وقت تک دوسرے سکون سے نہیں سو سکتے تھے۔

سلیقہ نے محسوس کیا کہ وہ کچھ بے چین سی ہو رہی ہے۔ من کا اپنا سکون ختم ہو رہا ہے۔ کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ وہ برآمدہ ویران ویران سا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ پلٹ کر کمرے میں آئی تو کمرہ بھی خالی خالی سا لگا۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ اس کی انگلیاں کچھ گیلی گیلی سی ہیں۔ اس نے جلدی سے اپنی انگلیوں کو دیکھا تو وہاں خون لگا ہوا تھا۔ وہ زخمی نوجوان جب دروازے کی چٹخنی ہٹا رہا تھا، تب ہی سلیقہ نے اس کے ہاتھ کو پکڑ لیا تھا اور شاید اسی وقت جوان کا لہو اس کی انگلیوں میں لگ گیا تھا۔ وہ دیر تک اپنی انگلیوں میں سرخ لہو کو دیکھتی رہی۔

اس کے دل نے عجیب طرح سے دھڑکنا شروع کر دیا۔ اس طرح کہ اسے پہلی بار اپنی دھڑکنیں سنائی دیں۔ وہ انگلیوں کو دیکھ رہی تھی۔ لہو کی سرخی میں زخمی جوان کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ کانوں میں اس کی باتیں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر محسوس ہوئی عمر کے کسی موڑ پر ایسا بھی ہوتا ہے۔ اچانک کوئی سامنے آتا ہے اور اپنی نگاہوں کا بچوڑی ٹیکہ لگا کر چلا جاتا ہے۔

اس نے لہو میں بھیگی ہوئی انگلیوں کو اپنے سینے پر رکھ لیا سفید کرتے پر لہو کے ننھے ننھے پھول کھل گئے۔ اسی وقت کمرے کے باہر قدموں کی آواز سنائی دی۔ خیر الدین کسی سے باتیں کرتا ہوا آ رہا تھا۔ وہ جلدی سے چلتی ہوئی باتھ روم میں گھس گئی۔ دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ اسی وقت کمرے میں قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر صابرہ بیگم نے کہا "یہ سلیقہ کہاں چلی گئی ہے؟"

خیر الدین کی آواز سنائی دی "کہاں جا سکتی ہے؟ یہ اپنی

جگہ ہے۔ گھر میں ہی ہوگی۔"

اس کے جتنے فراڈ رشتے تھے ان کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ تیسرا فراڈ رشتہ ایک بھائی کا تھا۔ رضی الدین نے کہا۔ "شاید وہ باتھ روم میں ہے۔"

وہ ان کی باتیں سن رہی تھی اور پھر انگلیوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس زخمی جوان کا لہو کچھ تو کرتے میں منتقل ہو گیا تھا۔ کچھ انگلیوں میں رہ گیا تھا۔ اس نے سوچا۔ انگلیوں کو اب دھو لینا چاہئے۔ لیکن جی نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ انگلیاں نہیں آئینہ ہیں۔ لہو نہیں عکس ہے اور وہ جانے والا اب تک نظر آرہا ہے۔ اگر وہ اسے دھو لے گی تو پھر وہ نظر نہیں آئے گا۔

وہ باتھ روم کے آئینے کے سامنے آگئی اور ایک ہاتھ پیچھے کی طرف کرکے بندھی ہوئی زلفوں کو کھولنے لگی۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ پھر صابرہ بیگم کی آواز آئی "کیا تم اندر ہو؟"

"جی ہاں! میں ابھی آتی ہوں۔"

زلفیں کھل گئیں بلکہ چہرے کی طرف بکھر گئیں۔ سیاہ زلفوں کے درمیان چہرے کا اجلا پن اور اجلا ہو گیا۔ چہرہ جیسے دمکنے چمکنے لگا۔ اس نے تمام زلفوں کو سمیٹ کر آگے کیا پھر لہو میں بھیگی ہوئی انگلیوں کو اپنی زلفوں میں چھپا لیا۔ کوئی بال بال موتی پروتا ہے۔ وہ بال بال لہو پرونے لگی۔ اپنی محبت کو زلفوں کے اندھیرے میں چھپا کر رکھنے لگی۔

دروازے کے دوسری طرف رضی الدین کی آواز سنائی دی۔ "ڈارلنگ! کیا غسل کر رہی ہو؟"

رضی الدین کے منہ سے ڈارلنگ کا لفظ سن کر اس کے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ رضی الدین جو اس کا چھوٹا بھائی بنا ہوا تھا، لیکن اچھے گہرے دوستوں میں سے تھا۔ اسے ڈارلنگ کہہ کر بلایا کرتا تھا۔ یعنی یہاں بھائی کا رشتہ تھا اور درپردہ عاشقانہ انداز تخاطب تھا۔ اب یہ بات اس کے دل میں چبھ گئی۔ یکبارگی احساس ہوا کہ یہ بُری بات ہے اور نہایت ہی نامعقول رشتوں میں وہ الجھی ہوئی ہے۔

وہ ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر آئی۔ رضی الدین خیرالدین اور صابرہ بیگم تینوں وہاں موجود تھے۔ وہ جھلا کر بولی۔ "یہ کیا بدتمیزی ہے۔ تم مجھے ڈارلنگ کیوں کہتے ہو؟ کیا میں تمہاری بہن نہیں ہوں؟"

رضی الدین نے مسکرا کر کہا۔ "کون کم بخت تمہیں بہن سمجھتا ہے۔ اسے! ہم تو یہاں ناٹک کھیلنے آئے ہیں۔"

"لعنت ہے ایسے ناٹک پر۔ جب زبان سے کسی کو بہن کہہ دیا اور کسی بہن کی زبان نے کسی کو بھائی کہہ دیا تو پھر وہ مقدس رشتہ ہوا۔ مجھے آئندہ ڈارلنگ کبھی نہ کہنا۔"

وہ تینوں سلیقہ کو حیرانی سے دیکھنے لگے۔ کیونکہ وہ پاکستان سے باہر ایسی دنیا میں رہتے ہوئے آئے تھے، جہاں محبت نہیں تھی۔ پاکیزگی نہیں تھی۔ اگر محبت تھی تو پاکیزگی نہیں تھی۔ وہاں یہ رشتے ایسے تھے جیسے ہاتھی کے دانت ہوتے ہیں۔ دنیا والوں کو دکھانے کے لئے کچھ اور رشتہ ہوتا ہے۔ گھر کے اندر رہنے کے لئے کچھ اور رشتہ ہوتا ہے، وہ ایسے ماحول سے، ایسے ملکوں سے آئے تھے جہاں جرم گرفت میں نہ آئے تو جائز ہو جاتا ہے۔

خیرالدین نے جلدی سے آگے بڑھ کر کہا۔ "ٹھیک ہے ٹھیک ہے، سلیقہ بالکل ٹھیک کہتی ہے۔ ہم سب کو بہت محتاط رہنا چاہئے جس رشتے کا ہم ناٹک کھیل رہے ہیں۔ اس رشتے کو گھر کی چار دیواری کے اندر بھی نبھانا چاہئے۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ ایسا نہ ہو رضی الدین! کہ تم دنیا والوں کے سامنے سلیقہ کو بہن کہو اور یہاں ڈارلنگ کہو تو کوئی پڑوسی سن لے۔ سلیقہ ٹھیک کہتی ہے۔ آئندہ تم عاشقانہ انداز اختیار نہ کرنا۔"

رضی الدین سلیقہ کو گھورتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔ شام کو جب مغرب کی اذان ہوئی تو خیرالدین اور رضی الدین نماز پڑھنے کے لئے محلے کی مسجد میں گئے۔ کیونکہ سبھی مرد نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں ضرور حاضر ہوتے تھے۔ نماز کے بعد مسجد میں اعلان کیا گیا کہ آج کی رپورٹ کے مطابق ہمارے محلے میں سبھی لوگ خوش حال ہیں۔ سبھی کے ہاں اچھا کھانا پکا ہے۔ مکان نمبر الف، ۱۵ کے کریم صاحب جو بیمار تھے وہ اب ماشاء اللہ تندرست ہو رہے ہیں۔ بعد نماز عشاء آپ تمام حضرات کھا پی کر آرام سے سو سکتے ہیں۔ کسی بات کی پریشانی یا کسی کی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

رات کو صابرہ بیگم میز پر کھانا لگاتے ہوئے بڑبڑا رہی تھیں۔ "یہاں تو یہ بڑی مصیبت ہے کہ ہر ایک کو اپنا کام اپنے ہاتھوں سے کرنا پڑتا ہے۔ اب ہم جب تک یہاں رہیں گے مجھے اپنے ہاتھوں سے تم لوگوں کو پکا کر کھلانا ہوگا اور میں نے کبھی اتنی محنت نہیں کی!"

وہ سب کھانے کے لئے میز کے اطراف بیٹھ گئے۔ خیرالدین نے کہا۔ "ہاں! یہ بات تو درست ہے مگر کیا کیا جائے۔ یہاں جیسا ماحول ہے، جیسا دوسرے لوگ کرتے ہیں، ویسا ہمیں بھی کرنا ہوگا۔ ذرا بھی ناگواری کا احساس کریں گے تو پکڑے جائیں گے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی دروازے پر دستک سنائی دی۔ رضی الدین نے وہاں سے اٹھ کر باہر والے دروازے کو کھولا۔

وہاں ایک شخص کھڑا ہوا تھا۔ اس نے سلام کیا تو رضی الدین نے جواب دیتے ہوئے پوچھا: "آئیے! اندر تشریف لائیے۔ ہم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟"

آنے والے شخص نے کہا: "میں آپ کا پڑوسی ہوں۔ آپ لوگ یہاں نئے آئے ہیں تو میں نے سوچا کہ آپ لوگوں کی خیریت دریافت کرلوں اور کچھ ضروری باتیں کرلوں۔ کیا آپ کو زحمت ہوگی؟"

رضی الدین نے کہا: "بالکل نہیں صاحب! آپ اندر تشریف لائیں۔ ہم کھانے کے لئے بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ ہماری خوش نصیبی ہوگی کہ آپ ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہوں گے۔"

"آپ کا بے حد شکریہ۔ میں کھانا کھا کر گھر سے نکلا ہوں۔ ویسے آپ لوگوں کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر رہوں گا۔ اور ایک پیالی چائے پی لوں گا۔"

وہ کھانے کی میز پر آیا۔ اور ایک پیالی چائے پی۔ رضی الدین کے ذریعے اس کا تعارف سبھی سے ہوا۔ پھر وہ ایک کرسی پر بیٹھ کر کہنے لگا: "میں کچھ ضروری باتیں کرنے آیا ہوں۔ آپ لوگوں نے مسجد میں یہ تو دیکھ ہی لیا ہے کہ وہاں محلے والوں کے متعلق معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ لیکن اب ہمارے ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس کی خبر ہمیں پوری طرح نہیں ہوتی بہت سی باتیں چھپالی جاتی ہیں۔ ان باتوں کو چھپانے میں لوگوں کا بھلا ہے۔ بہت سے لوگ کمزور دل کے ہوتے ہیں اور دشمنوں کے ظلم پر سہم جاتے ہیں۔"

خیر الدین نے کہا۔ "آپ درست کہہ رہے ہیں۔ سبھی کمزور اور سبھی باہمت نہیں ہوتے۔ ویسے آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

اس نے ذرا رازدارانہ انداز میں اپنی آواز دھیمی کرتے ہوئے کہا: "ہمارے ملک میں کچھ لوگ تخریبی کارروائیوں میں مصروف ہیں میرا تعلق یہاں کے ہسپتال سے ہے اور اس شعبے میں ہوں جہاں ایکسرے کے ذریعے پچوٹری غدود کا معائنہ کیا جاتا ہے۔ یہ دیکھا جاتا ہے کہ کس کے دماغ کے اندر کتنی مقدار میں غدود رہ گئے ہیں جس کے دماغ میں پچوٹری غدود کی کمی ہونے لگتی ہے۔ ٹیکے اور کیپسول کے ذریعے اس کمی کو پورا کیا جاتا ہے۔ پچھلے ہفتے ہمارے ہسپتال میں یہ انکشاف ہوا کہ جسے ہم نے دو ماہ پہلے پچوٹری ٹیکے لگائے تھے اس آدمی کے دماغ کے اندر وہ پچوٹری غدود ختم ہو گئے ہیں۔ برائے نام رہ گئے ہیں۔"

خیر الدین نے پوچھا: "دو ماہ کے اندر پچوٹری غدود کیسے ختم ہو سکتے ہیں۔ جبکہ تقریباً پانچ سال کی میعاد ہوتی ہے۔ پانچ سال کے بعد ہی یہ ٹیکے لگائے جاتے ہیں۔"

"جی ہاں یہی تو حیرانی اور پریشانی کی بات ہے کہ ایسا کیوں ہوا۔ پھر اس کی رپورٹ ہم نے اپنے اعلیٰ طبی شعبوں میں پہنچائی۔ اس کے جواب میں معلوم ہوا کہ ہمارے ملک کے ہر شہر میں ایسا ہو رہا ہے۔ بہت سے لوگوں کا طبی معائنہ کیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ پچوٹری غدود حیرت انگیز طور پر ختم ہو رہے ہیں۔ ایک ایسے مردہ شخص کا پوسٹ مارٹم کیا گیا جسے ایک ماہ پہلے پچوٹری ٹیکہ لگایا گیا تھا اس کے دماغ میں ان پچوٹری غدود کا رہنا لازمی تھا لیکن مردہ دماغ کی سرجری کے دوران ایک نیا انکشاف ہوا۔ اس دماغ میں کچھ ایسا مادہ پایا گیا جس کا طبی طور پر تجزیہ کرنے کے بعد ابھی تک کوئی خاص بات سمجھ میں نہیں آئی۔ بڑے بڑے ماہرین کا یہ خیال ہے کہ پچوٹری غدود کے توڑ میں کوئی ایسا غدود تیار کیا گیا ہے جو پچوٹری غدود کے لیے زہر ثابت ہوتا ہے۔ ان غدود کو آہستہ آہستہ ختم کرکے انسان کے اندر محبت کو فنا کر دیتا ہے اور جب محبت فنا ہو جاتی ہے تو پھر نفرت، بیزاری، غم، غصہ، انتقام اور ان سب کے نتیجے میں جرائم ہی جرائم رہ جاتے ہیں۔"

خیر الدین نے تشویش کا اظہار کیا: "یہ تو ہمارے ملک کے خلاف سازشیں کی جارہی ہیں۔"

پڑوسی نے تائید میں سر ہلا کر کہا: "بیشک یہی بات ہے۔ سرکاری طور پر عوام کو ان سازشوں کے متعلق کوئی خبر نہیں دی گئی ہے تاکہ سازش کرنے والے خوش فہمی میں مبتلا رہیں کہ ہم سب بے خبر ہیں۔ ہم فرداً فرداً لوگوں کو سمجھا رہے ہیں۔ ان سازشوں سے آگاہ کر رہے ہیں۔ اس طرح ہم چپ چاپ ان سازش کرنے والوں تک پہنچ جائیں گے اور انہیں گرفتار کرلیں گے۔"

رضی الدین نے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا: "اگر کوئی سازش کرنے والا میری گرفت میں آگیا تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

پڑوسی نے جلدی سے ہاتھ اٹھا کر کہا: "نہیں نہیں جناب۔ آپ غصے میں نہ آئیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ پر بھی ان منفی غدود کا اثر ہو رہا ہے جو سازش کرنے والے پتہ نہیں کسی ٹیکے کے ذریعے یا کسی دوا کے ذریعے ہمارے آپ کے دماغوں میں پہنچا رہے ہیں۔"

رضی الدین کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ خیر الدین نے جلدی سے بات بناتے ہوئے کہا: "یہ ابھی جوان ہے۔ ذرا جوش میں آگیا ہے۔ حب الوطنی ایسی چیز ہی ہوتی ہے۔ رضی الدین! تم اطمینان رکھو۔ مجرم جب گرفتار ہوں گے تو قانون خود انہیں سزا دیدے گا اور ایسی عبرتناک سزا دے گا کہ دوسرے عبرت حاصل کریں گے۔"

پڑوسی نے پھر ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "نہیں نہیں بھائی صاحب آپ ایسا نہ کہیں ہمارے ہاں کا قانون کسی کو بھی عبرت ناک سزا نہیں دیتا ہے۔"

خیرالدین نے بے اختیار حیرانی سے پوچھا۔ "کیوں کیا کوئی قاتل ہو تو اسے عمر قید یا سزائے موت نہیں دی جا سکتی۔؟"

پڑوسی نے حیرانی سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ ہمارے ملک میں سزا اور وہ بھی موت کی سزا دینے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ بس مجرم گرفتار ہوا۔ اسے پیجوٹری ٹیکہ لگا دیا اور وہ محبت میں مبتلا ہو گیا۔ سارا جرم ختم ہو جاتا ہے اور اس کے اندر محبت ہی محبت رہ جاتی ہے۔ پھر وہ جرم کیسے کرے گا؟"

سلیقہ، صابرہ بیگم، خیرالدین اور رضی الدین سب کے سب حیرانی سے اس پڑوسی کو دیکھ رہے تھے اور اس کی باتیں سن رہے تھے۔ واقعی انہوں نے یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک پیجوٹری غدود کے ذریعے بڑے سے بڑے بھیانک جرم کو بھی محبت سے ختم کیا جا سکتا ہے۔

پڑوسی نے اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا پیڈ نکال کر خیرالدین سے پوچھا۔ "جناب آپ کا نام؟"

"بابا خیرالدین۔"

"آپ کی بیگم کا نام۔؟"

"صابرہ بیگم۔"

وہ نام پوچھتا گیا۔ خیرالدین نام لکھواتا گیا۔ رضی الدین اور سلیقہ کا بھی نام لکھنے کے بعد پڑوسی نے اس کے نیچے دوسرے دن کی تاریخ لکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے اس میں کل دوپہر دو بجے کا وقت لکھا ہے۔ آپ اس وقت اپنے علاقے کے ہسپتال میں اپنے پورے خاندان کے ساتھ پہنچ جائیں۔ وہاں آپ سب کا طبی معائنہ ہوگا۔"

خیرالدین نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "ہمارے پاس پیجوٹری کارڈ موجود ہیں بھلا طبی معائنے کی کیا ضرورت ہے؟"

پڑوسی نے کہا۔ "ابھی میں نے آپ لوگوں کی باتوں سے اندازہ لگایا ہے کہ آپ لوگوں کے اندر پیجوٹری غدود کی کمی ہے۔ اس لیے آپ لوگوں نے مجھ سے گفتگو کے دوران کتنی ہی بار غم و غصے کا اظہار کیا ہے۔ حب الوطنی بیشک اچھی بات ہے۔ اس کے لیے جوش و جذبہ ہوتا ہے لیکن جب ہم محبت سے دشمنوں کو زیر کر سکتے ہیں تو جوش میں آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ سب کچھ اس لیے ہو رہا ہے کہ آپ لوگوں میں اس غدود کی کمی ہے۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم انشاءاللہ جو کمی ہوگی پیجوٹری ٹیکے لگا کر اس کو پورا کر دیں گے۔"

اس نے پیڈ میں سے اس ورق کو پھاڑ کر خیرالدین کی طرف بڑھا دیا۔ پھر اٹھتے ہوئے کہا۔ "آپ لوگ اداس ہو رہے ہیں۔ کل تک اس بات پر ذرا غور سے سوچیں کہ کن اجنبی لوگوں سے آپ کا کبھی رابطہ رہا ہے یا کہیں آپ کسی کے ہاں کھانے کے لیے گئے ہوں تو کھانے میں کچھ ملا کر آپ لوگوں کو دیا گیا ہو یا کسی ایسے ویسے ڈاکٹر سے آپ نے انجکشن لگوایا ہو یا اس سے کچھ دوائیں کھائی ہوں تو یہ پوری رپورٹ کل آپ دو بجے ہسپتال میں دیجئے گا تاکہ ہمیں دشمنوں تک پہنچنے میں کچھ مدد مل سکے۔ شکریہ!"

یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلا گیا۔ وہ چاروں تھوڑی دیر تک گم صم بیٹھے رہے اور ایک دوسرے کو خاموشی سے تکتے رہے۔ پھر رضی الدین جلدی سے اٹھ کر بیرونی دروازے کی طرف گیا۔ پھر اسے اندر سے بند کرنے کے بعد واپس آ گیا۔ صابرہ بیگم نے گھبرا کر کہا۔ "کل ہم معائنے کے لیے جائیں گے تو بری طرح پھنس جائیں گے۔ ہمارا بھید کھل جائے گا کہ ہمیں پیجوٹری ٹیکے نہیں لگائے گئے ہیں۔"

خیرالدین نے کہا۔ "تم خواہ مخواہ گھبرا رہی ہو۔ بھید کیسے کھلے گا۔ ایکسرے مشین کے ذریعے یہ معلوم ہو گا کہ ہمارے دماغوں میں پیجوٹری غدود نہیں ہیں تو یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ ہمارے دماغ میں کوئی منفی غدود ہے جس نے پیجوٹری غدود کو ختم کر دیا ہے۔"

رضی الدین نے کہا۔ "شاید آپ نے اس پڑوسی کی باتیں توجہ سے نہیں سنی ہیں۔ وہ کہہ رہا تھا کہ جس مردہ دماغ کی سرجری کی گئی تھی اس میں منفی غدود کے اجزا پائے گئے تھے۔ اگر ہمارے دماغ میں وہی منفی غدود کے اجزا نہ پائے گئے تو یہ کیسے ثابت ہوگا کہ ہمارے اندر کے پیجوٹری غدود کو کسی منفی غدود نے ختم کیا ہے۔؟"

خیرالدین نے کہا۔ "ہاں یہ بات بڑی تشویشناک ہے ہمیں فوراً ہی راحت عزیزی سے رابطہ قائم کر کے اسے موجودہ سچویشن کے متعلق بتانا ہوگا۔ ورنہ کل ہم بری طرح پھنس جائیں گے۔ وہی ہمیں یہاں سے نکال سکتا ہے۔"

کھانے کے بعد وہ لوگ ایک کمرے میں آئے۔ صابرہ بیگم جائے نماز پر بیٹھ گئیں۔ نماز پڑھنے کی جگہ تھی۔ اس کے اطراف خیرالدین اور رضی الدین بیٹھ گئے۔ سلیقہ بھی موجود تھی۔ پھر صابرہ بیگم نے اس جگہ ہاتھ بڑھایا جہاں سجدہ کیا جاتا تھا۔ اس جگہ جائے نماز کے نیچے ایک چھوٹا سا ٹرانسمیٹر رکھا ہوا تھا۔ اسے نکال کر وہ راحت عزیزی سے رابطہ قائم کرنے لگے۔

رابطہ قائم ہوتے ہی پہلے کوڈ ورڈز کا تبادلہ ہوا۔ پھر خیرالدین نے بتایا کہ ابھی ان پر کیا گزر رہی ہے اور کل دو بجے انہیں طبی معائنے کے لیے حاضر ہونا ہے اور طبی معائنہ کس قسم کا ہوگا یہ بھی بتایا گیا۔ ان کی باتیں سننے کے بعد راحت عزیزی نے پوچھا۔ "تمہارے اس

پڑوسی کا نام اور اس کے مکان کا نمبر کیا ہے اوور۔“

خیر الدین نے جواب دیا۔”ہم نے تو اس کا نام ہی نہیں پوچھا اور یہ بھی معلوم نہیں کیا کہ وہ ہمارے دائیں طرف رہنے والا پڑوسی ہے یا بائیں طرف۔ اوور۔“

”تم لوگ اگر ایسی ہی حماقتیں کرتے رہو گے تو ہم بُری طرح پھنس جائیں گے۔ تمہارے ساتھ ہم بھی ڈوب جائیں گے۔ تمہیں کتنی ٹریننگ دی گئی تھی کہ پاکستان پہنچتے ہی اپنے اندر صرف محبت کے جذبات رکھنے ہوں گے۔ کیا تم لوگ محبت سے اس کا نام نہیں پوچھ سکتے تھے۔ اس کا تعارف حاصل نہیں کر سکتے تھے کیا یہ کہ اس سے گفتگو کے دوران اپنے جوش اور جذبات اور انتقامی جذبوں کا بھی اظہار کر دیا کہ کس طرح قانون کے ذریعے مجرموں کو سزا ملنی چاہیے۔ تمہیں اتنی عقل تو ہونی چاہیے تھی کہ جہاں محبت سے سب کو راہِ راست پر لایا جاتا ہے وہاں سزا کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ محبت سے ہی مجرم راہِ راست پر آجاتے ہوں گے۔ کیا اتنی سی بات تم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ بہرحال تم لوگوں نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ آئندہ ایسی غلطیوں سے پرہیز کرو۔ اٹھتے بیٹھتے غور کرتے رہو کہ کس طرح ہر لمحہ اپنی طرف سے اپنے آس پاس والوں کے سامنے محبت کا اظہار کرتے رہو گے اور کسی کو شبہے میں مبتلا نہیں کرو گے۔ اب میں کل صبح تک تمہیں بتاؤں گا کہ ہم اس پڑوسی کے ساتھ کیا کریں گے۔ اوور۔“

خیر الدین نے کہا۔”اگر آپ حکم دیں تو ہم اس پڑوسی کو ٹھکانے لگا دیں اور اس کی وہ پرچی کہ ہمیں کل دو بجے ہسپتال پہنچنا ہے۔ پھاڑ کر پھینک دیں۔ اس طرح ہم طبی معائنے سے محروم رہیں گے۔ اوور۔“

”ایسی حماقت نہ کرنا۔ تم چاروں اس محلے میں اچھے، محبت کرنے والے شہریوں کی حیثیت سے رہو گے۔ یہ کام میں دوسروں سے کراؤں گا۔ ہمارے آدمی اس پڑوسی کو منفی غدود کا ٹیکہ لگائیں گے۔ جب اس کے اندر سے محبت کا جذبہ ختم ہوگا تو ہم اسے اس ملک کے خلاف بھڑکائیں گے اور اسے خریدنے کی کوشش کریں گے۔ اگر وہ راضی ہو گیا تو ہمارا آلہ کار بن جائے گا۔ اگر راضی نہ ہوا تو پھر ہم اسے ختم کر دیں گے۔ کل دوپہر کو تمہیں ہسپتال جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ بس اتنا کام کرو کہ فوراً ہی رضی الدین کو باہر بھیجو۔ وہ جا کر پڑوسی سے ملاقات کرے گا۔ اس کا نام معلوم کرے گا اور اس کے مکان کا نمبر دیکھ کر آئے گا۔ پھر ہم ان سے نمٹ لیں گے۔ اوور۔“

خیر الدین نے رضی الدین کو اشارہ کیا۔ وہ وہاں سے چلا گیا پھر ٹرانسمیٹر کے مائیک کو آن کرتے ہوئے کہا۔”میں ابھی ذرا سی دیر میں آپ کو اس پڑوسی کا نام اور اس کے مکان نمبر بتا دوں گا۔ اوور۔“

”ایک بات غور سے سنو۔ سرخ تنظیم والے تخریبی کارروائیوں میں ہم سے زیادہ تیزی دکھا رہے ہیں۔ وہ بھی منفی غدود کے ٹیکے اور کیپسول رکھتے ہیں۔ وہ ان کے ذریعے پچوٹری غدود کا خاتمہ کرتے جا رہے ہیں اور یہاں کے کتنے ہی لوگوں کو اپنا آلہ کار بناتے جا رہے ہیں۔ آج شام کو اسلام آباد سے ایک نوجوان جاوید رہبر یہاں آرہا تھا ہم اسے شکار کرنا چاہتے تھے۔ پتہ چلا کہ سرخ تنظیم والے پہلے ہی یہ چال چل چکے ہیں۔ یہاں جو جاوید رہبر پہنچا ہے وہ اصلی نہیں نقلی ہے۔ یہاں ہمارے آدمی اسے ایک کار میں گھیر کر لے جا رہے تھے لیکن وہ ان کی گرفت سے نکل بھاگا۔ ہمارے آدمی نے اس پر فائر کیا۔ یقیناً اسے گولی لگی ہوگی لیکن پھر بھی وہ ہاتھ سے نکل گیا۔ ہمارے آدمیوں کا بیان ہے کہ وہ اسی محلے میں کسی مکان میں جا کر چھپ گیا ہوگا اور چونکہ انہیں فرار ہونا تھا اس لیے وہ جاوید رہبر کو تلاش نہیں کر سکے۔“

ٹرانسمیٹر کے اسپیکر سے راحت عزیزی کی آواز ابھر رہی تھی اور سلیقہ حیرانی سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ٹرانسمیٹر کو دیکھ رہی تھی اور اس کی نگاہوں کے سامنے وہ زخمی نوجوان تکلیف سے کراہتا ہوا نظر آرہا تھا۔ اس کے بازو سے خون بہہ رہا تھا۔ کیا گولی اسی کو لگی تھی۔ کیا اسی کا نام جاوید رہبر ہے۔ ہاں اسی لیے تو وہ اس کے کمرے میں آکر چھپ گیا تھا۔ سلیقہ پھر توجہ سے ٹرانسمیٹر کی طرف دیکھ کر راحت عزیزی کی باتیں سننے لگی۔ وہ خیر الدین سے کہہ رہا تھا۔”اس نوجوان جاوید رہبر کی رہائش کا پتہ ہمیں معلوم کرنا ہے۔ کیونکہ ہمارا ایک جوان جاوید رہبر کا رول ادا کرنے والا تھا۔ اس لیے ہم نے اس سلسلے میں تمام معلومات حاصل کی تھیں۔ وہ تمہارے ہی محلے میں آیا ہوا ہے۔ تمہارے مکان کا نمبر ب۔۲۴ ہے اور جاوید رہبر کے مکان کا نمبر ب۔۷ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمہارے ہی بلاک میں رہتا ہے۔ یہ اچھا ہوا کہ وہ ہمارے ہاتھوں سے بچ گیا۔ اب ہم نے اس کی سرخ تنظیم کو اس کے ہاتھوں نقصان پہنچانے کی ایک تدبیر سوچی ہے جب سرخ تنظیم کو اس کے ذریعے نقصان پہنچے گا تو وہ لوگ خود ہی اپنے اس آلہ کار کو ختم کر دیں گے۔“

سلیقہ نے بے اختیار اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ اس کا دل سہمے ہوئے انداز میں دھڑک دھڑک کر پوچھ رہا تھا۔ کیا وہ مارا جائے گا۔

ٹرانسمیٹر سے راحت عزیزی کی آواز آرہی تھی۔”خیر الدین۔ تم غور سے میری پلاننگ کو سنو اور ابھی اس پر عمل کرو۔ سلیقہ اس کوارٹر نمبر ب۔۷ میں جائے گی اور جاوید رہبر کو اپنی محبت کے جال میں پھانسنے کی کوشش کرے گی۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ وہ سلیقہ کے حسن کا اسیر ہو جائے گا۔“

سلیقہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ بند آنکھوں کے پیچھے اس نے دیکھا کہ اس کی زلفیں زنجیر بنتی جا رہی ہیں اور جاوید رہبر کو اسیر کرتی جا رہی ہیں ہائے یہ کیا ہو رہا ہے۔ کیا پھر اس سے سامنا ہونے

والا ہے۔ یہ تقدیر کیا کہتی ہے میری تقدیر نہیں' کالی تنظیم مجھ سے کیا کام لینا چاہتی ہے۔

اس نے پھر آنکھیں کھول کر ٹرانسمیٹر کی طرف دیکھا۔ کالی تنظیم کا لیڈر راحت عزیزی سے کہہ رہا تھا: "جو نوجوان جاوید رہبر بن کر کوارٹر نمبر ب۔ ۶ میں آیا ہے اسے اب اس بات کا ڈر لگا ہوگا کہ ہم کل اسے ایک انجینئر کی حیثیت سے اس کے دفتر میں حاضر ہونے کا موقع نہیں دیں گے۔ اس کے خلاف یہ ثبوت پہنچا دیں گے کہ یہ جاوید رہبر نہیں ہے۔ وہ اپنے بچاؤ کے لیے صبح ہونے سے پہلے اپنے کوارٹر نمبر ب۔ ۶ کو چھوڑ کر جا سکتا ہے۔ کہیں روپوش ہو سکتا ہے۔ اس سے پہلے تم سلیقہ کو وہاں بھیج دو۔ وہ اسے اپنی باتوں سے' اپنی اداؤں سے بہلا پھسلا کر تمہارے ہاں لائے گی۔ تم لوگوں سے تعارف کرائے گی۔ ہم ابھی دو چار گھنٹے کے اندر تمہارے پاس ایک ایسا آدمی بھیج رہے ہیں جس کے پاس بیجو ٹڑی ٹیکے ہوں گے جب جاوید رہبر تمہارے پاس پہنچے گا تو تم اور رضی الدین اسے قابو میں کر لینا اگر وہ زیادہ طاقتور ہو اور قابو میں آنے والا نظر نہ آئے تو اسے کھانے میں کوئی نیند کی بے ہوشی کی دوا کھلا دینا۔ یہ دوا بھی تمہارے پاس بھیج دی جائے گی۔ بہر حال جب وہ بے ہوش ہو جائے گا تو اسے بیجو ٹڑی ٹیکہ لگا دیا جائے گا۔ اس ٹیکے کے اثر سے اس کے دل اور دماغ میں صرف محبت ہی محبت ہو گی۔ وہ پاکستان کے خلاف پھر کچھ سننا یا کرنا گوارا نہیں کرے گا بلکہ سرخ تنظیم کے جتنے بھی دشمن اس کی نظروں میں ہوں گے ان سب کی وہ نشاندہی کرتا جائے گا۔ اس طرح نشاندہی کرنے کے دوران ہو سکتا ہے کہ اپنے آدمیوں کے ذریعے مارا جائے۔ بہر حال ہمارا مقصد پورا ہو جائے گا سرخ تنظیم کے بہت سے لوگ ہماری اور یہاں کی حکومت کی نظروں میں آ جائیں گے اور ان کے مقابلے میں ہمیں کامیابی نصیب ہو گی۔"

وہ گم صم بیٹھی ہوئی تھی۔ اب اسے ٹرانسمیٹر سے راحت عزیزی کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کے کانوں میں جاوید رہبر کی باتیں بھری ہوئی تھیں۔ آنکھوں کے سامنے اس کا چہرہ تھا اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس دوران رضی الدین نے آ کر اپنے پڑوسی کا نام اور پتہ بتایا تھا جو راحت عزیزی تک پہنچا دیا گیا تھا۔ ٹرانسمیٹر سے ہونے والی گفتگو بھی ختم ہو گئی تھی۔ پھر خیر الدین کی آواز نے سلیقہ بیگم کو چونکا دیا: "تم کیا سوچ رہی ہو؟"

ایں۔ اس کے سامنے سے جاوید رہبر کا چہرہ گم ہو گیا۔ خیر الدین' صابرہ بیگم اور رضی الدین کے خبیث چہرے دکھائی دینے لگے۔ وہ جلدی سے سنبھل کر بولی: "میں... میں اس جاوید رہبر کے بارے میں سوچ رہی ہوں کہ اسے کس طرح پھانس کر یہاں لانا چاہیے؟"

"اس میں سوچنا کیا ہے۔ تم اس کے کوارٹر کی طرف جاؤ اور اس کے دروازے پر دستک دے کر اس سے باتیں کرو۔ اسے بتاؤ کہ تم اپنے

ماں باپ اور بھائی کے ساتھ لاہور سے یہاں پہلی بار آئی ہو اور ابھی مارکیٹ کی طرف گئی تھیں واپسی میں، اپنا مکان بھول گئی ہو۔ اپنے مکان کا نمبر بتا دینا اور یہ کہنا کہ وہ تمہیں یہاں تک لا کر پہنچا دے۔ بس اس بات کا خیال رکھنا کہ کچھ دیر اس کے ساتھ تم وقت گزار سکو تاکہ وہ پوری طرح تمہاری گرفت میں رہے اور اس وقت تک ہمارے پاس بچو بڑی ٹیکے لگانے والا پہنچ جائے۔"

پندرہ منٹ کے بعد وہ اپنے مکان نمبر ب۔ ۲۴ سے نکلی اور مکان نمبر ب۔ ۷ کی طرف جانے لگی۔ رات کے گیارہ بجے تھے۔ گلیاں قمقموں سے روشن تھیں۔ دور دور تک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہاں عورتیں رات کو کسی وقت بھی دور دور تک تنہا جا سکتی تھیں۔ کوئی چھیڑنے والا نہیں تھا۔ ہاں محبت سے پوچھنے والے بہت تھے کہ بہن رات کو تنہا کہاں جا رہی ہو۔ آؤ چلو ہم تمہیں وہاں تک پہنچا دیں۔ جہاں تک جانا ہوتا وہاں تک ساتھ دینے والے بہت مل سکتے تھے مگر عزت محفوظ رہتی تھی۔ کسی قسم کا دھڑکا نہیں لگا رہتا تھا کہ کوئی اٹھا کر لے جائے گا۔ اسی لیے اب پردے کا رواج بھی نہیں رہا تھا۔ کوئی عورت نہ تو چادر لپیٹتی تھی۔ نہ برقعے میں چھپتی تھی کیونکہ مرد کی آنکھوں میں محبت کی شرم تھی۔ جب وہاں کوئی چھیڑتا ہی نہیں تھا تو پھر عورت کس کے ڈر سے برقعہ پہنتی۔

سلیقہ ڈر رہی تھی۔ محبت اگر اپنے محبوب سے ملاتی ہے تو ڈراتی بھی ہے کہ جانے ملن کی گھڑیوں میں کیا ہونے والا ہے۔ وہ اس مکان کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ آس پاس تو ویسے ہی سناٹا تھا۔ مکان کے اندر بھی ایسی خاموشی تھی جیسے وہاں کوئی موجود نہ ہو۔ وہ برآمدے میں آئی۔ پھر دھڑکتے ہوئے دل سے دروازے پر دستک دی۔ کھٹ کھٹ کھٹ دستک کی آواز خود اسے یوں لگی جیسے دھک دھک دھک دل دھڑک رہا ہو۔

اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے دوبارہ دستک دی۔ پھر انتظار کرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد دروازے کے دوسری طرف سے بہت ہی دھیمی سی آواز سنائی دی۔ وہ بڑی رازداری سے پوچھ رہا تھا "کون ہے؟"

پہلے تو وہ ہچکچائی۔ پھر لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے بولی "م۔۔ میں۔ مَیں ہوں۔"

"یہ میں مَیں کا مطلب کیا ہوا۔ اگر یہ نام ہے تو میں کسی میں مَیں نام کی لڑکی کو نہیں جانتا ہوں۔"

سلیقہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اپنا تعارف کیسے کرائے۔ وہ بولی۔ "جی میں وہی ہوں۔"

بند دروازے کے پیچھے سے آواز آئی "میں اس آواز کو تو اب لاکھوں میں پہچان سکتا ہوں۔ اس آواز نے تو میرے دل کا سکون اور میرے سوچنے کی قوت چھین لی ہے۔ میں پھر بھی اپنے یقین کے لیے نام پوچھ رہا ہوں۔ نام بتا دو تو دروازہ کھولوں گا۔"

"جی میرا نام سلیقہ ہے۔"

یہ سنتے ہی دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا۔ پیشتر اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتی رہبر نے اس کے بازو کو پکڑ کر اندر کھینچ لیا اور ایسا کرتے ہی دروازے کو دوبارہ بند کر کے اندر سے چٹخنی چڑھا دی۔ ایک ساعت کے لیے جیسے سلیقہ کی سانس رک گئی تھی۔ اس کے چاروں طرف تاریکی تھی۔ اس کا بازو رہبر کی مضبوط گرفت میں تھا۔ وہ ایسی گرفت تھی جو عورت کو ایک انجانی خوشی کے خیال سے ڈراتی ہے۔ وہ گرفت ایسی تھی کہ اس کے بعد سلیقہ اندھیرے میں بھی ایک دنیا دیکھ رہی تھی۔ ایسی دنیا جو اس کے اور رہبر کے لیے بنی تھی۔ جہاں نفرت کا عذاب نہیں تھا۔ حرص و ہوس کی غلاظت نہیں تھی۔ صرف محبت ہی محبت تھی۔

اندھیرے میں اس کی بھاری بھرکم سی سرگوشی سنائی دی "میں جانتا تھا تم آؤ گی۔ محبت سے نہ سہی۔ اس ڈر سے آؤ گی کہ میں نے تمہاری اصلیت سمجھ لی ہے۔ تم اصلی سلیقہ نہیں ہو وہ کوئی اور ہو گی اور تم کوئی اور ہو۔"

تاریکی میں مترنم سی سرگوشی ابھری "وہ جاوید رہبر کوئی اور ہو گا تم کوئی اور ہو۔ تم نے محبت کا ٹیکا نہیں لگایا ہے۔ پھر بھی تمہیں میرا انتظار تھا۔ میں نے بھی محبت کے کیپسول نہیں کھائے۔ پھر بھی یہاں چلی آئی۔"

"اچھا تو تمہیں میرا نام معلوم ہو گیا ہے۔"

"مجھے جاوید رہبر کا نام معلوم ہوا ہے۔ جو شاید اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ کیا تم نے اسے قتل کر دیا ہے؟"

"نہیں سلیقہ، میں قاتل نہیں ہوں۔ میں اس ملک میں کسی کو جانی نقصان پہنچانے کے لیے نہیں، صرف نفرت اور بیزاری پھیلانے کے لیے آیا ہوں۔ اس کے عوض سرخ تنظیم والے مجھے بھاری معاوضہ دیں گے ایک بڑے ملک کے بینک میں میرے نام لاکھوں کا بینک بیلنس ہو گا۔ ایک شاندار بنگلہ اور ایک نئے ماڈل کی کار مجھے ملے گی۔ جب میں یہاں سے کامیاب ہو کر لوٹوں گا تو وہاں مجھے کوئی سرکاری عہدہ دیا جائے گا۔ تم اپنی بات بتاؤ۔"

"میں کالی تنظیم سے تعلق رکھتی ہوں۔ میرا مستقبل بھی بہت شاندار ہو گا۔ جب میں یہاں سے کامیاب ہو کر جاؤں گی تو میرا بینک بیلنس بھی اتنا ہو گا کہ میں ساری زندگی عیش و آرام سے گزار سکوں گی۔۔۔ مگر تم یہاں سے زندہ واپس نہیں جا سکو گے۔"

وہ بولا "ہاں کالی تنظیم کے لوگ سرخ تنظیم والوں کو دھمکی دیتے ہیں اور سرخ تنظیم والے کالی تنظیم والوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ یعنی ان دونوں کے ذریعے صرف پاکستانیوں کو نقصان نہیں پہنچ رہا ہے۔ بلکہ ان دونوں تنظیموں کو بھی نقصان پہنچ رہا ہے۔ کتنے ہی لوگ ہماری طرح سنہرے خواب دیکھ کر یہاں تخریب کاری کے

لیے آتے ہیں اور یہیں مر جاتے ہیں۔ انہیں واپس جانا نصیب نہیں ہوتا۔"

سلیقہ نے کہا "ہماری واپسی بھی نہیں ہوگی۔"

اس بار رہبر نے آہستگی سے کہا "ہم تم ایک ہو جائیں تو یہاں سے کامیابی کے ساتھ واپس جا سکیں گے۔"

"نہیں، رہبر تم نہیں جانتے۔ تمہارے خلاف چاروں طرف جال بچھایا جا رہا ہے۔ ایسی چال چلی جا رہی ہے کہ تمہیں تمہاری ہی تنظیم والوں کی نظروں سے گرایا جائے گا اور وہ لوگ تمہیں قتل کر دیں گے۔"

وہ بولا "میں تمہارے آنے سے پہلے اندھیرے میں بیٹھ کر یہی سوچ رہا تھا کہ اب میں جاوید رہبر کا رول ادا نہیں کر سکوں گا کیونکہ کالی تنظیم والوں کو میری اصلیت معلوم ہو گئی ہے۔ کل جب میں انجینئر کی حیثیت سے اپنے دفتر پہنچوں گا تو میرا بھید کھل چکا ہوگا اور اگر کل میں اپنی ڈیوٹی کا چارج نہیں لوں گا تو میری سرخ تنظیم والوں کو معلوم ہو جائے گا کہ کالی تنظیم والوں کی نظروں میں میرا بھید کھل چکا ہے۔ پھر یہ سرخ تنظیم والے بھی میرے دشمن بن جائیں گے کیونکہ یہ دونوں تنظیمیں اپنے ان آلہ کاروں کو زندہ نہیں چھوڑتی ہیں جو کسی مخالف تنظیم کی نظروں میں آ جائیں یا حکومت کے سامنے ان کا بھید کھل جائے۔"

سلیقہ نے کہا "ہاں ایسے بھی تمہاری مصیبت ہے اور ویسے بھی تمہارے خلاف چال چلی جا رہی ہے۔ ہمارے آدمی تمہیں گھیر کر بچوڑی ٹیکہ لگانا چاہتے ہیں تاکہ تمہارے اندر صرف محبت کے جذبات ہوں اور تم اس جذبے کے زیر اثر اپنی سرخ تنظیم والوں کو یہاں کی حکومت کے سامنے ظاہر کر دو۔ اس طرح سرخ تنظیم والے اور بھی تمہاری جان کے دشمن ہو جائیں گے۔"

"سلیقہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم اپنے ہی لوگوں کی سازشوں سے مجھے آگاہ کرنے آئی ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم مجھے دل و جان سے چاہتی ہو۔ تمہارے دل اور دماغ میں بھی وہی محبت کا جذبہ ہے جو میرے اندر ہے۔ ہم یہاں نفرت کا بیج بونے آئے تھے اور محبت کرنے لگے ہیں۔"

چند لمحوں تک خاموشی رہی۔ پھر سلیقہ نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا "ہاں اب میں سوچتی ہوں کہ جو کرنے آئی ہوں۔ بُرا کرنے آئی ہوں۔ محبت جہنم میں نہیں کی جاتی۔ جنت میں کی جاتی ہے محبت کے لیے لازمی ہے کہ ہمارے آس پاس رنگا رنگ پھول کھلے ہوں۔ ہم جدھر سانس لیں۔ ادھر خوشبو ہی خوشبو ہو۔ چاروں طرف کی فضا صاف دھلی دھلائی اور اجلی اجلی سی ہو۔ اگر یہ سب کچھ پاکستان میں موجود ہے تو ہم اس فضا کو آلودہ کیوں کریں۔"

"ہاں کیوں کریں۔ ہمارے اجداد نے یہ ملک بنایا تھا۔ ہم بیرونی ملکوں میں رہ کر صرف پاکستان کا نام سنتے تھے۔ اور بڑے بڑے ملکوں میں رہ کر پاکستان کو ایک حقیر سا ملک سمجھتے تھے۔ یہاں آ کر معلوم ہوا کہ یہ محض ایک ملک نہیں، ماں کی گود ہے جسے بیرونی آیا کی گود نے ہم سے چھین لیا تھا۔"

سلیقہ نے اندھیرے میں اسے ٹٹولتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیئے۔ پھر کہا "یہاں آ کر معلوم ہوا کہ پاکستان کا دوسرا نام رہبر ہے۔ اگر رہبر سلامت رہے گا تو پاکستان سلامت رہے گا۔ میں تمہاری سلامتی کے لیے اپنوں سے منہ موڑ کر دنیا چھوڑ کر آئی ہوں۔"

"ہم اس ملک سے فرار ہو کر باہر نہیں جا سکتے۔ بیرونی طاقتیں ہمیں کچل ڈالیں گی۔ میری اور تمہاری سلامتی اسی میں ہے کہ ہم اس زمین کو زندہ اور پائندہ رکھیں۔"

وہ بولی "پاکستان ہماری پناہ گاہ ہے۔ پہلے ہمیں اپنی پناہ گاہ کو دشمنوں سے بچانا ہوگا تبھی ہم باقی رہ سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ چلو ہم حکومت سے رابطہ قائم کریں اور ہماری نظروں میں جو بھی دشمن یہاں موجود ہیں ان کی نشاندہی کر دیں چاہے اس میں ہماری جان بھی چلی جائے۔"

"کوئی بات نہیں، محبت میں اپنی جان کی پروا نہیں کی جاتی۔ یہ دیکھا جاتا ہے کہ ہمارے بعد دوسرے محبت کرنے والوں کے لیے یہ زمین ہموار رہے۔"

دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھوں کو مضبوطی اور محبت سے تھام لیا۔ پھر رہبر نے کہا "تم کتنی اچھی ہو۔"

"ہم دونوں اچھے ہیں۔ اس لیے کہ اچھائی کو پا لیا ہے۔"

"سلیقہ، ہم نے بچوڑی ٹیکے نہیں لگائے اس کے باوجود ہم محبت کی کتنی گہرائیوں میں پہنچ گئے ہیں۔ ایک دوسرے کے لیے کام آنے کا جذبہ ہے اور اپنے ملک کے لیے بھی دشمنوں سے ٹکرانے کا حوصلہ پیدا ہو گیا ہے۔ اگر ہم ابھی کسی ہسپتال میں جا کر یہ اعتراف کر لیں کہ ہم نے بچوڑی ٹیکے نہیں لگائے ہیں اور ابھی یہ ٹیکے لگائے جائیں تو ہم محبت کی معراج کو پا لیں گے۔ یہ ٹیکے لگانے کے بعد ہمیں ایک دوسرے سے اور اپنے وطن سے جو شدید محبت ہوگی وہ موجودہ محبت سے زیادہ مستحکم اور پائیدار ہوگی۔"

"یہ تو ٹھیک ہے لیکن میں اپنا بچوڑی کارڈ اور شناختی کارڈ وغیرہ لے کر نہیں آئی ہوں۔ تمہارے ساتھ ہسپتال کیسے جاؤں گی۔"

رہبر نے کہا "اس کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ جب تم سلیقہ نہیں ہو اور میں جاوید رہبر نہیں ہوں تو ہمیں شناختی کارڈ سے کیا لینا ہے۔ جب ہم نے ٹیکے نہیں لگائے ہیں تو بچوڑی کارڈ لے جا کر

کیا کریں گے۔ ہم تو صاف اور سیدھی بات کہیں گے کہ ہم اپنے جرم کا
اعتراف کرنے آئے ہیں۔ جب وہ خود ہی دیکھیں گے کہ ہم مجرمانہ
زندگی گزارنے کے لیے پاکستان آئے تھے تو وہ ہمیں ٹیکے لگائیں
گے تاکہ ہم راہ راست پر آجائیں ویسے تو ہم راہ راست پر آہی چکے
ہیں۔"

اس نے پلٹ کر دروازے کی چٹخنی نیچے کی۔ پھر ایک پٹ
کھول کر باہر کی طرف دیکھا۔ باہر رات کا سناٹا تھا۔ دور دور تک
کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ لوگ اس وقت آرام سے گہری نیند سوتے
تھے۔ پاکستان میں دن کام کے لیے تھا اور رات آرام کے لیے تھی۔
صرف کچھ لوگ، جو ضرورت سے مجبور ہوتے تھے وہی رات کو
گھر سے نکلتے تھے۔

وہ پلٹ کر سلیقہ سے بولا "یوں تو باہر کوئی نظر نہیں آرہا
ہے لیکن میرے دشمن ضرور کہیں چھپے بیٹھے ہوں گے۔"

سلیقہ نے آگے بڑھ کر کہا "نہیں رہبر! میں سمجھتی ہوں
کہ ابھی ہماری کالی تنظیم کا کوئی فرد تمہیں نقصان نہیں پہنچائے گا۔
کیونکہ ہمارے لیڈر راحت عزیزی نے اپنی پلاننگ بدل دی
ہے۔ وہ تمہیں پیچوتڑی ٹیکے لگا کر سامنے لانا چاہتے ہیں۔ اس لیے
ابھی تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ یہی موقع ہے۔ ہم یہاں
سے نکل چلیں۔"

رہبر اس کی باتوں کا قائل ہو گیا۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر آیا۔
دروازے کو بند کیا۔ اس کے بعد وہ اپنی گلی سے گزرتے ہوئے
ایک کشادہ سڑک پر آگئے۔ سڑک کے اطراف دکانوں کے دروازے
بند تھے لیکن ان پر تالے نظر نہیں آرہے تھے۔ گھر ہو یا دکانیں
ہوں کوئی اپنے دروازے پر تالے نہیں لگاتا تھا۔ لوگ صرف
دروازوں کو اس لیے بند کرتے تھے کہ کوئی جانور اندر نہ گھس آئے۔
ویسے انسان تو ایسا جانور ہے جو تالے توڑ کر بھی گھس آتا ہے اس
لیے تالے بے مصرف ہو گئے تھے۔

وہ دونوں سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر چلتے جا رہے
تھے۔ اور محتاط انداز میں دائیں بائیں اور آگے پیچھے بھی دیکھتے جا
رہے تھے۔ رہبر نے پوچھا "تمہارا اصلی نام کیا ہے۔۔؟"

"میرا نام لیلیٰ ہے لیکن میرے اپنے مجھے للی کہہ کر پکارتے ہیں
اور تمہارا نام۔۔؟"

"میرا نام محمد یوسف ہے مگر مجھے تمہارا یہی نام سلیقہ پسند
ہے۔ اس نام سے مجھے تمہاری محبت ملی ہے۔"

"سچ پوچھو تو مجھے بھی تمہارے موجودہ نام رہبر سے محبت ہے۔
تم جاوید رہبر کا رول ادا کرنے آئے تو مجھ سے ملاقات ہوئی۔ ملاقات
ہوئی تو محبت ہوئی۔ پتہ نہیں وہ بے چارہ جاوید رہبر کون ہوگا
جو مارا گیا مگر مرتے مرتے ہمارے دلوں میں محبت کے چراغ روشن
کر گیا۔"

وہ اس علاقے کے ہسپتال میں پہنچ گئے۔ وہاں مریض برائے
نام تھے کیونکہ پوری قوم ایک صحت مند زندگی گزار رہی تھی۔ لوگ اگر
بیمار پڑتے بھی تھے تو جلد ہی صحت یاب ہو جاتے تھے کیونکہ ان کو
بیماری کے ساتھ کسی قسم کی فکر نہیں ہوتی تھی۔ روٹی کپڑے کی مکان
کی اور دوسری ضروریات زندگی کی فکر انہیں آدھا بیمار بنا کر رکھ دیتی
تھی۔ اب ایسی باتیں نہیں تھیں۔ پھر بھی وہاں رات کو ڈاکٹر ڈیوٹی
پر موجود رہتے تھے۔

ایک ڈاکٹر نے بڑی خوشدلی سے ان کا استقبال کیا "آیئے،
تشریف لایئے۔ میں آپ دونوں کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔۔؟"

رہبر نے کہا "ہم یہاں جھوٹ سے توبہ کر کے سچ بولنے آئے
ہیں اور ہم پیچوتڑی ٹیکا لگانا چاہتے ہیں۔"

ڈاکٹر نے ہنستے ہوئے کہا "جب آپ نے جھوٹ سے توبہ
کر لی ہے اور سچ بولنے آئے ہیں تو پھر پیچوتڑی ٹیکا لگانے کا کیا مطلب
ہوا۔ بھئی آپ کے دماغوں میں پیچوتڑی غدود کافی مقدار میں موجود
ہیں اسی لیے تو آپ سچ بولنے آئے ہیں۔"

سلیقہ نے کہا "لیکن ڈاکٹر ہم نے کبھی پیچوتڑی ٹیکے نہیں لگائے۔"

ڈاکٹر نے کہا "آپ دونوں اپنے پیچوتڑی کارڈ بتائیں۔ میں
دیکھ لیتا ہوں۔" رہبر نے کہا "یہی تو بات ہے۔ ہم بیرونی ممالک سے آتے
ہیں اور یہاں آکر ہم نے ٹیکے نہیں لگائے بلکہ حکومت کو اور عوام کو
دھوکا دینے کے لیے دوسروں کے شناختی کارڈ سے یہاں زندگی گزارنے
کا ارادہ کیا تھا کیونکہ اب ہم کسی کو دھوکا نہیں دینا چاہتے۔ اس لیے
اپنے جھوٹ اور فریب کا اعتراف کرنے آئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب! آپ
ہمارا طبی معائنہ کر کے ہمارے جھوٹ اور سچ کو سمجھ سکتے ہیں۔ اگر آپ
کے پاس ابھی وقت نہ ہو تو کوئی دوسرا وقت مقرر کر دیں۔ ہم اس
وقت آکر معائنے کے لیے حاضر ہو جائیں گے۔"

ڈاکٹر نے کہا "ہمارے پاکستان میں آج کا کام کل پر نہیں
ٹالا جاتا وہ وقت گزر گیا جب سرکاری محکموں کے افسران آنے
والوں کو یہ کہہ کر ٹال دیتے تھے کہ ایک ہفتے بعد آؤ یا ایک ماہ
بعد آؤ۔ پھر تمہارا کام ہوگا۔ اب تو جس وقت جو آتا ہے اسی وقت
ہم محبت سے اس کا کام کر دیتے ہیں۔ اسے مایوس لوٹتے وقت
ہمارا دل دکھتا ہے۔ اس لیے ابھی تم لوگوں کا معائنہ ہو جائے گا۔" یہ
کہہ کر اس نے ایک کاغذ پر کچھ لکھا۔ پھر اس کاغذ کو رہبر کی طرف
بڑھاتے ہوئے کہا "یہاں کوریڈور سے آپ آخری کمرے میں
چلے جائیں۔ وہاں ڈاکٹر زیدی ہیں۔ آپ انہیں یہ پرچی دیں۔ ابھی
آپ دونوں کا معائنہ ہو جائے گا۔"

وہ دونوں اس کمرے سے نکل کر کوریڈور میں آئے۔ رہبر نے اس پرچی کو پڑھا۔ اس پر لکھا تھا۔ "ڈاکٹر زیدی! حامل رقعہ اور اس کی ساتھی کا پیچوٹری معائنہ کریں اور ان کے لیے نئے پیچوٹری کارڈ بنا دیں۔ شکریہ!"

وہ اس کوریڈور کے آخری کمرے میں پہنچے۔ وہاں ڈاکٹر زیدی نے اسی طرح خوشدلی سے ان کا استقبال کیا۔ پھر پرچی پڑھنے کے بعد انہیں ایک ایسے کمرے میں لے گیا جہاں جدید قسم کی ایکسرے مشینیں تھیں۔ وہاں باری باری رہبر کو اور سلیقہ کو ایک اسکرین کے پیچھے کھڑا کیا گیا اور ایکسرے کے ذریعے ان کا معائنہ کیا گیا۔ بیس منٹ کے بعد وہ دونوں پھر ڈاکٹر زیدی کے کمرے میں تھے۔ ڈاکٹر نے پیچوٹری کارڈ کی خانہ پُری کرتے ہوئے کہا۔ "تم دونوں کے دماغوں میں پیچوٹری غدود کافی مقدار میں ہیں۔ تمہیں ٹیکے اور کیپسول کی ضرورت نہیں ہے۔"

سلیقہ اور رہبر نے ایک دوسرے کو حیرانی سے دیکھا۔ پھر رہبر نے کہا۔ "لیکن ڈاکٹر! ہم نے تو کبھی پیچوٹری ٹیکے نہیں لگائے نہ ہی کیپسول کھائے ہیں۔ پھر ہمارے دماغوں میں یہ غدود کافی مقدار میں کیسے ہو گئے؟"

ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔ "جب یہ غدود دریافت نہیں ہوئے تھے۔ جب ٹیکے اور کیپسول ایجاد نہیں ہوئے تھے۔ کیا اس سے پہلے انسانوں کے دماغ میں محبت کے غدود نہیں تھے۔ نہیں۔ مسٹر تھے لیکن کسی میں کم اور کسی میں زیادہ تھے۔ لیکن اب یہ محبت کے غدود عام ہو گئے ہیں۔ جن کے پاس نہیں تھے ان کے پاس بھی ٹیکے اور کیپسول کے ذریعے پہنچا دیئے گئے ہیں۔ ان کی بات تو بالکل الگ ہے جن کے دماغوں میں قدرتی طور پر بھی غدود کافی مقدار میں موجود ہوتے ہیں جیسے تم دونوں کے دماغوں میں ہیں۔ چلو، اب اپنے اپنے کارڈ میں اپنا اپنا نام لکھواؤ۔ ہاں تو پہلے تم بتاؤ کیا نام ہے تمہارا؟" اس نے سلیقہ سے پوچھا۔

سلیقہ نے رہبر کی طرف دیکھا۔ رہبر نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! ہم نے ابھی یوں سمجھیے کہ نیا جنم لیا ہے۔ ہم ایک نئی زندگی کی ابتدا کر رہے ہیں۔ پہلے میرا نام محمد یوسف اور اس کا نام لبنیٰ تھا۔ اب میرا جاوید رہبر اور اس کا نام سلیقہ ہے۔"

ڈاکٹر زیدی نے کارڈ پر لکھتے ہوئے کہا۔ "اچھا تو تمہارا نام ہوا محمد یوسف عرف رہبر اور تمہارا نام لبنیٰ عرف سلیقہ۔ اب اپنا پتہ ٹھکانہ بتاؤ۔"

رہبر نے کہا۔ "ہم ناظم آباد کے بی۔ ۷ اور بی۔ ۴۲ میں بستے تھے لیکن اب ہم حکومت کو فریب نہیں دیں گے۔ حکومت کے ذمہ دار افسران کے سامنے خود کو مجرم کی حیثیت سے پیش کریں گے اور دوسرے مجرموں کی نشاندہی بھی کریں گے۔"

ڈاکٹر زیدی نے تھوڑی دیر تک ان دونوں کو دیکھتے ہوئے کچھ سوچا۔ پھر کہا۔ "ٹھیک ہے میں محتسبِ اعلیٰ کے نام ایک رقعہ لکھ دیتا ہوں۔ تم ان سے ملو۔ وہ تمہارا بیان قلمبند کریں گے۔ پھر تمہاری مدد سے دوسرے مجرموں تک پہنچیں گے اور انہیں محبت سے حراست میں لے کر پیچوٹری ٹیکے لگا دیں گے۔"

❋

ایک بڑی سی میز کے اطراف کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سرخ تنظیم اور کالی تنظیم کے لیڈر بھی موجود تھے۔ کالی تنظیم کے لیڈر راحت عزیزی نے سرخ تنظیم کے لیڈر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "مسٹر فرید! ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اگر ہم اسی طرح آپس میں لڑتے جھگڑتے رہے تو اس ملک میں کامیابی کے ساتھ تخریبی کارروائیاں نہیں کر سکیں گے۔ اس ملک سے زیادہ ہم دونوں کی تنظیموں کو نقصان پہنچے گا۔"

کامریڈ فرید نے کہا۔ "بیشک ہمارا مقصد ایک ہے۔ پہلے

سزائے موت کے دو واقعات ایسے ہوئے ہیں جو ہمیشہ خصوصی دلچسپی اور توجہ کے ساتھ سنے اور سنائے جاتے رہیں گے۔ پہلا واقعہ سڈنی میں پیش آیا۔ جہاں سیموئل نام کے ایک شخص کو تین مرتبہ پھانسی پر چڑھانے کی کوشش کی گئی۔ دو مرتبہ وہ رسی ٹوٹ گئی جس سے سیموئل کو لٹکایا جاتا تھا اور تیسری مرتبہ سیموئل گھنٹوں آرام سے رسی سے لٹکا رہا۔ یہاں تک کہ وہاں موجود لوگ اس کی موت کا انتظار کرتے کرتے بور ہو گئے۔ ان مسلسل ناکامیوں کے بعد بالآخر حکومت کی طرف سے اسے رہا کر دیا گیا۔

دوسرا واقعہ انگلینڈ میں پیش آیا۔ جہاں جان لی نام کے ایک شخص کو ایکسیٹر کی جیل میں تین بار پھانسی پر لٹکایا گیا اور تینوں مرتبہ اس کے پاؤں کے نیچے والے تختے نہ کھل سکے۔

بالآخر ہوم سیکریٹری نے جان لی کی سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کر دیا۔ پھر اگلے ہی سال اسے باعزت طور پر رہا کر دیا گیا۔ رہائی کے فوراً بعد جان لی امریکہ منتقل ہو گیا۔

ہم اس ملک کو کھوکھلا کرنا چاہتے ہیں۔ جب تک اسے کمزور نہیں بنائیں گے۔ اس وقت تک ہم یہاں اپنی مرضی کی حکومت قائم نہیں کرسکیں گے۔ اب اپنی مرضی کی حکومت ہم قائم کریں گے یا تم قائم کروگے۔ اس کا فیصلہ اس وقت ہوگا جب یہ ملک کمزور اور ہمارا محتاج ہوجائے گا۔ ابھی تو ہم یہ طے کرلیں کہ ہم ایک دوسرے کے آدمیوں کو نقصان نہیں پہنچائیں گے۔"

راحت عزیزی نے کہا: "میں وعدہ کرتا ہوں کہ کبھی تمہارے راستے کی رکاوٹ نہیں بنوں گا اور نہ ہی تمہارے آدمیوں کو نقصان پہنچاؤں گا۔"

کامریڈ فرید نے کہا: "میرا بھی یہی وعدہ ہے۔ دیکھو ہم نے یہاں دور دور تک عوام میں نفرت اور بیزاری پھیلانے کے لئے دو اہم محکموں کا انتخاب کیا ہے۔ ایک تو پولیس والوں کا محکمہ ہے۔ ہم ایماندار پولیس افسروں کو کسی طرح گھیر کر اور اپنے قابو میں لاکر انہیں منفی غدود کے ٹیکے لگاتے ہیں۔ پھر وہ نفرت اور بیزاری میں مبتلا ہوجاتے ہیں اور مجرموں کا محاسبہ کرنے کی بجائے خود جرائم کو فروغ دینے میں ہمارا ساتھ دیتے ہیں۔ ہم نے تمام شہروں کے کتنے ہی پولیس افسروں کو اپنے قابو میں کرلیا ہے۔ دوسرا محکمہ ہسپتال کے اس شعبے کا ہے جہاں پچوڑی ٹیکے لگائے جاتے ہیں۔ ہم وہاں کے ڈاکٹروں کو بھی اپنے قابو میں کرتے جارہے ہیں۔ جو ڈاکٹر ہیں وہ عوام کو پچوڑی ٹیکے لگانے کی بجائے چپ چاپ ان کی لاعلمی میں منفی غدود کے ٹیکے لگا دیتے ہیں۔ اس طرح عوام میں نفرت اور بیزاری کا زہر پھیلتا جارہا ہے۔"

راحت عزیزی نے کہا: "کمال ہے یہی طریقہ کار ہمارا بھی ہے۔ ہم بھی احتساب کرنے والے محکموں کی طرف توجہ دیتے ہیں اور ان کے افسران کو اپنے قابو میں کرتے ہیں۔ پچوڑی ٹیکے لگانے والوں کو بھی ہم نے اپنے قابو میں کر رکھا ہے لیکن ادھر ناظم آباد کا ڈاکٹر زیدی ہمارے قابو میں اب تک نہیں آیا ہے۔"

کامریڈ فرید نے کہا: "تم فکر نہ کرو۔ ہمارے آدمی کل تک ڈاکٹر زیدی کو بھی منفی غدود کا ٹیکہ لگادیں گے۔ پھر وہ بھی ہمارے اشاروں پر ناچے گا۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی کمرے کا دروازہ کھلا۔ ایک ادھیڑ عمر اور لانبے قد کا آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی سب لوگ احتراماً کھڑے ہوگئے۔ وہ اس شہر کا محتسب اعلیٰ تھا۔ اس نے دروازے کو اندر سے بند کرنے کے بعد ان کے قریب آکر آہستگی سے کہا: "میرے پاس ایک نوجوان جوڑا آیا ہے۔ وہ دونوں تم لوگوں کے خلاف بیان لکھوا رہے ہیں۔"

کامریڈ فرید نے پوچھا۔ "کون ہیں وہ۔؟"

محتسب اعلیٰ نے کہا: "لڑکے کا نام محمد یوسف عرف رہبر ہے۔ اس کا بیان ہے کہ وہ سرخ تنظیم کے ذریعے اس ملک میں تخریب کاری کے لئے آیا ہے۔"

کامریڈ نے سر ہلاکر کہا: "ہاں، میں جانتا ہوں۔ کیا وہ ہمارے خلاف رپورٹ لکھوا رہا ہے۔؟"

محتسب اعلیٰ نے ہاں کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا: "اس کے ساتھ جو لڑکی ہے اس کا نام لبنیٰ عرف سلیقہ ہے اور وہ کالی تنظیم کے ذریعہ اس ملک میں آئی ہے۔"

راحت عزیزی نے جلدی سے کہا: "ارے ہاں، یہ تو ہماری تنظیم کی چھوکری ہے۔ کیا اس کا دماغ خراب ہوگیا ہے کہ یہ ہمارے خلاف قدم اٹھا رہی ہے۔"

محتسب اعلیٰ نے کہا: "میں نے ان کے پچوڑی کارڈ کا مطالعہ کیا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ یہ ٹیکے اور کیپسول کے بغیر محبت کرنے والی ہستیاں ہیں۔ ان کے دماغوں میں قدرتی طور پر پچوڑی غدود کی افراط ہے۔ شاید اسی لئے یہ لوگ پاکستان کی محبت میں تم لوگوں کے خلاف قدم اٹھا رہے ہیں۔"

کسی نے کہا: "پچوڑی غدود کی افراط کا مطلب یہ تو نہیں ہو سکتا کہ پاکستان سے محبت ہوجائے۔ کیا پاکستانی حکومت نے پچوڑی غدود کے اثرات کو اپنے ملک تک محدود کرلیا ہے۔؟"

محتسب اعلیٰ نے کہا: "یہ بات نہیں ہے۔ اصل میں قومیت اور زمین سے رشتے کی بات ہے۔ سرخ تنظیم اور کالی تنظیم کے جتنے آلہ کار ہیں وہ اپنی تہذیب، اپنی معاشرت اور اپنے آباؤ اجداد کے تعلق سے پاکستان کی زمین سے وابستہ رہے ہیں۔ اس لئے جب ان کے دماغوں میں یہاں کی محبت کے غدود کی افراط ہوتی ہے تو لامحالہ یہاں کی زمین سے محبت ہوجاتی ہے۔ وہ سب سے پہلے یہی سوچتے ہیں کہ ان کی سلامتی اسی میں ہے کہ پہلے ملک کی سلامتی ہو۔"

راحت عزیزی نے کہا: "ہم کس بحث میں الجھ گئے ہیں۔ پہلے ہمیں سلیقہ اور رہبر کو ٹھکانے لگانا چاہیئے۔"

کامریڈ فرید نے کہا: "انہیں مارنے یا سزا دینے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ انہیں صرف منفی غدود کے ٹیکے لگا دیئے جائیں۔ پھر وہ ساری محبت بھول کر اسی طرح ہمارے کام آنے لگیں گے۔"

محتسب اعلیٰ نے کہا: "میرا بھی یہی مشورہ ہے۔ میں نے ان دونوں کو اپنے دفتری کمرے میں بٹھایا ہے۔ میں انہیں یہاں پہنچا دیتا ہوں۔ تم لوگ انہیں پکڑ کر منفی غدود کے ٹیکے لگادو تاکہ وہ باہر جاکر ہمارے خلاف پھر کچھ نہ کرسکیں۔"

سب لوگ اس فیصلے پر متفق ہوگئے۔ محتسب اعلیٰ وہاں سے نکل کر اپنے دفتری کمرے میں آیا۔ وہاں سلیقہ اور رہبر بیٹھے ہوئے تھے۔

اس نے کہا۔"تم دونوں کے بیانات قلمبند ہو چکے ہیں۔ اب میرے ساتھ دوسرے کمرے میں چلو۔ وہاں دوسرے افسران بیٹھے ہوئے ہیں۔ تم ان کے سامنے جاکر بتا دینا کہ سرخ تنظیم اور کالی تنظیم کے کون کون سے افراد تم دونوں کی نظروں میں ہیں اور ان کے نام اور پتے بھی لکھوا دینا۔ آؤ میرے ساتھ۔"

وہ دونوں اپنی جگہ سے اٹھ کر محتسب اعلیٰ کے پیچھے چلنے لگے۔ ایک کمرے کے دروازے پر پہنچ کر محتسب اعلیٰ نے کہا۔"یہ دروازہ کھول کر اندر چلے جاؤ۔"

رہبر نے سلیقہ کا ہاتھ تھام لیا۔ پھر دروازہ کھول کر اندر جانے لگا۔ اندر پہنچتے ہی وہ دونوں ٹھٹک گئے۔ وہ جن تخریب کاروں اور ان کے لیڈروں کی نشاندہی کرنے آئے تھے وہ سب کے سب وہاں نظر آرہے تھے۔ رہبر فوراً ہی پلٹ کر سلیقہ کو کھینچتے ہوئے کمرے سے باہر لے جانا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے ہی محتسب اعلیٰ نے دروازہ بند کر دیا۔ کامریڈ فرید نے ریوالور نکال کر رہبر کو نشانے پر رکھتے ہوئے کہا۔"اب کوئی حرکت نہ کرنا۔ بھاگنے کی کوشش نہ کرنا۔ ورنہ گولی مار دوں گا۔"

ریوالور دیکھتے ہی سلیقہ دوڑ کر رہبر کے سامنے ڈھال بن گئی۔ "نہیں نہیں، کوئی میرے رہبر کو نہیں مار سکتا۔ اس سے پہلے میں اپنی جان دے دوں گی۔"

رہبر نے اسے اپنے پاس سے ہٹانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔"نہیں سلیقہ میں مرد ہوں۔ میں تمہاری حفاظت کا ذمہ دار ہوں۔ میں تمہارے لئے جان دوں گا۔"

وہ سب ہنسنے لگے۔ راحت عزیزی نے کہا۔"بڑی محبت ہو گئی ہے تم دونوں کو۔ لیلیٰ مجنوں بن گئے ہو۔ ساری محبت ابھی دھل کر رہ جائے گی۔"

رہبر نے محتسب اعلیٰ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔"جناب یہ کیا؟ آپ تو اس شہر کے محتسب اعلیٰ ہیں۔ آپ کے ذریعے قانون رائج ہوتا ہے اور آپ ہی مجرموں کا محاسبہ کرتے ہیں لیکن آپ تو مجرموں کی سرپرستی کر رہے ہیں۔"

محتسب اعلیٰ نے ہنستے ہوئے کہا۔"اب سے آٹھ برس پہلے پاکستان کی یہی حالت تھی۔ مجرموں کی پشت پناہی وہی افسران کرتے تھے جن کے ہاتھوں میں قانون کی عملداری ہوتی تھی۔ جتنے مجرم ہوتے تھے وہ سب بھاگ نے حوالات اور جیلوں میں جاکر جرائم کی تربیت حاصل کرتے تھے پھر معاشرے کا ناسور بن جاتے تھے۔ اب پھر وہی ہونے والا ہے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی دو آدمیوں نے رہبر کو اور دو آدمیوں نے سلیقہ کو پکڑ لیا۔ انہیں زبردستی کرسیوں پر لاکر بٹھا دیا۔ اس کے بعد انہیں رسیوں سے باندھنے لگے۔ وہ خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے ریوالور تھا۔ انہیں دھمکی دی جا رہی تھی کہ ان کی مرضی کے خلاف کوئی حرکت ہو گی تو گولی مار دی جائے گی۔ اب رہبر سلیقہ کی سلامتی کے لئے اور سلیقہ رہبر کی سلامتی کے لئے خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ اچانک سلیقہ کے حلق سے چیخ نکلی۔ وہ ٹیکہ لگانے سے ڈرتی تھی۔ جب اس کے بازو میں سوئی چبھوئی گئی تو اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ یہی سلوک رہبر کے ساتھ کیا گیا۔ اسے بھی ایک ٹیکا لگا دیا گیا۔

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ وہ دونوں آنکھیں بند کئے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھے ہوئے تھے۔ پھر راحت عزیزی نے پوچھا۔"اب ان کا کیا کیا جائے؟"

ان کے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک ڈاکٹر نے اپنی رسٹ واچ کو دیکھتے ہوئے کہا۔"یہ انجکشن زود اثر ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ انہیں چھوڑ دیا جائے۔ اب یہ ہمارے خلاف کچھ نہیں بولیں گے۔"

کامریڈ فرید نے راحت عزیزی کی طرف جھک کر آہستگی سے کہا۔"میرا بھی یہی خیال ہے۔ ان دونوں کو چھوڑ دیا جائے۔ یہ دونوں ہی اپنے اپنے ٹھکانوں پر واپس چلے جائیں گے۔ اب ان کے اندر سے محبت کے عمدہ عمل چکے ہوں گے یا نکل رہے ہوں گے تھوڑی دیر میں یہ ہمارے راستے پر چلنے لگیں گے۔"

راحت عزیزی نے کہا۔"ٹھیک ہے۔ مگر انہیں یہاں کچھ دیر روک کر دیکھنا چاہئے کہ اس ٹیکے کا ردعمل کیا ہوتا ہے۔"

سلیقہ اور رہبر کی رسیاں کھول دی گئیں۔ وہ دونوں تھوڑی دیر تک اسی طرح کرسی پر بیٹھے رہے۔ سلیقہ بار بار اپنے سر کو تھام لیتی تھی اور کچھ ایسا چہرہ بناتی تھی جیسے اپنے اندر کچھ تبدیلی محسوس کر رہی ہو۔ اور اس تبدیلی کو برداشت کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

رہبر اپنے آس پاس کے لوگوں کو نظر انداز کر کے صرف سلیقہ کو دیکھے جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت انگیز چمک تھی۔ وہ سلیقہ کے حسن کو اور شباب کو ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ یہ اب تک میرے ساتھ تھی مگر مجھے اتنی دلنشت

ردی کی تعریف

وہ چیزیں جنہیں ہم پندرہ سال تک سنبھال کر رکھتے ہیں کہ شاید کبھی ان کی ضرورت پیش آجائے ــــ آخر میں تنگ آکر انہیں ضائع کر دیتے ہیں اور تب تیسرے ہی دن ان کی ضرورت پیش آجاتی ہے۔

سے نظر نہیں آئی تھی۔ میں کیسا نادان تھا کہ یہ میرے کمرے میں آئی۔ اندھیرے میں میرے ساتھ کھڑی ہوئی باتیں کرتی رہی اور میں مرد کی بجائے الو بنا رہا۔

ایسا سوچتے وقت رہبر کے منہ سے رال ٹپکنے لگی۔ اس نے جلدی سے منہ کو پونچھتے ہوئے اپنے لیڈر کامریڈ فرید کی طرف دیکھا۔ پھر اٹھ کر عاجزانہ انداز میں کہا: "کامریڈ! میں آپ کے سامنے شرمندہ ہوں۔ پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا کہ میں بہک گیا تھا۔ آپ لوگوں کے خلاف پتہ نہیں کیسی کیسی باتیں کر رہا تھا۔"

کامریڈ فرید نے مسکراتے ہوئے کہا: "میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں تھا۔ یہ سب پچوڑی غدود کی کارستانی تھی۔ اب ہم نے اس غدود کا توڑ کر دیا ہے۔ تم پھر ہمارے وفادار ہو اور ہم تم پر اعتماد کرتے ہیں۔"

رہبر نے کہا: "کامریڈ! میں کل صبح ایک انجینئر کی حیثیت سے یہاں ڈیوٹی سنبھال لوں گا۔ جیسا آپ لوگوں کا اشارہ ہوگا ویسا ہی کام کروں گا۔ لیکن میری ایک ضرورت پوری کر دی جائے۔"

کامریڈ نے کہا: "بیشک تمہاری ہر ضرورت پوری کی جائے گی۔ بولو کیا چاہتے ہو؟"

اس نے سلیقہ کو دیکھتے ہوئے کہا:

"مجھے اس کی ضرورت ہے۔"

یہ سنتے ہی سلیقہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ رہبر سے ذرا دور جاتے ہوئے بولی: "یہ کیا بکواس ہے۔ تم میری توہین کر رہے ہو۔ تم نے اپنے آپ کو سمجھا کیا ہے۔ کبھی آئینے میں اپنی صورت دیکھی ہے۔ جو میری تمنا کر رہے ہو۔"

راحت عزیزی نے ہنستے ہوئے کہا: "کیوں سلیقہ، تھوڑی دیر پہلے تو تم اس پر دل و جان سے فدا ہو رہی تھیں۔"

"وہ میری بھول تھی۔ پتہ نہیں، مجھے کیا ہو گیا تھا کہ میں اس کے پیچھے پیچھے یہاں تک چلی آئی۔"

رہبر نے اس کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا: "میری جان، اب میں تمہارے پیچھے پیچھے چلوں گا۔ میرے کامریڈ کی اجازت مل جائے تو میں تمہیں یہاں سے اٹھا کر لے جاؤں گا۔"

کامریڈ فرید نے مسکراتے ہوئے کہا: "میری طرف سے اجازت ہے۔ میں مسٹر راحت عزیزی سے درخواست کروں گا کہ وہ سلیقہ کو ہمارے حوالے کر دیں۔ اس لڑکی کے عوض ہم راحت عزیزی کی کسی بہت بڑی مہم میں ساتھ دیں گے اور اس مہم کو کامیاب بنائیں گے۔"

راحت عزیزی نے کہا: "مجھے منظور ہے۔ رہبر! میں تمہیں اجازت دیتا ہوں۔ اگر یہ اپنا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں نہ دے تو تم اسے زبردستی اٹھا کر کہیں بھی لے جا سکتے ہو۔"

کامریڈ فرید نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا: "اگر رہبر اسے اٹھا کر لے گیا تو بڑا مزہ آئے گا۔ اس ملک میں کافی عرصے سے بڑا کوئی ایسا تماشا نہیں ہوا کہ کوئی کسی لڑکی کو اٹھا کر لے گیا ہو یا کسی قسم کی زبردستی کی گئی ہو۔ اب یہاں کے لوگ یہ تماشا بھی دیکھیں گے۔"

رہبر نے سلیقہ کی طرف اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا: "اپنا ہاتھ دو گی یا میں ہاتھ پکڑ کر کھینچ لوں۔"

وہ سہم کر پیچھے ہٹتے ہوئے راحت عزیزی سے بولی۔ "یہ کیا ہو رہا ہے۔ تم نے تو کہا تھا کہ یہاں میں جتنی بھی تخریبی کارروائیوں میں تم لوگوں کے ساتھ شریک رہوں گی۔ وہاں میری عزت کی جائے گی۔ مگر تم لوگ میری عزت کے دشمن بن گئے ہو۔"

راحت عزیزی نے کہا: "عزت پیاری ہے تو اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے کر یہاں سے چلی جاؤ اور اس کے گھر تک اس کی خوشامد ہی کرو۔ اگر یہ مان گیا یا تم کسی چالاکی سے اپنے آپ کو بچانے میں کامیاب ہو گئیں تو آئندہ میں تمہاری عزت کو داؤ پر نہیں لگاؤں گا۔ اب تم فیصلہ کرو کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔"

سلیقہ نے فیصلہ کرنے کے انداز میں سوچتے ہوئے کبھی راحت عزیزی کو کبھی رہبر کو، کبھی کامریڈ فرید کو دیکھا پھر آہستگی سے اپنا ایک ہاتھ رہبر کی طرف بڑھا دیا۔ رہبر نے مسکرا کر اس کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا۔ پھر اسے کھینچتا ہوا اپنے ساتھ کمرے سے باہر لے گیا۔ کسی نے انہیں نہیں روکا۔ ان کے لیڈر جانتے تھے کہ محبت کے غدود اب گل چکے ہیں تو وہ سیدھے اپنی اپنی جگہ پہنچیں گے یعنی سلیقہ خیرالدین کے پاس پہنچے گی اور رہبر اپنے مکان نمبر ب۔ ۷ میں پہنچ جائے گا اور کل سے انجینئر کے فرائض انجام دے گا۔

رہبر سلیقہ کے ساتھ چلتا ہوا محتسب اعلیٰ کے دفتر سے گذرنے لگا وہاں ایک لڑکی نے انہیں مخاطب کیا: "مس سلیقہ، مسٹر رہبر! آپ لوگوں کے پچوڑی کارڈ یہاں رہ گئے ہیں۔"

رہبر سلیقہ کے ساتھ چلتا ہوا لڑکی کی میز کے پاس آیا پھر ان دونوں پچوڑی کارڈ کو اٹھا کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہوئے بولا: "یہ سب فضول سی چیزیں ہیں۔ ان کی وجہ سے آدمی بالکل ہی الو بن کر رہ جاتا ہے۔ عورت ہاتھ آتی ہے تو اسے ہاتھ نہیں لگاتا۔"

یہ کہہ کر اس نے اس لڑکی کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ دفتر میں کام کرنے والی لڑکی نے جلدی سے اپنے ہاتھ کو چھڑاتے ہوئے کہا: "مسٹر، یہ کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا پچوڑی کارڈ غلط تھا۔ آپ کو پھر سے طبی معائنہ کرانا چاہیے۔"

رہبر ہنستا ہوا، اس کا مذاق اڑاتا ہوا سلیقہ کو ساتھ لے کر

اس وقت سے باہر نکل آیا۔ پھر وہ دونو سڑک پر پہنچ گئے۔ سلیقہ نے
فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے التجا آمیز لہجے میں کہا: "رہبر! یہ تمہیں کیا ہو
گیا ہے۔ تم تو میری بے حد عزت کرتے تھے اور اب میری عزت کے
دشمن بن رہے ہو۔"

رہبر نے چلتے چلتے آہستگی سے کہا: "میری جان میں اب بھی
تمہاری عزت کرتا ہوں بس مجھے ایکٹنگ کرنے دو۔ ذرا دور تک
اسی طرح چلتی رہو۔ نہیں تو ان لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ ان کے
منفی غدود کے ٹیکے نے ہم پر اثر نہیں کیا ہے۔ کیا تم پر اثر کیا ہے۔؟"

سلیقہ نے پہلے تو اسے حیرانی سے دیکھا۔ پھر خوش ہو کر بولی۔
"ہاں جب ٹیکا لگایا گیا تو اس وقت مجھے عجیب سا لگا۔ ایک دم سے
دماغ میں جھنجھلاہٹ سی محسوس ہوئی۔ جی چاہتا تھا کہ جو بھی سامنے
آئے اس کے منہ پر تھوک دوں۔ مگر میں سر کو تھام کر برداشت کر رہی
تھی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ میں پہلے کی طرح بالکل نارمل
ہوں۔"

"میں بھی یہی محسوس کر رہا تھا۔ ٹیکا لگانے کے تھوڑی دیر بعد
میں بھی نارمل ہو گیا تھا۔ لیکن ان کے خیال کے مطابق یہ ظاہر کرنا ضروری
تھا کہ میں جھنجھلاہٹ میں مبتلا ہوں اور اب میرے اندر محبت نہیں۔
نفرت ہی نفرت ہے۔ بہرحال یہ تم نے بھی عقل مندی کا ثبوت دیا کہ
ان کے سامنے مجھ سے سہمی ہوئی رہیں۔"

"میں تو سچ مچ سہمی ہوئی تھی کیونکہ تم میرے حسن و شباب کی
تعریف کر رہے تھے اور بڑے ہی سستے انداز میں بول رہے
تھے مجھے ڈر لگنے لگا۔ وہ مجھے پہلے والا رہبر نظر نہیں آیا تو میں
سہم گئی تھی۔"

"اب کیسا نظر آ رہا ہوں؟"

وہ مسکرا کر بولی: "اب تو تم بہت ہی پیارے لگ رہے ہو۔"

رہبر نے ذرا دور جا کر اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ پھر وہ دونوں
اطمینان سے فٹ پاتھ پر چلنے لگے۔ سلیقہ نے پوچھا: "اب کیا
ہوگا۔ ہمیں پناہ کہاں ملے گی۔ کیا ہم پھر ان لوگوں کے آلۂ کار بن
کر رہیں گے۔؟"

"کیا بتاؤں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ ہم ڈاکٹر کے پاس
طبی معائنے کے لئے گئے تھے لیکن اس ڈاکٹر نے ہمیں دوسرے
ڈاکٹر زیدی کے پاس بھیجا۔ ڈاکٹر زیدی نے ہمیں محتسبِ اعلیٰ
کے پاس بھیجا اور محتسبِ اعلیٰ نے ہمیں ہمارے ہی لیڈروں
کے سامنے جا کر پھنسا دیا۔ ایسا لگتا ہے جیسے ہمیں پھانسنے کا
یہ سلسلہ ہسپتال کے اس پہلے ڈاکٹر سے چلا تھا۔ سارے لوگ اس
سازش میں ملوث نظر آتے ہیں۔ کون فرشتہ ہے، کون شیطان ہے
ہم انہیں سمجھ نہیں سکتے۔؟"

سلیقہ نے کہا: "ہمارے لئے مشکل تو یہ ہے کہ محتسبِ اعلیٰ
جیسا افسر بھی سازش کرنے والوں کا ساتھ دے رہا ہے اور ہم
شکایت کریں یا سازشیوں کو بے نقاب کریں تو کس کے پاس
کریں۔؟"

"سلیقہ میرے دماغ میں ایک تدبیر ہے۔ ہمارے لیڈر ہمیں
جیسا دیکھنا چاہتے ہیں ہم انہیں ویسے ہی نظر آتے رہیں یعنی ان
کے سامنے بار بار جھنجھلاہٹ، نفرت اور بیزاری کا اظہار کرتے
رہیں، ان کے منصوبوں کے مطابق تخریبی کارروائیوں میں شریک
رہیں اور چپکے چپکے یہ معلوم کرتے رہیں کہ اب پاکستان میں کون
دیانت دار افسر رہ گیا ہے اور کون ان بدمعاشوں کو سزا دے سکتا
ہے یا انہیں ملک سے باہر نکال سکتا ہے تو ہم اس کے پاس جا کر
تمام رپورٹ پیش کر دیں گے۔"

سلیقہ نے کہا: "ہاں یہی مناسب ہے۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے مکان نمبر ب۔ ۷ میں پہنچ گئے۔

رہبر نے کہا: "آج رات تم میرے پاس رہو۔ صبح یہاں سے اپنے
مکان میں جانا تاکہ ان لوگوں کو اس بات کا یقین ہو جائے کہ ہم
گنہگار بن گئے ہیں۔"

سلیقہ نے اسے جھکی جھکی نظروں سے دیکھا۔ پھر کہا: "رہبر
مجھے پوچھنا تو نہیں چاہئے۔ میرا دل پوری طرح یقین کرتا ہے کہ تم بڑے
اچھے رہبر ہو مگر میں اپنی تسلی کے لئے پھر بھی پوچھ لیتی ہوں۔ کیا
میں تم پر اعتماد کروں؟"

رہبر نے اس کے ہاتھ کو تھام کر کہا: "ہاں سلیقہ، جو محبت
سچی ہوتی ہے وہ ہوس سے پاک ہوتی ہے۔ محبت کرنے والے
گناہ کی کالک اپنے منہ پر نہیں لگاتے اور ہم بھی نہیں لگائیں گے۔"

وہ خوش ہو کر بولی: "بس میں نے اعتماد کر لیا۔ ایک رات
نہیں ہزار راتیں تمہارے ساتھ گزار سکتی ہوں۔ اب چلو تم سو جاؤ
صبح تمہیں ایک انجینئر کی حیثیت سے ڈیوٹی پر جانا ہے۔"

وہ دونوں بیڈ روم میں آ گئے۔ وہاں تھوڑی دیر تک اس
موضوع پر بحث کرتے رہے کہ منفی غدود کے ٹیکے نے ان پر اثر کیوں
نہیں دکھایا اور ان کی محبت کے غدود کس طرح برقرار رہ گئے۔ ان
باتوں کا کوئی جواز تو ہونا چاہئے۔ کچھ سمجھ میں تو آنا چاہئے کہ ایسی
انہونی بات کیسے ہو گئی۔

بہت سی باتیں جو انہونی نظر آتی ہیں حقیقتاً انہونی نہیں ہوتیں۔
انہیں عام دماغ سمجھ نہیں پاتا کہ ایسا کیوں ہو گیا۔ کچھ لوگ سمجھ لیتے ہیں
وہ بھی ایسے وقت جب ایسے تجربات سے گزرتے ہیں۔ ابھی سلیقہ
اور رہبر ان تجربات سے گزر رہے تھے۔ جب وہ محبت کی انتہا
کو پہنچیں گے تو شاید وہ انہونی بات انہیں ہونی نظر آ جائے گی۔

دوسری صبح وہ رہبر کے مکان سے نکل کر اپنے مکان میں آئی۔ وہاں خیرالدین، صابرہ بیگم اور رضی الدین اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے سلیقہ کی زلفیں بکھری ہوئی تھیں۔ وہ اپنے چہرے سے پریشانی ظاہر کررہی تھی۔ خیرالدین نے کہا: "ہمیں راحت عزیزی سے معلوم ہوچکا ہے۔ تم رہبر کے پاس رات بھر رہی تھیں"۔

وہ جھنجلا کر بولی: "اگر معلوم ہوچکا ہے تو مجھے سنانے کی کیا ضرورت ہے۔" اور غصے سے پاؤں پٹختی ہوئی باتھ روم کی طرف جانے لگی۔

رضی الدین نے کہا "تم ہم پر غصہ کیوں دکھارہی ہو؟"

وہ پلٹ کر بولی: "تم لوگ نام کے مرد ہو۔ سرخ تنظیم کا ایک آدمی مجھے پکڑ کر لے گیا اور تم لوگوں سے کچھ نہ ہوا"۔

رضی الدین نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا: "راحت عزیزی نے بتایا ہے کہ یہ ہماری پلاننگ کا ایک حصہ تھا۔ اس کے بعد سرخ تنظیم والے ایک مہم میں ہماری بڑی مدد کریں گے"۔

سلیقہ نے 'اونہہ' کہہ کر باتھ روم کے دروازے کو اندر سے بند کردیا۔ دروازہ بند کرتے ہی وہ مسکرانے لگی۔ وہ ایسی مسکراہٹ تھی جو محبت کے چہرے سے طلوع ہوتی ہے اور محبوب کی آغوش میں غروب ہوکر بھی روشن رہتی ہے۔

اس ملک میں سلیقہ کا دوسرا دن تھا۔ اتنی مختصر مدت میں اس نے محبت کا سبق حاصل کرلیا تھا اور وہ سبق اسے دل و جان سے یاد ہوگیا تھا۔ اس کے علاوہ یہاں آکر وہ بہت سی معلومات حاصل کررہی تھی۔ بیرونِ ملک میں رہ کر وہ سوچتی رہتی تھی کہ پاکستان جنت بن گیا ہے۔ وہاں سب لوگ فرشتوں جیسی زندگی گزارتے ہیں۔ کوئی کسی سے جھوٹ نہیں بولتا کسی کو دھوکہ نہیں دیتا۔ سب ایمانداری اور بڑی پاکیزگی سے دن گزارتے ہیں۔ یہاں پہنچتے ہی دو ہی دن میں اسے پتہ چل گیا کہ جو کچھ اس نے سنا تھا اگرچہ وہ سچ تھا مگر اب اس سچ کے بیچ میں جھوٹ رواج پارہا تھا۔ بیرونی ممالک سے آئے ہوئے دشمنوں نے فریب کا جال پھیلا دیا تھا۔

دشمنوں کی کامیابی کی ایک ہی وجہ تھی۔ انہوں نے پھوڑی غدود کا توڑ پیدا کرلیا تھا۔ منفی غدود کے ٹیکے تیار کرلئے تھے۔ اسی ایک حربے سے وہ سچائی کو جھوٹ میں بدل رہے تھے۔ پتہ چلا کہ اب وہاں کبھی کبھی چوری ڈکیتی کی واردات ہوتی ہیں۔ کہیں کوئی قتل کردیا جاتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی لڑکی اغوا کرلی جاتی ہے۔ جب وہ دوبارہ واپس ملتی ہے تو اس کا سب کچھ لٹ چکا ہوتا ہے۔ ایسے دہشت زدہ کرنے اور منافقت کرنے والے واقعات پچھلے چھ ماہ سے ہوتے آرہے تھے اور اب ان واقعات میں رفتہ رفتہ شدت پیدا ہوتی جارہی تھی۔

حکومت کے ذمہ دار افراد پریشان تھے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے جنہیں پھوڑی ٹیکے لگائے جاتے ہیں وہ کچھ دنوں میں پھوڑی غدود سے خالی کیسے ہوجاتے ہیں اور ان میں نفرت، حرص و ہوس اور تشدد پسندی کیوں آجاتی ہے جس طرح شیطان نظر نہیں آتا اس طرح ایک مشین کے ذریعے منفی غدود نظر نہیں آتے تھے۔ جو نفرت کرنے والا یا تشدد پر آمادہ ہونے والا مرجاتا تھا تب اس کے دماغ کی سرجری کی جاتی تھی تو کچھ ایسے اجزا پائے جاتے تھے جو پھوڑی غدود کے لئے زہرِ قاتل کا کام کرتے ہیں اس طرح بڑے بڑے ڈاکٹروں اور انٹیلی جنس کے افسروں نے یہ رائے قائم کی تھی کہ پھوڑی غدود کے خلاف کارروائی کی جارہی ہے اور یہ سب بڑی سازشیں ہیں۔

جاوید رہبر پہلے ہی دن ڈیوٹی سنبھالنے کے دوران اس تاک میں رہا کہ اسے کوئی دیانت دار افسر مل جائے تو وہ اسے اپنے دل کی بات کہہ سکے اور ان دشمنوں کی نشاندہی کرسکے۔ ڈیوٹی کا چارج دوسرے انجینئر سے لیتے وقت اس سے بہت سی باتیں ہوئیں۔ اس نے محسوس کیا کہ چارج دینے والا انجینئر کچھ بیزار سا ہے اور تعمیری ذہن نہیں رکھتا ہے۔ اس کے اندر بھی کچھ تخریب پسندی ہے۔ رہبر نے اسے آزمانے کے لئے کوڈ ورڈ میں ایک جملہ ادا کیا جسے وہ سمجھ نہ سکا۔ اس نے پوچھا: "ابھی تم نے کیا کہا تھا؟"

رہبر نے جلدی سے مسکرا کر کہا: "ابھی میں رومانیہ کی زبان میں کہہ رہا تھا کہ راحت عزیزی میرا گہرا دوست ہے اور ہم آپس میں ساتھی ہیں۔"

یہ کہہ کر رہبر نے اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ اس کے مقابل بیٹھے ہوئے انجینئر نے کہا: "دوست، مجھے افسوس ہے کہ میں تمہاری باتیں نہیں سمجھ رہا ہوں۔ یہ راحت عزیزی کون ہے؟"

رہبر نے خوش ہوکر کہا: "اس کا مطلب یہ ہے کہ تم سچے پاکستانی ہو اور تمہارے اندر پھوڑی غدود کافی مقدار میں ہیں۔ میں تم سے ایک سلسلے میں تعاون چاہتا ہوں۔"

"بیشک بتاؤ۔ میں تمہارے لئے کیا کرسکتا ہوں"۔

"مجھے کسی ایسے دیانت دار محتسبِ اعلیٰ تک پہنچادو جو دشمنوں کو گرفتار کرسکے اور ان کا محاسبہ کرسکے۔ ہمارے ملک میں دشمن اپنا جال پھیلائے جارہے ہیں۔"

اس نے کہا: "اگر ایسی بات ہے تو ابھی میرے ساتھ چلو۔ میں اس نیک کام میں پوری طرح تمہارا ساتھ دوں گا"۔

رہبر نے کہا: "میں ایک محتسبِ اعلیٰ سے مل چکا ہوں۔ وہ غداروں کے لئے کام کررہا ہے۔ میں اگر تمہارے ساتھ اس کے پاس جاؤں گا تو پھر پھنس جاؤں گا"۔

"تم بے فکر رہو۔ میں ایسے غداروں کے پاس نہیں لے جاؤں گا تم مجھے اس محتسب اعلیٰ کا نام بتاؤ۔"

رہبر نے اس کا نام اور پتہ بتایا۔ وہ انجینئر اسے ایک دیانتدار آفیسر کے مکان میں لے گیا۔ وہ مکان خالی تھا۔ انجینئر نے اسے بیٹھنے کے لئے کہا اور کسی نمبر پر ٹیلیفون کر کے مختصر طور پر بتایا کہ اسلام آباد سے جاوید رہبر نام کا جو انجینئر یہاں آیا ہے وہ بیرونی ممالک سے آئے ہوئے دشمنوں کی صحیح نشاندھی کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے فوراً ہی آکر اس سے ملاقات کی جائے۔

وہ آنے والے ایماندار آفیسر کا انتظار کرنے لگا۔ آدھے گھنٹے کے بعد گھڑی دیکھتے ہوئے بولا "میں نے تو سنا تھا کہ پاکستان میں لوگ اب بہت ہی فرض شناس اور وقت کے پابند ہوگئے ہیں۔ یہ تمہارا دیانتدار آفیسر ابھی تک نہیں پہنچا۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی دروازے سے آواز آئی "ہم پہنچ گئے ہیں۔"

رہبر آواز سنتے ہی ایک دم سے اچھل کر کھڑا ہوگیا کیونکہ وہ کامریڈ فرید کی آواز تھی۔ دروازے پر کامریڈ فرید کے ساتھ ایک اور نوجوان ریوالور پکڑے کھڑا ہوا تھا۔ کامریڈ فرید اپنے ساتھی کے ساتھ اندر آتے ہوئے بولا "اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم نے منفی غدود کا جو ٹیکہ تمہیں اور سلیقہ کو لگایا تھا وہ کامیاب نہیں ہوا ہے۔ ضرور ہمارے ٹیکے میں کوئی خامی رہ گئی ہے۔ اچھا ہوا، تم پھر ہمارے دام میں آگئے۔ کسی دیانتدار آفیسر سے ٹکرا جاتے تو ہمارا نقصان ہوجاتا۔ مگر اب ہم تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے کسی ٹیکے کا خطرہ مول نہیں لیں گے۔"

رہبر نے غصہ سے اس انجینئر کو دیکھا جو اسے بہلا پھسلا کر وہاں تک لایا تھا۔ اس انجینئر نے مسکرا کر کہا "میں نے تمہارے کوڈ ورڈز کا مطلب سمجھ لیا تھا اور انجان بن کر معلوم کرنا چاہتا تھا کہ تمہاری حقیقت کیا ہے حقیقت معلوم ہوئی تو میں نے اپنے کامریڈ کو یہاں بلوالیا۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی رہبر نے اچانک ہی پلٹ کر ریوالور والے کے ہاتھ پر ایک زور کی ٹھوکر ماری۔ اس کے ہاتھ سے ریوالور نکل کر دور جا گرا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ لوگ ریوالور کی طرف لپکتے۔ رہبر چھلانگیں لگاتا ہوا، دوڑتا ہوا کمرے سے باہر آگیا اور دروازے کو باہر سے بند کر دیا۔

دوسری طرف سلیقہ بن سنور کر رہبر سے ملنے کے لئے گھر سے جانا چاہتی تھی لیکن اسی وقت رضی الدین اس کے کمرے میں آگیا اس نے مسکرا کر اسے دیکھتے ہوئے کہا "کیا خیال ہے۔ کہاں بجلی گرانے جا رہی ہو۔"

سلیقہ نے ناگواری سے کہا "اپنا لہجہ درست کرو۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا "جو لڑکی خود درست نہ ہو، اس کے ساتھ اور کیسی درستی۔"

وہ غصے سے اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ پھر بولی "آئندہ اگر تم نے میرے ساتھ ایسی گفتگو کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ میں راحت عزیزی سے شکایت کر دوں گی۔"

رضی الدین نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا "جب شکایت کرنا ہو تو کرتی رہنا۔ ابھی تو میں تمہیں کہیں جانے نہیں دوں گا۔"

وہ اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے چیخنے لگی۔ اس کی چیخ سن کر خیرالدین اور صابرہ بیگم کمرے میں آگئے۔ خیرالدین نے ڈانٹتے ہوئے کہا "رضی، اس کا ہاتھ چھوڑ دو۔ کیا تم اس علاقے میں ہمارا بھانڈا پھوڑنا چاہتے ہو۔ کیا تم بھول گئے کہ کسی کو جیتنے کے لئے اپنے اندر پھوڑی غدود کا ہونا ضروری ہے۔ محبت سے کسی کو جیت لیا جاتا ہے۔ اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو یہاں کے لوگ تمہیں پکڑ کر پھوڑی ٹیکہ لگادیں گے۔"

سلیقہ نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ پھر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی "میں اب تم لوگوں کے ساتھ نہیں رہوں گی نہ کوئی کام کروں گی۔" یہ کہتے ہوئے وہ جلدی سے باہر آگئی اسے ڈر

تھا کہ کہیں خیر الدین اور رضی اسے پکڑ کر کسے میں بند نہ کر دیں۔ باہر گلی میں آتے ہی سامنے راحت عزیزی کی گاڑی نظر آئی۔ وہ اپنے دو آدمیوں کے ساتھ گاڑی سے اتر رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اس نے دور سے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "سلیقہ کہاں جا رہی ہو۔ رک جاؤ۔"

وہ رک کر کچھ کہنا چاہتی تھی۔ اسی وقت جاوید رہبر کی آواز سنائی دی۔ وہ اس کے پیچھے والی گلی سے دوڑتا ہوا آ رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ "سلیقہ ادھر چلی آؤ۔ ان کے پاس نہ جانا۔ ہمارا بھید کھل گیا ہے انہیں معلوم ہو گیا ہے کہ منفی غدود کے ٹیکے نے ہم پر اثر نہیں کیا ہے۔ یہ راحت عزیز تمہیں نقصان پہنچانے آیا ہے۔"

وہ رہبر کو دیکھتے ہی اس کی طرف دوڑتی چلی گئی تھی۔ خیر الدین، صابرہ بیگم اور رضی الدین مکان سے باہر آ گئے تھے۔ دوسری طرف راحت عزیزی خلاف توقع جاوید رہبر کو دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔

جاوید رہبر نے سلیقہ کا ہاتھ تھام کر راحت عزیزی کی طرف دیکھتے ہوئے چیخ چیخ کر کہا۔ "لوگو اپنے اپنے گھروں سے باہر نکل آؤ اور اپنے دشمنوں کا محاسبہ کرو۔ یہی لوگ غیر ممالک سے یہاں آئے ہیں اور تمہارے ملک کو کھوکھلا کر دینا چاہتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ یہ لوگ پاکستان کو کوئی نقصان پہنچائیں انہیں پکڑ کر ہتھوڑی کے ٹیکے لگا دو یا انہیں ملک سے باہر بھگا دو۔"

رہبر کے چیخنے چلانے کے دوران بہت سے لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکل کر آ گئے تھے لیکن اس سے پہلے ہی راحت عزیزی اپنی گاڑی میں جا کر بیٹھ گیا تھا۔ خیر الدین اپنی فیملی کے ساتھ بھاگتا ہوا گاڑی کی طرف جا رہا تھا محلے والوں کو جاوید رہبر کی باتیں سمجھنے میں، دشمنوں کو پہچاننے میں ذرا دیر لگی۔ اتنی دیر میں وہ تمام لوگ گاڑی میں بیٹھ کر فرار ہو گئے۔

رہبر نے اطمینان سے محلے والوں کو تمام تفصیلات بتائیں کہ وہ اور سلیقہ دونوں سرخ تنظیم اور کالی تنظیم سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ دونوں تنظیمیں کس طرح ملک میں بدامنی پھیلا رہی ہیں۔ اس کی باتیں سننے کے بعد تمام محلے والوں نے ان دونوں کو سماجی بہبود کے دفتر میں پناہ دی۔ پھر وہاں بڑے بڑے افسران کو ٹیلیفون کے ذریعے رابطہ قائم کر کے بلایا۔ وہاں پر مسئلہ پیش آیا کہ سلیقہ اور رہبر کی کس طرح حفاظت کی جائے۔ وہ سب محبت کے مارے تھے اور یہ سوچ کر پریشان ہو رہے تھے کہ دشمن ان دونوں کی جان کے دشمن بن گئے ہیں۔ لہٰذا ان کی فکر میں دوسروں کو بھی نیند نہیں آ سکتی تھی اور نہ ہی وہ سکون سے رہ سکتے تھے۔

بہت سے لوگ کہہ رہے تھے کہ سلیقہ اور رہبر کو اسی محلے میں رکھا جائے وہ سب مل کر ان کی حفاظت کریں گے اور دشمنوں کو اس علاقے میں گھسنے نہیں دیں گے۔

ایک آفیسر نے کہا۔ "دشمنوں کا چہرہ کوئی نہیں پہچانتا جو دشمن ابھی پہچانے گئے ہیں وہ اب سامنے نہیں آئیں گے۔ اپنے دوسرے ساتھیوں کو انہیں ہلاک کرنے کے لیے بھیجیں گے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ ان دونوں کو فی الحال اس شہر سے دوسرے شہر منتقل کر دیا جائے۔"

رات کے دس بجے تک وہ سب اس فیصلے پر متفق ہو گئے۔ انہوں نے سلیقہ اور رہبر کو اپنے ساتھ رات کا کھانا کھلایا پھر ایک گاڑی آئی جس میں ان دونوں کو بٹھا دیا گیا۔ اس میں دو مسلح جوان بھی تھے۔ وہ گاڑی سپر ہائی وے کی طرف جانے لگی۔ دشمنوں کی تخریبی کارروائیوں سے پہلے اس ملک میں اس قدر امن و امان تھا کہ کوئی مجرم نظر نہیں آتا تھا۔ اگر اتفاق سے کہیں یہ پتہ چل جاتا کہ کسی نے کوئی خطا کی ہے یا کسی نے کسی بات پر جھگڑا کیا ہے تو پولیس والے اپنے ساتھ ہتھوڑی ٹیکا لگانے کی سرنجیں لے جاتے تھے۔ یہی ان کا ریوالور یا اصلاحی ہتھیار ہوتا تھا۔ اس کے بعد جو خطا کار ہوتا تھا وہ راہ راست پر آ جاتا تھا لیکن پچھلے کئی ماہ سے دشمنوں نے اتنے ہنگامے کیے تھے۔ ہر شہر میں ایسی تباہی و بربادی کا مظاہرہ کیا تھا کہ یہاں کے پولیس والے پھر سے ریوالور اور دوسرے ہتھیار رکھنے لگے تھے۔ اس وقت بھی سلیقہ اور رہبر کو اپنے ساتھ لے جاتے وقت دو نوجوان رائفل لیے ہوئے تھے۔

سپر ہائی وے پر تقریباً پچاس میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اچانک ہی فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ ان کی گاڑی کو ایکبارگی جھٹکا سا لگا۔ پھر وہ گاڑی قابو سے باہر ہو گئی۔ ڈرائیور نے اسٹیئرنگ کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن وہ گاڑی سڑک سے نیچے اتر گئی اور ایک جگہ جا کر رک گئی۔ پتہ چلا کہ گاڑی کے پہیے پر کسی نے فائر کیا تھا اور پہیہ بیکار ہو گیا تھا۔

چند لمحوں تک گاڑی کے اندر خاموشی رہی۔ سلیقہ گھبرائی ہوئی تھی اور رہبر سے لگی بیٹھی تھی۔ رہبر نے کہا۔ "باہر نکلنا خطرے سے خالی نہیں ہے دشمن کہیں آس پاس ہوں گے۔"

پیچھے بیٹھے ہوئے مسلح جوانوں نے اپنی اپنی رائفل کی نال کو سلیقہ اور رہبر کی گردن سے لگاتے ہوئے کہا۔ "باہر تو نکلنا ہی ہوگا۔ دشمن باہر بھی ہیں اور اندر بھی۔"

گاڑی ڈرائیو کرنے والا بری طرح زخمی ہو گیا تھا۔ اس نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کیا۔ تم دونوں بھی محبت کرنے والوں کے دشمن بن گئے ہو؟"

ایک مسلح جوان نے کہا۔ "اب وہ پاکستان نہیں ہے جس کے بارے میں تصور کیا جاتا تھا کہ یہاں صرف محبت ہے۔ نفرت

سے نہ کوئی سوچتا ہے نہ بولتا ہے۔ نہ کوئی کسی کو نقصان پہنچاتا ہے"۔

رہبر نے کہا: "ہم اپنے جیتے جی اس جنت کو جہنم بننے نہیں دیں گے"۔

سلیقہ نے بھی عزم سے کہا: "ہاں، میں اور رہبر اور ہمارے جیسے کتنے ہی محبت کرنے والے تم لوگوں کے ناپاک ارادوں کو ایک دن ختم کر دیں گے"۔

وہ دونوں مسلح جوان ہنسنے لگے۔ ایک نے کہا: "یہ تم نہیں تمہارے کبوتری غدود بول رہے ہیں چلو باہر نکلو۔ ابھی ہم ان غدود کا خاتمہ کر دیں گے۔ نہ تم رہو گے نہ غدود رہیں گے"۔

انہیں باہر نکلنا پڑا کیونکہ باہر دور دور تک ایسے کتنے ہی لوگ نظر آ رہے تھے جو ریوالور، رائفل اور دوسرے مہلک ہتھیار رکھے ہوئے تھے اور وہ اپنا گھیرا گاڑی کے اطراف تنگ کر رہے تھے۔ جب سلیقہ اور رہبر باہر آ گئے تو ایک مسلح جوان نے ڈرائیور کو بھی کھینچ کر باہر نکالا۔ جو دشمن چاروں طرف سے گھیر رہے تھے۔ ان کے لیڈر نے کہا: "یہ ڈرائیور بھی کبھی ہمارا آدمی تھا لیکن پتہ نہیں کیسے اس کے دماغ میں کبوتری غدود کی افراط ہو گئی۔ جیسے کہ تم دونوں کے دماغوں میں کبوتری غدود پیدا ہو گئے۔ ہم نے اس کمبخت کو بھی منفی غدود کے ٹیکے لگائے ان کا کوئی اثر نہیں ہوا"۔

رہبر نے کہا: "تم لوگ چاہے کتنی کوششیں کر لو۔ محبت کو نفرت میں نہیں بدل سکو گے"۔

اس کی بات ختم ہوتے ہی ڈرائیور کو گولی مار دی گئی ان کے لیڈر نے ہنستے ہوئے کہا: "ہم محبت کو مار تو سکتے ہیں"۔

"ہاں، یہ ازل سے ہوتا آیا ہے جب محبت کے دشمن محبت کو بدل نہیں سکتے، اسے کچل نہیں سکتے۔ اسے کم نہیں کر سکتے تو بیزار ہو کر جھنجھلا کر اسے مار ڈالتے ہیں۔ محبت کرنے والوں کے مرنے کی کتنی ہی داستانیں بکھری ہوئی ہیں لیکن محبت کے مرنے کی ایک بھی داستان تم نہیں سنا سکو گے۔ محبت اس وقت بھی زندہ تھی اور محبت آج بھی زندہ ہے"۔

"بکواس مت کرو۔ تم دونوں نے ہماری دونوں تنظیموں کو بہت زبردست نقصان پہنچایا ہے۔ یہاں سے لے کر لاہور اور اسلام آباد تک ہمارے جو آلہ کار ہیں۔ تم لوگوں نے ان کی نشاندہی کر دی ہے۔ ہم تم لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ تمہارے مرنے کے بعد بھی ہم اس معاشرے میں تباہی پھیلا سکتے ہیں"۔

رہبر نے کہا: "بیشک اب ہمیں اپنی موت نظر آ رہی ہے لیکن مرنے سے پہلے ہم کچھ کہنا چاہتے ہیں"۔

لیڈر نے کہا: "کہو۔ تمہیں آخری موقع دیا جاتا ہے"۔

رہبر نے کہا: "تم اتنے سارے لوگ جو ہمیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہو۔ تم میں سے کسی نہ کسی کو حالات کے کسی موڑ پر شاید کوئی دیانت دار افسر کبوتری ٹیکہ لگائے یا قدرتی طور پر کبوتری غدود پیدا ہو جائیں تو اس وقت تم میں سے وہ شخص اس ملک کے ذمہ دار افراد تک ہمارا پیغام دے۔ ہمارا پیغام یہ ہے کہ دنیا کا کوئی معاشرہ ایک پتھر نہیں ہوتا کہ اسے اصلاحی ہتھیاروں سے تراش کر ایک خوبصورت مجسمہ بنا لیا جائے۔ معاشرہ ایک گدھا نہیں ہوتا کہ اسے ڈنڈے مار مار کر ایک انسان بنا دیا جائے اور جو بظاہر انسان ہوتے ہیں انہیں صحیح معنوں میں انسان نہیں بنایا جا سکتا۔

آسمان سے صحیفے اترے تاکہ صراطِ مستقیم کی نشاندہی کی جائے ایک کے بعد دوسرے پیغمبر لاکھوں کی تعداد میں آتے رہے تاکہ وہ صراطِ مستقیم پر چلتے ہوئے عملی نمونے پیش کریں لیکن کسی بھی آسمانی کتاب کسی بھی نبی کو یہ اختیار حاصل نہیں تھا کہ وہ جسے چاہتے اسے راہِ راست پر لے آتے۔ اللہ تعالیٰ نے کلامِ پاک میں فرمایا ہے۔

'اے نبی تو راہ پر نہیں لا سکتا جسے چاہے، بلکہ اللہ ہی جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔

بیشک جسے اللہ چاہتا ہے اس کے دماغ کے آسمان سے دل کی زمین پر کبوتری غدود اُتارتا ہے۔ محبت کی نعمت عطا کرتا ہے۔ کیونکہ ایک محبت ہی ایسا صحیفہ ہے۔ خدا کی طرف سے پیدا ہونے والا کبوتری غدود ہی ایک ایسا غدود ہے جس کا کوئی توڑ نہیں ہو سکتا۔ تم دنیا میں کسی بھی عمل کا، کسی بھی ایجاد کا توڑ پیدا کر سکتے ہو لیکن محبت کا توڑ آج تک کسی نے پیدا نہیں کیا۔ محبت کو تم نفرت کی آگ میں جھونک کر غرور کے سامنے جھکا نہیں سکتے۔ محبت کو پیاسا مار کر اسے کربلا میں اپنا سر دینے سے نہیں روک سکتے۔ محبت مرتی ہے لیکن ہر کربلا کے بعد زندہ ہونے کے لئے مرتی ہے۔ تم لوگ ہمیں بھی مار دو۔ بس اتنی سی گذارش ہے کہ تم میں سے کسی کے دل و دماغ میں قدرتی طور پر جب محبت کے غدود پیدا ہوں تو ہمارا پیغام ہمارے پاکستانیوں تک، ہمارے ذمہ دار افسران تک پہنچا دینا"۔

اس کی بات ختم ہوئی تو تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔ زمین چپ ہو گئی، آسمان ایک تماشائی کی طرح خاموش رہا۔ پھر اس خاموشی اور سناٹے میں یکے بعد دیگرے دو بار فائرنگ کی آواز دور تک گونجتی چلی گئی۔ پھر اس کے بعد وہی کربلا کی خاموشی چھا گئی۔

Medora
SHAMPOOS

Medora
DELUXE
plain
shampoo
MEDORA OF LONDON
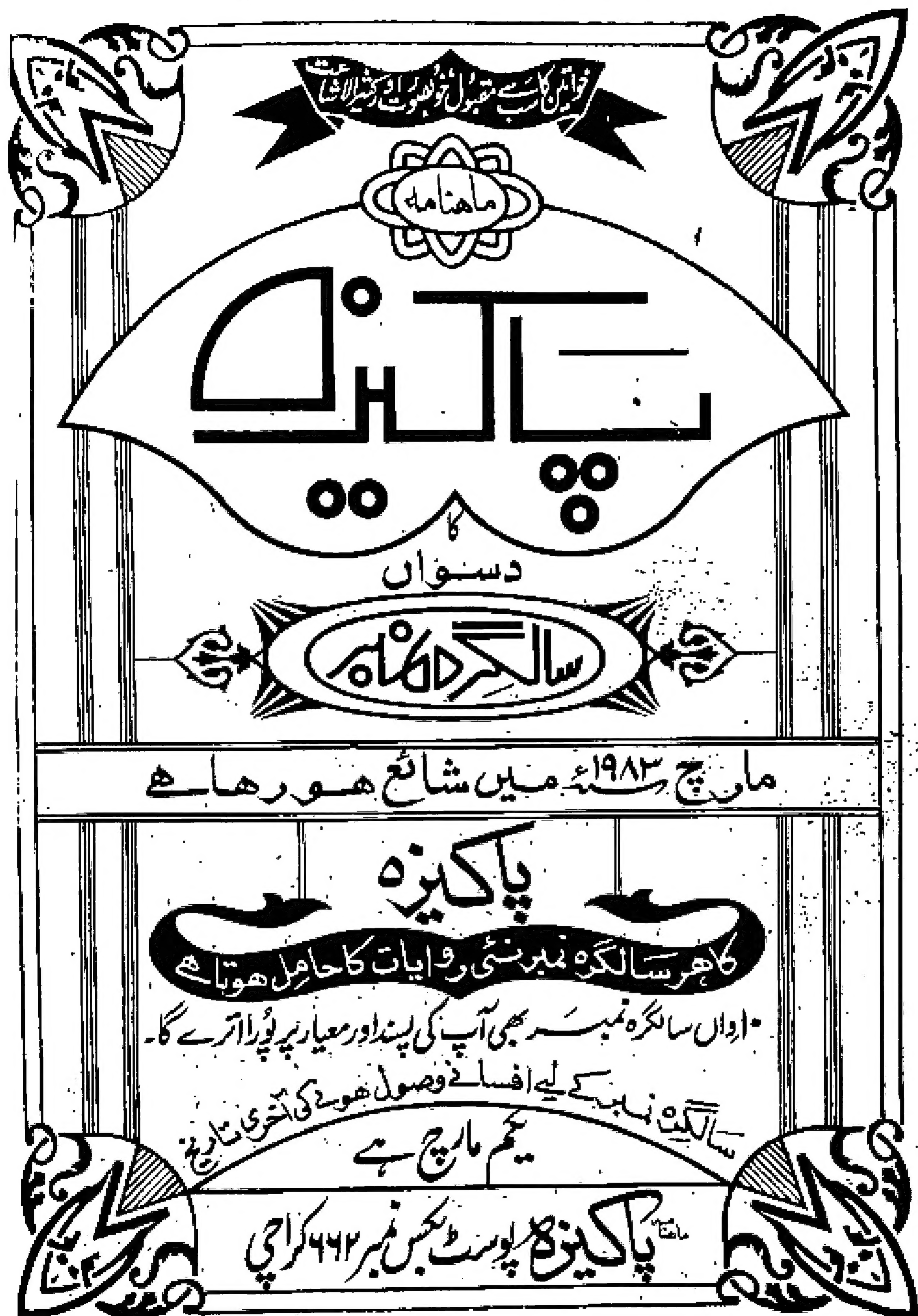
Medora
SHAMPOO

Medora
EGG
SHAMPOO

میڈوراشیمپو

میڈوراشیمپو میں شامل اجزاء بالوں کی صحت مند افزائش میں مدد دیتے ہیں۔ میڈوراشیمپو کا نرم و لطیف جھاگ بالوں کی صفائی کے ساتھ اُن کی حفاظت بھی کرتا ہے۔

گھنے اور مُلائم بالوں کے لئے میڈورا ایگ شیمپو یا پلین شیمپو اور خشکی دُور کرنے کے لئے میڈورا انٹی ڈینڈرف شیمپو۔

ڈیلکس، پلاسٹک اور شیشے کی بوتل میں دستیاب

MEDORA OF LONDON for a more beautiful you